

فتاویٰ
شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ



انتخاب وتقدیم
فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ
پروفیسر حافظ عبدالجبار حفظہ اللہ

فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وتقدیم

فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ

جلد چہارم

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

نام کتاب: ــــــــــ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

انتخاب وتقدیم: ــــــــــ فضیلۃ الشیخ محمد عزیر شمس رحمہ اللہ

ترجمہ: ــــــــــ پروفیسر حافظ عبد الجبار حفظہ اللہ

طبع اول: ــــــــــ فروری 2021ء

طبع دوم: ــــــــــ مارچ 2024ء

ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com darabitayyab1@gmail.com

www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست (جلد چہارم)

نماز

- نماز، زکات اور روزے کی فرضیت کی تاریخ 15
- نماز سے متعلقہ چند مسائل 15
- نماز کی شرطوں کی وضاحت 18
- کلمے کو کافی سمجھنے والے بے نمازی کا حکم 21
- بے نماز، روزہ خور اور حرام خور نام نہاد مسلمان 24
- فاسق و فاجر نمازی کا حکم 25
- کسی مصروفیت کی وجہ سے نماز موخر کرنے کا حکم 25
- عذر کے بغیر نماز چھوڑنے کا حکم 34
- نماز کو عمداً موخر کرنے کا گناہ 42
- تارکِ نماز سے متعلق اہلِ اختیار کی ذمے داری 48
- نماز میں سستی کرنے والوں کا حکم اور ان سے تعامل کا طریقہ 51
- نماز میں سستی کرنے والی بالغ لڑکی اور بوڑھی عورت کو فہمائش 53
- نماز نہ پڑھنے کا نکاح پر اثر اور ایسی عورت کو رکھنے یا نہ رکھنے کا مسئلہ 54
- بے نمازی کی دعوت قبول کرنے کا مسئلہ 56
- ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ سے غلط استدلال 56
- نماز نہ پڑھنے والے اور صرف جمعہ پڑھنے والے کو لعنتی کہنا 57

اذان:

- اذان کا حکم اور کیفیت 58
- "الصلاۃ خیر من النوم" کہنے کی کیفیت 61

مواقیت:

نمازِ فجر کا افضل وقت 62

صبح روشن کر کے نمازِ فجر پڑھنے کا مفہوم 64

قضا نماز:

توبہ کی قبولیت اور فرائض کی قضا کا مسئلہ 65

زندگی میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا مسئلہ 67

ماضی کی نمازوں کی قضا کا حکم 70

پہلے قضا شدہ نماز پڑھی جائے یا حاضر؟ 73

پہلے حاضر نماز پڑھی جائے یا قضا؟ 73

قضا شدہ نمازوں کی سنتوں کا حکم 74

دورانِ خطبہ جمعہ قضا شدہ نماز پڑھنے کا حکم 74

شروطِ نماز اور ارکان:

نماز میں اطمینان کا حکم 76

عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب 77

جوتے پہن کر نماز کا حکم 78

نماز میں عورت کے بال ننگے ہونے کا حکم 79

قیمتی لباس سے اجتناب کرنے کی حیثیت 79

ٹخنوں سے متجاوز شلوار کا حکم 85

نماز پڑھنے کے لیے ممنوعہ جگہیں 85

مجبوری میں غسل خانے میں نماز پڑھنے کا حکم 86

غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں نماز کا حکم 87

مسجد میں صفیں بچھانے کا حکم 88

غیر مسلم کے لیے مسجد میں داخل ہونا یا گزرگاہ بنانا 89

قبر والی مسجد میں نماز کا حکم 89
مسجد میں قیام و طعام کے لیے جگہ مخصوص کرنے کا حکم 90
مسجد میں سونے، بات کرنے اور جوتوں سمیت چلنے کا حکم 92
مسجد میں ذبح کرنے، غسل دینے اور ضائع شدہ بچہ دفن کرنے کا حکم 92
مسجد میں مانگنے کا حکم 93
امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کا حکم 93
نماز میں سورت فاتحہ کی تکمیل کے لیے رکوع سے پیچھے رہنے والے کا حکم 107
امام سے پہلے اٹھنے اور بیٹھنے والے نمازی کا حکم 107
صف کے پیچھے اکیلے کی نماز کا حکم 109

متفرق مسائل:

عبادات میں زبان سے نیت کا حکم 113
غیر مسلک کا امام 120
مخالف مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم اور امام مالک کے مذہب کی اہمیت 122
مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نماز کا حکم 128
حنفی کی غیر حنفی کی اقتدا میں نماز 131
چند اختلافی مسائل میں افضلیت کا پہلو 139
اکیلے نمازی کو امام بنانے کا حکم 191
﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کی صحیح تفسیر 191
پہلی صف کی فضیلت اور اس سے دور رہنے کی مذمت 194
غلط فاتحہ پڑھنے والے کی نماز کا حکم 194
دعائیہ الفاظ میں اِعرابی غلطی کا حکم 195
نبی اکرم ﷺ سے نمازِ مغرب وغیرہ میں سورت اعراف یا انعام پڑھنے کا ثبوت 196
رکوع کے بعد رفع الیدین 196

سجدے کے لیے جھکنے کی کیفیت 196
تیسری رکعت میں رفع الیدین کا حکم 197
تشہد پڑھے بغیر تیسری رکعت کے لیے اٹھ جانا 198
پانچویں رکعت کے لیے اٹھ جانے کا حکم 198
فرضوں کے بعد دعا کا مسئلہ 199
نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا حکم 200
نمازِ پنج گانہ کے بعد اجتماعی دعا کا حکم 201
نماز میں دعا کا اصل مفہوم 201
اذکار کے لیے انگلیوں اور تسبیح کا استعمال 211
باجماعت نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کا حکم 213
مسنون اذکار کو چھوڑ کر خود ساختہ اذکار و اوراد کا حکم 214
نماز میں موذی حشرات کو مارنے کا حکم 215
نماز میں وسوسوں سے چھٹکارا پانے کے اسباب 216
سلام پھیرنے سے پہلے وضو توڑنے والے کی نماز کا حکم 219
نماز میں ہنسنے کا حکم 219
نماز پڑھنے والے کو با آوازِ بلند سلام کہنے کا حکم 220
مقتدی کے آگے سے گزرنے کا حکم 220
حفظِ قرآن افضل ہے یا طلبِ علم؟ 220
حفظ و تلاوت افضل ہے یا دیگر اذکار 221
رات کے وقت نماز افضل ہے یا تلاوت 224
تلاوت افضل ہے یا ذکر و تسبیح 224
قرآن کے احترام میں کھڑا ہونا، اسے چومنا اور اس سے فال نکالنا 225
چاند اور سورج گرہن کی تعیین میں ماہرینِ فلکیات کی آرا کی حقیقت اور نماز کا طریقہ 227
سائنس و فلسفہ اور شریعت میں بارش، بجلی اور زلزلوں کی اصلیت 233

نوافل:

وتر اور تارکِ وتر کا حکم 236
مسافر کے لیے وتر کا حکم 236
وتر کی قضا کا وقت 236
وتر کے بعد دو رکعات نفل کا حکم 242
نمازِ زحافہ کا حکم 244
قنوتِ نازلہ اور وتر کا مسنون طریقہ اور حکم 244
نمازِ فجر اور عشا میں قنوتِ نازلہ کا حکم 249
عصر کی سنتوں کی مشروعیت 249
سنن موکدہ کی قضا 250
قصر نماز کی سنتوں کا حکم 250
مغرب کے بعد دو رکعات کا حکم 251
''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' کا مفہوم 252
عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب 252
نمازِ رغائب کی اصلیت 253
وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کا حکم 255
سجدے کی آیت سن کر بے وضو سجدہ کرنے کا حکم 255
دعائے استخارہ کی جگہ 255
ممنوعہ اوقات میں نماز اور اسباب والی نمازوں کا حکم 256
قصداً ممنوعہ وقت میں نماز کا حکم 262
ممنوع وقت میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم 263
موجودہ زمانے میں باجماعت نماز کی فرضیت اور نفاق کا وجود 264
مسجد سے متصل دکان میں اور گھر میں اکیلے تاخیر سے نماز پڑھنے کا حکم 270
مسجد کے چوکیدار کے لیے باجماعت نماز اور جمعے میں عدمِ شرکت کی رخصت 272

باجماعت نماز اور اکیلے کی نماز کا حکم 272
کسی کی پیروی میں ترکِ جماعت کی عادت بنانا 285
پہلی اختتام پذیر ہوتی جماعت اور دوسری کے امکان کی صورت میں مطلوب عمل 285
پڑھی ہوئی نماز دہرانے کے متعلق دو حدیثوں میں مطابقت 288
جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں پہلے سنتیں پڑھنے کا حکم 290
جمعہ اور جماعت پانے کی مقدار 291
نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم 294
بدعتی اور فاجر کے پیچھے نماز کا حکم 294
شرابی امام کے پیچھے نماز کا حکم 296
نماز سے پہلے امام کے عقیدے کی تحقیق کا مسئلہ 296
صاحبِ حیثیت امام کے لیے تنخواہ لینے کا حکم 296
نامرد کے پیچھے نماز کا حکم 299
قضا شدہ نماز کو اگلی باجماعت نماز کے ساتھ پڑھنے کا حکم 299
غسلِ جنابت اور حالتِ جنابت میں پڑھی گئی نماز دہرانے کا حکم 300
مکبّر کا حکم 300
امام کے آگے کسی رکاوٹ کی صورت میں نماز کا حکم 301
مسجد سے متصل اپنی اپنی دکانوں میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا حکم 303
اپنی مرضی سے مسجد سے متصل دکانوں میں جمعہ پڑھنے کا حکم 304
نصف شعبان (شبِ براءت کی نماز کا حکم) 304

رخصتیں:

بوڑھے معذور کی نماز 305
عورت کا طاقت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا 305
سفر میں قصر نماز کا حکم 306

شریعت میں قصر کی مسافت کی تعیین 307
چار دن سے زائد قیام کے ارادے کی صورت میں قصر کا حکم 310
سفر میں دو نمازیں اکٹھی پڑھنے اور قصر کا حکم 310
نماز جمع کرنے کے عذر 316

نمازِ جمعہ:

مسافر کے لیے جمعہ اور عیدین کا حکم 317
جمعہ کے لیے تعداد 319
جمعہ کے دن اذان کے بعد سنتوں کی حیثیت اور بعد از نماز سنتوں کی تعداد 319
نمازِ جمعہ پانے کے لیے بھاگ کر جانا 323
جمعہ کے دن نمازِ فجر میں سورت سجدہ پر مداومت کا حکم 324
جمعہ کے دن عید ہونے کی صورت میں جمعے کا حکم 325
جمعہ کے دن عصر کے بعد سورت کہف کی تلاوت کا حکم 326

نمازِ عید:

نمازِ عید میں مخصوص سورتوں کی تلاوت کا حکم اور دو تکبیروں کے درمیان کچھ پڑھنے کا ذکر 327
تکبیرات کے الفاظ، طریقہ اور وقت 327
عید الفطر میں تکبیرات کا اہتمام 328
عید مبارک کہنے کا حکم 329

جنازے کے مسائل:

کم سن فوت شدہ بچوں کے اعمال نامے، کنواری فوت ہونے والیوں کی جنت میں شادی اور حمل و ولادت کے مسائل 331
حاملہ فوت ہونے والی عورت کے پیٹ سے بچہ نکالنے کی صورت اور حکم 332
غائبانہ نمازِ جنازہ کی مشروعیت اور حدود 333
بے نماز اور شرابی کے جنازے کا حکم 338

میت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کا حکم 339

مقتول کے کسی زخم سے خون رسنے کی صورت میں اس کو غسل دینے کا حکم 341

سمندر میں ڈوب کر مرنے والے کا حکم 342

میت کو قبرستان لے جانے کا مسنون طریقہ اور چند بدعات کا تذکرہ 342

جنازے کے ساتھ باآواز بلند کلمہ طیبہ کے ورد کا حکم 346

دفن کے بعد کلمے کی تلقین کرنے کا حکم 347

مسلمانوں کے قبرستانوں میں غیر مسلموں کو دفنانے کا مسئلہ 349

عیسائی پڑوسی کی عیادت اور جنازہ پڑھنے کا حکم 349

مسلمان کی حاملہ عیسائی بیوی کے دفن کرنے کی جگہ 349

قبروں پر قرآن رکھنے اور چراغ جلانے کا حکم 350

اپنی زندگی میں اپنی قبر کو کھدوانے کا حکم 351

مسجد میں کسی شخص کا اپنے لیے قبر کے لیے جگہ مخصوص کرنے کا حکم 352

میت کو منتقل کرنا نیز روحوں کی ملاقات 354

ایک حدیث کی تحقیق 355

انسان کی کوشش صدقہ جاریہ اور ایصالِ ثواب 355

میت کو قرآن خوانی کا ثواب 362

قرآن خوانی کا ایصالِ ثواب 362

تلاوت کے ایصالِ ثواب کا مسئلہ 366

رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو تلاوت کا ایصالِ ثواب کرنے کا حکم 367

میت کو قرآن خوانی کا ثواب، اجرت پر پڑھوانا اور قبروں پر قرآن پڑھنا اور مسجد بنانا 370

ہفتہ وار یا ماہانہ ختم قرآن کی وصیت کا حکم 374

مزار سازی کی تاریخ اور بدعات 375

قبروں کی زیارت کی شرعی اور غیر شرعی صورت 389

عورتوں کے قبرستان جانے کا مسئلہ 392

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا حکم 394
نبی کا قبر میں زندہ ہونا، عبادت کرنا اور ان پر امت کے اعمال پیش کیے جانا 397
مردے کا زائر کی بات سننا، اس کی روح کا لوٹایا جانا 398
میت پر رونے سے میت کو تکلیف ہونا 402
تعزیت کا حکم اور طریقہ 409
نوحہ گری کا حکم 409
حشر کے روز سب برہنہ اٹھیں گے؟ 410

زکات

زکات کے عمومی ضوابط 414
سال کے دوران میں بکریوں کا نصاب پورا ہونے پر زکات 424
عشر کی مقدار نکالنے کا پابند 424
حکومت کو زکات دینا 425
زکات میں قیمت نکالنے کا حکم 426
والدین اور اولاد کو زکات دینے کا حکم 427
مقروض بیٹے کا باپ سے زکات لینا 427
حقیقی مستحق بھائی کو زکات دینا اور وقت سے پہلے زکات نکالنا 428
صدقہ فطر کی جنس اور مصارف 430
صدقہ فطر نکالتے وقت تمام مصارف کا احاطہ 431
مانگے بغیر کچھ مل جانے کو قبول کرنا 437
متفرق سوالات 438

روزہ

شک کا روزہ اور ابر آلود دن میں روزہ رکھنے کا حکم 441
اکیلے کی رؤیت کا حکم 446

حاکم شہر کے ہاں رؤیت کا عدمِ ثبوت مگر چند لوگوں کے ہاں رؤیت کا ثبوت 450
عام مسافر اور پیشہ ور مسافر کے لیے روزے کا حکم 451
آرام دہ سفر میں روزے کا حکم 457
صبح کی اذان کے بعد سحری کھانے والے کا حکم 457
روزے توڑنے والے کا حکم 457
روزہ توڑ کر مباشرت کرنے والے کا حکم 465
رمضان میں غلط فہمی کی بنا پر طلوعِ فجر کے بعد مجامعت کا مسئلہ 467
بوس و کنار کا روزے پر اثر 467
رمضان کا روزہ چھوڑنے والے کی سزا 468
کلی، مسواک، کھانا چکھنے، قے کرنے، خون نکلنے اور تیل یا سرمہ لگانے سے روزے پر اثر 468
رمضان میں بیمار ہو کر روزے نہ رکھ سکنے، پھر رمضان ہی میں فوت ہونے والے کے روزوں کا کفارہ 469
لیلۃ القدر کی تعیین اور علامات 469
لیلۃ القدر اور شبِ معراج کی فضیلت اور فرق 470
معراجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت 471
ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں اور رمضان کے آخری عشرے میں سے افضل 475
یومِ عرفات، یومِ جمعہ، عیدِ فطر اور قربان میں سے افضل 475
رجب، شعبان، رمضان کے روزے، اعتکاف کا مہینا اور خاموشی 476
صوم دہر کا مفہوم اور حکم 481
میلاد النبی کے موقع پر ختم قرآن کا حکم 484
عاشورا کے دن کیے جانے والے اعمال کی حقیقت 485
غیر مسلموں کے تہواروں کو منانا اور ان کو چیزیں فروخت کرنا 497

حج و عمرہ

عمرے کا حکم 500

عمرہ حج میں داخل ہے 501

بار بار حج کرنا افضل ہے یا غریبوں پر صدقہ کرنا؟ 502

عورت کا محرم کے بغیر حج کرنا اور حجِ بدل کرنا 503

مال کے عوض میت کی طرف سے حج کرنے کا حکم 503

قرض اتارنے کے لیے حجِ بدل کرنے کا حکم 506

مقروض کو حج کروانا 508

دورانِ سفر میں فوت ہو جانے والے حاجی کے حج کا حکم 508

احرام اور حج کی نیت کا حکم 509

طواف کے لیے طہارت کا حکم 517

عورتوں کو دورانِ حج میں پیش آنے والے مسائلِ حیض 522

مکی کے لیے طواف افضل ہے یا عمرہ؟ 528

افضل حج 549

عرفات کے اوقات میں بیت المقدس کی زیارت اور وہاں وقوفِ عرفہ کرنے کا حکم 549

قربانی اور شکار

قربانی کے لیے قرض لینا 559

میت کی طرف سے قربانی کرنا 559

ذبح کرنے کا شرعی طریقہ 560

مسلمان کا ذبیحہ اولیٰ ہے 561

حاملہ جانور کی قربانی 561

جنگلی جانوروں اور پرندوں کے شوقیہ شکار کا حکم 561

تیر اندازی اور بندوق بازی کا حکم 562

گھوڑے کے گوشت کا حکم 565

گھوڑوں کے گوشت اور دودھ کا حکم 565

لگڑ بھگے، لومڑی، جنگلی بلی اور گیدڑ کے گوشت اور کھال کا حکم 566

جا گیر کرائے پر دینے کا حکم 567

جنگلی گدھے اور گھوڑے سے پیدا ہونے والے خچر کا حکم 570

اہلِ کتاب کے ذبیحے کا حکم 570

عورت کا ذبح کرنا 579

مرتے ہوئے جانور کو ذبح کر کے کھانا 580

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی حیثیت 581



نماز

نماز، زکات اور روزے کی فرضیت کی تاریخ

سوال نماز، زکات اور روزہ کب فرض ہوئے؟

جواب الحمد لله. نماز اور زکات کا حکم ہجرت سے پہلے مکہ میں دیا گیا، لیکن نماز کے فرائض مدینہ میں مشروع ہوئے۔ روزہ دو ہجری میں فرض ہوا اور رسول کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں نو رمضان پائے۔ واللہ أعلم[1]

نماز سے متعلقہ چند مسائل

سوال درج ذیل مسائل کے بارے میں فتویٰ درکار ہے:

1. کیا امام کے لیے بلند آواز سے نیت کرنا، تکبیر کہنا اور دعا کرنا جائز ہے؟
2. کیا عصر اور فجر کے بعد مصافحہ کرنا مستحب ہے؟
3. کیا امام کے پیچھے تبلیغ، یعنی دوسری صفوں تک اس کی تکبیر پہنچانا جائز ہے؟
4. کیا مسجد میں بچوں کو تعلیم دینا جائز ہے؟

جواب الحمد لله.

مسئلہ 1: امام تکبیر تو بولے گا مگر بالاتفاق بلند آواز کے ساتھ نیت کرنا کوئی مستحب یا مطلوب عمل نہیں، بلکہ نیت کے الفاظ بولنا مطلوب ہی نہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ کچھ متاخرین کے ہاں اس کی ایک کمزور سی توجیہ ملتی ہے۔ ائمہ دین کا اتفاق ہے کہ مقتدی کے لیے طہارت، نماز اور روزے کے لیے منہ سے نیت بولنا جائز نہیں۔ نیت کے الفاظ ادا کرنے کے مستحب ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔ کچھ حنفی، شافعی اور حنبلی علما کے نزدیک مستحب اور موکد ہے اور کچھ مالکی اور حنبلی علما اس کو مکروہ کہتے ہیں، کیوں کہ یہ بدعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ثابت نہیں۔ کیوں کہ نیت دل کا عمل ہے جس کو زبان سے ادا کرنا عبث ہے۔ یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ تاہم اکثر اس سے منع کرتے ہیں، جو اس پر اصرار کرے قابلِ تعزیر ہے۔ واللہ أعلم

مسئلہ 2: نماز کے اندر دعا کے حوالے سے مسنون عمل آہستہ آواز سے دعا کرنا ہے، البتہ اگر جہری نماز میں قراءت

---

[1] جامع المسائل (٣٢٣/٤)

کے ضمن میں دعا آ جائے یا دعائے قنوت کی جائے تو آواز بلند کی جائے گی، کیوں کہ اس کے جواب میں آمین کہی جاتی ہے۔ نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ سے منقول اذکار کرنا سنت ہے۔ امام اور مقتدی کا اجتماعی دعا کرنا آنحضرت ﷺ سے ثابت نہیں۔ کچھ علما اس کو مستحب کہتے ہیں اور کچھ فجر اور عصر کے بعد مستحب نہیں کہتے، بالکل اسی طرح ان میں سے کچھ علما کے نزدیک نماز کے بعد امام کا بیٹھنا مکروہ ہے، بیٹھنا، ذکر کرنا یا دعا کرنا مستحب نہیں، مگر یہ دونوں اقوال سنت کے خلاف ہیں، نماز کے اندر دعا کرنا اور نماز کے بعد ذکر کرنا آنحضرت ﷺ کی سنت ہے۔ نماز پڑھنے والا اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے تو انسان کا اپنے رب سے مناجات کرنے کے لمحے میں دعا کرنا مناجات سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنے سے اچھا اور بہتر ہے۔

نماز کے بعد آہستہ آواز سے دعا کرنا جائز ہے۔ جن کے نزدیک نماز کے بعد امام کا دعا کرنا مستحب ہے، وہ کہتے ہیں امام آہستہ آواز سے دعا کرے۔ اگر آواز بلند کرنے میں مقتدیوں کو تعلیم وغیرہ دینے کی کوئی مصلحت ہو تو کوئی حرج نہیں، کیوں کہ دعا میں اصل آواز پست رکھنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ [الأعراف: ٥٥] ''اپنے رب کو گڑگڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو۔''

فرمایا:

﴿ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ﴾ [مریم: ٣] ''جب اس نے اپنے رب کو چھپی آواز سے پکارا۔''

اسی بنا پر کسی بزرگ نے کہا ہے کہ بلند آواز سے دعا کرنا بدعت ہے۔

ذکر میں کبھی آواز بلند کرنا مسنون ہوتا ہے، جیسے اذان اور تلبیہ اور کبھی پست رکھنا۔

مسئلہ 3: نماز کے بعد مصافحہ کرنا بدعت ہے، کیوں کہ یہ نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ کسی عالم نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔

مسئلہ 4: امام کے پیچھے بلاضرورت تبلیغ (تکبیر) کہنا بدعت اور بالاتفاق مکروہ ہے۔ نہ تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے دوبارہ تکبیر کہا کرتے تھے اور نہ کوئی خلفائے راشدین کے پیچھے ہی یہ عمل کرتا۔ اس لیے علما کا اتفاق ہے کہ امام کے لیے بلند آواز سے تکبیر کہنا مسنون ہے۔

علمانے فقہی مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مقتدی کسی ضرورت کے پیش نظر تبلیغ یعنی بلند آواز سے تکبیر کہہ سکتا ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ جب اپنے مرض الموت میں مسجد میں آئے اور آپ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں تک تکبیر کی آواز پہنچاتے، کیوں کہ آپ ﷺ بیمار تھے[1] اور آپ کی آواز بہت زیادہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٥٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤١٨)

مدہم تھی، یہ ضرورت کے وقت مقتدی کے لیے تبلیغِ تکبیر کے جواز کی دلیل ہے۔

اگر امام کے لیے اپنی آواز اتنی بلند کرنا ممکن ہو کہ مقتدی اس کی تکبیر سن سکیں تو سنت یہی ہے اور ایسی صورت میں تبلیغ مکروہ ہے۔

کیا مکبّر یعنی تکبیر بلند کرنے والے کی نماز ٹوٹ جاتی ہے؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ مالکی اور حنبلی مذہب میں اس کے حوالے سے دونوں اقوال ملتے ہیں۔ بالخصوص جب مکبّر امام سے پہلے تکبیر کہہ دے اور آواز کھینچنے میں مشغولیت کی وجہ سے نہ تو رکوع اور سجدے میں تسبیحات ادا کر سکے اور نہ ان میں اعتدال و اطمینان برقرار رکھ سکے۔ لہٰذا جو اس بدعت کی وجہ سے آواز بلند کرتا ہے وہ نماز کے ایک فرض، اعتدال و اطمینان اور ایک قول کے مطابق واجب تسبیح کو چھوڑ کر امام سے آگے بڑھنے کی خرابی کا شکار ہو جاتا ہے جس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو امام سے پہلے اپنا سر اٹھاتا ہے، کیا اس کو یہ خوف نہیں آتا کہ اللہ مبادا اس کا سر گدھے کے سر میں تبدیل کر دے۔''[1] ایسا کرنے والا بلاشبہہ نافرمان، گناہ گار، بلکہ علما کے صحیح تر قول کے مطابق اس کی نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

مسئلہ 5: امام کا مقتدیوں کو اوامر و نواہی کی تعلیم دینا بالاتفاق فرض ہے۔ اگر امام کو غالب گمان ہو کہ کوئی دوسرا یہ فرض ادا نہیں کر رہا تو اس وقت اس پر یہ کام فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اگر ترک کرے گا تو گناہ گار ٹھہرے گا۔

نماز کی اصلاح کے حوالے سے تو ائمہ دین نے صراحت سے لکھا ہے کہ جو آدمی کسی کو امام سے آگے بڑھتا ہوا دیکھے اور اس کی اصلاح نہ کرے یا نماز میں بھولنے والے کو متنبہ نہ کرے وہ گناہ میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں ذکر ہوا ہے:

« وَيْلٌ لِّلْعَالِمِ مَنَ الْجَاهِلِ، وَوَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ مِنَ الْعَالِمِ، فَوَيْلٌ لِّلْعَالِمِ إِذَا سَكَتَ عَنْ تَعْلِيمِ الْجَاهِلِ وَوَيْلٌ لِّلْجَاهِلِ إِذَا لَمْ يَقْبَلْ مِنَ الْعَالِمِ »[2]

''اگر کوئی عالم جاہل کو تعلیم نہ دے تو اس کے لیے ہلاکت ہے اور اگر کوئی جاہل عالم کی بات قبول نہ کرے تو اس کے لیے بھی ہلاکت ہے۔''

حدیثِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

« إِنَّ الْخَطِيئَةَ إِذَا خَفِيَتْ لَمْ تَضُرَّ إِلَّا صَاحِبَهَا وَإِذَا أُعْلِنَتِ الْخَطِيئَةُ فَلَمْ تُنْكَرْ ضَرَّتِ الْعَامَّةَ »[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢٧)

[2] مسند الفردوس (٣٩٥/٤) السلسلة الضعيفة (٤٧٥٦)

[3] المعجم الأوسط (٩٤/٥) شعب الإيمان (٩٦/٦) السلسلة الضعيفة (١٦١٢)

''غلطی جب چھپی ہے تو صرف غلطی کرنے والے کو نقصان دیتی ہے اور جب ظاہر ہو جائے اور اس سے روکا نہ جائے تو وہ عام لوگوں کو بھی نقصان دیتی ہے۔''

اس لیے اگر وہ نماز کا حکم جو دین کا ایک رکن ہے اور اس کے واجبات قائم کرنے کی دعوت نہیں دیتا، عذاب کا مستحق ہے، کیونکہ نماز ضائع کرنا سب سے بڑی برائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ [مريم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ [الماعون: ٤،٥]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''

یہ نماز پڑھتے تھے مگر وقت، اطمینان اور امام کی پیروی جیسے اس کے واجبات ضائع کر دیتے اور ان سے بے پروائی برتتے تھے۔

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ منافقوں کی نماز ہے۔ سورج کو دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان آتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مارتا ہے اور اس میں بہت تھوڑا اللہ کا ذکر کرتا ہے۔''[1] آپ ﷺ نے اس نمازی کو منافق کہا ہے، کیونکہ یہ وقت اور اطمینان دونوں کو کھو دیتا ہے۔

اگر مسجد میں بچوں کو تعلیم دینا مسجد کے لیے باعثِ اذیت ہو، وہ اس کو گندا کر دیں، شور مچائیں، نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالیں اور ان کے لیے مشکل پیدا کریں تو اس سے روکنا اور منع کرنا ضروری ہے۔ واللہ أعلم[2]

نماز کی شرطوں کی وضاحت

سوال نماز کی شرطوں میں سے نیت، ساتویں شرط اور فرائض کے ساتھ مسنون نوافل کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب الحمد للہ. نماز کی شرطیں حسبِ ذیل ہیں:

① طہارت۔ ② ستر۔ ③ قبلہ رخ ہونا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٢٢)

[2] جامع المسائل (٧/٤٠٠_٤٠٥)

طہارت کی دو انواع ہیں:

1 طہارتِ حدث: یعنی بے وضو ہونے کی حالت میں وضو کرنا۔ جنابت کی حالت میں ہونے میں غسل کرنا، عورت کا ماہواری سے فارغ ہو کر غسل کرنا۔

2 طہارتِ خبث: بدن، کپڑے اور نماز کی جگہ کا نجاست سے پاک ہونا۔ اگر کوئی انسان معذور ہو یعنی بھول جائے یا اس کو علم ہی نہ ہو تو علما کے صحیح تر قول کے مطابق اس پر نماز دہرانا واجب نہیں لیکن اگر طہارتِ حدث کو بھول جائے تو نماز دہرانا لازمی ہے۔

نیت کا مقام دل ہے۔ علما کے اتفاق کے ساتھ آدمی کو زبان سے نیت ادا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جو انسان جو کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو اچھی طرح جانتا ہو تو ضرور اس کی نیت کرتا ہے۔

کچھ علما کے نزدیک بول کر نیت کرنا مستحب ہے، مگر صحیح موقف کے مطابق یہ مستحب نہیں، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام طہارت، نماز اور روزے میں بول کر نیت نہیں کرتے تھے۔

ساتویں شرط فرض نمازوں کے لیے وقت ہے۔ فرض نماز اس وقت تک نہیں پڑھی جاتی جب تک اس کا وقت شروع نہ ہو۔ فجر کا وقت طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ شمس تک ہے۔

ظہر کا وقت زوال سے لے کر ہر چیز کا سایہ اس کے مثل اور برابر ہونے تک ہے۔ مگر اس میں جمہور ائمہ کے نزدیک زوال کا سایہ شامل نہیں۔ یہ شافعی احمد، مالک اور احناف میں سے قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی اور دیگر کئی علما کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں اسی کا ذکر ہوا ہے۔

عصر کا وقت علما کے صحیح تر قول کے مطابق سورج زرد ہونے تک ہے۔ اگر انسان غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے پڑھ لے تو وہ ادا ہو گی، قضا نہیں ہو گی، مگر غروب تک موخر کرنا جائز نہیں۔ مغرب کا وقت ایک قول کے مطابق سرخی کے غروب تک ہے۔

عشا کا وقت آدھی رات یا تہائی رات تک ہے۔ نماز کے ارکان میں قیام، رکوع، سجدہ، شروع میں ذکر اور تکبیرِ افتتاح متفق ارکان ہیں۔ ایسے ہی سورت فاتحہ بھی مگر یہ اکثر کے نزدیک ہے۔ جو اس کو چھوڑے وہ نماز دہرائے۔ بعض کے نزدیک یہ واجب ہے۔ اگر ترک کرے تو برا کام کرتا ہے مگر نماز نہیں دہرائے گا۔ یہ ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور پہلا مالک، شافعی اور احمد تینوں کا۔

رکوع سے اٹھتے وقت اعتدال کرنا یعنی صحیح کھڑا ہونا، دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا اور ان تمام ارکان میں اطمینان شافعی اور احمد وغیرہما کے نزدیک رکن ہے اور ابو حنیفہ کے نزدیک واجب۔

نماز کے آخر میں بیٹھنا تشہد اور سلام بھی شافعی و احمد کے نزدیک رکن ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی نماز:

حضور اکرم ﷺ فجر کی نماز میں سورت قٓ، طور اور ذاریات جیسی طوالِ مفصل سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ ظہر میں سورت ملک اور سجدہ جتنی لمبی سورتیں اور ان سے چھوٹی بھی پڑھتے تھے۔ عصر میں اس سے بھی زیادہ چھوٹی پڑھتے اور مغرب میں اس سے مزید چھوٹی۔ عشا میں عصر جتنی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ کی نماز انتہائی معقول ہوتی اور رکوع اور سجدہ پورا کرتے۔ جب رکوع سے سر اٹھا کر قیام کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے آپ بھول گئے ہوں۔ جب دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے تو کہنے والا کہتا: لگتا ہے جیسے آپ بھول گئے ہیں؟ آپ ﷺ سجدے میں کم و بیش دس مرتبہ "سبحان ربي الأعلى" پڑھتے اور رکوع میں "سبحان ربي العظيم" پڑھتے۔ دو سجدوں میں یہ دعا پڑھتے:

«رَبِّ اغْفِرْ لِيْ، رَبِّ اغْفِرْ لِيْ، رَبِّ اغْفِرْ لِيْ، وَارْحَمْنِيْ، وَاجْبُرْنِيْ، وَاهْدِنِيْ، وَعَافِنِيْ، وَارْزُقْنِيْ »[1]

آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے:

«رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْأَ السَّمَاوَاتِ وَمِلْأَ الْأَرْضِ وَمِلْأَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، أَهْلَ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، أَحَقُّ مَا قَالَ الْعَبْدُ، وَكُلُّنَا لَكَ عَبْدٌ، لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ »[2]

آپ ﷺ نماز کے آخر میں یہ دعا پڑھتے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ »[3]

آپ ﷺ ہر دعا کے آخر میں کہتے:

«رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ »[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٥٠، ٨٧٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٩٧، ٨٩٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ الفاظ مختلف احادیث سے ثابت ہیں۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٧، ٥٨٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٠)

نوافل اور سنتیں:

آپ ﷺ فرض نمازوں کے ساتھ دس یا بارہ رکعات بطور نوافل پڑھا کرتے تھے۔ ظہر سے پہلے کبھی دو رکعات پڑھتے، کبھی چار رکعات اور ظہر کے بعد دو رکعات پڑھتے، مغرب کے بعد دو رکعات پڑھتے اور عشا کے بعد بھی دو رکعات پڑھتے، فجر سے پہلے دو رکعات پڑھتے۔ یہ دو رکعات ان تمام نوافل سے زیادہ موکد ہیں۔ آپ ﷺ ان کا حکم دیا کرتے تھے۔ اسی طرح وتر کا حکم بھی دیتے تھے۔ آپ ﷺ کی رات کی نماز وتر سمیت کبھی گیارہ رکعات پر مشتمل ہوتی، کبھی تیرہ رکعات پر۔ آپ ﷺ کی دن رات کی مجموعی فرض اور نفل نمازیں تقریباً چالیس رکعات پر مشتمل ہوتی تھیں۔

آپ ﷺ عصر، مغرب اور عشا سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے، مگر آپ یہ فرمایا کرتے تھے:

«بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ» ”ہر دو اذانوں (اذان اور تکبیر) کے درمیان نماز ہے۔“

پھر تیسری مرتبہ فرمایا: ”جو چاہے اس کے لیے۔“[1] تا کہ کہیں لوگ اس کو سنت نہ بنا لیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مغرب کی نماز کے بعد اقامت سے پہلے دو رکعات پڑھتے تھے۔ آپ ان کو دیکھتے مگر منع نہ کرتے، اس لیے اگر کوئی عصر، مغرب اور عشا سے پہلے نماز پڑھ لے تو بہتر ہے مگر یہ سنتِ راتبہ (جو آنحضرت ﷺ کا معمول تھا) نہیں۔

اگر آپ ﷺ رات کو سوئے رہنے کی وجہ سے تہجد نہ پڑھ پاتے تو اس کے بدلے میں دن کے وقت پڑھتے، کیونکہ آپ ﷺ جب کوئی عمل شروع کرتے تو اس کو متواتر کرتے۔ آپ کا عمل دائمی ہوتا تھا۔[2]

کلمے کو کافی سمجھنے والے بے نمازی کا حکم

سوال کچھ لوگ مسجد میں بیٹھے رہتے ہیں، جیسے ہی نماز کا وقت ہوا اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کو نماز کے لیے بلایا جاتا ہے مگر وہ آنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ وہ جواب دیتے ہیں: جس نے کلمہ پڑھ لیا ہو وہ مسلمان ہوتا ہے۔

آپ ان لوگوں کا حکم بیان کریں اور بتائیں کہ ان کی سزا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو صرف عید کے عید نماز پڑھتے ہیں اور کچھ بالکل نہیں پڑھتے۔

جواب الحمد لله رب العالمين. جو انسان اہلِ فرض میں سے ہونے کے باوجود اپنے اوپر نماز کے فرض ہونے کا اقرار نہیں کرتا اور نماز چھوڑتا ہے وہ ائمہ کے اتفاق کے ساتھ کافر ہے، گو کلمے کا اقرار ہی کرے، اس سے توبہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨)

[2] جامع المسائل (٤٠٦/٧-٤١٠)

کروائی جائے گی۔ اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ اس کو کافر و مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ اگر وہ انسان نیا نیا مسلمان ہونے کی وجہ سے یا جاہل معاشرے میں پرورش پانے کی وجہ سے نماز کی فرضیت کا علم نہیں رکھتا تو اس کو اس کی فرضیت سے متعلق آگاہ کیا جائے۔ اگر اس کا اقرار کرے تو صحیح ورنہ کافر قرار دے کر قتل کر دیا جائے۔

نماز حیض و نفاس والی عورت کے سوا ہر عاقل و بالغ مرد اور عورت، آزاد اور غلام، مقیم و مسافر، بیمار و تندرست، حالتِ امن اور حالتِ خوف میں رہنے والے، صوفیانہ احوال کے حاملین، کرامات دکھانے والے اور نہ دکھانے والے، اصحابِ کشف اہلِ معرفت و حقائق، اہل اللہ وغیرہم اور عقل و شعور رکھنے والے بدحواس وغیرہم سب پر یکساں فرض ہے۔ جب کسی انسان کی عقل موجود ہو تو ان مذکورہ اسباب میں سے کسی بھی سبب کی وجہ سے اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اگر کوئی پاگل اور بے عقل ہو تو پاگل پن کی حالت میں اس پر نماز فرض نہیں ہوتی اور ہوش میں آنے کے بعد اس پر قضا دینا بھی واجب نہیں، چاہے پاگل پن کا دورانیہ مختصر ہی ہو۔ یہی جمہور علما کا موقف ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتَّى يُفِيْقَ، وَعَنْ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ »[1]

''مجنون سے جب تک ہوش میں نہ آ جائے، بچے سے جب تک بالغ نہ ہو جائے اور سوئے ہوئے سے جب تک بیدار نہ ہو جائے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔''

کچھ پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ پاگل پن کے باوجود ان میں کچھ نہ کچھ ایمان کی رمق اور کشف وغیرہ جیسے احوال ظاہر ہو جاتے ہیں، ان کو عقلاء المجانین، یعنی پاگلوں میں عقل مند کہا جاتا ہے اور کبھی ان کو شدتِ غم یا شدتِ عشق کی وجہ سے بدحواس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بدحواس اگر پاگل ہیں تو اس سے متعلق کسی صاحبِ علم نے کیا خوب کہا ہے: ''یہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ نے عقلیں بھی عطا کیں اور احوال بھی، پھر ان سے عقلیں سلب کر لیں اور ان کے احوال باقی رکھے تو جو ان سے سلب کیا اس کی وجہ سے ان سے فرائض ساقط کر دیے۔'' مگر جو عقل رکھتا ہو اس سے نماز ساقط نہیں ہوتی، چاہے اس پر احوال و معارف ظاہر ہوتے ہوں، یا اس کے ہاتھ سے غیر معمولی امور ظاہر ہوتے ہوں، بلکہ اگر ایسا انسان اپنے اوپر نماز کے فرض ہونے کا انکار کرتا ہے تو اس سے توبہ کروائی جائے گی، اگر توبہ کر لے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٠٣، ٤٣٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٤١، ٢٠٤٢) صحيح الجامع (٣٥١٢، ٣٥١٣، ٣٥١٤)

تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اس طرح جس کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی ہو کہ ان جیسے لوگوں پر نماز فرض نہیں ہوتی، کیوں کہ نماز کا مقصود ان کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والے سے بھی توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے۔

جو سویا رہے، وہ جب بیدار ہو اس وقت نماز کی قضا دے۔ ان تمام مسائل میں مسلمان کا کوئی اختلاف نہیں۔

جو انسان کسی بیماری، یا خوف یا خوفِ خدا یا قرآن سننے کی وجہ سے طاری ہونے والے کسی حال کی وجہ سے بے ہوش ہو جائے، یہ امام احمد کے مذہب کے مطابق مطلقاً قضا دے گا۔ یہی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ امام شافعی کے مذہب میں اس پر قضا نہیں، امام ابو حنیفہ اور مالک کے مذہب میں وہ ایک دن اور ایک رات کی نماز کی قضا دے گا۔

اگر کسی انسان کی عقل شراب نوشی، حشیش یا بھنگ جیسی حرام اشیا کے استعمال کی وجہ سے یا ممنوعہ اشعار وغیرہ کی وجہ سے طاری ہونے والے حرام حال کی وجہ سے زائل ہو تو یہ بلا اختلاف قضا دے گا۔ جب سبب محصور ہو تو نشی معذور نہیں ہوتا۔

اگر ان مذکور لوگوں میں سے کوئی شخص نماز کی فرضیت کا قائل تو ہے لیکن ادا کرنے سے انکار کرتا ہے، اس سے بھی توبہ کروائی جائے گی، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ امام مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور ائمہ کے نزدیک اس کو بھی قتل کر دیا جائے۔ ان کے ظاہر مذہب میں ایک نماز ترک کرنے والا بھی واجب القتل ہے۔ جب فجر کا وقت گزر جائے تو اس کو نماز پڑھنے کا کہا جائے، اگر نہ پڑھے تو اس کا خون بہانا حلال ہو جاتا ہے، چاہے ہوا میں اڑے یا پانی پر چلے۔ دجال آسمان کو حکم دے گا وہ بارش برسانا شروع کر دے گا، زمین کو حکم دے گا وہ اگانا شروع کر دے گی اور خزانوں کو اپنے ساتھ چلائے گا، لیکن اس کے باوجود وہ کافر اور اللہ کی مخلوق ہے اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس کو مشرقی دروازے پر قتل کریں گے۔ لیکن اس بے نماز کو توبہ کروائے بغیر قتل نہیں کیا جائے گا، البتہ کیا یہ توبہ کروانا واجب ہے یا مستحب اور کیا تین دن تک کروائی جائے گی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ پھر کیا اس کو کافر اور مرتد قرار دے کر قتل کیا جائے گا اور نہ غسل دیا جائے گا، نہ جنازہ پڑھا جائے گا اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہی کیا جائے گا یا اس کو فاسق قرار دے کر قتل کیا جائے گا جس طرح ڈاکو اور زانی کو قتل کیا جاتا ہے؟ اگر وہ اس کی فرضیت کا قائل ہے تو اس میں دو مشہور اقوال ہیں جو دونوں امام احمد سے مروی ہیں، اکثر سلف صالحین کا کلام اس کی تکفیر پر دلالت کرتا ہے، بہت سے اصحابِ احمد اور بعض اصحابِ مالک و شافعی نے بھی اسے راجح کہا ہے۔ صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ثابت ہے: ''بندے اور شرک کے درمیان ترکِ نماز کے سوا کچھ نہیں۔''[1]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۲)

ایک حدیث میں ہے: ''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے، جس نے اسے چھوڑا اس نے کفر کیا۔''[1] عبداللہ بن شقیق کا قول ہے: ''اصحابِ محمد (ﷺ) نماز کے سوا کسی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''جس نے نماز چھوڑی، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔'' انھوں نے تین دن نہیں کہا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے اس آیت: ﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِ﴾ [مريم: ٥٩] کا مفہوم پوچھا گیا تو انھوں نے بتایا: نماز تاخیر سے پڑھنا نماز ضائع کرنا ہے۔ پوچھنے والوں نے کہا: ہم تو اس کو ترکِ نماز سمجھتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا: اگر وہ ترک کر دیتے تو کافر ہو جاتے، اللہ نے یہاں تک فرمایا ہے: ﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّينَ ۝ ٱلَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ﴾ [الماعون: ٤، ٥] اگر یہ اس کے لیے وعید ہے جو اس کو وقت پر پڑھنے سے بھول جاتا ہے تو جو ترک کر دے اس سے متعلق کیا وعید ہو گی؟[2]

بے نماز، روزہ خور اور حرام خور نام نہاد مسلمان

سوال کچھ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں، پھر ان میں جو روزہ رکھتے ہیں وہ نماز نہیں پڑھتے، ان کا مال بھی حرام ہے، لوگوں کا مال چھینتے ہیں، لیکن پڑوسی اور مہمان کی عزت کرتے ہیں، ان کا کوئی مذہب معلوم نہیں اور ہیں وہ مسلمان، ان کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. اگر یہ لوگ والیانِ ریاست کی ماتحتی میں آتے ہیں تو وہ ان کو نماز قائم کرنے کا حکم دیں اور نہ پڑھنے پر سزا دیں۔ اسی طرح روزے کا معاملہ ہے۔ اگر وہ نمازِ پنج گانہ، رمضان کے روزوں اور فرض زکات کی فرضیت کا اقرار کریں تو صحیح ہے، ورنہ ان میں جو ان کی فرضیت کا اقرار نہ کرے وہ کافر ہے۔ اگر یہ لوگ نماز کی فرضیت کا اقرار کرتے ہوں مگر پڑھنے سے انکار کریں تو ان کو سزا دی جائے، تاآنکہ نماز پڑھنا شروع کر دیں۔

امام مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور علما کے نزدیک جو انسان عاقل و بالغ ہو، لیکن نماز نہ پڑھتا ہو، وہ واجب القتل ہے۔ اسی طرح ان پر حدود بھی نافذ کی جائیں گی۔ اگر یہ انکار کرنے والا گروہ قوت و اقتدار رکھتا ہو تو ان سے لڑنا فرض ہے، جب تک نماز روزے اور زکات جیسے ظاہری اور متواتر فرائض ادا نہ کریں اور زنا، سود اور راہزنی وغیرہ جیسے حرام کام چھوڑ نہ دیں۔

جو انسان نماز اور زکات کی فرضیت کا اقرار نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کر لے تو

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٤٣)

[2] جامع المسائل (٤/١١٨-١٢١)

صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے۔ جو اللہ، رسول، روزِ آخرت اور جنت، دوزخ پر ایمان نہیں رکھتا وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بڑا کافر ہے۔ والدین کی نافرمانی جہنم واجب کرنے والا کبیرہ گناہ ہے۔[1]

فاسق و فاجر نمازی کا حکم

سوال ایک آدمی فاسق و فاجر ہے، شراب پیتا ہے اور پانچوں نمازیں بھی پڑھتا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہر وہ نماز جو آدمی کو فحاشی اور برائی سے نہ روکے وہ اس کو اللہ سے مزید دور ہی کرتی ہے۔'' تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، لیکن نماز فحاشی اور برائی سے ضرور روکتی ہے، جس طرح اللہ رب العزت نے بھی فرمایا ہے، بہرحال نماز آدمی کو اللہ سے دور نہیں کرتی، بلکہ جو انسان نماز پڑھتا ہے وہ نماز نہ پڑھنے والے سے بہتر ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے، گو وہ فاسق ہی ہو، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''تیری نماز سے تیرا حصہ وہی ہے جو تو نے اس سے سمجھ کر پڑھا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بندہ نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو اس کے لیے نماز کا آدھا حصہ لکھا جاتا ہے، اس کا تیسرا حصہ لکھا جاتا ہے، اس کا چوتھا حصہ لکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دسواں حصہ لکھا جاتا ہے۔''[2]

تاہم جب بندہ نماز اسی طرح ادا کرتا ہے جس طرح ادا کرنے کا حکم ہے تو وہ اس کو فحاشی اور برائی سے روکتی ہے، اگر وہ نماز انسان کو اس سے نہ روکے تو اس کا مطلب ہے وہ شخص نماز کے حقوق ضائع کر رہا ہے، اگرچہ وہ فرماں بردار ہی ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ﴾ [مریم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔''

نماز ضائع کرنا اس کے فرائض و واجبات میں تقصیر سے کام لینا ہے، اگرچہ وہ بندہ نماز پڑھتا ہی ہو۔ واللہ أعلم[3]

کسی مصروفیت کی وجہ سے نماز موخر کرنے کا حکم

سوال کچھ لوگ کاروباری مصروفیات، کھیتی باڑی، کسی کی خدمت گزاری یا جنابت کی وجہ سے رات کی نماز دن تک موخر کر دیتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

---

[1] جامع المسائل (٤/١٢٥۔١٢٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩٦) صحيح الجامع (١٦٢٦)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٥۔٦)

جواب کسی کے لیے دن کی نماز کو رات تک یا رات کی نماز کو دن تک موخر کرنا جائز نہیں، خواہ وہ کھیتی باڑی میں مصروف ہو، یا کاروباری مصروفیات میں ڈوبا ہوا ہو، یا جنابت زدہ ہو، یا نجاست سے آلودہ ہو، یا شکار یا کھیل کود میں وقت ضائع کر دے، یا کسی کی خدمت میں لگا رہا ہو، یا اس طرح کا کوئی بھی کام ہو، بلکہ تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ شخص دن میں ظہر اور عصر کی نماز پڑھے، طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی نماز پڑھے اور ان نمازوں کو کسی پیشے، شغل میلے یا کھیل کود کی وجہ سے نہ چھوڑے، نہ آقا کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے غلام کو وقت پر نماز پڑھنے سے روکے نہ کسی مالک کو یہ اختیار ہے کہ وہ مزدور کو بر وقت نماز ادا کرنے سے منع کرے۔ جو انسان کسی ایسی مصروفیت کی وجہ سے ان کو اتنا موخر کر دیتا ہے کہ سورج غروب ہو جائے تو وہ سزا کا حق دار ٹھہرتا ہے، بلکہ جمہور علما کے نزدیک ایسے شخص سے توبہ کروائی جائے۔ اگر وہ توبہ کر کے اور وقت پر نماز پڑھنے کا پابند ہو جائے تو صحیح، ورنہ اس کو قتل کر دینا چاہیے۔ اگر وہ کہے: میں تو اپنی مصروفیات کی بنا پر دن کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد ہی پڑھوں گا تو اس کو قتل کر دیا جائے۔[1]

صحیح بخاری و مسلم میں یہ حدیث مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلُهُ وَمَالُهُ»[2]

''جس سے عصر کی نماز چھوٹ گئی تو گویا اس کا اہل اور مال دونوں برباد ہو گئے۔''

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ»[3]

''جس سے عصر کی نماز چھوٹ گئی، یقیناً اس کے عمل ضائع ہو گئے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت کی تھی:

"إِنَّ لِلّٰهِ حَقًّا بِاللَّيْلِ لَا يَقْبَلُهُ بِالنَّهَارِ وَحَقًّا بِالنَّهَارِ لَا يَقْبَلُهُ بِاللَّيْلِ"

''رات میں اللہ کا ایک حق ہوتا ہے جس کو وہ دن میں قبول نہیں کرتا اور دن میں حق ہوتا ہے جس کو وہ رات میں قبول نہیں کرتا۔''

نبی اکرم ﷺ نے جنگِ خندق کے موقعے پر کافروں کے خلاف جہاد میں مشغولیت کی بنا پر عصر کی نماز موخر کی

---

[1] یاد رہے یہ قتل کے فتوے اس وقت تھے جب مسلمان با تمکین تھے اور اسلامی نظامِ حکومت رائج تھا، یہ زوال کے دور کی فقہ نہیں۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٤) صحيح الجامع (٦١٤٦)

تھی اور آپ ﷺ نے وہ نماز مغرب کے بعد پڑھی، جس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ [البقرة: ٢٣٨]

''سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی۔''

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الصَّلَاةَ الوُسْطَى صلاةُ العَصْرِ »[1] ''صلاۃِ وسطیٰ یعنی درمیانی نماز، نمازِ عصر ہے۔''

اس بنا پر جمہور علما نے کہا ہے کہ یہ تاخیر اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے، اس لیے وہ حالتِ جنگ میں بھی نماز میں تاخیر جائز نہیں کہتے، بلکہ حالتِ جنگ میں بھی جب نماز کا وقت ہو جائے تو وہ مجاہد کے لیے وقت پر نماز پڑھنا لازمی قرار دیتے ہیں۔ یہ امام مالک، شافعی اور احمد کا مشہور مذہب ہے۔ امام احمد سے ایک دوسری روایت بھی مروی ہے کہ مجاہد کو حالتِ جنگ میں اختیار ہے، چاہے نماز پڑھ لے، چاہے موخر کر لے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ مجاہد لڑائی میں مشغول رہے اور وقت کے بعد نماز پڑھ لے۔ یہ تو جہاد کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی پیشے، کھیتی باڑی یا کسی بھی کام کی وجہ سے نماز موخر کرنا کوئی عالم بھی جائز قرار نہیں دیتا، بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ [الماعون: ٥]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''

اسلاف کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کے وقت سے موخر کر کے پڑھتے ہیں۔ کچھ کا قول ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس طرح ادا نہیں کرتے جس طرح ادا کرنے کا حکم ہے۔ بہر حال نماز کو اس کے وقت سے موخر کرنا حرام ہے۔ اس پر سب علما کا اتفاق ہے۔ نیز اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ رات کی نماز کو دن تک موخر کرنا اور دن کی نماز کو رات تک موخر کرنا ایسا ہی ہے جیسے رمضان کے روزے کو شوال تک موخر کر دینا۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں تو ظہر اور عصر دونوں کو رات میں پڑھوں گا، وہ ایسے ہے جیسے کہے کہ میں رمضان میں روزے نہیں رکھوں گا، بلکہ کھاؤں پیوں گا اور شوال میں روزے رکھوں گا۔ تاخیر کے معاملے میں ایک سویا ہوا شخص معذور ہوتا ہے اور دوسرا بھولا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

« مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ ذَلِكَ وَقْتُهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ »[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧، ٦٢٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

''جو نماز سے سو جائے یا بھول جائے اس کو جب یاد آ جائے وہ اسے اسی وقت پڑھ لے، وہی اس کا وقت ہوگا اور اس کا کفارہ بھی وہی ہے۔''

لہٰذا جنابت، بے وضوئی، پلیدی یا کسی اور وجہ سے نماز کو اس کے وقت تک موخر کرنا جائز نہیں، بلکہ آدمی اپنے حسبِ حال وقت پر نماز ادا کرے، اگر وہ بے وضو ہو اور پانی میسر نہ ہو یا اس کے استعمال سے اس کو سردی کی وجہ سے یا کسی بیماری کی وجہ سے کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تو وہ تیمّم کرے اور نماز پڑھے۔

اسی طرح اگر آدمی حالتِ جنابت میں ہو اور پانی میسر نہ ہو، یا کسی بیماری یا ٹھنڈک کی وجہ سے اس کے استعمال میں کسی طرح کا کوئی خطرہ ہو تو وہ بھی تیمّم کرے اور نماز پڑھے۔ اسی طرح اگر آدمی ننگا ہو اور اس کے پاس کپڑے نہ ہوں اور نماز کا وقت ہو جائے تو وہ ننگا ہی نماز پڑھ لے اور کپڑوں کے انتظار میں نماز کا وقت نہ نکالے۔ اگر انسان پر کوئی نجاست ہو جسے زائل کرنے پر وہ قادر نہ ہو تو اپنے حسبِ حال وقت پر نماز پڑھے۔ اسی طرح مریض بھی اپنی حالت کے مطابق وقت پر نماز پڑھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھ۔ اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ جا اور اگر بیٹھنے کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر پہلو کے بل دراز ہو کر نماز پڑھ لے۔''[1]

مریض بالاتفاق وقت پر نماز پڑھے گا، خواہ بیٹھ کر پڑھے یا لیٹ کر۔ اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اس کے مرض میں اضافے کا باعث ہو تو وہ یہ انتظار نہ کرے کہ جب کھڑے ہونے کے قابل ہوگا تب نماز پڑھ لے گا اور نماز کا وقت نکال دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کو وقت پر پڑھنا فرض ہے۔ وقت نماز کے تمام فرائض میں سے سب سے زیادہ تاکیدی فرض ہے، جس طرح رمضان کے روزے اپنے وقت میں، یعنی رمضان ہی میں فرض ہوتے ہیں، کوئی ان کو ان کے وقت سے پیچھے نہیں کر سکتا۔ لیکن میدانِ عرفات میں ظہر و عصر کو اکٹھا کر کے پڑھنا اور مزدلفہ میں مغرب و عشا کو اکٹھا کر کے پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ اسی طرح بہت سے علما کے نزدیک سفر، مرض یا اس طرح کے عذروں کی بنا پر ظہر و عصر کو اکٹھا کر کے پڑھنا بھی جائز ہے، لیکن دن کی نماز کو رات تک موخر کر دینا یا رات کی نماز کو دن تک موخر کر دینا، یہ بیماری اور سفر کی وجہ سے بھی نیز کسی کام یا کسی پیشے کی وجہ سے قطعاً جائز نہیں، یہ اتفاقی مسئلہ ہے، بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''کسی شرعی عذر کے بغیر دو نمازوں کو اکٹھا کرنا کبیرہ گناہ ہے۔'' لیکن مسافر دو رکعات پڑھے۔ اس پر چار رکعات پڑھنا لازم نہیں۔ قصر کے سفر میں دو رکعات ہی مسافر کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ اس پر بھی علما کا اتفاق ہے۔ جو انسان یہ کہتا ہے کہ مسافر پر بھی چار رکعات پڑھنا واجب ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہے کہ مسافر پر رمضان کے روزے رکھنے واجب ہیں۔ یہ دونوں باتیں ہی گمراہی اور اجماع کی مخالفت پر مبنی ہیں۔ مسلمانوں کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦)

اتفاق ہے کہ مسافر جب چار رکعات والی نماز دو رکعات کے ساتھ ادا کرتا ہے، فجر کی دو رکعات پڑھتا ہے، مغرب کی تین رکعات پڑھتا ہے اور رمضان کا روزہ چھوڑ کر بعد میں اس کی قضا دیتا ہے تو یہ اس کے لیے کافی ہیں۔ لیکن جو شخص رمضان کے مہینے میں سفر کی حالت میں بھی روزہ رکھتا ہے یا چار رکعات ادا کرتا ہے تو اس مسئلے میں علما کے ہاں مشہور اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں: یہ اس کو کفایت نہیں کرتا۔ مریض کو بالاتفاق روزہ موخر کرنے کی اجازت ہے، لیکن نماز موخر کرنے کی اجازت نہیں۔ اس پر بھی اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ اسی طرح مسافر بالاتفاق روزے کو موخر کر سکتا ہے، لیکن نماز کو موخر نہیں کر سکتا۔ اس پر بھی اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز کے اوقات کی پابندی روزے کے وقت کی پابندی سے زیادہ تاکیدی اور ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ [مريم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا۔''

اسلاف کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نماز کو ضائع کرنا اس کو اس کے وقت سے موخر کرنا ہے۔ اگر وہ اس کو ترک ہی کرتے ہوتے تو وہ کافر ہو جاتے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''میرے بعد ایسے حکمران ہوں گے جو نماز کو اس کے وقت سے موخر کر کے پڑھیں گے، تم نماز کو وقت پر پڑھنا، پھر ان کے ساتھ اپنی نماز کو نفل بنا لینا۔''[1] صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس وقت کیا کرو گے جب تمھارے امرا اور حکمران ایسے ہوں گے جو نماز کو اس کے وقت سے موخر کر کے پڑھیں گے؟'' میں نے کہا: آپ ﷺ اس حالت میں مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تُو نماز وقت پر پڑھ۔ اگر نماز ان کے ساتھ پالے تو اسے پڑھ لے، وہ تمھارے لیے نفل ہو گی۔''[2] حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم پر ایسے لوگ حکمران ہوں گے جن کو بہت سی چیزیں نماز سے مشغول رکھیں گی، یہاں تک کہ اس کا وقت جاتا رہے گا، تم وقت پر نماز پڑھنا۔''[3] ایک آدمی نے پوچھا: کیا میں ان کے ساتھ بھی نماز پڑھ سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر تُو چاہے تو، اور اس نماز کو نفل بنا لو۔'' (رواه أحمد وأبو داود)[4] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھاری اس وقت کیا کیفیت ہو گی جب تمھارے حکمران نماز کو اس کے وقت پر نہیں پڑھیں گے؟'' میں نے کہا: اگر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٧) صحيح الجامع (٣٦١٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٣) صحيح الجامع (٢٤٢٩)

میں ایسی صورتِ حال کو پالوں تو اس وقت کے لیے آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز وقت پر پڑھ اور ان کے ساتھ اپنی نماز نفل بنا لے۔''[1]

بنا بریں علما کا اتفاق ہے کہ آدمی اگر ننگا ہو، مثلاً وہ کشتی یا بحری جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ کشتی یا جہاز ٹوٹ گیا، یا لٹیروں نے اس کے کپڑے لوٹ لیے، پھر نماز کا وقت ہو گیا، لیکن اس کے پاس کپڑے نہیں تھے وہ بنا کپڑوں کے ہی نماز پڑھ لے۔ مسافر کو اگر پانی نہ ملے تو وہ تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھ لے، اس پر بھی علما کا اتفاق ہے۔ گو اس کو وقت کے بعد پانی مل ہی جائے۔ ایسے ہی مسافر اگر جنبی ہو جائے اور اس کو پانی نہ ملے تو وہ تیمّم کرے اور نماز پڑھے۔ چاروں ائمہ اور دیگر علما کا اس پر اتفاق ہے کہ اس پر نماز کو دہرانا واجب نہیں۔ اسی طرح اگر سردی شدید ہو اور آدمی کو خدشہ ہو کہ اگر اس نے غسل کیا تو وہ بیمار ہو جائے گا، وہ تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھ لے اور یہ سوچتے ہوئے نماز کو موخر نہ کرے کہ وہ وقت کے بعد غسل کر کے نماز پڑھ لے گا۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''پاک مٹی مسلمان کو پاک کرتی ہے، چاہے وہ دس سال بھی پانی نہ پائے۔ جب تو پانی پا لے تو اس کو اپنے بدن پر لگا لے، یہ بہتر ہے۔''[2]

معلوم ہوا کہ ہر وہ کام جو پانی کے ساتھ مباح اور جائز ہے وہ تیمّم کے ساتھ بھی مباح ہے۔ جب آدمی فرض نماز کے لیے تیمّم کرتا ہے تو نماز کے اندر قرآن پڑھتا ہے۔ وہ (تیمّم کے ساتھ) نماز کے باہر بھی قرآن پڑھ سکتا ہے، خواہ جنبی ہی ہو۔ جو تیمّم کے ساتھ نماز پڑھنے سے رکتا ہے وہ یہود و نصاریٰ کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے، کیونکہ تیمّم امتِ محمدیہ ﷺ کا خاصہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہمیں لوگوں پر تین چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے: ① ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں کی طرح کر دی گئی ہیں۔ ② میرے لیے زمین کو سجدہ گاہ بنایا گیا ہے اور اس کی مٹی کو طہور، یعنی پاک کرنے والی بنایا گیا ہے۔ ③ میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کی گئیں۔''[3] ایک حدیث کے الفاظ ہیں: ''میرے لیے زمین کو مسجد اور طہور بنایا گیا ہے۔ تو میری امت کے جس آدمی کو بھی نماز کا وقت پا لے اس کے پاس مسجد بھی ہوتی ہے اور طہور بھی۔''[4]

اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے کہ کیا انسان نماز کے وقت سے پہلے بھی تیمّم کر سکتا ہے یا نہیں؟ کیا وہ ہر نماز کے لیے تیمّم کرے گا، کیا تیمّم وقت نکل جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے؟ یا آدمی جس طرح پانی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، اسی طرح تیمّم کے ساتھ بھی جو نماز چاہے پڑھ سکتا ہے اور تیمّم کو وہی چیز توڑ سکتی ہے جو وضو کو توڑتی ہے یا پانی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٢) صحيح الجامع (٤٥٩٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٤) صحيح الجامع (١٦٦٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

استعمال کرنے کی قدرت بھی اس کو توڑ دیتی ہے؟ یہ آخری بات امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے، اور امام احمد کے مذہب میں ایک قول۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''پاک مٹی مسلمان کا طہور ہے، چاہے دس سال بھی پانی نہ پائے، جب تو پانی پالے تو اس کو اپنے بدن پر لگا لے، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔''[1] امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اگر آدمی کو نجاست لگی ہوئی ہو، لیکن اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کے ساتھ وہ اس نجاست کو دور کر سکے تو وہ اس کے ہوتے ہوئے وقت پر نماز پڑھے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عالم میں نماز پڑھی کہ ان کے زخم سے خون بہہ رہا تھا، لیکن انھوں نے نماز کو موخر نہیں کیا کہ وقت نکل جائے (تو بعد میں پڑھ لیں گے)۔

جس کے پاس کپڑے کے علاوہ کوئی اور کپڑا نہ ہو تو اس کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ ننگا نماز پڑھ لے، دوسرا قول یہ ہے کہ اسی کپڑے میں نماز پڑھ لے، لیکن بعد میں صاف کپڑے ملنے پر دہرا لے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس میں نماز پڑھ لے اور نہ دہرائے۔ یہ سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔ کیونکہ اللہ نے بندے کو دو مرتبہ فرض نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا، مگر یہ کہ وہ اس واجب کو صحیح طور پر ادا نہ کرے جسے وہ پہلی مرتبہ صحیح طور پر ادا کرنے پر قادر تھا، مثلاً کوئی شخص اطمینان کے بغیر نماز پڑھے تو وہ نماز دہرائے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو نماز دہرانے کا حکم دیا تھا جس نے اطمینان کے بغیر نماز پڑھی تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے کہا تھا: ''واپس ہو اور نماز پڑھ، تُو نے نماز نہیں پڑھی۔''[2] اسی طرح جو شخص وضو کرنا بھول جائے اور بے وضو ہی نماز پڑھے تو وہ دہرائے، جس طرح آپ ﷺ نے اس شخص کو دوبارہ وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا حکم دیا جس نے وضو کرتے وقت پاؤں کا معمولی سا حصہ خشک ہی چھوڑ دیا تھا، لیکن جو انسان اس فعل کو اپنی طاقت کے مطابق کرے جس کا اس کو حکم دیا گیا ہے تو وہ اس زمرے میں نہیں آتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[3]

''جب میں تم کو کسی کام کا حکم دوں تو اس کو اپنی طاقت کے مطابق بجا لاؤ۔''

بنا بریں جو انسان نماز کے وقت میں بیدار ہو، لیکن پانی اس سے اتنا دور ہو کہ اگر وہ اس تک پہنچنا چاہے تو نماز

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٤) صحيح الجامع (١٦٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

کا وقت نکل جانے کا یقین ہو وہ بالاتفاق تیمّم کرے اور وقت پر نماز پڑھے۔

اسی طرح جب سردی شدید ہو اور انسان کے لیے ٹھنڈا پانی نقصان دہ ہو، لیکن اس کے لیے وقت کے اندر اندر حمام تک پہنچنا یا پانی گرم کرنا ناممکن ہو تو وہ تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں۔ اگر وہ دونوں حالتِ جنابت میں ہوں اور وقت کے اندر اندر ان کے لیے غسل کرنا ممکن نہ ہو تو وہ دونوں تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح جب حائضہ عورت کی ماہواری نماز کے وقت کے اندر ختم ہو جائے، لیکن اس کے لیے وقت کے اندر اندر غسل کرنا ممکن نہ ہو تو وہ تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھ لے۔[1]

جو یہ سمجھتا ہے کہ وقت گزر جانے کے بعد پانی کے ساتھ وضو یا غسل کر کے نماز پڑھنا وقت پر تیمّم کر کے نماز پڑھنے سے بہتر ہے وہ گمراہ اور جاہل انسان ہے۔ جب انسان فجر کے آخری وقت میں بیدار ہو اور اس پر غسل فرض ہو، اگر وہ غسل شروع کر دے تو سورج طلوع ہو جائے گا اور نماز کا وقت جاتا رہے گا، ایسی صورتِ حال میں جمہور علما کا یہ کہنا ہے کہ وہ غسل کر کے طلوعِ آفتاب کے بعد نماز پڑھے۔ یہ امام ابوحنیفہ، شافعی، احمد اور ایک قول میں مالک کا مذہب ہے۔ امام مالک کا دوسرا قول یہ ہے کہ وہ یہاں تیمّم کر کے طلوعِ آفتاب سے پہلے نماز پڑھے، جس طرح اوپر کے مسائل میں ذکر ہوا ہے، کیونکہ تیمّم کر کے وقت پر نماز پڑھنا وقت کے بعد غسل کر کے نماز پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے۔ یہاں صحیح جمہور کا قول ہے، کیونکہ سوئے ہوئے کے لیے وہی وقت ہے جب وہ بیدار ہو، جو اس سے پہلے ہے وہ اس کے حق میں نماز کا وقت نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو کسی نماز سے سو جائے یا اسے (پڑھنا) بھول جائے اس کو جب یاد آئے، اسی وقت اسے پڑھ لے، وہی اس کا وقت ہے۔''

بنا بریں جب انسان طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار ہو تو اس کے لیے غسل کرنا اور نماز پڑھنا طلوعِ آفتاب سے پہلے ممکن نہیں ہو گا، لہٰذا وہ طلوعِ آفتاب کے بعد غسل کر کے نماز پڑھے۔ وہی اس کا وقت ہو گا اور اس نے وہ نماز وقت پر ادا کی ہے۔ وہ اس سے چھوٹی نہیں، اس شخص کے عکس جو اول وقت میں بیدار ہو اس کے حق میں وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے ہے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ نماز کو موخر کر دے۔

اسی طرح جو شخص نماز پڑھنا بھول گیا اور اس کو بعد میں یاد آیا تو وہ جو وقت بھی ہو وہ اسی وقت غسل کرے (اگر اس کو غسل کی حاجت ہو) اور نماز پڑھے۔ وہی اس کے حق میں اس نماز کا وقت ہو گا۔ اگر کوئی انسان طلوعِ آفتاب کے بعد بیدار ہو، جس طرح خیبر کے موقع پر صحابہ کرام نمازِ فجر سے سوئے رہے اور طلوعِ آفتاب کے بعد بیدار ہوئے تو وہ مکمل طہارت کے ساتھ نماز پڑھے، چاہے اس کو زوال تک ہی کیوں نہ موخر کر دے۔ فرض کریں اگر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠)

وہ جنبی ہو تو وہ غسل کرے چاہے اس کو قریبِ زوال تک موخر کر دے۔ یہاں وہ تیمم کے ساتھ نہ پڑھے، تاہم اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اس جگہ سے منتقل ہو جائے جہاں سویا ہوا تھا، جس طرح نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ اس جگہ سے منتقل ہو گئے تھے جہاں وہ سب سوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: «هذا مَكانٌ حَضَرَنَا فيه شيطانٌ» [1] ''اس جگہ ہمارے پاس شیطان آ گیا۔'' تاہم اگر وہ اسی جگہ نماز پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔

اگر کوئی کہے: اس نماز کو ادا کہیں گے کہ قضا؟ تو کہا جائے گا کہ ان دونوں الفاظ کا فرق اصطلاحی ہے، جس کی اللہ اور اس کے رسول کے کلام میں کوئی اصل اور دلیل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وقت پر نماز پڑھنے کے عمل کو بھی قضا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جمعہ کی نماز کے حوالے سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ [الجمعة: ١٠]

''پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔''

دوسری جگہ حج کے بارے میں فرمایا:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ﴾ [البقرة: ٢٠٠]

''پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو۔''

حالانکہ یہ دونوں افعال اپنے اپنے وقت پر ہوتے ہیں۔ لفظ قضا کا عربی میں معنی ہے کسی چیز کو پورا اور مکمل کرنا، جیسے اس آیت میں ہے:

﴿فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ﴾ [حمٓ السجدة: ١٢] ''تو اس نے انھیں سات آسمان پورے بنا دیا۔''

یعنی ان کو مکمل اور پورا کیا لہٰذا جو انسان کامل عبادت کرتا ہے وہ اس کو قضا یعنی پورا کرتا ہے، اگرچہ اس نے اس کو اس کے وقت ہی پر کیا ہو۔ جہاں تک میرا علم ہے، علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا رہا کہ نماز کا وقت ابھی باقی ہے اور اس نے ادا کی نیت کی، پھر بعد میں اس کو علم ہوا کہ اس نے تو وقت گزر جانے کے بعد نماز پڑھی تھی تو اس کی نماز صحیح ہو گی۔ اسی طرح اگر وہ یہ سمجھتا رہا کہ نماز کا وقت تو گزر چکا ہے اور اس نے قضا کی نیت سے نماز پڑھ لی، بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ نماز کا وقت ابھی باقی تھا تو اس کی نماز بھی صحیح ہو گی۔

قصہ مختصر جو اس وقت پر عبادت کا کوئی کام کرتا ہے جس وقت اس کو حکم ہوا ہو تو اس کی نماز صحیح ہوتی ہے اور اس کو کفایت کرتی ہے، خواہ وہ قضا کی نیت کرے یا ادا کی، جمعہ بھی صحیح ہو گا، چاہے ادا کی نیت کرے یا قضا کی، اگر وہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠)

قضا مراد ہو جو قرآن میں مذکور ہے چنانچہ سویا ہوا اور بھولنے والا اگر یاد آنے اور بیدار ہونے کے وقت نماز پڑھ لیں تو وہ اسی وقت میں نماز پڑھنے والے شمار ہوں گے جس وقت میں انھیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، چاہے وہ اس وقت کے نکلنے کے بعد ہی پڑھیں جو ان دونوں کے علاوہ باقی افراد کے لیے مشروع اور جائز تھا۔ لہٰذا جو اس معنی کے اعتبار سے اسے قضا کہتا ہے اور اس کی زبان میں قضا سے مراد یہ ہے کہ شرعی طور پر عمومی متعین وقت کے گزر جانے کے بعد عبادت کرنا تو یہ نام رکھنا اس کو کوئی فائدہ دیتا ہے نہ کوئی نقصان ہی پہنچاتا ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ کسی کا کوئی ایسا کام نہیں جو اس سے نماز کو وقت پر ادا کرنا، اس طرح ساقط کر دے کہ وہ دن کی نماز رات تک موخر کر دے اور رات کی نماز دن تک، بلکہ اسے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے، لیکن ہر ایک کے حسبِ حال جو جس جس فریضے کو ادا کرنے کی سکت رکھتا ہو اسے ادا کرے اور جس کو ادا کرنے سے قاصر ہو وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے، تاہم اکثر علما کے نزدیک کسی شرعی عذر کے ہوتے ہوئے دن کی دو نمازوں اور رات کی دو نمازوں کو اکٹھا کرنا جائز ہے۔

امام مالک اور شافعی کے نزدیک مسافر کے لیے جب اس کو سفر جاری رکھنا ہو تو جمع کرنا جائز ہے، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے، لیکن دوسری روایت میں جائز نہیں، امام ابوحنیفہ کا قول بھی یہی ہے۔ مسافر کے لیے نماز وقت پر ادا کرنا جمع کرنے سے افضل ہے اگر اس کے لیے کوئی حرج اور تنگی نہ ہو، لیکن قصر کے عکس دو رکعات چار رکعات سے افضل ہیں، یہ جمہور علما کا موقف ہے، لیکن اگر وہ چار بھی پڑھ لے تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ اس میں دو اقوال ہیں، نبی اکرم ﷺ نے اپنے سارے سفروں میں دو رکعات ہی پڑھی ہیں، آپ نے سفر میں کبھی چار رکعات نہیں پڑھیں، اسی طرح حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے بھی۔[1]

عذر کے بغیر نماز چھوڑنے کا حکم

سوال کسی عذر کے بغیر نماز چھوڑنے والے کا کیا حکم ہے، کیا وہ اس حالت میں مسلمان ہی رہتا ہے؟

جواب نماز چھوڑنے والا اگر اس کے فرض ہونے کا عقیدہ نہ رکھتا ہو تو وہ نص اور اجماع کی روشنی میں کافر ہو جاتا ہے، لیکن جب کوئی انسان مسلمان ہو اور اس کو علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز فرض کی ہے یا اس کے کچھ ارکان کے واجب ہونے کا علم نہ ہو، مثلاً وہ وضو کے بغیر ہی نماز پڑھتا ہو اور اس کو علم نہ ہو کہ اللہ نے نماز کے لیے وضو لازمی قرار دیا ہے، یا وہ حالتِ جنابت میں بھی نماز پڑھ لیتا ہو اور اس کو خبر نہ ہو کہ اللہ نے غسلِ جنابت فرض کیا ہے، ایسا شخص اگر ان امور کو نہیں جانتا تو وہ کافر نہیں ہوتا، لیکن جب اس کو ان امور کے واجب ہونے کا علم ہو

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۲۷۔۳۸)

جائے تو کیا تب اس پر ان کی قضا دینا واجب ہے کہ نہیں؟ اس میں امام احمد اور امام مالک کے مذہب میں علما کے دو اقوال ہیں: ایک قول کے مطابق قضا واجب ہے، یہ اصحابِ شافعی اور اکثر اصحابِ احمد کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر قضا واجب نہیں اور یہی ظاہر اور راجح ہے۔

جو شخص اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھ لے، لیکن اس کو منع کا پہلے علم نہ ہوا ہو، بعد میں علم ہوا ہو، اسی طرح جو شخص اونٹ کا گوشت کھا کر وضو نہ کرے اور اس کو منع کا علم پہلے نہ ہوا ہو بعد میں ہوا ہو تو کیا وہ نماز دہرائے گا؟ اس مسئلے میں امام احمد سے دو روایات منقول ہیں، ایک کے مطابق اس وقت اس پر نماز دہرانا واجب ہے جب وہ دار السلام میں رہتا ہو، دار الحرب میں نہیں اس کے باوجود نماز کے واجب ہونے سے جاہل اور ناواقف رہا ہو، ابو حنیفہ کا یہی مذہب مشہور ہے۔ اسی طرح جب روزے دار کوئی ایسا کام کرے جو روزہ توڑ دے، لیکن اس کو اس کے حرام ہونے کا علم نہ ہو، کیا وہ بھی روزہ دہرائے گا؟ یہاں بھی امام احمد سے دو روایات منقول ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی انسان حج کے موقع پر کوئی ممنوعہ کام کرے اور اس کو علم نہ ہو کہ یہ ممنوع ہے۔ اس مسئلے کی اصل یہ ہے کہ کیا مکلّف کے حق میں حکمِ خطاب اس تک پہنچنے سے پہلے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں، یہاں امام احمد کے مذہب میں تین اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ ثابت ہوتا ہے، دوسرا ہے کہ وہ ثابت نہیں ہوتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ ابتدائی حکم ثابت ہے، اس کو منسوخ کرنے والا ناسخ ثابت نہیں ہوتا، لیکن زیادہ ظاہر یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان جیسی چیزوں میں قضا واجب نہیں ہوتی اور حکمِ خطاب اس وقت ثابت ہوتا ہے جب مکلّف تک پہنچے، اس تک پہنچنے سے پہلے ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لِأُنذِرَكُم بِهِۦ وَمَنۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ١٩]

''تاکہ میں تمھیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔''

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

﴿ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ [النساء: ١٦٥]

''تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے۔''

قرآن کریم میں اس جیسی آیات متعدد ہیں جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتا جب تک اس تک رسول کی پیش کردہ تعلیمات نہ پہنچا دے۔ جس کو علم ہو جائے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، پھر وہ آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان لے آئے اور اس کو وہ بہت سی تعلیمات نہ پہنچیں جو آپ نے پیش کی ہیں تو اللہ اس کو ان باتوں پر سزا نہیں دیں گے جو اس تک پہنچ ہی نہیں سکیں، کیونکہ اگر وہ کسی شخص کو ترکِ ایمان پر بھی اس وقت

تک سزا نہیں دیتا جب تک اس تک ایمان کی خبر پہنچ نہ جائے تو علم ہونے سے پہلے ایمان کی بعض شرائط پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے سزا نہ دینا تو زیادہ مناسب اور قرینِ قیاس ہے۔ ان جیسے امور میں یہی رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مشہورہ ہے۔

صحاح میں یہ روایت موجود ہے کہ کچھ صحابہ کرام نے یہ سمجھا تھا کہ اس آیت:

﴿الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا خوب ظاہر ہو جائے۔''

سے مراد کالے دھاگے سے سفید دھاگے کا واضح ہونا ہے۔ ایک صحابی پاؤں میں دھاگا باندھ لیتا اور کھانا شروع کر دیتا، حتیٰ کہ کالا دھاگا سفید دھاگے سے واضح اور ظاہر ہو جائے تو نبی اکرم ﷺ نے بیان کیا کہ اس سے مراد دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی ہے، لیکن آپ ﷺ نے ان صحابہ کو دوبارہ روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما کسی سفر میں تھے کہ جنبی ہو گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک نماز نہ پڑھی جب تک پانی نہ پا لیا اور غسل نہ کر لیا، لیکن حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے سمجھا، مٹی بھی وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں پانی پہنچتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مٹی میں اس طرح پلٹیاں کھائیں جس طرح جانور پلٹیاں کھاتے ہیں، پھر نماز پڑھ لی۔ جب یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کیا گیا تو آپ ﷺ نے کسی کو بھی اسے دہرانے کا حکم نہ دیا۔ ایسے ہی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی حالتِ جنابت میں رہے اور انھوں نے نماز نہ پڑھی تو آپ ﷺ نے ان کو بھی اس کی قضا دینے کا حکم نہ دیا، بلکہ مستقبل میں ایسی صورتِ حال میں تیمّم کرنے کا حکم دیا۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک خاتون آئی جو استحاضہ کے مرض کا شکار تھی، وہ کہنے لگی: مجھے استحاضہ کا شدید مرض لاحق ہے جو مجھے نماز اور روزے سے روکے رکھتا ہے، آپ ﷺ نے اس کو استحاضہ کے خون کے دوران میں نماز پڑھنے کا حکم دیا اور جو پہلے نمازیں چھوٹ چکی تھیں ان کی قضا دینے کا حکم نہ دیا۔ جب نماز میں بات چیت کرنے کو منع قرار دے دیا گیا تو اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت معاویہ بن حکم سلمی نے نماز میں بات چیت کی، لیکن انھیں اس حکم کا علم نہیں تھا آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''ہماری اس نماز میں آدمیوں کے کلام اور بات چیت مناسب نہیں۔''[1] لیکن ان کو وہ نماز دہرانے کا حکم نہ دیا۔ جب رسول کریم ﷺ مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے اور حضر کی نماز دو رکعات سے چار رکعات کر دی گئی تو جو لوگ آپ سے دور مکہ میں تھے یا حبشہ کی سرزمین پر تھے، ان تک یہ حکم نہیں پہنچا تھا اور وہ دو رکعات ہی پڑھتے رہے، آپ ﷺ نے ان کو بھی وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ دو ہجری میں روزے فرض ہوئے، جو مسلمان حبشہ میں تھے، انھیں یہ حکم معلوم نہیں تھا، اس لیے وہ اس مہینے کے روزے نہ رکھ سکے۔ آپ ﷺ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٧)

نے ان کو بھی وہ روزے دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا۔

ابھی رسول کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت نہیں کی تھی کہ کچھ انصار مکہ آئے، انھوں نے وہاں رسول اللہ ﷺ کو کعبے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا تو ایک انصاری کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آنے سے پہلے ہی کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا رہا، کیونکہ وہ اس کو جائز سمجھتے تھے۔ اس وقت مسلمان شام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تو آپ ﷺ نے اس کو شام کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور ان نمازوں کو دہرانے کا حکم نہ دیا جو اس نے پہلے پڑھی تھیں۔

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ جعرانہ کے مقام پر تھے کہ آپ ﷺ سے ایک آدمی کے متعلق پوچھا گیا جس نے جب احرام باندھا تو اس پر ایک جبہ تھا جو خوش بو سے معطر تھا۔ جب آپ ﷺ پر وحی اتری تو آپ ﷺ نے اس سے کہا: ''اپنا جبہ اتار دے اور جو تجھ پر خوش بو کے اثرات ہیں انھیں دھو اور اپنے عمرے میں وہ اعمال کر جو اپنے حج میں کرنے والا تھا۔''[1] اس شخص نے وہ کام کیا یعنی جبہ پہنا جو حج میں ممنوع تھا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو اس کی وجہ سے دم دینے کا حکم نہیں دیا، لیکن اگر وہ یہ کام علم کے ہوتے ہوئے کرتا تو پھر اس کے لیے دم دینا ضروری ہو جاتا۔

بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دیہاتی کو دیکھا جو نماز صحیح نہیں پڑھ رہا تھا تو آپ ﷺ نے اس سے کہا: ''نماز پڑھ، تو نے نماز نہیں پڑھی۔'' آپ ﷺ نے اس سے یہ بات دو یا تین مرتبہ کہی۔ اس نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! مجھے اس سے اچھی نہیں آتی۔ آپ مجھے وہ سب سکھا دیں جو مجھے نماز میں کفایت کر جائے تو آپ ﷺ نے اس کو کفایت کرنے والی نماز سکھا دی۔[2] لیکن آپ ﷺ نے اس کو وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا جو وہ پہلے پڑھ چکا تھا، حالانکہ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کو اس سے اچھی نماز نہیں آتی اور وہ اسی طرح پڑھتا رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو صرف وہ نماز دہرانے کا حکم دیا، کیونکہ ابھی اس کا وقت باقی تھا اور وہ اس نماز کا مخاطب تھا، جس کو اس نے پڑھا تھا، لیکن وہ ابھی تک اس سے بری الذمہ نہیں ہوا تھا اور نماز کا وقت بھی باقی تھا۔

یہ عام مسئلہ ہے کہ جب کوئی بچہ بالغ ہو یا کوئی کافر مسلمان ہو یا حیض والی عورت پاک ہو یا پاگل شخص پاگل پن سے نکل آئے اور ابھی نماز کا وقت باقی ہو تو ان سب کے لیے نماز کو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، قضا دینا نہیں۔ اگر یہ سارے کام اس نماز کا وقت نکل جانے کے بعد ہوں تب وہ نماز ان پر لازم نہیں ہوتی اور ان پر گناہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٨٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

شخص جو نماز صحیح نہیں پڑھ رہا تھا، جب اس کو معلوم ہو گیا کہ نماز میں اطمینان واجب ہے تو اس وقت اس اطمینان کو اختیار کرنا اس پر واجب ہو گیا، لیکن اس سے پہلے وہ اس پر واجب نہیں تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کو اس وقت کی نماز میں، ارکانِ نماز کو اطمینان کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا، اس سے پہلی نمازوں کو دہرانے کا حکم نہ دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے صف کے پیچھے اکیلے شخص کو نماز دہرانے اور اس شخص کو دہرانے کا حکم دیا جس نے وضو کیا اور پاؤں کی کچھ جگہ خشک چھوڑ دی۔ آپ ﷺ کا دیہاتی سے کہنا: « صَلِّ ، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ » ''نماز پڑھ، تو نے نماز نے نہیں پڑھی۔''[1] واضح کرتا ہے کہ اس نے پہلے جو کام کیا تھا وہ نماز نہیں تھی، لیکن اس کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ نماز میں اطمینان کے واجب ہونے سے ناواقف تھا، اس لیے آپ نے اس کو شروع سے نماز دہرانے کا حکم دیا: جب اس نے کہا کہ مجھے تو اس سے بہتر آتی نہیں تو پھر آپ نے اس کو اس کی تعلیم دی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات ہیں جو نماز، روزے اور حج کے ممنوعہ امور سے تعلق رکھتے ہیں جب بندہ ناواقفیت کی بنا پر ان کا ارتکاب کرے اور جہالت و ناواقفیت ہی کی بنا پر کسی واجب کو ترک کر دے، لیکن آپ ﷺ نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے والے کو نماز دہرانے کا جو حکم دیا ہے تو وہ اس وجہ سے کہ وقت ابھی باقی تھا اور اس نے ایک واجب ادا نہیں کیا تو اس کے حق میں وجوب اسی وقت ثابت ہو گیا جب آپ ﷺ نے اس کو اس کا حکم دیا، کیونکہ وجوب کا وقت ابھی باقی تھا، وقت گزر جانے کے ساتھ آپ نے اس کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ دوسرا وہ شخص جس نے وضو کرتے وقت پاؤں کا کچھ حصہ خشک ہی چھوڑ دیا، اس کو نماز دہرانے کا حکم اس لیے دیا، کیونکہ وہ بھول گیا تھا اور اس واجب کو ادا نہ کر سکا، جس طرح کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے اور وقت ابھی باقی ہو۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا: « ویلٌ لِّلأعْقَابِ من النَّار »[2] ''وضو کرتے وقت جو ایڑھی خشک رہی وہ آگ میں جھلسے گی۔'' یہ وضو کو مکمل کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس میں کسی چیز کو دہرانے کا حکم نہیں۔

جو یہ سمجھتا ہے کہ نماز عارفوں، یا پہنچے ہوئے پیروں یا ان کے کچھ ماننے والوں سے ساقط ہو جاتی ہے، یا یہ کہ پیر کی طرف سے کوئی بھی نماز پڑھ دے تو اس کی طرف سے ہو جاتی ہے، یا اللہ کے کچھ ایسے بندے ہیں جن سے نماز ساقط ہو چکی ہے، جس طرح پیروں فقیروں کو اکثر ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہوتا ہے، تو ایسے تمام لوگوں سے توبہ کروائی جائے۔ اگر وہ نماز کے ہر ایک کے حق میں فرض ہونے کا اقرار کریں تو صحیح، ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے، اگر وہ نماز کی فرضیت کا انکار کرتے رہیں تو وہ مرتد سمجھے جائیں گے، لیکن ان میں جو توبہ کر کے نماز پڑھنا شروع کر دے تو علما کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠۔٢٤٢)

راجح قول کے مطابق اس پر ان نمازوں کو دہرانا فرض نہیں جو اس نے نہیں پڑھی تھیں۔ یہ بات کہنے والے یا تو مرتد ہوں گے یا ایسے مسلمان جو نماز کی فرضیت نہ جانتے ہوں۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ مرتد ہیں تو مرتد بھی اگر دوبارہ مسلمان ہو جائے تو اس پر بھی جمہور علما کے نزدیک ان نمازوں کو دہرانا فرض نہیں ہوتا جو اس نے حالتِ ارتداد میں چھوڑی ہوں جس طرح کافر ان نمازوں کی قضا نہیں دیتا جو اس نے حالتِ کفر میں نہیں پڑھی ہوتیں۔ اس پر علما کا اتفاق ہے۔ البتہ امام شافعی سے ایک روایت ہے کہ مرتد ان نمازوں کی قضا دے۔ لیکن پہلا قول ہی راجح اور ظاہر ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں کچھ لوگ مرتد ہوئے تھے، جیسے حارث بن قیس اور اس کے ساتھ چند لوگ، جن کے بارے میں یہ آیت اتری:

﴿ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ﴾ [آل عمران: ٨٦]

''اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔''

کچھ لوگ ان کے بعد بھی مرتد ہوئے جن میں عبداللہ بن ابی سرح اور ان لوگوں کا نام آتا ہے جو بدر کے دن کافروں کے ساتھ نکلے تھے، جن کے بارے میں یہ آیت اتری:

﴿ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ [النحل: ١١٠]

''پھر بے شک تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنھوں نے وطن چھوڑا، اس کے بعد کہ فتنے میں ڈالے گئے، پھر انھوں نے جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تیرا رب اس کے بعد ضرور بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

یہ سب لوگ دوبارہ مسلمان ہو گئے تھے اور عبداللہ بن ابی سرح فتح مکہ کے سال دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اس نے نبی اکرم ﷺ کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہ دیا جو انھوں نے حالتِ ارتداد میں چھوڑی تھیں، جس طرح آپ دیگر ان تمام مسلمان ہونے والے کافروں کو اس کا حکم نہیں دیا کرتے تھے۔

آپ ﷺ کی زندگی میں بہت سے لوگ مرتد ہو کر یمن میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے اسود عنسی کے پیروکار بن گئے، پھر اللہ نے اس کو ہلاک کر دیا اور وہ لوگ دوبارہ مسلمان ہو گئے۔ ان کو بھی وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ پھر مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ بہت سے لوگ اس کے پیچھے بھی لگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے جنگ کی۔ اس کے مرنے کے بعد بھی بہت سے لوگ اسلام کی طرف لوٹ آئے، لیکن ان کو بھی وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہ دیا گیا۔ بہت سے اہلِ بادیہ بھی مرتد

ہوئے، پھر مسلمان ہو گئے اور ان کو بھی وہ نمازیں دہرانے کا حکم نہ دیا گیا، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾ [الأنفال: ٣٨]

''ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا۔''

ہر کافر کو شامل ہے۔

اگر کہا جائے کہ یہ لوگ مرتد نہیں، بلکہ نماز کی فرضیت سے ناواقف اور جاہل ہیں تو یہ پہلے گزر چکا ہے کہ ان کے حق میں زیادہ ظاہر قول یہ ہے کہ وہ نماز کو نئے سرے سے صحیح طریقے کے مطابق شروع کریں جس طرح حکم دیا گیا ہے اور ان پر قضا نہیں۔ یہ اس شخص کا حکم ہے جو نماز کے فرض نہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوئے اس کو چھوڑتا ہے، لیکن جو شخص نماز کی فرضیت کا عقیدہ رکھتے ہوئے اس کو مسلسل چھوڑتا ہے تو اس کے متعلق فقہا نے کئی فروع پیش کی ہیں۔ ایک تو یہی ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ جمہور وفقہا یعنی امام مالک، احمد اور شافعی کا قول ہے۔ اگر ایسا شخص قتل ہونا پسند کرے، لیکن نماز نہ پڑھے تو کیا جب اس کو قتل کیا جائے تو کافر سمجھتے قتل کیا جائے یا مرتد سمجھتے ہوئے؟ اس کے جواب میں امام احمد سے دو مشہور روایات ہیں، لیکن یہ فروع صحابہ کرام سے منقول نہیں اور یہ فاسد فروع ہیں۔ اگر کوئی شخص دل میں نماز کا اقرار کرتا ہو اور اس کو واجب ہی سمجھتا ہو، تو پھر یہ ناممکن ہے کہ وہ قتل ہونا تو پسند کرے، لیکن ترکِ نماز پر اصرار کرے اور قطعاً نماز نہ پڑھے۔ کم از کم انسانوں کے عرفِ عام میں تو ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام میں ایسے کبھی ہوا بھی نہیں کہ کسی ایسے شخص کو قتل کیا گیا ہو۔ ایسا کوئی شخص نہیں ہو سکتا جو نماز کے فرض ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو اور اس سے کہا جائے کہ اگر تو نے نماز نہ پڑھی تو ہم تمھیں قتل کر دیں گے، لیکن پھر بھی وہ ترکِ نماز پر اصرار کرے، جب کہ اس کے فرض ہونے کا اقرار بھی کر رہا ہو؟! اسلام میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔

جو شخص قتل ہونا تو پسند کرے لیکن نماز پڑھنے سے انکار کر دے وہ حقیقت میں نماز کے فرض ہونے کا عقیدہ ہی نہیں رکھتا اور اس کو ادا کرنے کا پابند بھی نہیں بنتا۔ یہ بالاتفاق کافر ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایسے بہت سے آثار منقول ہیں جو ایسے شخص کے کافر ہونے پر دلالت کرتے ہیں، نیز یہ صحیح حدیث سے بھی ثابت ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ» (رواہ مسلم)[1]

''بندے اور کفر کے درمیان ترکِ نماز ہی کا فرق ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢)

«اَلْعَهْدُ الَّذِي بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ »[1]

''ہمارے اور ان کے درمیان جو عہد ہے وہ نماز کا ہے، جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔''

عبداللہ بن شقیق کا قول ہے: ''صحابہ کرام نماز کے علاوہ کسی عمل کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ تو جو انسان مرنا قبول کرے، لیکن اللہ کے لیے ایک سجدہ کرنا بھی پسند نہ کرے اور نماز چھوڑنے پر اصرار کرے، وہ کبھی مسلمان نہیں ہوسکتا جو اس کے فرض ہونے کا عقیدہ بھی رکھتا ہو، کیونکہ فرض ہونے کا عقیدہ رکھنا اور یہ عقیدہ بھی رکھنا کہ جو انسان نماز کا تارک ہے وہ قتل کا مستحق ہے، یہ نماز کو ادا کرنے کا مکمل باعث اور سبب ہے۔ جب باعث کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہو تو یہ مقدور کے وجود کو لازم کر دیتی ہے۔ اگر انسان قادر تو ہو، لیکن اس نے کبھی نماز نہ پڑھی ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس کے حق میں اس کا باعث (عقیدہ) موجود ہی نہیں۔ تارکِ نماز کی سزا کا مکمل عقیدہ رکھنا ہی نماز کے فعل کا باعث ہے۔ لیکن بسا اوقات بہت سی چیزیں اس کے سامنے رکاوٹ بن جاتی ہیں جس کی وجہ سے آدمی نماز میں تاخیر کر دیتا ہے، یا اس کے بعض فرائض کو ترک کر دیتا ہے، یا کبھی وقت نکال دیتا ہے اور نماز چھوٹ جاتی ہے۔ جو انسان اس حد تک نماز چھوڑنے پر مصر ہو کہ اس نے زندگی میں کبھی نماز پڑھی ہی نہ ہو اور اسی اصرار اور ترکِ نماز پر مر جائے تو یہ مسلمان نہیں ہوگا۔ لیکن اکثر لوگ کبھی نماز پڑھ لیتے ہیں، کبھی چھوڑ دیتے ہیں، ایسے لوگ نماز کی پابندی نہیں کرتے۔ یہ وعید کے زمرے میں آتے ہیں۔ انھی کے بارے میں یہ حدیث ہے جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دن رات میں بندوں پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جو ان کی پابندی کرتا ہے، اس کے لیے اللہ کا یہ عہد ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کرے گا اور جو ان کی محافظت، یعنی پابندی نہیں کرتا اس کے لیے اللہ کا کوئی عہد نہیں، چاہے تو اس کو عذاب دے اور چاہے تو اس کو معاف کر دے۔'' (رواہ أهل السنن)[2] نمازوں کی محافظت وہ شخص کرتا ہے جو ان کو ان کے اوقات پر ادا کرتا ہے، جیسے اللہ نے حکم دیا ہے۔ جو اس طرح نہیں کرتا، کبھی دیر کر کے پڑھتا ہے یا اس کے کچھ واجبات چھوڑ دیتا ہے، ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی تلے ہے، بلکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے پاس نوافل ہوں جن کے ذریعے اس کے فرائض کی تکمیل ہو جائے، جس طرح حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوا ہے۔[3]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح الجامع (٤١٤٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٤٢، ٣٢٤٣)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٩۔٥٠)

نماز کو عمداً موخر کرنے کا گناہ

سوال ایک شخص نے اس نیت سے ایک نماز چھوڑی کہ اس کا وقت گزر جانے کے بعد قضا کر کے پڑھ لے گا، کیا اس کا یہ فعل کبیرہ گناہ ہے؟

جواب الحمد لله. نماز کو عمداً اس وقت سے موخر کر کے پڑھنا جس وقت میں اسے پڑھنا ضروری ہوتا ہے، کبیرہ گناہ ہے، بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''عذر کے بغیر دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا کبیرہ گناہ ہے۔''

ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ جَمَعَ بَيْنَ الصَّلَاتَيْنِ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَقَدْ أَتَى بَابًا مِنْ أَبْوَابِ الْكَبَائِرِ » [1]

''جس نے دو نمازوں کو عذر کے بغیر جمع کیا وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے میں داخل ہوا۔''

گو اس حدیث کا مرفوع ہونا محلِ نظر ہے، مگر ترمذی نے کہا ہے: اہلِ علم کے ہاں اسی پر عمل ہے۔ یہ اثر معروف ہے۔ اہلِ علم نے اس کا اقرار کرتے ہوئے اسے ذکر کیا ہے، انکار اور تردید کرتے ہوئے نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ » [2]

''جس کی عصر کی نماز چھوٹ گئی، اس کا عمل ضائع ہو گیا۔''

عمل ضائع ہونے کی وعید اسی عمل کے متعلق وارد ہوتی ہے جو خطرناک ترین کبیرہ گناہ ہو۔ اس طرح عصر کی نماز نکال دینا کسی دوسری نماز کو چھوڑنے اور نکال دینے سے زیادہ سنگین ہے، کیوں کہ یہ صلاۃِ وسطیٰ (درمیانی) نماز ہے، جس کی حفاظت کا حکم خصوصیت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ ہم سے پہلی امتوں پر یہی نماز فرض تھی۔ انھوں نے اس کو ضائع کر دیا، اس لیے جو اس کی محافظت اور پاسداری کرتا ہے اس کے لیے دو مرتبہ اجر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب گھوڑوں میں مشغول ہوئے تو اس وقت یہی نماز ان سے چھوٹی تھی۔

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

«مَنْ فَاتَتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلَهُ وَمَالَهُ » [3]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٨) السلسلة الضعيفة (٤٥٨١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٤) صحيح الجامع (٦١٤٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٦)

''جس سے عصر کی نماز چھوٹ گئی، گویا اس کے اہل وعیال اور مال برباد ہو گیا۔''

جس کا خاندان اور مال برباد ہو جائے وہ خالی ہاتھ ہو جاتا ہے اور اس کے پاس مال و اہل سے استفادے کے لیے بھی کوئی چیز نہیں بچتی۔ وہ اس شخص کے قائم مقام ہے جس کا عمل ضائع ہو جائے۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ ﴾ [الماعون: ٤، ٥]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔''

یہاں ﴿ وَيْلٌ ﴾ (ہلاکت) کی وعید ہے جو نماز سے جان بوجھ کر غفلت برتتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وقت نکل جاتا ہے، گو اس کے بعد اسے پڑھ لے۔ اسی طرح یہ فرمان بھی ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ [مریم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسے ''ضائع کرنے'' کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: اسے ضائع کرنا ''اتنی تاخیر کرنا ہے کہ اس کا وقت نکل جائے۔'' انھوں نے کہا: ہم تو اس کو ترکِ نماز ہی خیال کرتے تھے۔ انھوں نے کہا: اگر وہ نماز ترک کر دیتے تو کافر ہو جاتے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کے بعض امرائے کوفہ کے بارے میں کہا کرتے تھے: ''تمھارے اخلاف نے جو کیا، وہ ان کے نماز میں تاخیر کرنے کی وجہ سے تھا۔''

آیت کے یہ الفاظ: ﴿ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ ہر اس شخص پر صادق آتے ہیں جو نماز کے وقت اپنی لذت کوشیوں میں مشغول رہتا ہے اور وقت پر نماز ادا نہیں کرتا، خواہ وہ لذت کوشیاں حرام کے زمرے میں ہوں، جیسے حرام کھانا، حرام پینا، حرام سننا اور حرام جنسی سرگرمی۔ یا حلال اور مباح کی قبیل سے ہوں لیکن اس میں اسراف اور حد سے تجاوز ممنوع ہو، یا اس طرح کا کوئی بھی کام۔ لہٰذا جو شخص نماز کے وقت کھیل، تماشے، سیر سپاٹے، کاروباری سرگرمی یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ وغیرہ میں مشغول رہ کر نماز کو بروقت ادا نہیں کرتا وہ اس نماز کو ضائع کرتا اور اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو

ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

جس شخص کا مال اور اولاد اس کو فرض نماز بروقت ادا کرنے سے بھلا دیتا اور غافل کر دیتا ہے وہ اس وعید میں داخل اور خسارہ پانے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابل لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ ﴾ [النور: ۳۶،۳۷]

''اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان میں صبح و شام۔ وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکات دینے سے غافل نہیں کرتی۔''

اگر خدائے بزرگ و برتر نے نماز کو وقت پر ادا نہ کر کے ضائع کرنے اور خواہشات کی پیروی کرنے والے کو غَيّ (گمراہی/جہنم) میں ملنے کی وعید سنائی ہے، جو اپنی خواہشات اور من پسند کاموں میں مشغول رہ کر نماز کے وقت میں تاخیر کرتا ہے وہ نماز ضائع کرنے والا اور اپنی خواہشِ نفس کا پیروکار ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے، کیوں کہ یہ وعید کبیرہ گناہ کے علاوہ کی نہیں، پھر اس کو خاسر اور نامراد قرار دینا بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ خسران اور خسارہ محض ان صغیرہ گناہوں کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کی شرط کے ساتھ مٹا دیے جاتے ہیں۔

مزید یہ کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر طہارت کے بغیر یا جہتِ قبلہ چھوڑ کر یا رکوع و سجود اور قراءت وغیرہ کو چھوڑ کر نماز پڑھے تو اس نے محض کبیرہ گناہ ہی کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ اگر وہ ان واجبات کے ترک کو حلال نہیں سمجھتا تو اس کے کفر کا خدشہ ہے۔ اگر وہ انھیں عمداً چھوڑنا حلال سمجھتا ہو تو پھر اس کے کفر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

یہ بھی معلوم ہے کہ نماز کا وقت نماز کے ان تمام فرضوں پر مقدم ہے۔ اس بات میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں کہ اگر مسافر کے پاس پانی نہ ہو اور اس کو یقین ہو کہ پانی نماز کا وقت گزر جانے کے بعد ہی مل سکے گا تو اس کے لیے اس نیت سے نماز میں تاخیر جائز نہیں کہ وہ وقت گزر جانے کے بعد وضو یا غسل کر کے نماز پڑھ لے گا، بلکہ وہی اس وقت فرض ہے۔ اسی طرح جو شخص رکوع و سجود اور قراءت سے عاجز ہو مگر وہ اس کو نہ کرنا حلال سمجھتا ہو تو بلاشبہہ کافر ہے۔

یہ بھی علم ہے کہ اگر اس (عاجز) کو یقین کی حد تک معلوم ہو کہ وقت کے بعد اس کے لیے رکوع، سجدہ اور قراءت مکمل کر کے نماز پڑھنا ممکن ہوگا تو اس امکان کی وجہ سے بھی وقت پر پڑھنا ہی اس پر واجب اور لازم ہے۔

ہمارے اصحاب یعنی حنابلہ میں سے جس نے یہ کہا ہے کہ نماز کو وقت سے موخر کرنا صرف اس کو جمع کرنے کی نیت رکھنے والے یا اس کی کسی شرط میں مشغول کے لیے جائز ہے۔ یہ قول اس قائل سے پہلے اصحابِ احمد میں سے کسی نے نہیں کہا، بلکہ مسلمانوں کے تمام گروہوں میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں، البتہ بعض شافعی اس کے قائل ہوں تو

ہوں، مگر مجھے اس میں شک ہے۔ بلاشبہہ یہ بالا جماع اپنے عموم اور اطلاق پر نہیں، اس میں ایک معروف صورت ہے، مثلاً یہ امکان ہو کہ کوئی شخص کنویں تک پہنچے اور پھر پانی حاصل کرنے کے لیے رسی لگائے، مگر وقتِ نماز ختم ہونے سے پہلے پہلے فارغ نہ ہو سکے، یا کسی ننگے کے لیے کپڑے سیئے جائیں اور اس وقت نماز سے پہلے پہلے اس سے فارغ ہونا ممکن نہ ہو، یا اس طرح کی کوئی صورت ہو، باوجودیکہ یہ قول امام احمد اور ان کے اتباع کے معروف مذہب اور حنفیہ و مالکیہ کے بھی خلاف ہے۔

میرے علم کے مطابق کچھ شافعی فقہا نے اس پر اتفاق کیا ہے، مگر اس قول کے قائل کے خلاف سب سے بڑی حجت اہلِ اسلام کا یہ اجماع ہے کہ محض نماز کی کسی شرط کی تکمیل میں مشغولیت نماز کے شرعی طور پر متعین وقت میں تاخیر کو جائز نہیں کرتی۔ اگر نماز کا وقت شروع ہو جائے اور وقت کے اندر اندر پانی کا ملنا ناممکن نظر آ رہا ہو تو اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ نماز کو وقت سے موخر کرنا جائز نہیں، خواہ انسان نماز کی شرط ہی میں مشغول ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ننگا ہو اور وقت کے اندر اندر اس کے لیے کپڑا خریدنا اور حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو اس کے لیے بھی بلا اختلاف نماز میں تاخیر جائز نہیں۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی ان پڑھ سورت فاتحہ سیکھ رہا ہو مگر وقت کے اندر اندر اس کے لیے سیکھنا ممکن نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وقت پر نماز پڑھے۔ جو تکبیر و تشہد سیکھنے سے عاجز ہو، اگر وقت تنگ اور محدود ہو تو وہ حسبِ امکان نماز پڑھے اور انتظار نہ کرے۔ ایسے ہی جس عورت کو استحاضہ کا عارضہ ہو، اگر اس کا خون وقت کے بعد بند ہو تو اس کے لیے وقت کے بعد طہارت کے ساتھ نماز پڑھنے کے ارادے سے تاخیر جائز نہیں، بلکہ وقت پر حسبِ امکان نماز پڑھے۔

دوسری یہ بات کہ جہاں جمع جائز ہو تو اس صورت میں وقت ایک ہوتا ہے، وہاں تاخیر کرنے والا اس وقت سے تاخیر نہیں کرتا جس میں اس کو ادا کرنا جائز ہوتا ہے، بلکہ ایک قول کے مطابق جمع میں نیت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ قصر کا حکم بھی یہی ہے اور یہ ابوحنیفہ و مالک جیسے جمہور کا قول ہے۔

اسی طرح نمازِ خوف بھی وقت پر فرض ہو جاتی ہے، حالانکہ اسے موخر کر کے کامل صورت میں پڑھنا ممکن ہوتا ہے، جس میں قبلہ کی طرف پشت کرنے، عملِ کثیر، امام سے پہلے رکعت پڑھ لینے، سلام پھیرنے سے پہلے امام سے علاحدہ ہونے، سلام سے پہلے رہ جانے والی رکعات پوری کرنے اور اس طرح کے ان دیگر کاموں سے بچا جا سکتا ہے جو نمازِ خوف میں کیے جاتے ہیں، لیکن یہ سب صرف وقت کی وجہ سے ہے، ورنہ وقت گزر جانے کے بعد، چاہے رات کے وقت ہی نماز کو کامل صورت میں ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ایسے ہی جس پر قبلہ واضح نہ ہو اور وقت سے پہلے پہلے شہر جا کر قبلہ کی درست سمت معلوم کرنا ممکن نہ ہو اس کے لیے بھی یہ تاخیر جائز نہیں۔ کسی نے صرف یہ اختلاف کیا ہے کہ اگر اس کے لیے قبلہ کی جہت معلوم کرنے کے دلائل سیکھنا ممکن ہو، لیکن وقت کے اندر اندر نہ سیکھ سکتا ہو، اس کے لیے

تاخیر جائز ہے۔ مگر یہ قول نیا اور شاذ ہے، جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اس جیسے مسائل میں ائمہ کا مشہور اختلاف اس جیسی صورت میں ہے جب کوئی سویا ہوا نماز کے آخری وقت میں بیدار ہو اور اس کے لیے طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے وضو کر کے نماز پڑھنا ممکن نہ ہو تو کیا وہ تیمّم کر کے نماز پڑھے یا وضو کر کے طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھے، اس میں دو مشہور اقوال ہیں:

پہلا قول: وقت کا خیال رکھنا ہے، یہ امام مالک کا قول ہے۔

دوسرا قول: یہ احمد شافعی اور ابو حنیفہ جیسے اکثر فقہا کا قول ہے۔

جن فقہا نے شرطِ نماز کو وقتِ نماز پر مقدم رکھا ہے، ان کو اس مسئلے سے یہ وہم پیدا ہوا ہے، حالانکہ اس طرح نہیں، کیوں کہ سوئے ہوئے کے لیے وقت وہی ہے جس وقت میں وہ بیدار ہو۔ صحیح میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ نَامَ عَنْ صَلَاةٍ أَوْ نَسِيَهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ ذَلِكَ وَقْتُهَا » [1]

''جو نماز سے سو گیا یا بھول گیا، جب اس کو یاد آئے اسی وقت پڑھ لے، وہی اس کا وقت ہے۔''

آپ ﷺ نے یاد آنے اور بیدار ہونے کے وقت کو وہ وقت قرار دیا ہے جس میں اللہ نے اس پر نماز فرض کی ہے، لہٰذا جو اس وقت میں ممکنہ حد تک واجب طہارت کے بعد اس کو ادا کرتا ہے وہ اس کو اس کے وقت ہی پر پڑھتا ہے اور یہ شخص نماز میں بے پروائی یا اس کو ضائع کرنے والا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« لَيْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِيطٌ إِنَّمَا التَّفْرِيطُ فِي الْيَقَظَةِ » [2]

''نیند میں تفریط (بے پروائی) نہیں ہوتی، بیداری میں تفریط ہوتی ہے۔''

اس کے برخلاف جو اول وقت میں بیدار ہو وہ اس کو اسی وقت پڑھنے کا مامور ہے۔ یہ اگر اس کو عمداً اس کے وقت سے موخر کرے تو ضائع کرنے والا اور بے پروا ہوگا، چاہے نماز کی کسی شرط میں مشغولیت کی بنا ہی پر تاخیر کرے، یہ اس وقت سے موخر کرنے والا ہے جس میں اسے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، کیوں کہ اگر وہ اس وقت میں اسے پڑھنے کا مامور اور مکلّف نہ ہوتا تو اس کے لیے اس وقت سے تاخیر کرنا جائز ہوتا، جب طہارت کے لیے پانی حاصل کرنے میں یا کسی دوسری جگہ جا کر ادھار کپڑے لانے میں مشغول ہوتا اور یہ اجماع کے خلاف ہے، بلکہ جو آخری وقت میں بیدار ہو، وہ اسی طرح وضو کرے جس طرح وقت پر بیدار ہونے والا وضو کرتا ہے۔ اگر وہ اس وجہ سے موخر کرے کہ اس کو پانی ہی زوال کے وقت ملا ہے تو یہ اس کے لیے جائز نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨١)

مزید یہ کہ علما نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے اور وہ نماز نہ پڑھے تو اس کو قتل کر دیا جائے، چاہے کہے: میں قضا کر کے پڑھ لوں گا۔ اسی طرح اگر کہے: میں وضو کے بغیر نماز پڑھوں گا یا قبلے کی طرف منہ نہیں کروں گا، الغرض نماز کا ہر وہ فرض جس پر امت کا اجماع ہے، اگر وہ اسے جان بوجھ کر چھوڑ دے تو اس کو قتل کیا جائے گا، جس طرح ترکِ نماز پر قتل کیا جائے گا۔

اگر ہم کہیں: وہ دوسری اور چوتھی کا وقت تنگ ہونے پر قتل کیا جائے تو بات ایسے ہی ہے۔ اسی طرح اگر ہم کہیں: پہلی کا وقت تنگ ہونے پر قتل کیا جائے تو وہ صحیح ہے یا تیسری پر، یہ اس اساس پر مبنی ہے کہ کیا ایک نماز ترک کرنے پر قتل کیا جائے گا یا تین نمازوں کو چھوڑنے پر؟ اس میں دو روایات ہیں۔

اگر کہا جائے: ایک نماز کے ترک کرنے پر تو کیا اس کے بعد کی نماز کے وقت کی شرط ہے یا اسی کے وقت کی تنگی ہی کافی ہے؟ اس میں دو وجوہ ہیں اور ایک یہ تیسری وجہ بھی ہے کہ جمع وغیرہ کی دو نمازوں میں فرق کیا جائے گا۔ یہ اس کے معارض نہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ وقت کے بعد درست ہے، بقیہ فرائض کے برخلاف، کیوں کہ وقت جب چھوٹ جائے تو اس کا تدارک ممکن نہیں ہوتا، تاخیر کا گناہ کبائر کے باب سے ہے، جسے توبہ وغیرہ مٹا دیتی ہے، باقی فرائض کا تدارک قضا کے ساتھ ممکن ہے۔

باقی رہے وہ امرا جو نماز کو اس وقت سے موخر کر کے پڑھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے لڑنے سے منع کیا ہے، اگر کہا جائے کہ وہ نماز کو اس کے آخری وقت تک موخر کرتے تھے تو پھر کوئی کلام اور اعتراض نہیں۔ اگر کہا جائے کہ وہ نماز کو اس وقت سے نکال دیتے تھے جو صحیح ہے تو رسول اللہ ﷺ نے امت کو وقت پر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا:

«اِجْعَلُوْا صَلَاتَكُمْ مَعَهُمْ نَافِلَةً» [1] "ان کے ساتھ اپنی نماز کو نفل بنا لو۔"

اور آپ ﷺ نے ان سے لڑنے سے منع کیا، جس طرح ان امرا سے لڑنے سے منع کیا جو مال بناتے اور لوگوں کے حقوق میں ظلم کرتے ہیں، چاہے اس دوران میں جو کبیرہ گناہ ہوتے رہے وہ ہوتے رہیں۔

نماز کے وقت میں تاخیر کرنے والا فاسق ہے۔ ائمہ محض فسق کی وجہ سے لڑائی نہیں کرتے۔ گو کبھی کوئی فرد جس پر اختیار ہو، فسق کی بعض انواع جیسے زنا وغیرہ کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ فعل جس میں قتل جائز ہو، ائمہ ان کے اس فعل کی وجہ سے لڑائی کریں، کیوں کہ لڑائی کا فساد ولی امر کے کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اسی لیے اصحابِ احمد میں سے کچھ فقہا نے واضح الفاظ میں فاسقوں کے پیچھے نفلی نماز پڑھنے کے جواز کا فتویٰ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٨)

دیا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے امرا کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے جو وقت نکل جانے تک نماز موخر کرتے ہیں۔ یہ فاسق ائمہ ہیں، جن کے پیچھے آپ ﷺ نے نفل نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ فقہا کے ہاں نماز کے وقت کو نکال دینے کا فسق ہونا معروف ہے، لیکن اگر کوئی کہے: اس کو ہمیشہ نکال دینا کبیرہ گناہ ہے، یہ تو صغیرہ پر اصرار ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا: گذشتہ معروضات سے واضح ہوتا ہے کہ ایک نماز نکال دینے پر بھی وعید لاحق ہے، نیز اصرار دوبارہ کرنے کا ارادہ ہے۔ جو صغیرہ گناہ کرتا ہے اور اس سے توبہ کرتا ہے، پھر دوبارہ وہی کرتا ہے تو وہ کبیرہ کا ارتکاب نہیں کرتا، مزید یہ کہ جس نے نماز نکال دینے پر ہیشگی کی شرط عائد کی ہے یہ بھی کسی ضابطے کی محتاج ہے۔ اگر اس پر ہیشگی سے اس کی مراد ساری عمر پر مشتمل ہے تو جن کا ذکر ہوا وہ اس باب سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر اس سے محدود مقدار مراد ہے تو اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا۔

پھر ایک نماز کے ترک کرنے پر قتل کی سزا اس کو کبیرہ قرار دینے سے بہت زیادہ آگے ہے۔ والله سبحانه أعلم[1]

تارکِ نماز سے متعلق اہلِ اختیار کی ذمے داری

سوال ایک شخص کو نماز پڑھنے کا کہا جاتا ہے، مگر وہ انکار کرتا ہے، اس پر کیا عائد ہوتا ہے؟ جو اس حدیثِ رسول ﷺ «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُولُوا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»[2] سے عذر پیش کرتا ہے، کیا یہ اس کے لیے ترکِ نماز کی سزا سے بچنے کے لیے عذر بن سکتی ہے؟ نیز ان صاحبانِ اختیار کی کیا ذمے داری ہے جن کے زیرِ اختیار لوگ نماز نہیں پڑھتے، کیا اس سلسلے میں ان کا اقدام سب سے بڑا جہاد اور نیکی کا سب سے بڑا دروازہ سمجھا جا سکتا ہے؟

جواب الحمد لله، جو فرض نماز سے روگردانی کرتا ہے وہ مسلمانوں کے ائمہ کے اتفاق کے ساتھ شدید سزا کا سزاوار ہے، بلکہ مالک، شافعی اور احمد وغیرہم جیسے جمہور ائمہ امت کے نزدیک اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو ٹھیک، ورنہ قتل کر دیا جائے۔

بلکہ تارکِ نماز چور، زانی، شرابی اور حشیش خور سے بھی بدتر ہے۔ ہر صاحبِ امر کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی فرماں برداری کرنے والے کو نماز کا حکم دے، حتی کہ نابالغ بچوں کو بھی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مُرُوهُمْ بِالصَّلَاةِ لِسَبْعٍ وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا لِعَشْرٍ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۵۳-۶۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠-٢٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٤) صحيح الجامع (٥٨٦٧)

''سات سال کی عمر میں ان کو نماز پڑھنے کا کہو، دس سال کی عمر میں انھیں اس کے لیے مارو اور ان کے بستر الگ کر دو۔''

جس کے پاس کوئی چھوٹا غلام، یا یتیم بچہ یا لڑکا ہو اور وہ اس کو نماز کا حکم نہ دے تو اس بڑے کو اس کی وجہ سے سخت تعزیری سزا دی جانی چاہیے، کیوں کہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی ہے۔ اسی طرح جس کے پاس بڑی عمر کے غلام یا جانوروں کا خیال رکھنے والے نوکر، کپڑے دھونے وغیرہ والے، صفائی کرنے والے، خادم، بیوی، لونڈی یا لونڈیاں ہوں تو وہ ان سب کو نماز پڑھنے کا حکم دے۔

اگر وہ یہ کام نہیں کرتا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان ہوگا۔ وہ مسلمانوں کے لشکر سے ہونے کا مستحق ہی نہیں، بلکہ تاتاریوں کے لشکر سے ہے۔ تاتاری کلمہ پڑھتے ہیں، اس کے باوجود ان سے لڑنا مسلمانوں کے اجماع کے ساتھ واجب ہے۔ اسی طرح اسلام کے ظاہری یا باطنی معلوم احکام میں سے کسی ایک حکم کو ماننے سے انکار کرنے والے ہر گروہ سے لڑنا واجب ہے۔ اگر وہ کہیں: ہم کلمہ پڑھتے ہیں، لیکن نماز نہیں پڑھیں گے تو ان سے اس وقت تک لڑا جائے گا، جب تک نماز پڑھنا شروع نہیں کر دیتے۔ اگر کہیں: ہم نماز پڑھیں گے، مگر زکات نہیں دیں گے تو ان سے اس وقت تک لڑا جائے گا، جب تک زکات نہیں دے دیتے۔ اگر کہیں: ہم زکات دیں گے مگر حج نہیں کریں گے اور روزہ نہیں رکھیں گے تو ان سے اس وقت تک لڑا جائے گا جب تک حج نہیں کرتے اور رمضان کے روزے نہیں رکھتے۔ اگر وہ کہیں: ہم یہ سارے کام کریں گے مگر سود نہیں چھوڑیں گے یا شراب نوشی ترک نہیں کریں گے یا برائیوں سے باز نہیں آئیں گے یا جہاد فی سبیل اللہ نہیں کریں گے یا یہود و نصاریٰ پر جزیہ وغیرہ عائد نہیں کریں گے تو ان سے اس وقت تک لڑا جائے گا جب تک وہ یہ سارے کام نہ کر لیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ [الأنفال: ٣٩]

''اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٧٨، ٢٧٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کا اعلان سن لو۔''

سود وہ کام ہے جس کو اللہ نے سب سے آخر میں حرام کیا، طائف کے لوگ مسلمان ہوئے، وہ نماز کے پابند

تھے اور انھوں نے جہاد بھی کیا، اللہ نے بیان کیا ہے: اگر وہ سود سے باز نہ آئے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والوں میں شمار ہوں گے۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ فوت ہو گئے اور عرب میں سے جنھوں نے کافر ہونا تھا، کافر ہو گئے تو عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ لوگوں سے کس طرح لڑ سکتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا ہے:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُوْلُوْا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ.... »[1]

"مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ اللہ کے ایک معبود ہونے اور میرے رسول ہونے کی گواہی نہ دے دیں، اگر وہ ایسا کر لیں تو وہ مجھ سے اپنے خون اور مال بچا لیں گے، ماسوائے ان کے حق کے۔"

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا: ماسوائے ان کے حق کے؟! اللہ کی قسم! اگر انھوں نے مجھے وہ ایک رسّی دینے سے بھی انکار کر دیں جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے تو میں اس کے لیے بھی ان سے لڑوں گا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللہ کی قسم! میں نے دیکھ لیا: اللہ نے لڑائی کے لیے ابوبکر کو شرح صدر سے نواز دیا ہے تو مجھے اس کے حق اور صحیح ہونے کا یقین ہو گیا۔"

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خارجیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا: "تم میں سے ایک اپنی نماز کو ان کی نماز، اپنے روزے کو ان کے روزے اور اپنی قراءت کو ان کی قراءت کے سامنے حقیر دیکھے گا، وہ قرآن پڑھیں گے، وہ ان کے حلقوں سے نیچے نہیں اترے گا، وہ اس سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار کے آر پار ہو جاتا ہے۔ تم جہاں انھیں پاؤ قتل کر دو، جو ان کو قتل کرے گا اس کو قیامت کے دن اللہ کے ہاں بڑا اجر ملے گا۔"[2]

اگر وہ لوگ رات کو قیام کرتے، دن کو روزہ رکھتے اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان سے لڑنے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ انھوں نے سنت اور جماعت سے علاحدہ راہ اختیار کر لی تو وہ گروہ جو اسلام کے احکام اور شرائع کی پابندی ہی نہیں کرتے، بلکہ اپنے بادشاہوں کے بنائے ہوئے قوانین کی پاسداری کرتے ہیں، ان کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟ والله أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠-٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٥٠-٥٣)

نماز میں سستی کرنے والوں کا حکم اور ان سے تعامل کا طریقہ

سوال کچھ لوگ سستی کرتے ہوئے پانچوں نمازیں نہیں پڑھتے۔ ہر وقت انھیں نماز کے لیے کہا جاتا ہے، لیکن وہ نہیں مانتے، ان کا کیا کرنا چاہیے؟ جب یہ کسی کو سلام کہیں تو جواب دیا جائے یا نہیں؟ کیا اللہ کی خاطر ان سے ترکِ تعلق کر لینا چاہیے؟ ان میں ایک آدمی کہتا ہے: میں بلاوضو نماز پڑھ لیتا ہوں اور کبھی کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر نماز فرض ہی نہیں کی، اس کا کیا کیا جائے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. یہ لوگ اگر نماز کے فرض ہونے کے قائل نہیں تو بالاجماع کافر و مرتد ہیں۔ اگر توبہ نہ کریں تو سب واجب القتل ہیں۔ جو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر نماز فرض ہی نہیں کی، یہ بالاتفاق کافر ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے۔ اگر یہ نماز کے فرضیت کے قائل ہوں مگر پڑھنے سے انکار کر دیں تو جمہور ائمہ اسلام کے نزدیک ان سے بھی توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ نہ کریں اور فرض نماز ادا نہ کریں تو یہ بھی واجب القتل ہیں، لیکن کیا ان کو بطور کافر قتل کیا جائے گا یا بطور فاسق؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں، اکثر سلف، اصحابِ مالک و شافعی کے ایک گروہ اور امام احمد سے ایک روایت کے مطابق جس کو ان کے اکثر اصحاب نے اختیار کیا ہے، ان کو بطور کافر قتل کیا جائے گا، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ» (رواه مسلم)[1]

''بندے اور کفر و شرک کے درمیان ترکِ نماز کے سوا کچھ نہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْعَهْدُ الَّذِيْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ، فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ»[2]

''ہمارے اور ان کے درمیان نماز کا عہد ہے جس نے اسے ترک کیا اس نے کفر کیا۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔

امام ترمذی نے عبداللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے کہ ''اصحابِ محمد ﷺ نماز کے سوا کسی عمل کے ترک کو کفر خیال نہیں کرتے تھے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا اس سے اللہ اور رسول کا ذمہ اٹھ گیا۔''[3]

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٤٣)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٢٢) صحيح الترغيب والترهيب (١/١٣٧)

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا گیا اس وقت انھیں نماز کا کہا گیا تو انھوں نے کہا: ''ہاں، تارکِ نماز کے لیے اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔''[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ [التوبة: ١١]

''پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دینی اخوت کو شرک سے توبہ کے ساتھ ساتھ نماز قائم کرنے اور زکات ادا کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے جس طرح ترکِ قتال کو بھی اس کے ساتھ مشروط کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَإِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴾ [التوبة: ٥]

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ ان کو کیسے پہچانیں گے جنھوں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ قیامت کے دن وضو کے آثار کی وجہ سے روشن پیشانی اور روشن اعضا کے ساتھ آئیں گے۔''[2] جس نے کبھی نماز نہیں پڑھی قیامت کے دن اس میں امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نشانی نہیں ہوگی۔

صحیحین میں حدیثِ شفاعت میں ہے کہ آپ نے ان جہنمیوں کا ذکر کیا جن کو سفارش سے نکالا جائے گا تو فرمایا: ''سجدوں کی جگھوں کے سوا آگ نے ان کو کھا لیا ہوگا، کیوں کہ اللہ نے آگ پر سجدوں کے نشان کھانا حرام کیا ہے۔''[3] اس طرح کی کئی احادیث ہیں۔

جو کہتا ہے: میں بلا وضو نماز پڑھتا ہوں، اگر وہ اسے حلال و جائز سمجھتا ہے یا نماز کے ساتھ استہزا اور ٹھٹھول کرتا ہے تو وہ بالاتفاق کافر ہے اور واجب القتل ہے۔ اگر نماز کے لیے وضو کی فرضیت اور بے وضو پڑھنے کا حرام ہونے کا قائل ہے تو اس کے کفر میں فقہا کے دو اقوال ہیں۔ حنفیہ کے ایک گروہ کے نزدیک اس کو کافر قرار دیا جائے اور اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ اس جیسے انسان کو شدید ترین سزا دی جائے۔ واللہ أعلم

ایسے لوگوں سے قطع تعلقی کر لینا یا ان کے سلام کا جواب نہ دینا انتہائی ہلکی پھلکی سزا ہے۔ یہ اس سے بہت سخت سزا کے مستحق ہیں۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] الموطأ (٣٩/١) سنن الدارقطني (٥٢/٢) مصنف عبد الرزاق (١٢٥/٣) مصنف ابن أبي شيبة (٤٣٨/٧) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٣٥٧/١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٢)

[4] جامع المسائل (١٠٤/٤-١٠٦)

نماز میں سستی کرنے والی بالغ لڑکی اور بوڑھی عورت کو فہمائش

سوال جب لڑکی بالغ ہو جائے اور نماز نہ پڑھے، اگر اس کو نماز پڑھنے کا کہا جائے تو وہ جواب میں کہے: میں بڑی نہیں، ایسے ہی اگر کوئی بوڑھی عورت نماز نہیں پڑھتی اور اس کے خاوند نے یہ قسم کھائی ہے کہ اگر وہ نماز نہیں پڑھے گی تو اس کو خرچ دے گا نہ اس کا حقِ زوجیت ادا کرے گا، کیا وہ قسم توڑ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب مردوں اور عورتوں میں سے جو بالغ ہو جائے اس پر نماز اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ فرض ہو جاتی ہے۔ عورت کے بالغ ہونے کی نشانی حیض آنا اور انزال ہونا ہے۔ اسی طرح حمل ٹھہرنا بھی انزال کی علامت ہے۔ لہٰذا جب عورت کو حیض آنا شروع ہو جائے یا وہ حاملہ ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ اللہ نے اس پر نماز فرض کی ہے مگر وہ اپنے اوپر نماز کی فرضیت کا اقرار نہیں کرتی، ایسی عورت بالاتفاق کافر ہے۔ یہ اپنے خاوند کے لیے حلال ہے نہ اس کے ساتھ نکاح کرنا ہی صحیح ہے۔ یہ مرتدہ ہے۔ اور ائمہ کے نزدیک مرتدہ کا نکاح باطل ہے۔ یہ مالک، شافعی اور احمد وغیرہم کے نزدیک واجبۃ القتل ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک مرتد ہونے والی ساری عورتیں واجبۃ القتل ہیں۔ اگر وہ اس گمان کی وجہ سے اپنے اوپر نماز کی فرضیت کا اقرار نہیں کرتی کہ نماز بوڑھی پر فرض ہوتی ہے جوان پر نہیں تو اس کو اس وقت تک کافرہ اور مرتدہ قرار نہیں دیا جائے گا جب تک یہ اپنے اوپر نماز کا فرض ہونا جان نہیں لیتی۔

کیا ایسی عورت ان نمازوں کو دہرائے گی جو اس نے اپنے اوپر اس کی فرضیت سے لاعلمی کے عرصے میں چھوڑیں؟ اس سے متعلق امام احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بوڑھی عورت نماز کی فرضیت کا اقرار نہیں کرتی اور نماز پڑھنے سے انکار کرتی ہے تو اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح ورنہ امام مالک، شافعی اور احمد وغیرہ کے نزدیک واجبۃ القتل ہے۔ اگر اس کا خاوند اس وقت تک اس سے قطع تعلقی کر لیتا ہے جب تک وہ نماز نہیں پڑھتی تو وہ اس قطع تعلقی اور ازدواجی تعلقات چھوڑنے میں نیک ہے۔ اس مدت میں وہ عورت خرچے کا حق نہیں رکھتی۔ مرد نے جو کام کیا ہے اس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔ عورت پر اس حکم میں اس کی فرماں برداری کرنا ضروری ہے۔ خاوند اپنی بیوی کو حرام کام چھوڑنے کا پابند بنا سکتا ہے، اگرچہ اس کے اس فعل کے ساتھ مجامعت ممکن ہو۔ اسی طرح خاوند بیوی کو غسلِ جنابت کرنے اور نجاست دور کرنے کا پابند بنا سکتا ہے، گو جنابت کے ساتھ بھی مجامعت ممکن ہوتی ہے، مگر انسانی نفس جنابت والی اور گندی عورت سے مجامعت کرنے میں کراہت محسوس کرتا ہے۔ تو جو عورت نماز نہیں پڑھتی وہ اس سے بھی بری ہے۔ نماز چھوڑنا اکثر حرام کاموں سے زیادہ برا کام ہے۔ اگر عورت مرد کی کسی پابندی کی پاسداری کرتی ہو تو وہ ایسی پابندی لگا سکتا ہے، اگر نافرمان ہو تو جب تک نافرمان رہے گی تب تک خرچے کی حق دار نہیں ہو گی۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] جامع المسائل (٤/١١٦-١١٧)

نماز نہ پڑھنے کا نکاح پر اثر اور ایسی عورت کو رکھنے یا نہ رکھنے کا مسئلہ

سوال ایک شخص کی بیوی نماز نہیں پڑھتی، کیا وہ اس پر حرام ہو جائے گی؟ یا عقدِ نکاح فسخ یعنی ٹوٹ جائے گا؟ اس نے بیوی کے لیے بڑا بھاری حق مہر طے کیا ہے، مگر اسے ادا کرنے پر قادر نہیں، اس کو یہ ڈر بھی ہے کہ اگر اس نے بیوی کو فارغ کر دیا تو وہ اس سے ایسی کسی چیز کا مطالبہ کر دے گی جسے ادا کرنا اس کے بس میں نہیں، اب یہ شخص کرے تو کیا کرے؟

جواب الحمد للّٰہ. بیوی یا کسی بھی ایسے فرد کو جو انسان کے زیرِ اطاعت ہو، نماز نہ پڑھنے پر برقرار رکھنا اور ٹھہرانا، اہلِ اسلام کے اجماع کے ساتھ حرام ہے، منع کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود بھی اگر کوئی اس پر خاموش رہتا ہے تو وہ بلااختلاف گناہ گار نافرمان اور فاسق ہے، بلکہ جو انسان کے ماتحت نہ ہو، اس کو بھی نماز کا حکم دینا فرضِ کفایہ ہے۔ جب لوگ اس کام کو چھوڑ دیں تو وہ نافرمان، گناہ گار اور سب کے سب اللہ کے عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ تو اگر کوئی اس کو بھی حکم نہیں دیتا جو اس کی اطاعت میں آتا ہے تو اس کا جرم کتنا بڑا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۲]

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور اس پر خوب پابند رہ۔''

اللہ نے اپنے نبی کو جو حکم دیا ہے وہ امت کے لیے بھی حکم کا درجہ رکھتا ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو اور یہاں بالاتفاق تخصیص نہیں، لہٰذا ہر مسلمان پر اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دینا فرض ہے، ایسے ہی اللہ کا فرمان ہے:

﴿ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ ﴾ [التحریم: ٦] ''اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچاؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو تعلیم دو اور ادب سکھاؤ۔''

جب آدمی کو معلوم ہو جائے کہ اس کی منگیتر نماز نہیں پڑھتی تو اس کے ساتھ اس کا شادی کرنا کسی زانیہ یا چورنی یا شراب پینے والی سے شادی کرنے سے بھی زیادہ برا ہے، کیوں کہ نماز نہ پڑھنے والا علما کے اتفاق کے ساتھ چور اور زانی سے بھی زیادہ برا ہے، لہٰذا نماز چھوڑنے والا مرد ہو یا عورت امام مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور علما کے نزدیک واجب القتل ہے، حالانکہ چور اور غیر شادی شدہ زانیہ واجب القتل نہیں۔ اگر کوئی لڑکی اپنے والدین کے ہاں بالغ ہوتی ہے اور کنواری ہے مگر نماز نہیں پڑھتی تو وہ ان کے پاس رہ کر چوری کرنے یا زنا کرنے سے بھی بدتر ہے۔ جب سارے لوگ کسی چورنی یا شراب پینے والی یا زانیہ وغیرہا سے شادی کرنے کو برا سمجھتے ہیں تو ان کو بے نمازی سے شادی کرنے کو اس سے کئی درجے زیادہ برا سمجھنا چاہیے۔ یہاں کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ جب مسلمان کے لیے یہودی

اور عیسائی عورت سے شادی کرنا جائز ہے تو بے نماز عورت کے ساتھ کیوں نہیں؟ کیوں کہ یہودی اور نصرانی عورت کو اس کے دین پر برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو مارا جاتا ہے نہ قتل ہی کیا جاتا ہے، لیکن بے نمازی، چور اور زانی کو ان برے کاموں پر برقرار نہیں رکھا جاتا، بلکہ قتل کرنے، ہاتھ کاٹنے یا کوڑے مارنے کی سزا دی جاتی ہے۔ گو آخرت میں اس کی سزا کافر کی سزا سے ہلکی ہوگی، لیکن کسی دوسرے کے لیے اس کو اس کے فسق پر برقرار رکھنے کی اجازت نہیں۔ جو انسان کسی فاسق کو اس کے فسق پر برقرار رکھتا ہے اور اس کو منع نہیں کرتا وہ نافرمان اور گناہ گار ہوتا ہے، لیکن جو ذمی کو اس کے دین پر برقرار رکھتا ہے وہ گناہ گار یا نافرمان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ ﴾ [النور: ٢٦]

''گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لیے ہیں اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لیے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے ہیں۔ یہ لوگ اس سے بری کیے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔''

یعنی خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے ہیں۔ خبیثہ فاجر عورت کو کہتے ہیں جو خبیث اور فاجر مرد کے لیے ہوتی ہے۔

اگر خبث سے زنا مراد لیا جائے، جیسا کہ ایک قول ہے، تو معلوم ہوا کہ زانیہ سے نکاح اس وقت تک **جائز نہیں** جب تک وہ توبہ نہیں کر لیتی، یہ علما کے دو اقوال میں سے صحیح تر قول ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ ﴾ [النور: ٣]

''اور زانی عورت، اس سے نکاح نہیں کرتا مگر کوئی زانی یا مشرک۔''

نبی اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو ''عناق'' نامی عورت سے شادی کرنے سے روک دیا تھا، جس کے ساتھ وہ قبل از اسلام زنا کیا کرتا تھا، [1] اللہ نے یہ آیت اس سے متعلق نازل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ زانیہ کے ساتھ شادی کرنے والا عام اہلِ عقل کے نزدیک برا اور مذموم ہوتا ہے، بلکہ رنڈی کا خاوند ہونا گالی ہے۔ عربی محاورے میں کہا جاتا ہے: ''شتمه بالزين والقاف'' اس نے اس کو ''طوائف کا شوہر'' کہہ کر گالی دی۔

وہ حدیث جس میں ایک شخص نے یہ شکایت کی تھی کہ ''اس کی بیوی چھونے والے کا ہاتھ نہیں روکتی۔'' [2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٥١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٦/٢٩٦) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٢٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زانیہ کی طرف سے بستر خراب کرنے کا ڈر ہوتا ہے۔ اس پہلو سے یہ عورت کی ہر برائی سے زیادہ برا کام ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی بدکاری نہیں کی، لیکن بے نماز عورت کی سزا بعض بدکار عورتوں کی سزا سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس لیے جو انسان ایسی عورت سے شادی کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے گھر میں ایسی برائیوں کو لاتا اور برقرار رکھتا ہے جو اپنے گھر میں اپنی زنا کرنے والی بیٹی یا بہن کو ٹھہرانے سے بھی زیادہ بڑی برائی ہے۔

جہاں تک محض نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے نکاح ٹوٹنے کی بات ہے تو یہ فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، البتہ جب اس کو نماز کی دعوت دی جائے اور وہ انکار کر دے تو علما کے ایک قول کے مطابق اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا اور دوسرے قول میں نہیں، لیکن آدمی کو اپنی ذمے داری ادا کرتے رہنا چاہیے، ایسا نہیں جس کو طلاق دینی ضروری ہو جائے طلاق دیے بغیر ہی اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، بلکہ اس شخص سے کہا جائے گا تو اس کو نماز کا حکم دے یا اس کو علاحدہ کر دے، اگر وہ حق مہر بھاری ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا تو وہ اس اعتبار سے ایسی بے نماز عورت سے شادی کرنے کی وجہ سے غلط کام کر بیٹھا ہے، لہٰذا اس کو توبہ کرنی چاہیے اور یہ ارادہ رکھنا چاہیے کہ جب وہ اس سے زیادہ کچھ کرنے پر قادر ہوا تو ضرور ایسا کرے گا۔ واللہ أعلم [1]

بے نمازی کی دعوت قبول کرنے کا مسئلہ

سوال کیا بے نمازی کی دعوت قبول کرنا جائز ہے؟

جواب بے نمازی کی دعوت قبول کی جائے نہ اس کے سلام کا جواب دیا جائے، بلکہ وہ قتل کا مستحق ہے۔ اگر اس سے تعلق ختم کر لیا جائے، اور نہ اس کو سلام کہی جائے نہ اس کی دعوت ہی قبول کی جائے تو یہ اس کی بہت ہلکی سزا ہے۔ [2]

﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ سے غلط استدلال

سوال ایک آدمی کو نماز کا کہا گیا تو اس نے یہ آیت پڑھ دی: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ [النساء: ٤٣] اس کو آیت پوری پڑھنے کا کہا گیا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا: عقل مند کے لیے ایک کلمہ ہی کافی ہوتا ہے، اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ انسان اللہ کی آیات کو مذاق بنانے والا ہے۔ اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے۔ [3]

---

[1] جامع المسائل (١٤١/٤۔١٤٤)

[2] جامع المسائل (١٤٥/٤)

[3] جامع المسائل (١٤٥/٤)

نماز نہ پڑھنے والے اور صرف جمعہ پڑھنے والے کو لعنتی کہنا

سوال ایک مسلمان نماز نہیں پڑھتا، مگر جمعہ پڑھتا ہے، کیا اس پر لعنت بھیجنا ضروری ہے؟

جواب الحمد للہ، یہ شخص مسلمانوں کے اتفاق کے ساتھ سزا کا مستحق ہے۔ مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور علما کے نزدیک اس سے توبہ کروانا ضروری ہے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔[1] تارکِ نماز کو بالعموم لعنت کرنا جائز ہے، لیکن کسی مخصوص اور متعین شخص کو لعنت کرنے سے احتراز کرنا ہی زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ ممکن ہے وہ توبہ کر لے۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] امام صاحب پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں جلدی کرتے ہیں، حالانکہ ایسے نہیں، بلکہ فقہی ادبیات میں "یُستتاب وإلا یقتل" (توبہ کروائی جائے اور نہ کرنے کی صورت میں قتل کر دیا جائے) مسئلے کی سنگینی واضح کرنے کا ایک اسلوب ہے، جس سے اہلِ علم اچھی طرح واقف ہیں۔ (مترجم)

[2] مجموع الفتاویٰ (۶۳/۲۲)

اذان

اذان کا حکم اور کیفیت

سوال کیا اذان فرض ہے یا سنت؟ کیا ترجیع (دوہری اذان پڑھنا جس میں پہلے آہستہ آواز میں أشهد أن لا إله إلا الله، أشهد أن محمداً رسول الله پڑھا جاتا ہے، دوبارہ یہی کلمات بلند آواز سے کہے جاتے ہیں) مستحب ہے یا نہیں؟ کیا اللہ اکبر چار مرتبہ کہنا ہے یا دو مرتبہ (جس طرح امام مالک کا مذہب ہے)؟ نیز کیا اقامت دہری ہے یا اکہری؟ پھر "قد قامت الصلاۃ" دو مرتبہ کہنا ہے یا ایک مرتبہ؟ ان تمام امور کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب صحیح قول کے مطابق اذان فرضِ کفایہ ہے۔ کسی شہر کے باشندوں یا کسی بستی کے مکینوں کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اذان اور اقامت چھوڑ دیں۔ یہ امام احمد وغیرہ کا مشہور مذہب ہے۔

علما کے کچھ گروہ اس کو سنت کہتے ہیں، پھر ان میں کچھ علما ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اگر کسی شہر کے رہنے والے اذان ترک کر دیں تو ان سے قتال کیا جائے، تاہم ان کا یہ اختلاف محض لفظی نزاع ہے، کیونکہ اکثر علما ایسے کام کو سنت کہتے ہیں شریعت میں جسے ترک کرنے والے کی مذمت کی جاتی ہو اور وہ قابلِ سزا ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا اسے واجب کہنے والوں اور سنت کہنے والوں میں اختلاف محض لفظی ہے اور اس کی کئی نظائر اور مثالیں موجود ہیں۔

اذان دار الاسلام کا شعار:

لیکن جو اس معنی میں اس کو سنت کہتا ہو کہ اس کو ترک کرنے والا گناہ گار نہیں ہوتا، نہ کسی سزا کا مستحق ہی ہوتا ہے تو یہ بات غلط ہے، کیونکہ اذان دار الاسلام کا شعار اور علامت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی ملک پر حملہ کرنے کے جواز کے لیے اسی کو بنیاد بناتے تھے۔ آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھتے، پھر اذان کا انتظار کرتے۔ اگر وہاں کوئی اذان سنائی دیتی تو حملہ نہ کرتے، لیکن اگر اذان سنائی نہ دیتی تو پھر حملہ کر دیتے، یہ صحیح بخاری میں موجود ہے۔ سنن ابوداود اور نسائی میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر کسی بستی میں تین لوگ ہوں اور وہاں اذان ہوتی ہو نہ جماعت ہی کرائی جاتی ہو تو شیطان ان کے دل و دماغ پر قبضہ جما

لیتا ہے، تو جماعت سے وابستہ رہ، کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو۔‘‘[1] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المجادلة: ١٩]

’’شیطان ان پر غالب آ گیا، سو اس نے انھیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو! یقیناً شیطان کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہیں۔‘‘

اذان میں ترجیع اور الفاظ کا تنوع:

جہاں تک ترجیع کو اختیار کرنے اور ترک کرنے، پہلے اللہ اکبر دو مرتبہ یا چار مرتبہ کہنے اور دہری اذان یا اکہری اذان کہنے کا مسئلہ ہے تو یہ باتیں احادیث میں موجود ہیں۔ صحیح مسلم اور سنن میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے سال ان کو اذان سکھائی۔ یہ وہ اذان ہے جو وہ اور ان کی اولاد مکے میں دیتی رہی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان بھی سکھائی اور تکبیر بھی۔ اس اذان میں ’’ترجیع‘‘ ہے۔ پھر ان کی حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ تکبیر دو مرتبہ سکھائی۔[2] یہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے، لیکن سنن ابو داود وغیرہ میں یہ بھی مروی ہے کہ تکبیر چار مرتبہ سکھائی، انہی کی حدیث میں دہری اقامت کا ذکر ہے۔[3] دوسری طرف صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ’’جب لوگ زیادہ ہو گئے تو انھوں نے نماز کا وقت جاننے کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرنے کے لیے مذاکرہ کیا۔ ایک یہ بات ذکر کی گئی کہ آگ جلا لی جائے۔ دوسری یہ رائے پیش کی گئی کہ ناقوس (سینگ) بجا لیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دہری اذان اور اکہری تکبیر کہنے کا حکم دیا۔‘‘[4] سنن ابو داود وغیرہ میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان دکھائی گئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ یہ اذان حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سکھا دیں تو انھوں نے جو اذان حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بتائی اس میں ترجیع کے بغیر چار مرتبہ اللہ کا ذکر ہے۔

بنا بریں اہلِ حدیث اور ان کے ہم خیال علما کا مذہب درست ہے، جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ثابت ہے سب جائز ہے۔ ان کے نزدیک امور میں سے کوئی امر بھی مکروہ نہیں، جس طرح قراء ات اور التحیات کے الفاظ میں تنوع ہے، اسی طرح اذان اور اقامت کی کیفیت میں بھی تنوع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٤٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٧٠١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٨)

جو جو طریقے چھوڑے ہیں، کسی کو ان کو مکروہ کہنے کا اختیار نہیں۔

لیکن جو لوگ ان جیسے جائز امور میں اس حد تک اختلاف اور فرقے بندی میں چلے جاتے ہیں کہ اس کی بنیاد پر کسی سے محبت یا عداوت رکھتے ہیں اور لڑنے مارنے پر اتر آتے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جو دین میں فرقے بندی کو ہوا دے کر مختلف جماعتوں میں بٹ جاتے ہیں، جس طرح بعض مشرق کے رہنے والے لوگوں کا وتیرہ ہے۔ اس طرح کچھ ائمہ میں یہاں ان کا نام لینا نہیں چاہتا، ترجیع کو مکروہ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے نقل کرنے میں کوئی غلطی کی ہے۔ انھوں نے جو تکرار کا ذکر کیا ہے تو یہ صرف اپنے یاد کرنے کے لیے کیا تھا اور دوسرے حضرات دہری اقامت کو مکروہ کہتے ہیں، حالانکہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کی اذان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ (حنفی) ان کی اقامت اختیار کرتے ہیں اور ان کی اذان کو مکروہ کہتے ہیں۔ تو یہ دونوں اقوال ہی ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور درمیانی رائے یہ ہے کہ نہ یہ مکروہ ہے نہ وہ۔

اگرچہ امام احمد اور ائمہ حدیث حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اقامت کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اسی پر ہمیشگی کی۔ تو یہ ایسے ہی ہے جیسے بعض قراءتوں اور تشہد کے الفاظ کو اختیار کیا جاتا ہے۔ ان جیسے امور میں سنت پر مکمل عمل کرنے کی یہ صورت ہے کہ کبھی یہ کر لیا جائے کبھی دوسرا۔ ایک جگہ ایک کام کر لیا جائے اور دوسری جگہ دوسرا۔ کیونکہ جو امور سنت میں ذکر ہوئے ہوں ان کو چھوڑ کر کسی ایک کام پر ہمیشگی اختیار کر لینا بسا اوقات سنت کو بدعت اور مستحب کو واجب بنا دینے کا سبب بن جاتا ہے، بالخصوص جب دوسرے لوگ دوسری صورت پر عمل کو اپنی شناخت بنا لیں تو یہ کام فرقے بندی اور اختلاف کی راہ ہموار کرتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو ان کلی قواعد کا التزام کرنا چاہیے جو کتاب و سنت اور اہلِ سنت والجماعت کے دامن کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رکھتے ہیں، خاص طور پر نماز جیسے اہم مسئلے میں، ان امور میں بہترین طریقہ علمائے حدیث کا ہے جو سنت کو جانتے اور اس کی پیروی کرتے ہیں، کیونکہ ائمہ فقہ میں ایسے امام بھی ہیں جو ان امور میں ضعیف حدیث پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسے تھے جن کے ہاں وہ عمل ہی مستند دلیل تھا جو ان کے شہر میں رواج پذیر تھا۔ وہ اسی کو سنت کہتے تھے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امور میں وسعت دے رکھی ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ لوگوں نے اپنے اپنے شہر مثلاً کوفہ یا شام یا مدینہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور اقامت سنی تو اسی کو اختیار کر لیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت کم اذان دی۔ مدینے میں سعید قرظی اذان دیتے رہے جو اہلِ قبا کے موذن تھے۔

ائمہ اربعہ کا مذہب:

اذان میں ترجیع امام مالک اور امام شافعی کا مذہب ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک اللہ اکبر دو مرتبہ ہے جب

کہ امام شافعی کے نزدیک چار مرتبہ۔ ترکِ ترجیع امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔ امام احمد کے نزدیک دونوں عمل ہی سنت ہیں، تاہم ترکِ ترجیع زیادہ پسند ہے، کیونکہ یہ حضرت بلال کی اذان تھی۔ اکہری اقامت امام مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔ تاہم امام احمد دوہری اقامت کو بھی سنت ہی سمجھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ، شافعی اور احمد تینوں ہی "قد قامت الصلاۃ" کے تکرار کے قائل ہیں، لیکن امام مالک تکرار کے قائل نہیں۔ واللہ أعلم [1]

"الصلاۃ خیر من النوم" کہنے کی کیفیت

سوال موذن جب فجر کی اذان میں "الصلاۃُ خیرٌ مِنَ النَّوم" کہتا ہے تو کیا دائیں اور بائیں مڑنا چاہیے یا قبلہ رخ رہنا چاہیے؟ یا مشرق کی طرف منہ کرنا چاہیے، سنت کیا ہے؟

جواب یہ کلمات ادا کرتے وقت دائیں بائیں مڑنا کسی امام کے نزدیک بھی سنت نہیں، بلکہ سنت یہی ہے کہ جس طرح موذن دیگر کلمات کہتے وقت قبلہ رخ رہتا ہے اور اقامت میں "قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃ" کہتے وقت بھی قبلہ رخ ہی ہوتا ہے، ان کلمات کو کہتے وقت بھی قبلے کی طرف ہی منہ رکھے۔ علما نے اس سے صرف "حي علی الصلاۃ" اور "حي علی الفلاح" کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ان کلمات کو کہتے وقت موذن دائیں اور بائیں مڑتا ہے، ان دونوں کلمات کا مشرق کی طرف منہ کرنے کا کوئی جواز نہیں، بلکہ اذان اور اقامت میں کوئی ایسا کلمہ نہیں جسے ادا کرتے وقت بالذات مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا جاتا ہو، جو شخص "الصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ" کہتے وقت مشرق و مغرب کی طرف منہ کرتا ہے، اذان میں اس کا یہ عمل سنت سے خارج ہے اور بدعت ہے۔ اس پر علما کا اتفاق ہے۔ واللہ أعلم [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۶۴۔۶۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۷۰)

مواقیت

نمازِ فجر کا افضل وقت

سوال کیا فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھنا افضل ہے یا دن کر کے؟

جواب اگر کوئی ایسا سبب نہ ہو جو تاخیر کا باعث بنے تو نمازِ فجر اندھیرے میں پڑھنا ہی افضل ہے۔ صحیح اور مشہور احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر اندھیرے ہی میں ادا کرتے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھاتے۔ نماز میں اہلِ ایمان خواتین بھی چادریں اوڑھے ہوئے شرکت کرتیں، پھر وہ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتیں تو اندھیرے کی وجہ سے انھیں کوئی پہچان نہ پاتا۔''[1] مسجد نبوی میں کوئی قندیل نہیں تھی۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ''آپ ﷺ فجر کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیات تک کی تلاوت کیا کرتے اور اس سے جب فارغ ہوتے تو آدمی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کو پہچان لیتا۔''[2] یہ تلاوت تقریباً نصف پارہ یا ایک تہائی پارہ بنتی ہے اور آپ ﷺ نماز سے اس وقت فارغ ہوتے جب آدمی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیتا۔ صحیح بخاری میں ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''آپ ﷺ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھتے۔''

نماز تاخیر سے پڑھنے کی وجہ اور استدلال:

اسی طرح آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا کا عمل بھی یہی رہا، پھر آپ ﷺ کے بعد ایسے لوگ حکمران بنے جو نماز کو تاخیر سے پڑھتے تو ان کی حکومت میں ایسے فقہا پیدا ہوئے جنھوں نے ان کی یہ روش دیکھی تو سمجھ بیٹھے کہ فجر اور عصر کو پہلے پڑھنے سے تاخیر سے پڑھنا زیادہ بہتر ہے، لیکن یہ بات سنت کے مطابق غلط ہے۔

یہ لوگ جامع ترمذی کی اس حدیث کو دلیل بناتے ہیں جس میں یہ مذکور ہے:

«أَسفِرُوا بالفَجرِ، فانه أعْظَمُ لِلأجْرِ»[3] ''فجر کو دن کر کے پڑھو، اس کا اجر زیادہ ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٦١)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٨) صحيح الجامع (٩٧٠)

جواب امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث اگر پہلی حدیث کے مخالف بھی ہوتی تب بھی اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہوتی، کیونکہ وہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں ہے اور مشہور و مستفیض روایت ہے۔ جب خبر واحد مشہور و مستفیض عمل کی مخالفت کرے وہ شاذ ہوتی ہے یا منسوخ بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ تغلیس یعنی اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھنا رسول اللہ ﷺ کا دائمی عمل تھا اور آپ اپنی وفات تک اسی پر کاربند رہے، پھر آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفا بھی اسی کی پابندی کرتے رہے۔ امام ابو حنیفہ کے ماننے والوں میں سے امام طحاوی اور امام احمد کے ماننے والوں میں سے ابو حفص برمکی وغیرہ نے "أسفروا بالفجر" "فجر کو دن کر کے پڑھو" کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے یہ مراد ہے کہ جب تم نمازِ فجر سے فارغ ہو تو اس وقت دن ہو جانا چاہیے اور خوب روشنی ہو جانی چاہیے۔ مراد یہ ہے کہ فجر میں اتنی لمبی قراءت کرو کہ جب تم اس سے فارغ ہو تو خوب روشنی ہو چکی ہو۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ یہاں اسفار (خوب روشن کرنا) سے مراد تبیین و وضاحت ہے، یعنی جب فجر واضح ہو جائے اور اس کا اچھی طرح پتا چل جائے، پھر پڑھو، صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: میں نے دو نمازوں کے سوا کبھی رسول اللہ ﷺ کو نماز تاخیر سے پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، ایک مزدلفہ میں فجر کی نماز تھی اور دوسری عرفات میں مغرب کی نماز۔ اس دن آپ ﷺ نے فجر کی نماز طلوعِ فجر کے فوراً بعد پڑھی۔" صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں: « وصَلَّى صَلاةَ الْفَجْرِ حِيْنَ بَرِقَ الْفَجْرُ »[1] "آپ ﷺ نے اس وقت فجر کی نماز پڑھی جب فجر چمک اٹھی۔" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ عموماً فجر کے طلوع کے فوراً بعد نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ تھوڑا انتظار کرتے، تاکہ فجر اچھی طرح واضح ہو جائے، لیکن اس دن آپ ﷺ نے اسے بہت جلد پڑھ لیا۔

کسی جائز سبب کی وجہ سے تاخیر:

اگر اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا جائے تو احادیث میں کوئی تضاد نہیں رہتا۔ لیکن اگر کوئی انسان کسی ایسے سبب کی وجہ سے تاخیر کرے جو تاخیر کا باعث ہو، مثلاً اگر کسی انسان نے تیمم کرنا ہو تو وہ اس وجہ سے تاخیر کرتا ہے کہ آخر وقت میں پانی مل جانے پر وضو کر کے نماز پڑھ لے۔ اگر کوئی آدمی اکیلا ہو تو وہ اس لیے تاخیر کرتا ہے کہ شاید آخر وقت تک اس کو جماعت مل جائے تو وہ اکیلا پڑھنے کے بجائے جماعت کے ساتھ پڑھ لے۔ یا اگر کوئی شخص اول وقت میں کسی وجہ سے قیام نہ کر سکتا ہو اور اس کو امید ہو کہ وہ نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے قیام کے قابل ہو جائے گا تو

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٢٤٩) میں اسے صحیح کہا ہے۔

وہ اس امید پر تاخیر کرتا ہے، یعنی اس طرح کے وہ کام جن میں اول وقت میں نماز پڑھنے کی نسبت تاخیر کے ساتھ پڑھنے میں زیادہ فضیلت ہو تو ایسے انسان کے لیے تاخیر افضل ہے۔ واللہ أعلم [1]

صبح روشن کر کے نمازِ فجر پڑھنے کا مفہوم

سوال اس حدیث: «أَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلْأَجْرِ» ''صبح روشن کر کے فجر کی نماز پڑھو، اس کا اجر زیادہ ہے۔'' کا کیا مفہوم اور حکم ہے؟

جواب یہ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ: «أَسْفِرُوْا بِالْفَجْرِ، فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلْأَجْرِ» [2] صحیح حدیث ہے، لیکن آپ ﷺ سے فجر اندھیرے میں پڑھنا ہی مشہور ہے۔ اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ باپردہ مسلمان خواتین جب نماز پڑھ کر واپس جاتیں تو اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتیں، اس لیے حدیث کی تشریح دو طرح کی گئی ہے:

1. اسفار (روشن کرنا) سے مراد نماز سے نکلنا ہے، یعنی اتنی طویل قراءت کرو کہ جب نماز پڑھ کر نکلو تو صبح روشن ہو۔ نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر میں ساٹھ سے لے کر سو آیات تک پڑھا کرتے تھے جو تقریباً نصف حزب بنتا ہے۔
2. اس سے مراد فجر کا واضح اور ظاہر ہونا ہے، یعنی غالب گمان کو بنیاد بنا کر نماز نہ پڑھی جائے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ (فجر) واضح ہو جانے کے بعد نماز پڑھا کرتے تھے۔ صرف مزدلفہ کے دن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس دن آپ ﷺ نے اس کو اپنی عادت سے پہلے پڑھا تھا۔ واللہ أعلم [3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۹۵-۹۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٨) صحيح الجامع (٩٧٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۹۷)

قضا نماز

توبہ کی قبولیت اور فرائض کی قضا کا مسئلہ

سوال ایک شخص نے اعتقادات اور اعمال میں بہت زیادہ کوتاہی کی، کیا اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا؟ نیز کیا توبہ کی صورت میں ان فرائض کی قضا ساقط ہو جائے گی، جن میں وہ کوتاہی کرتا رہا، اسی طرح رمضان میں دن کے وقت کھانے پینے اور جماع کرنے کی وجہ سے عائد ہونے والے کفارے بھی ساقط ہو جائیں گے یا باقی رہیں گے؟ مزید یہ کہ اس کو چھوڑی ہوئی نمازوں کی تعداد بھی معلوم نہیں۔

جواب ہاں اللہ اس کی توبہ اور ہر تائب کی توبہ قبول کرتے ہیں اور ہر تائب کا وہ گناہ معاف کر دیتے ہیں جس سے وہ توبہ کر لیتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ [الزمر: ۵۳]

"کہہ دے اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔ بے شک وہی تو بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔"

البتہ اس نے جو نمازیں اور روزے چھوڑے ہیں، اگر باطنی ارتداد کی وجہ سے تھے، یعنی وہ ان کے وجوب کا منکر تھا یا اس کو ان کے وجوب میں یا رسول کی رسالت میں شک تھا، تو اس صورت میں اس شخص پر جمہور فقہا یعنی مالک، ابوحنیفہ اور احمد کے ظاہر مذہب میں قضا نہیں۔

اگر اس کا ارتداد ظاہری تھا تو جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے دور اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مرتد ہوئے تھے، جب دوبارہ مسلمان ہوئے تو عبداللہ بن سعد بن ابوسرح وغیرہ جیسے کسی کو زمانۂ ارتداد میں چھوڑے گئے فرائض قضا دینے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

بنابریں اگر یہ باطنی طور پر مرتد تھا اور اس نے کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تو زیادہ سے زیادہ آپ اس کو منافق کہہ سکتے ہیں، جس نے توبہ کی اور مومن بن گیا، کیوں کہ جو منافق توبہ کر لیتے تھے، ان کو بھی منافقت کی

حالت میں چھوڑے گئے فرائض کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔

اس کی دلیل یہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾ [الأنفال: ٣٨]

''ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا۔''

پھر اہلِ اسلام کا اجماع ہے جو دین میں بالضرورۃ اور بداہتاً معلوم ہے کہ کوئی اصلی کافر جب مسلمان ہو تو اس پر حالتِ کفر میں چھوڑی گئی نمازوں، روزوں اور زکاتوں وغیرہ کی قضا دینا لازمی نہیں ہوتا، خواہ یہ کہا جائے کہ شریعت کی فروع اور احکام میں کافر بھی مخاطب و مکلّف ہیں یا یہ کہا جائے کہ وہ ان کے مخاطب و مکلّف نہیں۔ اس اختلاف کا اثر تو ظاہر ہے، آخرت ہی میں کھلے گا مگر دنیا میں حالتِ کفر میں ان کی یہ عبادات نہ صحیح ہوتی ہیں اور نہ انھیں اسلام کے بعد ان کی قضا دینے کا ہی کہا جاتا ہے۔

جو شخص نماز روزے وغیرہ کی فرضیت سے لاعلمی کی وجہ سے کچھ نمازیں یا کچھ ارکان چھوڑ چکا ہے اس پر علما کے دو اقوال میں سے راجح قول کے مطابق قضا نہیں اور امام احمد کے مذہب میں بھی ایک یہی رائے ہے۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مستحاضہ کو استحاضہ کے دوران میں چھوڑی گئی نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا۔

اسی طرح حضرت عمر اور عمار رضی اللہ عنہما نے جنابت کی وجہ سے جو نماز نہ پڑھی، آپ ﷺ نے ان کو اس کی قضا دینے کا حکم بھی نہیں دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز نہیں پڑھی تھی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جانور کی طرح مٹی میں لوٹ لگائی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ جنابت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو بھی ان نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔ پھر جو صحابہ کالے دھاگے سے سفید دھاگے کے واضح ہونے تک کھاتے رہتے، آپ ﷺ نے ان کو بھی ان روزوں کی قضا دینے کا نہیں کہا تھا۔

اس طرح کے معاملات میں آپ ﷺ ان کو ازسرِ نو عمل کرنے کا حکم دیتے تھے اور جو کام وہ وجوب سے ناواقفیت کی وجہ سے چھوڑ دیتے، اس کی قضا نہیں دیتے تھے، کیوں کہ مکلّف کے حق میں حکمِ خطاب، خطاب پہنچنے کے بعد ثابت ہوتا ہے۔ مگر جو شخص وجوب کا علم رکھنے کے باوجود جان بوجھ کر نماز اور روزہ گزار دیتا ہے، کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے، اس سے اس وقت تک سزا ساقط نہیں ہوتی، جب تک توبہ نہ کر لے، چاہے قضا بھی دے لے، لیکن کیا اس سے گناہ یا سزا میں تخفیف کی جائے گی؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ یہاں اس کو قضا نہیں توبہ ہی فائدہ پہنچائے گی۔ اگر توبہ کرے گا تو اللہ بھی اس پر مہربانی کرے گا، جس طرح کوئی بھی انسان زنا، چوری اور شراب نوشی جیسے تمام کبیرہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے۔ اسی طرح جو شخص جمعہ وغیرہ جیسے اعمال چھوڑنے سے

توبہ کرتا ہے جن کو صرف ان کے وقت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں شرعی دلائل میں مکمل مطابقت ہے کہ ایسی عبادات جو وقت کے ساتھ مربوط ہوں، جب ہی قبول ہوتی ہے، جب بندہ ان کو ان کے مقررہ وقت میں ادا کرتا ہے۔ جو انسان رمضان میں دن کے وقت جماع کے حرام ہونے کا علم رکھتا ہے اگر جماع کر بیٹھتا ہے تو اس پر رسول اللہ ﷺ کا بیان کردہ کفارہ لاگو ہوتا ہے جو غلام آزاد کرنا، نہ ہونے کی صورت میں مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا اور روزوں کی عدمِ استطاعت میں سات مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔[1] واللہ أعلم[2]

زندگی میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کا مسئلہ

سوال اہلِ قبلہ میں سے ایک آدمی نے دو سال تک نماز چھوڑے رکھی، پھر توبہ کی اور پابندی سے نماز ادا کرنے لگا، کیا اس کے لیے گذشتہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا دینا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب جو نماز یا نماز کا کوئی فرض چھوڑتا ہے یا تو اس نے اس کے فرض ہونے کا علم ہونے کے بعد بھول کر اسے چھوڑا، یا وہ اس کے فرض ہونے سے لاعلم ہوگا یا کسی ایسے عذر کی بنا پر چھوڑا ہوگا جس کے ہوتے ہوئے وہ تاخیر کے جواز کا قائل ہوگا یا اس نے علم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر چھوڑا۔

جو بھول کر نماز چھوڑتا ہے، اس کو جب یاد آ جائے وہ اسی وقت پڑھ لے، اس پر ائمہ کا اتفاق بھی ہے اور اس کی دلیل یہ مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو نماز سے سو گیا یا اسے بھول گیا اس کو جب یاد آئے پڑھ لے، اس کا کفارہ صرف یہی ہے۔''[3]

صحیح وغیرہ میں یہ مشہور واقعہ بھی مروی ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ سمیت سوئے رہے اور نمازِ فجر نکل گئی۔ انھوں نے طلوعِ آفتاب کے بعد اذان اور اقامت کے ساتھ سنتیں اور فرض ادا کیے۔[4]

اسی طرح جو طہارتِ حدث یعنی وضو کرنا بھول جائے اور بھول کر نماز پڑھ لے وہ وضو کر کے نماز دہرائے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

حتی کہ اگر بھولنے والا امام ہو تو وہ نماز دہرائے گا، مگر مقتدی مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور علما کے نزدیک علم ہونے پر دہرانے کے پابند نہیں۔ جس طرح حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ اس طرح کا واقعہ ہوا تھا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١١)
[2] جامع المسائل (٩/٢٢٤_٢٢٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠، ٦٨١)

جو طہارتِ خبث، یعنی گندگی دھونا بھول جائے تو امام مالک، امام احمد سے صحیح تر روایت اور شافعی کے ایک قول میں اس کے لیے اعادہ لازم نہیں، کیوں کہ یہ منہی عنہ یعنی منع کردہ امور کے باب سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ترکِ مامور یعنی جس کا حکم ہے، اسے ترک کرنے کے باب سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا جو منع کردہ کام بھول کر کرے تو کتاب وسنت کی روشنی میں اس پر کوئی گناہ نہیں، جس طرح رمضان میں بھول کر کھانے والے کے متعلق سنت میں ذکر ہوا ہے۔ یہ ابوحنیفہ، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔ نماز میں بھول کر بات کرنے والے اور (حالتِ احرام میں) بھول کر خوش بو لگانے اور کپڑے پہننے والے کو بھی اس پر قیاس کیا گیا ہے۔ یہ شافعی اور ایک روایت میں احمد کا مذہب بھی ہے۔ یہاں کچھ مسائل میں علما نے اختلاف کیا ہے، مثلاً جو پانی گھر یا سواری پر بھول آئے اور تیمّم کر کے نماز پڑھے، تاہم یہ ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔

جو انسان نماز کی فرضیت سے لاعلمی کی وجہ سے نماز چھوڑتا ہے، مثلاً کوئی دارحرب میں مسلمان ہو اور اس کو نماز کی فرضیت کا علم نہ ہو، اس مسئلے میں فقہا کے تین اقوال ہیں اور امام احمد کے مذہب میں دو وجوہ ہیں:

(1) اس پر مطلقاً دہرانا لازم ہے۔ یہ شافعی کا قول ہے اور مذہبِ احمد میں ایک پہلو ہے۔

(2) اگر دار الاسلام میں چھوڑی ہوں، دارِحرب میں نہیں تو پھر دہرانا ضروری ہے۔ یہ ابوحنیفہ کا مذہب ہے، کیوں کہ دارِحرب دارِ جہالت ہے دار الاسلام کے عکس۔ اس میں وہ معذور ہے۔

(3) مطلقاً اعادہ نہیں، یا امام احمد وغیرہ کے مذہب میں دوسرا پہلو ہے۔

ان دونوں آرا کی اصل یہ نقطہ ہے کہ آیا مکلّف کے حق میں شارع کا حکم اس تک اس کا خطاب (کلام) پہنچنے سے پہلے ثابت ہوتا ہے؟ امام احمد وغیرہ کے مذہب میں اس باب میں تین اقوال ہیں:

(1) مطلقاً ثابت ہوتا ہے۔

(2) مطلقاً ثابت نہیں ہوتا۔

(3) ابتدائی خطاب کا حکم ثابت ہے، ناسخ خطاب کا نہیں، مثلاً: اہلِ قبا کا مسئلہ۔ وکیل کو جب معزول کر دیا جائے تو اس کے متعلق مشہور اختلاف کہ کیا علم ہونے سے پہلے اس کے حق میں معزولی کا حکم ثابت ہوتا ہے؟

اس بنیاد پر اگر کوئی نص (آیت یا حدیث) کے نہ پہنچنے کی وجہ سے واجب طہارت چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اس نے اونٹ کا گوشت کھایا اور وضو نہیں کیا، بعد میں اس کو حدیث پہنچی اور اس کے لیے اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو کا واجب ہونا واضح ہوا۔ یا اس نے اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھی، پھر بعد میں اس تک ممانعت کی نص پہنچی تو کیا وہ گذشتہ نماز دہرائے گا؟ اس میں دو اقوال ہیں اور وہ دونوں امام احمد سے مروی ہیں۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ کوئی شخص آلۂ تناسل کو مس کرنے کے بعد نماز پڑھے، پھر بعد میں اس کو علم ہو کہ آلۂ تناسل کو چھونے سے وضو ضروری ہو

جاتا ہے۔ ان تمام مسائل میں صحیح رائے کے مطابق دہرانا لازمی نہیں، کیوں کہ اللہ نے خطا اور بھول چوک سے درگزر کیا ہے، نیز فرمایا ہے:

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٥]

''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

لہٰذا جس تک کسی مخصوص چیز میں رسول اللہ ﷺ کا حکم نہیں پہنچتا اس پر اس کے واجب ہونے کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک مرتبہ حضرت عمر اور عمار رضی اللہ عنہما جنبی ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز نہ پڑھی، مگر حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مٹی میں لوٹ پوٹ ہو کر نماز پڑھ لی، آپ ﷺ نے کسی کو بھی نماز دہرانے کا حکم نہ دیا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بھی دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا، جب انھوں نے جنابت کی وجہ سے کئی روز تک نماز نہ پڑھی۔ جس صحابی کے لیے سفید دھاگا کالے دھاگے سے واضح نہ ہوا اور وہ کھاتا رہا آپ ﷺ نے اس کو روزے کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔ پھر جو منسوخی قبلہ کا حکم معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، آپ ﷺ نے ان کو بھی ان نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔

اسی باب سے ''مستحاضہ'' کا معاملہ بھی ہے، جو کچھ دنوں تک یہ سمجھتے ہوئے نماز نہ پڑھے کہ اس پر نماز فرض نہیں، اس پر قضا دینے کے واجب ہونے میں دو اقوال ہیں:

(1) اس پر اعادہ نہیں، یہ مالک وغیرہ سے منقول ہے، کیوں کہ جس مستحاضہ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کہا تھا کہ مجھے حیض کا خون اتنی کثرت سے اور شدت سے آتا ہے کہ وہ مجھے نماز اور روزے سے روک دیتا ہے،[1] آپ ﷺ نے اس کو جو حکم دیا تھا وہ مستقبل کے حوالے سے تھا، ماضی کی نمازوں کو دہرانے کا حکم نہیں دیا تھا۔

میرے ہاں یہ تواتر سے ثابت ہے کہ دیہات وغیرہ میں رہنے والے بہت سے بالغ مرد اور عورتیں ایسی ہیں، جنھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ نماز ان پر فرض ہے، بلکہ جب عورت سے کہا جائے: نماز پڑھ! وہ کہتی ہے: جب بڑی اور بوڑھی ہو جاؤں گی تب پڑھوں گی۔ یہ سمجھتی ہے کہ نماز کا حکم بڑی عمر کی عورت، یعنی بڑھیا وغیرہا کو ہے۔ اسی طرح بہت سے پیروں کو ماننے والے ایسے افراد ہیں جو نماز کی فرضیت سے لاعلم ہیں۔ ایسے لوگوں پر صحیح رائے کے مطابق نمازوں کی قضا دینا لازم نہیں، خواہ انھیں کافر کہا جائے یا لاعلمی کی بنا پر معذور۔

اسی طرح جو منافق اور زندیق ہو، بظاہر مسلمان ہو مگر بباطن اسلام مخالف، وہ نماز نہیں پڑھتا یا کبھی پڑھتا بھی ہے تو وضو کے بغیر یا نماز کے وجوب کا قائل نہیں۔ یہ اگر اپنے نفاق سے توبہ کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو جمہور علما کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٣٣)

نزدیک اس پر بھی قضا دینا لازم نہیں۔ وہ مرتد جو نماز کے وجوب کا قائل تھا، پھر مرتد ہو گیا، پھر دوبارہ مسلمان ہو گیا تو جمہور علما (یعنی مالک، ابو حنیفہ اور احمد کے ظاہر مذہب میں) کے نزدیک اس نے ارتداد کی حالت میں جو نمازیں چھوڑیں تھیں، ان کی قضا نہیں۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح جیسے لوگ جو عہدِ رسالت میں مرتد ہوئے اور ایک مدت تک کفر پر رہے، پھر مسلمان ہو گئے، ان کو کسی نے ان نمازوں کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا جو انھوں نے چھوڑیں، اسی طرح عہدِ صدیقی کے مرتدوں کو بھی نماز وغیرہ کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

۲ البتہ جو نماز کے وجوب کا علم رکھتا ہو اور کسی تاویل کے بغیر نماز چھوڑ دے یہاں تک کہ اس نماز کا مقررہ وقت نکل جائے، ائمہ اربعہ کے نزدیک اس پر اس نماز کی قضا دینا فرض ہے۔ ابن حزم وغیرہ کی رائے میں وقت نکل جانے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے اسے پڑھنا درست نہیں۔ جو جان بوجھ کر روزہ چھوڑتا ہے اس سے متعلق بھی ان کی یہی رائے ہے۔ واللہ أعلم [1]

ماضی کی نمازوں کی قضا کا حکم

سوال ایک آدمی پر ایسا وقت گزرا جس میں اس نے کوئی نماز نہ پڑھی، پھر توبہ کی اور باقاعدگی سے پانچوں نمازیں پڑھنا شروع کر دیں، لیکن اس کے پاس ان قضا نمازوں کو پڑھنے کی فرصت نہیں، کیا اس حالت میں اللہ تعالیٰ اس سے ان قضا نمازوں کو پڑھنے کا مطالبہ کرے گا یا نہیں؟

جواب الحمد لله. اگر وہ پہلے ایسے لوگوں میں سے تھا جو نماز کی فرضیت کے قائل تو نہیں، لیکن پڑھنے کا عزم رکھتے ہیں، یہ باطن میں مومن نہیں گو ظاہر میں مسلمان تھا، جیسے منافقین ہوتے ہیں، ان پر اسلام کے ظاہری احکام نافذ ہوتے ہیں، مگر وہ آخرت میں جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔ اگر وہ باطن میں رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنے والا نہ ہو، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا معترف بھی ہو سکتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی تصدیق وتکذیب سے اعراض کرتا ہو، وہ اس کے باوجود رسولوں کی پیش کردہ شریعت سے اعراض کرنے والا ہے، اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ نماز فرض ہے یا فرض نہیں، کیا اس پر اسے پڑھنا لازم ہے یا لازم نہیں؟ اگر اس کے دل میں اس کا خیال آئے تو اس سے منہ موڑ لے اور فرضیتِ نماز کا عقیدہ رکھنے اور اس کو پڑھنے کا عزم کرنے سے صرفِ نظر کر کے دنیاوی کاموں اور خواہشات میں مصروف ہو جائے تو ایسے لوگ اگر نماز پڑھیں بھی تو ان کی نماز قبول نہیں ہوتی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۹۸۔۱۰۳)

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [النساء: ١٤٢]

''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔''

فرمایا:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧ ﴾ [الماعون: ٤۔٧]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔ اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں۔''

اس انسان نے جب توبہ کر لی، نماز کی فرضیت کا قائل ہو گیا، نماز پڑھنے کا عزم کر لیا اور اس کو قائم کرنا شروع کر دیا تو یہ زکات نہ دینے سے توبہ کرنے والے کے قائم مقام ہوگا، ایسے انسان پر اکثر علما اور صحیح تر قول کے مطابق اسلام سے پہلے چھوڑی گئی کسی چیز کی قضا نہیں، وہ نماز ہو یا کوئی اور حکم۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ توبہ کرنے والے منافقوں کو کسی ایسے کام کے اعادے کا حکم نہیں دیتے تھے جو انھوں نے اپنے نفاق کی حالت میں کیا یا چھوڑا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کسی توبہ کرنے والے مرتد کو بھی حالتِ ارتداد میں چھوڑے گئے اعمال کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا۔ بعینہٖ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب مرتدوں سے جنگ کی تو ان کو حالتِ ارتداد میں چھوڑے گئے اعمال کی قضا دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے، امام احمد کے ظاہر مذہب میں مرتد جب مسلمان ہو جائے تو اس پر حالتِ ارتداد میں چھوڑے گئے اعمال کی قضا دینا فرض ہے، اس میں امام احمد سے دو روایات منقول ہیں۔ ابو حنیفہ اور مالک کے مذہب میں اس پر ان میں سے کسی چیز کی قضا لازم نہیں، امام شافعی کے مذہب میں وہ سب کی قضا دے گا۔ ان کے اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ کیا ارتداد مطلقاً انسان کے اعمال ضائع کر دیتا ہے یا اس کے لیے حالتِ ارتداد میں مرنا شرط ہے۔

یہاں اس اساس اور ان مسائل کی تقریر کی بحث کا موقع نہیں۔ جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے معروف سنت سے اس کا حکم معلوم ہو چکا ہے اور یہی قرآن کا کہنا بھی ہے:

﴿ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ﴾ [الأنفال: ٣٨]

''ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا۔''

اس پر اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ کافر ذمی ہو یا حربی نماز نہیں پڑھتا اور اس پر ان فرائض میں کسی فرض کی قضا بھی واجب نہیں اور اس کے ساتھ جمہور کا یہ قول بھی ہے کہ اگر وہ مسلمان نہیں ہوتا تو ان کے ترک پر آخرت میں سزا پائے گا۔

یہ شخص جس نے کچھ نمازیں جان بوجھ کر چھوڑ دی ہیں، اگر مومن ہے، ان کی فرضیت کا قائل ہے اور ادا کرنے کا عزم رکھتا ہے مگر بعض اوقات سستی کر جاتا ہے۔ اس انسان پر جمہور کے نزدیک قضا دینا واجب ہے اور بعض کے نزدیک اگر توبہ کرے تو اس پر قضا واجب نہیں، لیکن جو سو جانے یا بھول جانے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ پاتا اس پر سنت اور اجماع کی دلیل سے قضا دینا واجب ہے۔ جس کا کہنا ہے کہ عمداً چھوڑنے والے پر قضا نہیں، کیوں کہ اس کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ قضا بھی اس کو فائدہ نہیں پہنچاتی، لیکن جب توبہ کر لے تو توبہ سابقہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، جن علما نے اس انسان پر قضا دینا واجب قرار دیا ہے انھوں نے حسبِ امکان واجب قرار دیا ہے۔ اکثر کا کہنا ہے جب چھوٹی ہوئی نمازیں بہت زیادہ ہوں تو فی الفور اور ترتیب کے ساتھ ان کی قضا دینا ضروری نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ، ایک روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔ امام شافعی کے اصحاب، دو وجوہ میں سے صحیح تر وجہ کے مطابق جان بوجھ کر چھوڑی جانے والی نمازوں کی قضا فی الفور دینا ضروری قرار دیتے ہیں۔ امام احمد نے دوسری روایت میں تمام نمازوں کی قضا فی الفور اور ترتیب وار دینا ضروری قرار دیا ہے، لیکن حسبِ امکان کہ جس سے معیشت وغیرہ جیسے ضروری کام متاثر نہ ہوں اور کسی واجب میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

وہ بہت زیادہ چھوٹی ہوئی نمازیں جن کی قضا فی الفور ترتیب وار ضروری نہیں، ان کی مقدار کیا ہے؟ امام ابو حنیفہ اور مالک کے مذہب میں ایک دن اور ایک رات کی نمازیں، امام احمد سے منقول قول کے مطابق جن کو ادا کرنا موجودہ نماز کو چھوڑے بنا ممکن نہ ہو۔

اس توبہ کرنے والے کو چاہیے کہ باقی عمر نماز پابندی سے پڑھے۔ اگر چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا دینے میں کوئی کوتاہی کرے تو کثرت سے نوافل پڑھے، کیوں کہ قیامت کے دن پہلے نماز کا حساب ہوگا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ صَلَاتُهُ، فَإِنْ كَانَ أَتَمَّهَا كُتِبَتْ تَامَّةً، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ أَتَمَّهَا، قَالَ اللّٰه: اُنْظُرُوا هَلْ تَجِدُوْنَ لِعَبْدِيْ مِنْ تَطَوُّعٍ فَتُكْمِلُوْنَ بِهِ فَرِيْضَتَهُ، ثُمَّ الزَّكَاةُ كَذٰلِكَ، ثُمَّ تُؤْخَذُ الْأَعْمَالُ عَلَىٰ حَسْبِ ذٰلِكَ »[1]

''سب سے پہلے بندے کا حساب نماز سے ہوگا، اگر اس نے پوری پڑھی ہوں گی تو پوری لکھ دی جائیں گی، اگر پوری نہ کی ہوں گی تو اللہ کہیں گے: دیکھو کیا تم میرے بندے کے لیے کوئی نفل پاتے ہو تو اس کے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦٥، ٨٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٥، ٤٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٢٥، ١٤٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٧٤)

ساتھ اس کے فرض کو مکمل کرو، پھر اسی طرح زکات کا حساب ہوگا، پھر اس کے مطابق اعمال لیے جائیں گے۔"

اگر فرض کیا جائے کہ یہ انسان قضا دینے سے عاجز رہا اور توبہ کرنے کے بعد بھی موت تک قضا کے لیے وقت نہ نکال سکا تو اللہ اس کو بخش دے گا۔ولا حول ولا قوة إلا بالله۔ اسی طرح اگر کچھ کی قضا دے دی اور کچھ سے عاجز رہا اور عاجز ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر وہ قضا دینے میں مشغول ہو جائے تو کاروبار، اہل و عیال کی ضروریات اور قرض اتارنے وغیرہ جیسے ضروری امور متاثر ہو سکتے ہیں، لہٰذا وہ قضا کو اس تسلسل سے سرانجام نہ دے جس سے ضروری امور میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، اس پر علما کا اتفاق ہے۔ والله أعلم [1]

پہلے قضا شدہ نماز پڑھی جائے یا حاضر؟

سوال ایک آدمی سے عصر کی نماز چھوٹ جاتی ہے، وہ مغرب کے وقت مسجد میں آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مغرب کی نماز ادا کی جا رہی ہے تو کیا وہ پہلے عصر کی چھوٹی ہوئی نماز پڑھے یا امام کے ساتھ مغرب کی پڑھے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. وہ امام کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھے، پھر عصر کی نماز پڑھے۔ اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ لیکن کیا وہ مغرب کی نماز دوبارہ پڑھے، اس میں دو اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ نمازِ مغرب دہرائے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مغرب کی نماز دوبارہ نہ پڑھے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عباس، امام شافعی اور امام احمد کا دوسرا قول ہے اور صحیح یہی دوسرا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندے پر ایک ہی نماز دو مرتبہ پڑھنا فرض نہیں کی، جب وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ سے ڈرتا ہے اور کوتاہی سے بچتا ہے۔ والله أعلم [2]

پہلے حاضر نماز پڑھی جائے یا قضا؟

سوال ایک آدمی کی عصر کی نماز چھوٹ گئی، وہ مسجد میں آیا، جہاں مغرب کی نماز ہو رہی تھی، کیا وہ پہلے چھوٹی ہوئی نماز پڑھے یا نہیں؟

جواب بلکہ وہ امام کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھے، پھر عصر کی نماز پڑھے، اس پر ائمہ کا اتفاق ہے، لیکن کیا وہ مغرب کو دوبارہ پڑھے گا؟ اس میں دو اقوال ہیں: ایک یہ ہے کہ دوبارہ پڑھے، یہ عبداللہ بن عمر، مالک، ابو حنیفہ اور احمد کا مشہور قول ہے۔ دوسرا قول ہے: مغرب دوبارہ نہ پڑھے، یہ عبداللہ بن عباس، شافعی کا مذہب اور امام احمد کا دوسرا قول ہے۔ دوسرا قول ہی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اللہ نے بندے پر ایک دن میں دو مرتبہ مغرب کی نماز پڑھنا فرض نہیں کی، اگر وہ اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کرتا ہے۔ والله أعلم [3]

---

[1] جامع المسائل (٤/١٠٧-١١٠) [2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/ ١٠٦) [3] جامع المسائل (٤/٣٣٨)

قضا شدہ نمازوں کی سنتوں کا حکم

سوال ایک آدمی سے بہت سی نمازیں چھوٹ چکی ہیں، جب وہ ان کی قضا دے گا تو ان کی سنتیں بھی پڑھے گا یا صرف فرض ہی پڑھے گا؟ نیز کیا قضا دن یا رات میں کسی بھی وقت دی جا سکتی ہے؟

جواب اگر بہت سی نمازیں چھوٹ چکی ہوں تو ان کی قضا دینے میں جلدی کرنا نوافل میں مصروف رہنے سے زیادہ مناسب ہے، لیکن اگر چھوٹی ہوئی نمازیں تھوڑی ہوں تو پھر ان کے ساتھ سنتوں کی قضا دینا بھی بہتر ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام سوئے رہے اور فجر کی نماز چھوٹ گئی تو انھوں نے سنت اور فرض دونوں کی قضا دی تھی، لیکن جب خندق کے موقع پر آپ سے نماز چھوٹی تھی، اس وقت آپ نے صرف فرائض کی قضا دی تھی، سنتوں کی نہیں۔ جو فرض نمازیں چھوٹ چکی ہوں، تمام اوقات میں ان کی قضا دی جا سکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُصَلِّ إِلَيْهَا أُخْرَى» [1] ''جو سورج طلوع ہونے سے پہلے فجر کی ایک رکعت پا لے تو اس کے ساتھ دوسری بھی پڑھ لے۔'' واللہ أعلم [2]

دورانِ خطبہ جمعہ قضا شدہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال ایک آدمی جمعے کے دن مسجد میں آتا ہے اور خطیب خطبہ دے رہا ہوتا ہے، وہ مسجد میں بیٹھ جاتا ہے کہ اس کو یاد آتا ہے کہ اس کی کوئی نماز چھوٹی ہوئی ہے اور وہ اسی وقت اس کی قضا دے دیتا ہے، کیا اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. جب انسان کو یاد آئے کہ اس کی کوئی نماز رہتی ہے اور وہ خطبہ سن رہا ہو تو وہ اسی وقت اس کی قضا دے، اگر اس کے لیے قضا دینا اور جمعے کو پا لینا ممکن ہو، بلکہ یہ جمہور علما کے نزدیک واجب ہے، کیونکہ خطبے کے دوران میں نماز سے ممانعت فرض نماز کی قضا دینے میں ممانعت نہیں، بلکہ وہ ممانعت تحیۃ المسجد کی دو رکعات کو بھی شامل نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب آدمی مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعات پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔ [3] نیز ممنوع وقت میں قضا پڑھنا ثابت ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے فجر کی ایک رکعت پا لیتا ہے وہ فجر پا لیتا ہے۔'' [4]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٠٧)

[2] مجموع الفتاویٰ (١٠٤/٢٢)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٨٨٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٧٥)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٠٧)

البتہ اس بات میں علما کا اختلاف ہے کہ اگر اس کو اس وقت یاد آئے جب جمعہ کی نماز کھڑی ہو رہی ہو کہ اس کی کوئی نماز رہتی ہے تو اس وقت کیا وہ پہلے اس کی قضا دے، چاہے جمعہ جاتا رہے؟ جس طرح امام ابو حنیفہ کا کہنا ہے یا پہلے جمعہ پڑھے بعد میں قضا نماز پڑھے، جس طرح امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا قول ہے؟ پھر کیا وہ بعد میں جمعے کی نماز ظہر کے طور پر دوبارہ پڑھے؟ اس میں بھی امام احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں۔

اختلاف کا سبب:

اس مسئلے کی اصل اور بنیاد یہ ہے کہ قلیل تعداد میں چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا دیتے وقت ترتیب ملحوظ رکھنا واجب ہے، یہ جمہور ائمہ جیسے کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد کا موقف ہے، بلکہ امام احمد سے ایک روایت کے مطابق یہ تھوڑی یا زیادہ ساری نمازوں میں فرض ہے۔ اب تھوڑی نمازوں کی کیا حد ہے۔ اس میں بھی ان کا اختلاف ہے۔ اسی طرح ان تمام کے نزدیک ان قضا نمازوں کو فوراً پڑھنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح امام شافعی کے نزدیک بھی جب وہ جان بوجھ کر انھیں چھوڑ دے۔ جمہور کے ہاں بھول کر چھوڑنے والے کے عکس جمہور کی دلیل یہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جو نماز سے سویا رہے یا اس کو پڑھنا بھول جائے تو جب اس کو یاد آئے تو وہ اس کو پڑھ لے، اس کا یہی کفارہ ہے۔" دوسری حدیث میں ہے کہ "یہی اس کا وقت ہے۔"[1]

جو علما ترتیب کو واجب قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک کیا یہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں جو امام احمد سے مروی ہیں، لیکن ان کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا قول ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ ترتیب ساقط نہیں ہوتی۔ یہ امام مالک کے قول جیسا قول ہے۔ اسی طرح کیا یہ بھول کر چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا دیتے وقت بھی ملحوظِ خاطر رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؟ اس میں بھی اسی طرح کا اختلاف ہے جو اوپر ذکر ہوا ہے۔ اگر چھوٹی ہوئی نماز کی قضا دینے میں جلدی کرنا اور اس کو حاضر نماز سے مقدم رکھنا، یہ خوبی رکھتا ہے تو پھر اس جیسے وقت میں اس کو ادا کرنا واجب ٹھہرا۔ اب امام شافعی کے نزدیک اگر اس جیسے وقت میں تحیۃ المسجد پڑھنا جائز ہے تو جو چھوٹی ہوئی نماز تھی اسے پڑھنا تو زیادہ قرینِ قیاس ٹھہرے گا۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/١٠٦_١٠٨)

شروطِ نماز اور ارکان

نماز میں اطمینان کا حکم

سوال جو شخص نماز میں اطمینان کو بروئے کار نہیں لاتا، اس کی نماز کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله.

اطمینان کی فرضیت:

نماز میں اطمینان واجب ہے اور تارکِ اطمینان نماز کو خراب کرتا ہے۔ اس پر جمہور ائمہ اسلام جیسے مالک، شافعی، احمد، اسحاق بن راہویہ، قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو حنیفہ سب کا اتفاق ہے۔ اس میں کوئی ان کا اختلاف نہیں کہ اطمینان کا تارک نماز کو اچھے طریقے سے ادا نہیں کرتا، بلکہ وہ نافرمان، گناہ گار اور تارکِ واجب ہے۔ ان کے علاوہ دیگر ائمہ ایسے شخص کو نماز دہرانے کا حکم دیتے ہیں۔

نماز دہرانے کے فرض ہونے کی دلیل بخاری و مسلم کی یہ حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک آدمی نے مسجد میں دو رکعات پڑھی، پھر آیا اور اس نے آ کر آنحضور ﷺ کو آداب عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جا نماز پڑھ، تو نے نماز نہیں پڑھی۔ دوسری مرتبہ بھی ایسے ہی ہوا اور تیسری مرتبہ بھی تو وہ کہنے لگا: اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر مبعوث کیا! مجھے اس سے اچھی نہیں آتی، آپ مجھے سکھا دیں، جس سے میری نماز ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تو نماز شروع کرے تو اللہ اکبر کہہ، پھر تجھے جو قرآن میسر ہو اسے پڑھ، پھر رکوع کر، یہاں تک کہ تجھے رکوع میں اطمینان ہو جائے، پھر سر اٹھا، یہاں تک کہ تو سیدھا کھڑا ہو جائے، پھر سجدہ کر، حتی کہ تجھے سجدے میں اطمینان ہو جائے، پھر بیٹھ، حتی کہ تجھے بیٹھنے میں اطمینان ہو جائے، پھر اپنی ساری نماز میں یہی کر۔''[1] یہ آدمی چونکہ لا علم تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس کو نماز دہرانے کا حکم دیا اور کہا کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ معلوم ہوا جو اطمینان چھوڑ دیتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز نہیں پڑھتا، اس لیے اللہ اور اس کے رسول نے اس کو نماز دہرانے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٧)

سنن میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے: ''اللہ اس بندے کی نماز قبول نہیں کرتا جو رکوع و سجود میں اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا۔''[1]

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو رکوع اور سجدے میں اپنی کمر سیدھی نہیں کرتا تھا، انھوں نے پوچھا: تو کتنے عرصے سے ایسے ہی نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا: اتنے اتنے عرصے سے، انھوں نے کہا: اگر تو اسی پر مر جاتا تو رسول اللہ ﷺ کی جاری کردہ سنت کے خلاف عمل کرتا۔[2]

ابن خزیمہ نے اسی معنی میں یہ حدیث مرفوع بھی روایت کی ہے اور کہا: ''جو رکوع اور سجدہ مکمل نہیں کرتا وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایک دو لقمہ کھا لے، جس سے بھوک نہیں مٹتی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے۔ وہ سورج ڈھلنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان آتا ہے تو وہ اٹھ کر چار ٹھونگے لگاتا ہے جس میں اللہ کا ذکر بالکل تھوڑا کرتا ہے۔''[3] واللہ أعلم[4]

عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب

سوال ایک عورت تہجد کی نماز پڑھتی ہے، لیکن کبھی کبھی بیٹھ کر پڑھ لیتی ہے اور کھڑی نہیں ہو سکتی، اس کو بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملتا ہے۔''[5] اب یہ عورت کیا کرے؟

جواب یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان صحیح ہے، لیکن اگر اس کا معمول کھڑے ہو کر پڑھنا ہی ہے، لیکن بسا اوقات تھک ماندکر اور کھڑے رہنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ جاتی ہے تو اللہ اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کا اجر ہی دیں گے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بندہ اگر بیمار ہو جائے یا سفر پر نکلے تو اس کا عمل اسی طرح لکھا جائے گا جس طرح وہ صحت اور اقامت کی حالت میں اس کو کرتا تھا۔''[6] بیماری کے عالم میں اگر انسان ساری

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٥٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٢٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٧٠) صحيح الجامع (٧٢٢٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٢)

[4] مجموع الفتاویٰ (٦٠١-٦٠٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)

نماز پڑھنے سے بھی عاجز ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس کی نیت اور فعل کی وجہ سے اس کے لیے ساری کا اجر لکھ دیتے ہیں تو اگر وہ نماز کا کوئی ایک رکن ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہو تو اس کو پورا اجر کیوں نہیں ملے گا؟ واللہ أعلم [1]

جوتے پہن کر نماز کا حکم

سوال کیا جوتے وغیرہ پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب جوتے، سینڈل، چپل یا اس جیسی کسی بھی پاؤں میں پہنی جانے والی چیز میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں، بلکہ مستحب ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جوتوں میں نماز پڑھا کرتے تھے، [2] سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ الْيَهُوْدَ لَا يُصَلُّونَ فِيْ نَعَالِهِمْ فَخَالِفُوْهُمْ » [3] ''یہود اپنے جوتوں میں نماز نہیں پڑھتے، تم ان کی مخالفت کرو۔'' اس حدیث میں آپ ﷺ نے یہود کی مخالفت میں جوتے پہن کر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔

اگر جوتوں کے پاک ہونے کا یقین ہو تو پھر ان میں نماز پڑھنا مکروہ نہیں۔ اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لیکن اگر انسان کو ان کے پلید ہونے کا یقین ہو تو پھر وہ ان کو پاک کیے بغیر ان میں نماز نہ پڑھے۔ تاہم صحیح بات یہ ہے کہ جب جوتے زمین کے ساتھ رگڑ کھاتے ہیں، یا انسان ان کو رگڑ لے تو وہ پاک ہو جاتے ہیں، جس طرح سنت میں وارد ہوا ہے، خواہ وہ نجاست براز ہو یا غیر براز، کیونکہ جوتوں کا تلوا ایسی چیز ہے جس کے ساتھ بار بار نجاست لگنے کا احتمال ہوتا ہے، وہ اس اعتبار سے سبیلین یعنی پیشاب اور پاخانہ نکلنے کی جگہوں کے قائم مقام ہے۔ تو جب پتھر یا ڈھیلے کے ساتھ ان مقامات سے نجاست کو دور کرنا متواتر احادیث سے ثابت ہے تو جوتوں کا زمین کے ساتھ رگڑنے کی صورت میں پاک ہو جانا بھی اسی ضمن میں داخل ہے۔ اگر انسان کو محض شک ہو کہ اس کے موزے کے نیچے نجاست لگی ہوئی ہے تو اس میں نماز مکروہ نہیں۔ پھر نماز کے بعد اس کو یقین ہو جائے کہ نجاست واقعی لگی ہوئی تھی تو صحیح قول کے مطابق اس کو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح دیگر چیزوں جیسے بدن، کپڑوں اور زمین وغیرہ کے نجس ہونے کا مسئلہ ہے (کہ اگر انسان کو ان کے نجس ہونے کا محض شک ہو)۔ واللہ أعلم [4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۱۳۰/۲۳)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۷۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۵۵)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٢) صحيح الجامع (۳۲۱۰)

[4] مجموع الفتاویٰ (۱۲۲-۱۲۱/۲۲)

نماز میں عورت کے بال ننگے ہونے کا حکم

سوال اگر نماز میں عورت کے کچھ بال ننگے ہو جائیں تو کیا اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں؟

جواب اگر عورت کے تھوڑے سے بال اور بدن کا معمولی سا حصہ ظاہر ہو جائے تو اکثر علما کے نزدیک اس کو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا مذہب ہے۔ لیکن اگر زیادہ بال ننگے ہو جائیں تو وہ عام علمائے ائمہ اربعہ کے نزدیک اس نماز کے وقت میں اسے دوبارہ پڑھے گی۔ واللہ أعلم [1]

قیمتی لباس سے اجتناب کرنے کی حیثیت

سوال ریشم اور کاٹن وغیرہ کی طرح کے مہنگے کپڑے پہننے سے اجتناب کرنا اور ان سے مکمل طور پر دور رہنا کیا باعثِ اجر ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب الحمد للہ رب العالمین. جو کپڑا اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے، جیسے ریشم ہے جس طرح اسے پہننے پر سزا ملتی ہے، اسی طرح اسے ترک کر دینے پر ثواب بھی ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو دنیا میں ریشم پہنتا ہے، آخرت میں نہیں پہنے گا۔'' [2] آپ ﷺ نے سونے اور ریشم کے بارے میں فرمایا: ''یہ میری امت کے مردوں پر حرام ہیں اور عورتوں کے لیے حلال۔'' [3]

لیکن جو چیزیں مباح ہیں، ان میں سے فضولیات کو چھوڑ دینے پر ثواب ملتا ہے۔ فضولیات سے مراد وہ چیز ہے جس کی انسان کو دین میں ضرورت نہ ہو۔ مطلب ہے وہ دینی مصلحت کے لیے ضروری نہ ہو۔ جس طرح مباح اور جائز چیزوں میں فضول خرچی منع ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٧]

''اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور (ان کا خرچ) اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جہنم کی خبر دیتے ہوئے ذکر کیا ہے:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الواقعة: ٤٥، ٤٦]

---

[1] مجموع الفتاوی (٢٢/١٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٥٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٩٧)

''بے شک وہ اس سے پہلے نعمتوں میں پالے ہوئے تھے۔ اور وہ بہت بڑے گناہ (شرک) پر اڑے رہتے تھے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومٗا مَّحۡسُورًا ﴾

[بني إسرائيل: ٢٩]

''اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا کر لے اور نہ اسے کھول دے، پورا کھول دینا، ورنہ ملامت کیا ہوا، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے گا۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَءَاتِ ذَا ٱلۡقُرۡبَىٰ حَقَّهُۥ وَٱلۡمِسۡكِينَ وَٱبۡنَ ٱلسَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِيرًا ۝٢٦ إِنَّ ٱلۡمُبَذِّرِينَ كَانُوٓاْ إِخۡوَٰنَ ٱلشَّيَٰطِينِۖ وَكَانَ ٱلشَّيۡطَٰنُ لِرَبِّهِۦ كَفُورٗا ﴾ [بني إسرائيل: ٢٦، ٢٧]

''اور رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو اور مت بے جا خرچ کر، بے جا خرچ کرنا۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے ہمیشہ سے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان ہمیشہ سے اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے۔''

ترکِ مباحات کی مذمت:

مباحات میں اسراف اور فضول خرچی سے مراد حد سے تجاوز کرنا ہے، یا حرام تجاوز میں شامل ہے اور ان میں سے فضول کو چھوڑ دینا زہدِ مباح سے تعلق رکھتا ہے، لیکن مباحات سے مطلقاً اور مکمل طور پر اجتناب کرنا اور ان کو اپنے اوپر حرام کر لینا جاہلوں، گمراہوں اور عیسائی راہبوں کا کام ہے، مثلاً: کوئی شخص گوشت کھانا چھوڑ دے یا روٹی کھانا چھوڑ دے یا پانی پینا چھوڑ دے، یا کاٹن کے کپڑے پہننا ترک کر دے، صرف اونی کپڑے پہننا اختیار کرے، یا شادی ہی نہ کرے اور سمجھے کہ یہ سارے کام مستحب زہد سے تعلق رکھتے ہیں، تو اس کی یہ سوچ مذکورہ لوگوں کی سوچ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُحَرِّمُواْ طَيِّبَٰتِ مَآ أَحَلَّ ٱللَّهُ لَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُعۡتَدِينَ ۝٨٧ وَكُلُواْ مِمَّا رَزَقَكُمُ ٱللَّهُ حَلَٰلٗا طَيِّبٗاۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ ٱلَّذِيٓ أَنتُم بِهِۦ مُؤۡمِنُونَ ﴾

[المائدة: ٨٧، ٨٨]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو۔''

اس آیت کا شانِ نزول کچھ اس طرح ہے کہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گوشت جیسی پاک چیزوں کو نہ کھانے اور

شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہے؟ کوئی کہتا ہے: میں تو روزے ہی رکھتا جاؤں گا، کبھی روزہ نہیں چھوڑوں گا۔ کوئی کہتا ہے: میں تو قیام اللیل کروں گا اور بالکل نہیں سوؤں گا۔ کوئی کہتا ہے: میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ لیکن میں تو روزہ رکھتا بھی ہوں، چھوڑتا بھی ہوں۔ قیام کرتا بھی ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی کرتا ہوں اور گوشت کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے تعلق نہیں رکھتا۔''[1]

صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دھوپ میں کھڑے دیکھا تو پوچھا: یہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ یہ ابو اسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ یہ کھڑا ہی رہے گا، سائے میں نہیں جائے گا، بات نہیں کرے گا اور روزہ رکھے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اس سے کہو: ''سائے میں چلا جائے، بات بھی کرے، بیٹھے بھی، لیکن اپنا روزہ مکمل کر لے۔''[2] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾

[البقرة: ١٧٢]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو کھانے اور اپنا شکر بجا لانے کا حکم دیا ہے، طیب اور پاکیزہ چیز وہ ہوتی ہے جو انسان کے لیے مفید ہو، اس نے خبیث اور گندی چیز کو حرام کیا ہے اور خبیث وہ چیز ہوتی ہے جو انسان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ پھر اس نے اپنا شکر بجا لانے کا حکم دیا ہے جو مامور بہ (جس کا حکم دیا ہے) کو کر کے اور ممنوع کو چھوڑ کر اس کی اطاعت کے عمل کا نام ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ بندہ جب کوئی لقمہ کھائے تو اس پر اللہ کی تعریف کرے اور پانی کا گھونٹ پیئے تو اس پر بھی اللہ کی تعریف کرے۔''[3] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا ﴾ [المؤمنون: ٥١] ''پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''

لٰہذا جو انسان طیبات اور پاکیزہ چیزوں کو کھائے، لیکن شکر نہ کرے اس نے صالح عمل نہیں کیا۔ اس نے جو فرائض چھوڑے، ان کی وجہ سے قابلِ سزا ہے اور اس کے لیے طیبات حلال نہیں۔ اس نے ان پاکیزہ چیزوں کو اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٤)

کے لیے حلال کیا ہے جو ان کو استعمال کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری کرتا ہے، اس کے لیے نہیں جو ان کو استعمال کر کے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [المائدة ٩٣]

''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے، جب کہ وہ متقی بنے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، پھر وہ متقی بنے اور ایمان لائے، پھر وہ متقی بنے اور انھوں نے نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے دعا فرمائی:

﴿ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ﴾ [البقرة: ١٢٦]

''اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے، جو ان میں سے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لائے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [البقرة: ١٢٦]

''اور جس نے کفر کیا تو میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کروں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے۔''

اس لیے مباحات کے ذریعے نافرمانیوں پر انسان کی معاونت کرنا جائز نہیں، مثلاً کسی انسان کو اس لیے روٹی اور گوشت دینا کہ وہ ان میں رکھ کر شراب پیئے اور فحاشی میں اس سے مدد لے۔

جو انسان کھانے، لباس اور شادی جیسے پاک، طیب اور حلال امور میں سے کسی چیز کو حرام کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کاموں کو بالکل چھوڑ دینا اس شخص سے بہتر ہے جو ان امور کو اللہ کی اطاعت میں استعمال کرتا ہے تو ایسا شخص حد سے تجاوز کرنے والا ہے اور اس کو اللہ اور اس کے رسول کی حلال کردہ اشیا کو حرام کرنے، رہبانیت اور ترکِ دنیا کو عبادت بنا لینے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے رغبتی کرنے اور فرائض و واجبات میں بے پروائی سے کام لینے کی بنا پر سزا ملے گی، کیونکہ جس کام کے بغیر کوئی فرض اور واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح جو شخص بعض عبادات میں اسراف اور تجاوز سے کام لیتا ہے، مثلاً: وہ روزے رکھتا ہے اور ہمیشہ ساری رات کا قیام کرے اور اتنا کمزور ہو جائے کہ بعض فرائض کو ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو وہ بھی سزا کا مستحق ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: ''تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے، تیرے گھر والوں کا حق ہے اور تیری

بیوی کا حق ہے، لہٰذا تو ہر حق والے کو اس کا حق دے۔''[1] تو دین کی اصل، بنیاد اور قاعدہ فرائض و واجبات کو ادا کرنا اور محرمات کو چھوڑ دینا ہے، کیونکہ کوئی بندہ فرائض سے افضل کسی عبادت کے ساتھ اللہ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا اور بندہ ہمیشہ نوافل ادا کرتا رہتا ہے اور اللہ کے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے لہٰذا مستحب نوافل وہ ہیں جو انسان کو فرائض سے نہیں روکتے۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کے درجات بلند کرتا ہے اور فضول مباحات کو چھوڑنا جو وہ ہوتے ہیں جن کی انسان کو کسی واجب یا مستحب عمل کے لیے ضرورت نہیں ہوتی، پھر بھی وہ ان کو ترجیح دیتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے، تو اس کو ثواب ملے گا، لیکن جو ان فضول مباحات کو محض کنجوسی کی وجہ سے چھوڑتا ہے، اللہ کا قرب اور خوش نودی چاہنے کے لیے نہیں یہ شخص قابلِ تعریف نہیں، جو انسان کسی بھی نوع کی مباح چیز کو اس نیت سے استعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے کہ اس سے اللہ راضی ہوگا تو وہ غلط اور گمراہ ہے اور جو انسان مباح کھانے اور لباس کو اللہ کی نعمت کے اظہار اور اس کے ذریعے اس کی اطاعت کرنے کی نیت سے استعمال کرتا ہے تو اس کو اس کا ثواب ملے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴾ [التکاثر: ۸]

''پھر یقیناً تم اس دن نعمتوں کی بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے۔''

یعنی تم سے نعمت کے شکر کے بارے میں سوال کیا جائے گا، لہٰذا اللہ کی نعمت استعمال کر کے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا بندے سے مطلوب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مباح کام پر سزا نہیں دیتا، بلکہ مامور (حکم) کو ترک کرنے اور ممنوع کو کرنے پر سزا دیتا ہے، یہ جامع قواعد ہیں جو مذکورہ اور دیگر مسائل کو واضح کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ریشم استعمال کرنے کا مسئلہ ہے تو یہ چند جگہوں کو چھوڑ کر مردوں کے لیے حرام ہے اور جو انسان کسی ایسے لباس کو پہنتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے تو وہ گناہ گار ہے۔

کاٹن اور پٹ سن کے کپڑے کو ضرورت کے باوجود نہ پہننا جاہل اور گمراہ لوگوں کا کام ہے، لیکن جو ان میں اسراف سے کام لیتا ہے تو وہ بھی قابلِ مذمت ہے۔ جو انسان اللہ کی نعمت کے اظہار کے لیے خوب صورت لباس پہنتا ہے تو وہ قابلِ قدر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَنْعَمَ عَلَى عَبْدٍ بِنِعْمَةٍ أَحَبَّ أَنْ يُّرَى أَثَرُ نِعَمِهِ عَلَيْهِ »[2]

''اللہ جب کسی بندے کو کسی نعمت سے نوازتا ہے تو اس پر اپنی نعمت کے اثرات کو دیکھنا بھی پسند کرتا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨١٩) صحيح الجامع (١٧١٢)

نیز فرمایا:

«إن اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَال »[1] ''اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

لہٰذا جو انسان قیمتی لباس بخیلی کی وجہ سے یا مطلقاً ترک کر دینے کی وجہ سے نہیں بلکہ محض انکسار اور اللہ کی رضا کی خاطر نہیں پہنتا، اللہ تعالیٰ اس کو ثواب بھی دیں گے اور کرامت کا لباس بھی پہنائیں گے۔

البتہ لباس شہرت مکروہ ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ لباس ہے جو عرفِ عام سے ہٹ کر ہو اور اس کو پہن کر برتری جتائی جائے یا وہ لباس ہے جو عرفِ عام سے ہٹ کر ہو اور اس کو پہن کر خود ساختہ مسکینی اور نیچ ہونا ظاہر کیا جائے۔ اسلافِ امت دونوں طرح کی شہرت، یعنی برتری جتانا اور مسکینی ظاہر کرنا، ناپسند کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ الشُّهْرَةِ أَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثَوْبَ مَذِلَّةٍ »[2]

''جو لباس شہرت پہنتا ہے، اللہ اس کو لباسِ ذلت پہنائے گا۔''

نیت کا اثر:

تاہم بہترین چیز میانہ روی ہی ہے۔ ظاہر میں فعل ایک ہی ہوتا ہے لیکن انسان کو اچھی نیت کی وجہ سے ثواب ملتا ہے اور بری نیت کی وجہ سے سزا۔

ایک انسان پیدل چلنے کی طاقت رکھتا ہے اور اس کے پاس زادِ راہ بھی موجود ہے، لیکن وہ زادِ راہ کسی کو دے دیتا ہے اور خود پیدل حج کرتا ہے تو اس کو دوہرا اجر ملتا ہے: ایک پیدل چلنے کا اور دوسرا ایثار کرنے کا۔ لیکن ایک انسان بخیلی کی وجہ سے اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر پیدل حج کرتا ہے تو اس کو دو گناہ ہوتے ہیں: ایک کنجوسی کا اور دوسرا اپنی جان کو عذاب میں ڈالنے کا۔ ایک اور انسان ہے جو سوار ہو کر حج کرتا ہے، کیونکہ وہ پیدل چل نہیں سکتا تو وہ اس نیت سے سوار ہو کر اپنی جان کو نشاط اور آرام پہنچاتا ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ عبادت کر سکے تو اس کو دو اجر ملیں گے۔ اور اس کے عکس ایک انسان سوار ہو کر حج کرتا ہے مگر وہ اونٹ پر بھی ظلم کرتا ہے اور بوجھ اٹھانے والوں پر بھی تو اس کو دو گناہ ہوں گے۔ اسی طرح لباس کا معاملہ ہے۔ جو انسان محض کنجوسی کی وجہ سے اچھے کپڑے نہیں پہنتا اس کو کوئی اجر نہیں ملتا اور جو مباحات کو حرام قرار دے کر عبادت اور قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے ترک کر دیتا ہے وہ گناہ گار ہے اور جو اللہ کی نعمت کے اظہار اور اللہ کی اطاعت میں معاون سمجھ کر عمدہ کپڑے پہنتا ہے اس کو اجر ملتا ہے، لیکن جو اظہارِ فخر اور اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے کوئی لباس پہنتا ہے تو اس کو گناہ ملتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر فخر کرنے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٦، ٣٦٠٧)

والے اور اترانے والے کو ناپسند کرتا ہے، اسی لیے اس نیت کے ساتھ کپڑا ٹخنوں سے نیچے رکھنا حرام ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اتراتے اور تکبر کرتے ہوئے اپنے ازار (تہبند) کو کھینچا، اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نہیں دیکھیں گے۔'' تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے تہبند کا ایک پلو لٹک جاتا ہے مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ اس سے بچوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر! تم ان لوگوں میں سے نہیں جو یہ کام اتراتے ہوئے کرتے ہیں۔''[1]

صحیح بخاری اور مسلم ہی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی اتراتے ہوئے اپنے تہبند کو کھینچ اور لٹکا کر چل رہا تھا کہ اللہ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک اس میں دھنستا ہی جاتا رہے گا۔''[2]

یہ اور اس طرح کے مسائل لوگوں کے علم و اعتقاد اور نیت کے مختلف ہونے سے مختلف حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، تاہم بندے کو حکم ہے کہ وہ ہر نماز میں کہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾. والله سبحانه و تعالى أعلم[3]

ٹخنوں سے متجاوز شلوار کا حکم

سوال اگر شلوار اتنی لمبی ہو کہ ٹخنوں سے متجاوز ہو تو کیا جائز ہے؟

جواب شلوار قمیص اور تمام لباسوں کی لمبائی اگر زیادہ ہو تو اس کو ٹخنوں سے نیچے تک رکھنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت صحیح احادیث میں اس کی ممانعت اور وضاحت موجود ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْإِسْبَالُ فِيْ السَّرَاوِيْلِ وَالإِزَارِ وَالْقَمِيْصِ »[4] ''شلوار، قمیص اور تہبند کو لٹکانا منع ہے۔''[5]

نماز پڑھنے کے لیے ممنوعہ جگہیں

سوال کیا زمین کے کسی حصے میں نماز پڑھنا مکروہ بھی ہوتا ہے؟

جواب ہاں، کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں نماز پڑھنا منع ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٨)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/١٣٣۔١٣٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٧٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٦٧)

[5] مجموع الفتاویٰ (٢٢/١٤٤)

''وہاں نماز نہ پڑھو۔'' پھر آپ ﷺ سے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہاں نماز پڑھ لو۔''[1]

سنن میں حدیث ہے کہ ''قبرستان اور حمام کے علاوہ ساری زمین پر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔''[2]

صحیح بخاری میں ہے: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[3] اس حدیث میں آپ ﷺ نے ان کے کام سے خبردار کیا۔ صحیح بخاری ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، لیکن تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[4]

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے ایسی زمین میں نماز پڑھنے سے منع کیا جہاں کسی قوم کو (عذاب دے کر) دھنسایا گیا ہو۔

سات ممنوعہ جگہیں:

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے سات جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا، وہ جگہیں یہ ہیں: قبرستان، ذبح خانہ، روڑی، وسطِ راہ، حمام اور بیت اللہ کی چھت۔''[5] کچھ فقہا بیت اللہ کی چھت کے علاوہ دیگر مذکورہ جگہوں پر نماز پڑھنے سے ممانعت کی یہ علت قرار دیتے ہیں کہ ان جگہوں پر عموماً گندگی کا گمان رہتا ہے۔ کچھ دوسرے فقہا اس نہی کو تعبدی قرار دیتے ہیں (یعنی یہ محض اللہ کا حکم ہے) لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کی علتیں مختلف ہیں، بسا اوقات علت اہلِ شرک سے مشابہت ہوتی ہے، مثلاً قبروں کے نزدیک نماز پڑھنا، کبھی اس وجہ سے کہ وہ جگہیں شیطانوں کا مسکن ہوتی ہیں، جیسے اونٹوں کے باڑے اور کبھی کوئی اور علت ہوتی ہے۔ واللہ أعلم[6]

مجبوری میں غسل خانے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال اگر کوئی مسلمان حمام میں نماز پڑھنے پر مجبور ہو اور اس کو وقت نکل جانے کا ڈر ہو تو کیا اس کے لیے وہاں نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٦٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٩٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٧٤٥) صحیح الجامع (٢٧٦٧)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٦٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٩-٥٣١)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٢)

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٥٦) سنن ابن ماجه، قرم الحدیث (٧٤٦، ٧٤٧)

[6] مجموع الفتاویٰ (١٥٨/٢٢)

جواب اگر یہ ممکن نہ ہو کہ انسان غسل کر کے نکلے اور وقت پر نماز پڑھ سکے تو وہ غسل کر کے حمام ہی میں نماز پڑھ سکتا ہے، کیوں کہ جن جگہوں پر نماز پڑھنا منع ہے وہاں بروقت نماز پڑھ لینا دوسری جگہوں پر وقت کے بعد پڑھنے سے بہتر ہے، اس لیے اگر کوئی شخص بیت الخلاء وغیرہ میں محبوس ہو جائے تو وہیں نماز پڑھ لے، اس کو دہرانے میں فقہا کا اختلاف ہے، لیکن صحیح رائے کے مطابق اس کے لیے دہرانا لازمی نہیں۔ بنابریں انسان بروقت عریانی کی حالت میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے، اگر اس کے بنا چارہ نہ ہو، لیکن اگر غسل سے فارغ ہو کر حمام سے باہر بروقت نماز پڑھنا ممکن ہو تو تب حمام میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اسی طرح اگر گھر میں غسل کرنا ممکن ہو تو وہ حاجت کے بغیر حمام میں نماز نہ پڑھے۔ واللہ أعلم[1]

غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں نماز کا حکم

سوال کیا یہود کے عبادت خانے اور چرچ میں تصویروں کے باوجود نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ نیز کیا انھیں بھی اللہ کے گھر کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب یہ اللہ کے گھر نہیں، اللہ کے گھر تو مسجدیں ہیں، بلکہ یہ تو وہ گھر ہیں جہاں اللہ کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے، اگرچہ اس میں ذکر کا امکان بھی ہوتا ہے، لیکن گھر مکینوں کے اعتبار سے ہوتے ہیں جو کافر ہیں، لہٰذا یہ کافروں کے عبادت خانے ہیں۔ جہاں تک ان میں نماز کے جواز کا سوال ہے تو اس کے متعلق امام احمد وغیرہ کے مذہب میں تین اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ ان میں نماز پڑھنا قطعاً منع ہے، امام مالک کا قول بھی یہی ہے۔ دوسرا قول مطلق اجازت کا ہے، یہ امام احمد کے بعض پیروکاروں کا قول ہے۔ تیسرا قول جو صحیح ہے اور حضرت عمر بن خطاب سے بھی مروی ہے اور امام احمد وغیرہ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان میں تصویریں ہوں تو پھر نماز نہ پڑھی جائے، کیونکہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔ نیز نبی اکرم ﷺ اس وقت تک کعبے کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے جب تک اس میں موجود تمام تصویروں کو مٹا نہ دیا گیا تھا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ہم ان کے کنیسوں (گرجوں) میں داخل نہیں ہوتے تھے، درآنحالیکہ ان میں تصویریں موجود ہوتیں۔

یہ اس مسجد کے قائم مقام ہیں جو قبروں پر بنائی جاتی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بتایا گیا کہ حبشہ میں ایک گرجا ہے اور اس میں تصاویر بھی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ تھے جب ان میں کوئی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۵۹)

نیک آدمی مرتا تو اس کی قبر پر سجدہ گاہ بنا لیتے اور اس میں تصاویر بنا لیتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے ہاں بدترین مخلوق ہوں گے۔"[1] لیکن اگر اس میں تصویریں نہ ہوں تو صحابہ نے ایسے گرجے میں نماز پڑھی ہے۔ واللہ أعلم[2]

مسجد میں صفیں بچھانے کا حکم

سوال مسجد میں مصلیٰ، صف اور قالین وغیرہ بچھانا کیسا ہے؟ کیا یہ فعل بدعت میں شمار ہوگا یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين. تکلف کر کے مصلیٰ تلاش کرنا اور پھر اس پر نماز پڑھنا صحابہ کرام اور تابعین عظام کا طریقہ نہیں، بلکہ وہ مسجد رسول میں زمین ہی پر نماز پڑھتے تھے، کوئی اپنے ساتھ مصلیٰ لے کر نہیں آتا تھا۔ مروی ہے کہ عبدالرحمان بن مہدی جب مدینے آیا تو اس نے مصلیٰ بچھایا، امام مالک نے اس کو روکنے کا حکم دیا۔ ان کو بتایا گیا کہ یہ عبدالرحمان بن مہدی ہیں، تو انھوں نے جواب دیا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہماری مسجد میں مصلیٰ بچھانا بدعت ہے؟ صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے اعتکاف کی حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے اعتکاف کیا ہوا ہے وہ اپنے معتکف (خیمے) میں چلا جائے۔ میں نے اس رات اپنے آپ کو پانی اور مٹی میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔" اس حدیث کے آخر میں راوی فرماتے ہیں کہ "میں نے اکیسویں رات کی صبح دیکھا کہ آپ ﷺ کی ناک اور نتھنوں پر پانی اور مٹی کے نشانات تھے۔"[3] اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ مٹی پر سجدہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی مسجد کی چھت کھجور کی ڈالیوں کی تھی جو بارش کی صورت میں ٹپکتی تھی۔ آپ ﷺ کی مسجد میں کوئی چیز بچھی ہوئی نہیں تھی۔ بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مٹی اور کنکریوں پر سجدہ کرتے تھے اور کنکریوں کو ادھر ادھر کرنا مکروہ سمجھا جاتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ضرورت کے وقت ان کو ہٹانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں: "ہم سخت گرمی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے، اگر کسی کے لیے اپنی پیشانی زمین پر رکھنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اپنا کپڑا بچھا کر اس پر سجدہ کر لیتا۔"[4] اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سخت گرمی میں صحابہ کرام سجدے کی جگہ پر کوئی چیز بچھا کر سجدہ کر لیا کرتے تھے، جس سے صاف معلوم ہوتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٨)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/١٦٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٠)

ہے کہ وہ مصلّوں پر یا کسی پردے پر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جوتوں سمیت بھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور جوتوں سمیت نماز پڑھنا اسی صورت میں متصور ہے جب مسجد میں کوئی چیز نہ بچھی ہو۔ مختصراً واللہ أعلم[1]

غیر مسلم کے لیے مسجد میں داخل ہونا یا گزرگاہ بنانا

سوال اگر کوئی عیسائی یا یہودی کسی مسلمان کی اجازت کے ساتھ یا اجازت کے بغیر مسجد میں داخل ہو یا مسجد کو گزرگاہ بنائے تو کیا جائز ہے؟

جواب مسجد کو گزرگاہ بنانا مسلمان کے لیے بھی جائز نہیں تو کافر کے لیے کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ یہ بلاشبہہ منع ہے۔ اگر کوئی ذمی کسی مصلحت کے پیشِ نظر مسجد میں داخل ہوتو اس سے متعلق علما کے دو اقوال ہیں اور وہ دونوں امام احمد رحمہ اللہ سے روایتیں ہیں:

1. جائز نہیں، مالکی مذہب بھی یہی ہے، کیوں کہ اس پر صحابہ کا عمل قائم تھا۔
2. جائز ہے، یہ ابوحنیفہ اور شافعی کا مذہب ہے۔ مذہبِ احمد وغیرہ میں مسلمان کی اجازت کی شرط لگانے کے دونوں پہلو موجود ہیں۔[2]

قبر والی مسجد میں نماز کا حکم

سوال کیا ایسی مسجد میں نماز پڑھنا درست ہے جس میں کوئی قبر ہو؟

جواب الحمد لله. ائمہ کا اتفاق ہے کہ کسی قبر پر مسجد نہ بنائی جائے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بنا لیتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[3] لہٰذا کسی میت کو مسجد میں دفن کرنا جائز نہیں۔ اگر مسجد پہلے ہو اور قبر بعد میں بنائی گئی ہو تو قبر کو برابر کر دیا جائے یا اگر نئی ہو تو اکھاڑ دیا جائے، لیکن اگر قبر پہلے ہو اور مسجد بعد میں بنائی گئی ہو تو یا مسجد کو ہٹا دیا جائے یا قبر کی شکل مٹا دی جائے، کیونکہ وہ مسجد جو قبر پر ہو اس میں فرض نماز پڑھی جائے نہ نفل ہی، کیونکہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۶۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۹۳)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۳۲)

[4] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۹۴۔۱۹۵)

مسجد میں قیام و طعام کے لیے جگہ مخصوص کرنے کا حکم

سوال مسجد میں دن رات قیام کرنا، کھانا، پینا، سونا اور کوئی جگہ مخصوص کر لینا کیسا ہے؟

جواب کسی کے لیے مسجد کے کسی حصے کونے کو اس انداز میں اپنے لیے خاص کر لینا جائز نہیں کہ کسی دوسرے کو اس میں آنے سے مستقل منع کر دیا جائے، بلکہ رسولِ رحمت ﷺ نے مسجد کے کسی مقام پر اس طرح قبضہ جما لینا منع کیا ہے جس طرح اونٹ کہیں بیٹھ کر قبضہ جما لیتا ہے۔[1]

علما اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ کوئی شخص مسجد میں اپنے لیے کوئی جگہ مخصوص کر لے اور وہیں نماز پڑھے۔ اگر انسان کو نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرنے کی اجازت نہیں تو اس شخص کو کیسے اجازت ہو سکتی ہے جو اس کے کسی مقام پر مستقل قبضہ جما لے اور ڈیرے ڈال لے؟ پھر اس کو اپنا گھر قرار دے کر کھانا، پینا، سونا اور دیگر وہ کام کرے جن کے لیے مساجد تعمیر نہیں کی جاتیں۔ یہ بالاتفاق ممنوع ہے۔

ضرورت مندوں کے لیے قیام کی اجازت:

ان میں سے کچھ امور کی رخصت صرف حاجت مندوں کے لیے ہے، جس طرح اہلِ صفہ تھے۔ آدمی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچتا اور اس کا وہاں کوئی ٹھکانا نہ ہوتا تو وہ صفہ میں ٹھہر جاتا۔ جب اس کو گھر والے یا گھر میسر آ جاتا تو وہ وہاں منتقل ہو جاتا۔ اسی طرح وہ عورت تھی جو مسجد میں رہتی اور مسجد کی صفائی کیا کرتی تھی۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی جب تک کنوارے تھے مسجد میں سوتے تھے، کیونکہ ان کا کوئی گھر اور گرہستی نہیں تھی۔ جب ان کی شادی ہو گئی تو پھر انھوں نے مسجد میں سونا ترک کر دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مثال بھی دی جا سکتی ہے کہ جب ان کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کسی بات پر تو تکار ہوئی تو وہ مسجد میں جا کر سو گئے۔ لہٰذا معمولی معاملے، ضرورت مندوں اور عادت بنا لینے، حد سے بڑھے ہوئے معاملے اور غیر ضرورت مندوں میں فرق کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا تھا: مسجد کو سونے اور آرام کرنے کا ٹھکانا نہ بناؤ۔ یہ تو صرف سونے کی حد تک بات تھی، لیکن اگر ذکر کردہ باقی کام بھی کیے جائیں تو ان کو کس طرح پسند کیا جا سکتا ہے؟

معتکف کے بارے میں علما کا اختلاف ہے کہ آیا وہ مسجد میں کھائے یا گھر میں؟ حالانکہ اس کو مسجد میں ٹھہرنے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١١١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٢٩) السلسلة الصحيحة (١١٦٨)

کا حکم ہے اور وہ کسی حاجت کے بغیر مسجد سے نہیں نکل سکتا! بلکہ ائمہ کرام نے تو مسجد میں شاہی گوشے بنانے کو بھی ناپسند کیا ہے جو کچھ بادشاہوں نے اپنے لیے نماز پڑھنے کے لیے بنوا لیے تھے۔

مسجد ہوٹل نہیں:

رہی یہ بات کہ مسجد کو رہایش، سونے کا مقام، کپڑے اور ساز و سامان کی حفاظت گاہ بنا لیا جائے تو میں کسی ایسے مسلمان عالم کو نہیں جانتا جس نے اس کی اجازت دی ہو۔ پھر وہ مسجد تو نہ رہی، ہوٹل اور مسافر خانہ بن گیا، جس میں لوگ اپنے لیے کمرے بک کروا لیتے ہیں اور رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے لیے مشترک ہو۔ اس کی کوئی چیز اور جگہ کسی کے لیے صرف اس حد اور مقدار تک خاص کی جا سکتی ہے جس حد تک وہ اس میں ٹھہر کر کوئی ایسا عمل کرنا چاہے جو مسجد میں کیا جاتا ہے۔ جو نماز کے لیے، تلاوت کے لیے، ذکر کے لیے، اعتکاف کے لیے یا دینی علم سیکھنے کے لیے مسجد کے کسی حصے میں سب سے پہلے آ جائے تو وہ جب تک اپنا وہ عمل پورا نہیں کر لیتا تب تک اس جگہ پر ٹھہرے رہنے کا مجاز اور زیادہ حق دار ہوتا ہے۔ کوئی اس کو وہاں سے اٹھا نہیں سکتا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے آدمی کو اس کے بیٹھنے کی جگہ سے اٹھانے سے منع کیا ہے، لیکن یہ حکم دیا ہے کہ مجلس کو کھلا کر لیا جائے، اگر اس کا وضو ٹوٹ جائے اور وہ وضو کر کے دوبارہ آئے تو وہ اسی جگہ پر بیٹھنے کا زیادہ حق دار ہوتا ہے، کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

« إِذَا قَامَ الرَّجُلُ عَنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ عَادَ إِلَيْهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ »[1]

''جب کوئی آدمی اپنی مجلس (یعنی بیٹھنے کی جگہ) سے اٹھ کر جائے، پھر دوبارہ آئے تو وہ وہیں بیٹھنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔''

اعتکاف کی اجازت:

لیکن مسجد میں قیام اور رہایش کے لیے کوئی جگہ اس طرح مخصوص کر لینا جس طرح لوگ اپنے گھروں کو مخصوص کرتے ہیں تو یہ سب سے بڑی برائی ہے۔ اس پر تمام علما کا اتفاق ہے۔ مسجد میں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ معتکف کو ایک جگہ خاص کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے لیے چٹائی وغیرہ سے ایک کمرہ نما بنا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح لوگ بھی مسجد میں اعتکاف کرتے ہیں اور پردے وغیرہ لٹکا کر ایک کمرہ نما بنا لیتے ہیں۔ لیکن یہ خاص طور پر اعتکاف کی مدت تک ہوتا ہے۔ پھر اعتکاف ایک شرعی عبادت بھی

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٩)

ہے، معتکف کسی اشد ضرورت کے بغیر مسجد سے باہر نہیں نکل سکتا اور اس کے لیے حکم ہے کہ وہ جب تک اعتکاف میں رہے، عبادت کے کاموں میں مشغول رہے۔ لیکن جو مسجد کو رہایش بناتا ہے وہ اعتکاف کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایسے کام بھی کرسکتا ہے جو شرعاً ممنوع ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان کاموں میں رکاوٹ بھی بن سکتا ہے جن کو کرنے کے لیے لوگ مسجد میں آتے ہیں۔ مساجد اللہ کے ذکر، عبادت اور تلاوت کے لیے بنائی جاتی ہیں، لوگوں کو رہایش مہیا کرنے کے لیے نہیں۔ یہ اللہ کی شریعت ہے۔ کسی کو اپنی طرف سے شریعت کاری اور بدعت سازی کا حق حاصل نہیں۔ مساجد کے جو شرعی مقاصد اور احکام ہیں کوئی ان کو تبدیل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ مختصراً واللہ أعلم[1]

مسجد میں سونے، بات کرنے اور جوتوں سمیت چلنے کا حکم

سوال کیا مسجد میں سونا، بات کرنا اور نماز کی جگہوں پر جوتوں سمیت چلنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب کسی ضرورت مند کے لیے، جیسے کہ کوئی مسافر یا بے گھر فقیر، بعض اوقات مسجد میں سونا جائز ہوتا ہے، لیکن اسے مستقل سونے اور قیلولہ کرنے کی جگہ بنانے سے ان کو منع کیا جائے۔

وہ بات جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو، مسجد میں کرنا مستحسن ہے اور جو حرام بات ہو، وہ مسجد میں کرنا زیادہ سختی سے حرام ہے، اسی طرح مکروہ بھی۔ فضول گفتگو، گو مباح ہو، مگر مسجد میں مکروہ ہے۔

تیسری بات جوتوں سمیت چلنا جائز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجدِ نبوی میں جوتوں سمیت چلا کرتے تھے، لیکن جب آدمی مسجد میں آئے تو وہ کام کرے، جسے کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اپنے جوتے اچھی طرح دیکھے۔ اگر ان میں گندگی لگی ہو تو ان کو مٹی پر رگڑ کر صاف کرے، کیوں کہ مٹی انھیں پاک کر دیتی ہے۔ واللہ أعلم[2]

مسجد میں ذبح کرنے، غسل دینے اور ضائع شدہ بچہ دفن کرنے کا حکم

سوال کیا مسجد میں قربانی کے جانور ذبح کیے جاسکتے ہیں؟ کیا مردوں کو غسل دیا جاسکتا ہے؟ کیا اس میں ضائع شدہ بچوں کو دفن کیا جاسکتا ہے؟ کیا اس کے وقف کو کسی مفید کام میں تبدیل کیا جاسکتا ہے؟ نیز کیا مسجد میں استنجا اور غسل کیا جاسکتا ہے؟

جواب مسجد میں جانور ذبح کرنا جائز نہیں، خواہ وہ قربانی کے جانور ہی کیوں نہ ہوں، یہ کیونکر جائز ہوسکتا ہے جب ایسے ذبح خانے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے جو اسی کام کے لیے بنایا گیا ہوتا ہے؟ خواہ یہ کراہت تنزیہی ہو یا

---

① مجموع الفتاویٰ (۲۲/۱۹۵۔۲۰۰)

② مجموع الفتاویٰ (۲۲/۲۰۰)

تحریمی، اس سے قطع نظر مسجد کو ذبح خانے کے مشابہ نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ اس کی وجہ سے مسجد گندی اور خون آلود ہو جاتی ہے جس سے اس کو بچا کر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اسی طرح مسجد میں کسی مردے کو دفنانا جائز نہیں، خواہ وہ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا یا ضائع شدہ بچہ یا کوئی اور صورت، کیونکہ مساجد کو قبرستان کی طرح بنانا جائز نہیں۔

کسی وقف شدہ چیز کو مصلحت اور فائدے کے بغیر تبدیل کرنا جائز نہیں۔ مسجد کے اندر استنجا کرنا بھی جائز نہیں۔ اگرچہ مسجد میں وضو کرنے کو بھی مکروہ کہا گیا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں۔

اسی طرح مسجد میں مردوں کو غسل بھی نہیں دینا چاہیے۔ مسجد میں اگر کوئی ایسا کام شروع کر دیا جائے جو نمازیوں کے لیے باعثِ آزار ہو تو اسے ختم کر دیا جائے اور ان کے مفاد و مصلحت کو مدِنظر رکھا جائے، تاہم مسجد کو مسجد ہی رہنے دینا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ أعلم.[1]

مسجد میں مانگنے کا حکم

سوال مسجد میں مانگنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب ضرورت کے بغیر مانگنا اصلاً ہر جگہ حرام ہے، لیکن اگر کسی کو ضرورت ہو اور وہ مسجد میں مانگتا ہے، لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر یا کسی بھی طرح انھیں اذیت نہیں دیتا، جھوٹ نہیں بولتا، آہستہ آواز میں اپنی حالت ذکر کرتا ہے، خطبے یا کسی علمی مباحثے کے دوران میں نہیں مانگتا، تو جائز ہے۔ واللہ أعلم[2]

امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب اس مسئلے کی عمومی ضرورت کے باوجود اس میں علما کا اختلاف و اضطراب ہے۔ تمام بنیادی اقوال تین رجحانات پیش کرتے ہیں، جن میں دو رجحان ایک دوسرے کے مخالف کھڑے ہیں اور ایک درمیان میں ہے۔

ایک طرف یہ موقف ہے کہ امام کے پیچھے سورت فاتحہ کسی صورت نہ پڑھی جائے۔ دوسری طرف یہ موقف ہے کہ امام کے پیچھے سورت فاتحہ ہر حال میں پڑھی جائے اور تیسرا موقف جو اکثر سلف کا ہے، وہ یہ ہے کہ مقتدی جب امام کی قراءت سنے تو نہ پڑھے، کیوں کہ اس کا امام کی قراءت توجہ سے سننا، خود پڑھنے سے بہتر ہے۔ جب امام کی قراءت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۰۲/۲۲)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۰۶/۲۲)

نہ سنے تو خود پڑھے، کیوں کہ اس کا پڑھنا اس کے خاموش رہنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا امام کی قراءت توجہ سے سننا خود پڑھنے سے بہتر ہوا اور خود پڑھنا خاموشی سے افضل۔ یہ جمہور علما کا قول و مذہب ہے جن میں امام مالک، امام احمد بن حنبل، ان کے اکثر اصحاب، امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کے اصحاب اور پیروان کا ایک گروہ شامل ہے، نیز یہ امام شافعی کا قدیم قول ہے اور احناف میں سے محمد بن حسن کا قول ہے۔

اس قول اور مذہب کی بنیاد پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب امام خاموش ہو تو اس وقت کیا مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے یا مستحب؟ اس سلسلے میں امام احمد کے دو اقوال ہیں اور مشہور قول یہ ہے کہ یہ مستحب ہے۔ امام شافعی کا قدیمی قول بھی یہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب امام قراءت کر رہا ہو اس وقت توجہ سے سننا واجب ہے یا مستحب؟ نیز مقتدی جب امام کی قراءت سنے تو کیا اس کا خود پڑھنا حرام ہوگا یا مکروہ؟ پھر اگر مقتدی امام کی قراءت سنتے وقت خود بھی پڑھ لے تو کیا اس کی نماز باطل ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے متعلق بھی امام احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں:

1. اس وقت قراءت کرنا حرام ہے، لہٰذا اگر مقتدی قراءت کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔
2. اس وجہ سے اس کی نماز باطل نہیں ہوگی اور یہی اکثر کا قول اور امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔ اسی سے ملتا جلتا یہ مسئلہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص رکوع یا سجدے میں قرآن پڑھے تو کیا اس کی نماز باطل ہو جائے گی؟ اس مسئلے میں بھی امام احمد کے مذہب میں دو اقوال ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا ہے۔

وہ علما جو کہتے ہیں کہ سری اور جہری دونوں حالتوں میں قراءت کی جائے وہ دراصل مقتدی کو یہ حکم دیتے ہیں کہ صرف سورت فاتحہ پڑھ لی جائے اور فاتحہ کے بعد جو امام قراءت کرتا ہے اس کو دھیان سے سنے، پڑھے نہیں۔ ان علما کے موقف کی بنیاد پر اگر پوچھا جائے کہ جہری نماز میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے یا مستحب؟ تو اس میں بھی دو اقوال ہیں:

1. یہ واجب ہے اور یہ امام شافعی کا جدید قول اور امام ابن حزم کا مسلک ہے۔
2. یہ مستحب ہے۔ یہ امام اوزاعی، لیث بن سعد اور میرے دادا ابو البرکات کا مسلک ہے۔ اس مسئلے میں اختلاف سے احتیاط کی طرف نکلنے کا کوئی راستہ نہیں جس طرح عصر کے وقت حج کے فسخ ہونے اور اس طرح کے دیگر مسائل میں اختلاف سے باہر نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔

اس طرح کے مسائل میں شرعی دلیل کیا واجب اور لازم کرتی ہے، اس میں غور کرنا چاہیے، مثلاً: اکثر علما کہتے ہیں کہ جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل ہو جائے، یعنی دو گنا ہو جائے تو اس وقت عصر کا وقت نکل جاتا ہے، یہ امام مالک و شافعی کا مشہور مذہب اور امام احمد سے ایک روایت ہے، لیکن امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اس وقت عصر کا وقت شروع ہوتا ہے۔

ان فقہا کا کسی ایسے وقت پر اتفاق نہیں جس میں عصر کی نماز جائز ہوتی ہو، لیکن عصر کے عکس اگر کوئی زوال کے بعد کہ جب ہر چیز کا سایہ زوال کے سائے کے سوا، اس کے مثل اور برابر ہو جائے اور اس وقت کوئی ظہر کی نماز پڑھے تو اس کی نماز صحیح ہو گی۔ اسی طرح اس مسئلے میں بھی ان کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی مغرب کی نماز غروب کے بعد پڑھے، یا عشا کی نماز سفید شفق کے غائب ہونے کے بعد سے لے کر رات کے ایک تہائی حصے تک جب چاہے پڑھ لے، اس کی نماز صحیح ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی فجر کی نماز طلوعِ فجر کے بعد بہت دن چڑھے پڑھے تو اس کی نماز بھی صحیح ہو گی، لیکن عصر کے متعلق ایک فریق کہتا ہے کہ اس کو اس وقت تک پڑھا جا سکتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے دوگنا نہ ہو جائے، جب کہ فریقِ مخالف یہ کہتا ہے کہ عصر کا وقت ہی تب شروع ہوتا ہے جب ہر چیز کا سایہ اس کے دو مثل (دوگنا) ہو جائے۔

یہ بات بیان کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کچھ مسائل ایسے ہیں جن پر کسی ایسے قول کے مطابق عمل کرنا ممکن نہیں ہوتا جو متفق علیہ ہو، لیکن الحمد للہ صحیح قول پر شرعی دلائل دلالت کرتے ہیں جو حق واضح کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کا مسئلہ فسخِ حج ہے، حجِ تمتع اور حجِ قِران پر تو امت کا اتفاق ہے، لیکن حجِ افراد میں سلف سے لے کر خلف تک سب میں اختلاف رہا ہے۔

زیرِ بحث مسئلے کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب امام بلند آواز سے قراءت کر رہا ہو اس وقت مقتدی اسے توجہ سے سنے، اگر وہ دور ہو اور اس وجہ سے نہ سن رہا ہو تو صحیح قول کے مطابق خود پڑھے (یہ امام احمد وغیرہ کا قول ہے) اگر وہ بہرہ ہونے کی وجہ سے نہ سن سکتا ہو یا امام کو اچھی طرح نہ سن سکتا ہو تو اس کے متعلق حنبلی مذہب میں دو اقوال ہیں، لیکن راجح یہی ہے کہ وہ پڑھے، کیوں کہ افضل یا تو یہ ہوتا ہے کہ وہ توجہ سے سنے یا دوسری صورت میں پڑھے، لیکن یہ شخص سننے والا نہیں ہوتا، کیوں کہ سننے کا مقصود اس کو حاصل نہیں ہوتا، اس لیے اس کا پڑھنا چپ رہنے کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ یہاں ہم ان دونوں علاحدہ علاحدہ صورتوں کے دلائل ذکر کرتے ہیں کہ وہ حالتِ جہر میں توجہ سے سنے اور حالتِ سر میں پڑھے۔

کتاب وسنت اور اعتبار (قیاس) سے پہلی صورت کی دلیل:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

’’اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

سلف سے شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت نماز میں قراءت کے متعلق نازل ہوئی۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ خطبہ جمعہ کے متعلق نازل ہوئی۔ امام احمد نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ اسی کے متعلق نازل ہوئی، نیز انھوں نے اس بات پر بھی اجماع ذکر کیا ہے کہ جہری حالت میں مقتدی پر قراءت واجب نہیں۔ پھر وہ فرماتے ہیں، یہ آیت:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا...﴾ عام ہے اس کو نماز میں قراءت کے ساتھ مخصوص کیا جائے، یا نماز سے باہر قراءت پر مخصوص کیا جائے یا پھر دونوں حالتوں میں عام رکھا جائے۔ دوسرا احتمال قطعاً لغو ہے، کیوں کہ کسی مسلمان کا یہ کہنا نہیں کہ نماز کے باہر استماعِ قرآن (قرآن توجہ سے سننا) فرض ہے اور نماز میں فرض نہیں، کیوں کہ سننے والے (مقتدی) کا اس امام کی قراءت سننا جس کی وہ اقتدا کر رہا ہو اور اس کی متابعت اس پر فرض ہوتی ہے۔ اس شخص کی قراءت سننے سے زیادہ استحقاق رکھتا ہے جو نماز سے باہر ہو اور قرآن پڑھ رہا ہو تو نماز اس آیت میں یا تو بالخصوص داخل ہے یا پھر بالعموم، دونوں صورتوں میں یہ آیت مقتدی کو امام کی قراءت دھیان سے سننے کے حکم پر دلالت کرتی ہے، خواہ اس کو واجب مانا جائے یا مستحب۔ مقصود حاصل ہے، یعنی استماع (سننا) قراءت سے اولیٰ ہے۔ دونوں احتمالات کی صورت میں یہ آیت اس حکم پر صریح دلالت کرتی ہے۔ اختلاف رکھنے والے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ فاتحہ سے زائد جو قراءت ہوتی ہے اسے سننے کا حکم ہے، پڑھنے کا نہیں۔ آیت حکم دیتی ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے خاموشی اختیار کی جائے۔ فاتحہ ام القرآن ہے۔ اس کو ہر نماز میں پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ قرآن کی افضل سورت ہے۔ یہ وہ سورت ہے جس جیسی سورت تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ خود قرآن میں۔ تو یہ ناممکن اور ممتنع ہے کہ آیت سے مراد اس کو چھوڑ کر باقی قرآن کو سننا ہو، باوجودیکہ یہ آیت مطلق اور عام ہے اور باوجودیکہ فاتحہ کی قراءت اکثر اور مشہور تر ہے اور یہ دوسری صورتوں سے افضل بھی ہے۔ یہ ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ﴾ کے حکم میں اسی طرح داخل ہے جس طرح باقی قرآن اس میں داخل ہے۔ فاتحہ کا اس آیت کے عموم میں داخل ہونا لفظاً اور معناً واضح اور ظاہر تر ہے۔ جو اس کو سننا چھوڑ کر پڑھنا اختیار کرتا ہے، اس لیے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کی قراءت اس کے استماع سے افضل ہے، لیکن یہ بات غلط اور نص و اجماع کے خلاف ہے، کیوں کہ کتاب و سنت مقتدی کو سننے کا حکم دیتے ہیں، پڑھنے کا نہیں اور امت کا اتفاق ہے کہ فاتحہ سے زائد قراءت کو سننا اس کو پڑھنے سے افضل ہے۔

اگر امام کی قراءت کو سننے کی نسبت پڑھنا افضل ہوتا ہے تو مقتدی کا فاتحہ سے زائد قراءت کو پڑھنا بھی افضل ہوتا، لیکن یہ بات کوئی بھی نہیں کہتا۔ جو اختلاف کرتا ہے وہ فاتحہ میں اختلاف کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس کو حالتِ جہر میں بھی مقتدی پر فرض یا مستحب کہتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو جو مصلحت اور فائدہ پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے اس سے بڑا فائدہ تو سننے سے حاصل ہو جاتا ہے، جو پڑھنے سے افضل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ فاتحہ کے بعد والی قراءت سنتا ہے پڑھتا نہیں۔ اگر اس کو استماع سے وہ مصلحت حاصل نہ ہو چکی ہوتی جو قراءت سے افضل ہے تو پھر بہتر یہی تھا کہ وہ اسی کو کرتا جو

زیادہ بہتر ہو۔ جب کتاب و سنت اور اجماع سے استماع کا قراءت سے افضل ہونا ثابت ہو گیا تو معلوم ہوا مستمع (سننے والا) کو قاری (پڑھنے والا) سے افضل مصلحت حاصل ہوتی ہے اور یہ مفہوم فاتحہ اور غیر فاتحہ سب میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں کہ مقتدی کو اعلیٰ سے منع کیا جائے اور ادنیٰ کا حکم دیا جائے، لہٰذا ثابت ہوا اس حالت میں امام کی قراءت مقتدی کی قراءت بھی ہوتی ہے جو جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک ہے اور یہ معروف حدیث کہ «مَنْ كانَ لَهُ إمام فَقِراءَةُ الإمامِ له قِرَاءةٌ»[1] ''جس کا امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت بھی ہے۔'' اسی مفہوم میں ہے۔

یہ حدیث مرسل بھی مروی ہے اور مسند بھی، لیکن اکثر ثقہ ائمہ اسے عبداللہ بن شداد سے مرسل ہی روایت کرتے ہیں۔ ابن ماجہ نے اس کو مسند روایت کیا ہے، تاہم ظاہر قرآن و سنت اسی مرسل کی تائید کرتے ہیں۔ جمہور صحابہ و تابعین کا قول بھی یہی ہے اور وہ (عبداللہ بن شداد) اکابر تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ اس طرح کی مرسل ائمہ اربعہ کے اتفاق کے ساتھ قابلِ حجت ہے۔ امام شافعی سے بھی اس طرح کی مرسل سے دلیل لینا واشگاف الفاظ میں منقول ہے۔ معلوم ہوا کہ امام کی قراءت کو سننے کا حکم قرآن کی دلالتِ قطعی سے ثابت ہے، کیوں کہ یہ ان ظاہری امور میں داخل ہے جن کی ضرورت امت کو رہتی ہے، اس لیے قرآن میں اس کا بیان اور تفصیل اسی طرح وارد ہوئی ہے جس سے مقصودِ بیان حاصل ہو جاتا ہے اور سنت بھی قرآن کی موافقت کرتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، ہمارے لیے سنت کو بیان کیا، ہمیں ہماری نماز سکھائی تو فرمایا: ''اپنی صفیں درست کرو، پھر کوئی تمھاری امامت کروائے، جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو اور جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو۔''[2] یہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی مشہور طویل حدیث سے اقتباس ہے، تاہم اس میں کچھ راویوں نے کچھ اضافے بھی ذکر کیے ہیں، کچھ راوی «وإذا قُرِئَ القرآنُ فَانْصِتُوا» ''جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو'' کے الفاظ ذکر نہیں کرتے، کچھ دوسرے ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں، یہ ثقہ راوی کا اضافہ ہے جو اس کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ اس کے معنی کی مطابقت کرتا ہے، اسی لیے امام مسلم نے اس کو اپنی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے۔

لہٰذا پڑھنے والے کی قراءت توجہ سے سننا اس کی مکمل اقتدا کا تقاضا ہے، کیوں کہ جو پڑھتے ہیں امام کی قراءت سنتے نہیں، وہ اس کی اقتدا کرنے والے نہیں ہوتے۔ اس سے مقتدی سے قراءت کے ساقط ہونے کی حکمت واضح ہو جاتی ہے، کیوں کہ مقتدی کی اپنے امام کی اقتدا ہر چیز پر مقدم ہے، حتی کہ افعال میں بھی۔ اگر مقتدی امام کو سجدے کی حالت میں پائے وہ اس کے ساتھ سجدے ہی میں شریک ہوتا ہے۔ اگر وہ اس کو آخری رکعت میں پائے تو اس کے

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٠) مسند أحمد (٣/٣٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٨٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٤)

ساتھ ہی تشہد میں بھی بیٹھتا ہے۔ لیکن اگر وہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو اور پہلی رکعت میں ہی تشہد میں بیٹھ جائے تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ لیکن باجماعت نماز میں وہ یہ کام صرف امام کی اقتدا میں کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقتدا کی وجہ سے نمازی پر وہ کام بھی لازم ہو جاتے ہیں جو اکیلے نماز پڑھنے کی صورت میں لازم نہیں ہوتے اور وہ امور ساقط ہو جاتے ہیں جو اکیلے نماز پڑھنے کی صورت میں لازم ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إنَّما جُعِلَ الإمامُ لِيُؤْتَمَّ بِه فَإذا كَبَّرَ فَكَبِّرُوا، وإذا قَرأَ فَانْصِتُوا» ''امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ اللہ اکبر کہے تو اللہ اکبر کہو اور جب پڑھے تو خاموش رہو۔'' (رواه أحمد، وأبو داود، والنسائي، وابن ماجه)[1] امام مسلم سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث: «وإذا قرأ فانصتوا» کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: میرے نزدیک وہ صحیح ہے۔ پھر پوچھا گیا: اگر صحیح ہے تو آپ نے اس کو صحیح مسلم میں کیوں نہیں رکھا؟ انھوں نے کہا: میں نے وہ سب یہاں نہیں رکھا جو میرے نزدیک صحیح ہے، بلکہ میں نے یہاں وہی رکھا ہے جس پر ان (محدثین) کا اجماع ہے۔

زہری نے ابن اکیمہ لیثی کی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہراً قراءت کی تھی تو فرمایا: ''کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ پڑھا ہے؟ ایک آدمی نے کہا: ہاں، اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی کہہ رہا تھا، کیا وجہ ہے میرے ساتھ قراءت میں منازعت (مشارکت) کی جا رہی ہے؟'' راوی کہتا ہے: لوگوں نے جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تو وہ جہری نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قراءت کرنے سے رک گئے۔ (رواه أبو داود، وأحمد و ابن ماجه والنسائي والترمذي وقال حديث حسن)[2] ابو داود کہتے ہیں: میں نے محمد بن یحییٰ بن فارس سے سنا، اس حدیث میں "فانتهى الناس" (لوگ رک گئے) زہری کا قول ہے: یہی بات امام بخاری سے بھی مروی ہے، یہ اگر زہری کی بات بھی ہو پھر بھی اس کی کھلی دلیل ہے کہ صحابہ جہری نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں پڑھا کرتے تھے، کیوں کہ زہری اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے یا اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالمِ سنت تھے۔

اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صحابہ کی قراءت واجب یا مستحب تھی تو یہ ان عام احکام سے ہوگی جن کو عام صحابہ

---

[1] مسند أحمد (٢/٣١٤، ٣٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٠٤)، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٤٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٥٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٩١٩) صحيح الجامع (٧٠٣٦)

اور تابعین جانتے تھے۔ زہری جو سنت کے سب سے بڑے عالم تھے، اگر انھوں نے اسے بیان نہ کیا ہوتا تو اس سے اس کے نہ پڑھنے اور نہ ہونے پر استدلال کیا جا سکتا تھا، لیکن اگر زہری قطعیت کے ساتھ کہیں کہ صحابہ جہری نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نہیں پڑھتے تھے تو پھر شک کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے؟

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بیہقی کہتے ہیں: ابن اکیمہ مجہول ہے اور اس نے یہی ایک حدیث روایت کی ہے جسے اس سے زہری کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: حقیقت یہ نہیں، اس کے بارے میں ابو حاتم نے کہا ہے: اس کی حدیث صحیح ہے۔ اس کی حدیث مقبول ہے۔ ابو حاتم بستی کا قول ہے: ''روى عنه الزهري وسعيد بن هلال وابن أبيه عمر، وسالم بن عمار ابن أكيمة بن عمر''

امام مالک نے موطا میں وہب بن کیسان سے روایت کیا ہے، اس نے جابر بن عبداللہ سے سنا: ''من صلى ركعة لم يقرأ فيها، لم يصل إلا وراء الإمام''[1] ''جس نے کوئی رکعت پڑھی اور اس میں قراءت نہ کی، اس نے نماز نہیں پڑھی، سوائے اس کے کہ اس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی۔''

انھوں نے نافع سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا جاتا: کیا امام کے پیچھے قراءت کی جائے؟ وہ کہتے: جب کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لیے کافی ہوتی ہے، لیکن جب اکیلا نماز پڑھے پھر قراءت کرے۔ نافع کہتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے۔

صحیح مسلم میں عطا بن یسار سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت زید بن ثابت سے امام کے ساتھ قراءت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: امام کے ساتھ قراءت نہیں۔[2]

بیہقی نے ابو وائل سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: قرآن خاموشی سے سن۔ اس سے نماز میں خلل واقع ہوتا ہے۔ وہ امام ہی تجھے کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کوفہ کے فقیہ صحابی اور حضرت زید بن ثابت مدینہ کے فقیہ صحابی تھے۔ ان دونوں کے اقوال میں یہ تنبیہ ہے کہ امام کی قراءت خاموشی سے سنی جائے اور یہ خاموش رہنا مقتدی کی قراءت میں مانع ہے۔

اسی طرح امام بخاری نے اپنی کتاب ''القراءة خلف الإمام'' میں حضرت علی سے نقل کیا ہے: ''اگر امام جہری نماز نہ پڑھا رہا ہو تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعات میں سورت فاتحہ کے علاوہ بھی کوئی سورت پڑھ، لیکن دوسری دو رکعات میں صرف فاتحہ پڑھ، مغرب کی آخری رکعات اور عشا کی آخری دو رکعات میں صرف سورت فاتحہ پڑھ۔''

---

[1] موطأ للإمام مالك (٨٤/١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٧)

نیز اہلِ اسلام کا اجماع ہے کہ فاتحہ سے زائد قراءت کو سننے کا حکم ہے، یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ امام کی قراءت سننا اس کے ساتھ پڑھنے سے افضل ہے، بلکہ وہ امام کے ساتھ سننے کا پابند بنایا گیا ہے، پڑھنے کا نہیں۔

مزید برآں اگر جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قراءت کرنا واجب ہو تو دو باتوں میں سے ایک ضرور لازم آئے گی:

1 وہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھے۔

2 یا امام خاموش رہے تاوقتیکہ مقتدی اس کی قراءت سے پہلے پہلے پڑھ لے اور علما کا اتفاق ہے کہ امام پر یہ بالکل لازم نہیں کہ وہ مقتدی کو فاتحہ یا غیر فاتحہ پڑھنے کا موقع دینے کے لیے خاموش رہے۔ دوسری طرف امام کے ساتھ پڑھنا کتاب وسنت کی روشنی میں ممنوع ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حالتِ جہر میں مقتدی پر قراءت واجب نہیں، بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اگر حالتِ جہر اور استماع میں مقتدی کی قراءت مستحب ہوتی تو امام کے لیے بھی مستحب ہوتا کہ وہ مقتدی کی قراءت کے لیے خاموش ہو جائے، لیکن جمہور علما کے نزدیک امام کا مقتدی کی قراءت کے لیے خاموش رہنا مستحب نہیں۔ یہ ابو حنیفہ، مالک اور ابن حنبل وغیرہم کا مذہب ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مقتدیوں کے پڑھنے کے لیے خاموش نہیں ہوا کرتے تھے۔ کسی صحابی نے یہ عمل آپ ﷺ سے نقل نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ اللہ اکبر کے بعد دعائے استفتاح پڑھنے کے لیے خاموش ہوتے تھے۔[1] سنن میں ہے کہ آپ دو مرتبہ خاموش ہوتے: ایک قراءت سے پہلے اور دوسرے قراءت سے فارغ ہونے کے بعد۔ یہ انتہائی مختصر خاموشی اور سکتہ ہوتا ہے جو فاتحہ پڑھنے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ سکتہ فاتحہ کے بعد ہوتا۔ یہ کسی صحابی نے نقل نہیں کیا کہ آپ کے تین سکتے یا چار سکتے ہوتے تھے۔ جس نے رسول اللہ ﷺ سے تین یا چار سکتے نقل کیے ہیں اس نے ایسی بات کہی ہے جو کسی مسلمان نے نقل نہیں کی۔ وہ سکتہ جو ﴿ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ کے بعد ہوتا وہ ہر آیت کے اختتام پر سکتوں کی طرح کا سکتہ ہی ہے۔ اس طرح کے سکتے (معمولی خاموشی) کو سکوت (خاموشی) نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کسی عالم نے نہیں کہا کہ اس طرح کے سکتے میں فاتحہ پڑھ لی جائے۔

ہم نے اپنے جن اصحاب اور ہم مذہب علما کو پایا ہے ان میں کچھ آیات کے وقفے میں پڑھتے، مثلاً امام کہتا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ تو وہ کہتے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ لیکن یہ کسی عالم سے منقول نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٨)

امام کے سکوت میں تین اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ نماز میں کسی حالت میں سکوت نہیں۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ ایک قول ہے: اس میں ایک ہی سکوت ہے اور وہ استفتاح کے لیے ہے، یہ ابو حنیفہ کا قول ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ نماز میں دو سکتے ہیں۔ یہ شافعی اور احمد کا قول ہے۔ ان کی دلیل حضرت سمرہ بن جندب کی یہ حدیث ہے: ''رسول اللہ ﷺ کے دو سکتے تھے، ایک سکتہ نماز کے آغاز کے موقع پر ہوتا اور دوسرا سکتہ دوسری سورت پڑھنے کے بعد اور رکوع سے پہلے۔''[1] یہ بات عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہی گئی تو انھوں نے کہا: سمرہ کو غلطی لگی ہے، پھر انھوں نے یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے مدینہ میں حضرت ابی بن کعب کو خط لکھا تو انھوں نے جواب دیا: سمرہ نے سچ کہا ہے۔ (رواہ أحمد)

ابو داود کی روایت میں ہے: ''ایک سکتہ تکبیر کے بعد اور دوسرا سکتہ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴾ سے فارغ ہونے کے بعد۔'' امام احمد نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے اور فصل (رکوع اور قیام کے ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا) کے لیے دوسرے سکتے کو مستحب کہا ہے، اس لیے نہیں کہ امام مقتدی کو قراءت کا موقع دے دے، تاہم بعض حنابلہ نے اس کو مستحب سمجھا ہے، لیکن یہ عام سی بات ہے کہ اگر نبی اکرم ﷺ اتنا سکتہ کرتے جو فاتحہ پڑھنے کے لیے کافی ہوتا تو صحابہ اس کو بڑے اہتمام اور شوق سے نقل کرتے، لیکن جب کسی صحابی نے یہ بات نقل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ یہ سکتہ اس کے لیے نہیں ہوتا تھا۔

سمرہ بن جندب کی حدیث میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے دوسرے سکتے کی نفی کی، کیوں کہ یہ انتہائی معمولی تھا جس کو بالعموم یاد نہیں رکھا جاتا۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ فاتحہ کے بعد ہوتا۔

معلوم ہوا کہ آپ دو سکتے کرتے: ایک طویل ہوتا، دوسرا اتنا مختصر کہ وہ فاتحہ پڑھنے کے لیے کافی نہیں ہوتا تھا۔

نیز اگر سارے صحابہ پہلے سکتے یا دوسرے سکتے میں فاتحہ پڑھتے تھے تو پھر اس کو نقل کرنا بھی ہر کسی کے بس میں تھا، لیکن یہ بات کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ وہ دوسرے سکتے میں فاتحہ پڑھتا تھا، حالانکہ اگر یہ جائز ہوتا تو صحابہ کو سب سے پہلے اس کا علم بھی ہوتا اور وہ اس پر عمل بھی کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بدعت ہے۔

مزید برآں جہر سے مقصود مقتدیوں کا سننا ہے، اس لیے وہ جہری نماز میں امام کی قراءت پر آمین کہتے ہیں، سری نماز میں نہیں۔ اگر مقتدی اپنی قراءت میں مشغول رہیں اور امام کی قراءت نہ سنیں تو اس کا مطلب ہوا کہ امام کو ایسے لوگوں کے سامنے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس کی قراءت نہیں سنتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ایسے شخص سے بات کرے جو اس کی بات سنے ہی نہ، اور ایسے لوگوں کو خطبہ دے جو اس کے خطبے کو سنیں ہی نہ، یہ انتہائی بے وقوفی ہے جس سے شریعت مبرا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے: ''جو امام کے خطبہ دیتے وقت باتیں کرتا ہے وہ اس گدھے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٤٤، ٨٤٥) مسند أحمد (١٥/٥، ١٦)

جیسا ہے، جو اپنی پشت پر کتابوں کے ڈھیر اٹھائے ہوئے ہو۔''[1] بعینہٖ یہ بات یہاں بھی صادق آتی ہے جب امام بلند آواز سے پڑھ رہا ہوتو یہ بھی پڑھنا شروع کر دے۔ اگر مقتدی حالتِ جہر میں امام کی قراءت کو خاموشی سے سننے اور اس کے علاوہ کوئی ذکر، قراءت یا دعا نہ کرنے کا پابند بنایا گیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ دعائے استفتاح اور تعوذ بھی نہ پڑھے؟ اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے اور اس میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ حالتِ جہر میں تعوذ اور دعائے استفتاح پڑھے، لیکن قراءت نہ کرے، کیوں کہ قراءت سننے سے قراءت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن مقتدی تعوذ اور استفتاح سنتا ہی نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ دعائے استفتاح پڑھے، لیکن تعوذ نہ پڑھے، کیوں کہ تعوذ قراءت کے تابع ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نہ دعائے استفتاح پڑھے نہ تعوذ پڑھے۔ یہی صحیح ترین قول ہے، کیوں کہ یہ استماع اور خاموشی سے غافل کر دیتا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور انسان کو کسی ایسے کام میں مشغول نہیں ہونا چاہیے جو اس کو اس کام سے غافل کر دے جس کا حکم دیا گیا ہو۔

دوسری فصل (امام کی قراءت نہ سننے کی صورت میں سورت فاتحہ پڑھنے کا حکم):

مقتدی کا اس وقت پڑھنا جب وہ امام کی قراءت نہ سن رہا ہو، مثلاً امام خاموش ہو، کیوں کہ قرآن کی تلاوت کا حکم نماز کے باہر کی نسبت نماز کے اندر زیادہ ہے۔ نماز میں قرآن کی تلاوت نماز سے باہر تلاوت سے افضل ہے۔ قرآن کی تلاوت کرنے والے کی جو فضیلت وارد ہوئی ہے وہ نماز میں تلاوت کرنے والے پر بالاولیٰ صادق آتی ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے قرآن کی تلاوت کی، اس کو ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔ میں یہ نہیں کہتا: ﴿الٓمٓ﴾ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔''[2] بالخصوص نماز کا ذکر بھی اس صحیح حدیث میں آیا ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «من صَلَّى صلاةً لَمْ يَقْرَأْ فيها بأُمِّ القرآنِ فَهِيَ خِداجٌ ثلاثاً»[3] ''جو نماز پڑھے اور اس میں فاتحہ نہ پڑھے وہ ناقص ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ کہی۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: جب ہم امام کے پیچھے ہوں؟ تو انھوں نے کہا: اسے دل میں پڑھ لے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مسند أحمد (۲۳۰/۱) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۸۷/۲) میں کہا ہے کہ اسے احمد، بزار اور طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے۔ اس کے راوی مجاہد بن سعید کو اکثر نے ضعیف کہا ہے، جب کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اسے ثقہ کہا ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۱۰) صحيح الجامع (٦٤٦٩)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۳۹۵)

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا ایک نصف میرے لیے ہے اور دوسرا نصف اس کے لیے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اس کا ہوا۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اللہ کہتے ہیں: «حَمِدَنِي عَبْدِيْ» (میرے بندے نے میری حمد کی) جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اللہ فرماتے ہیں: «أثنى علي عبدي» (میرے بندے نے میری تعریف کی۔'' جب بندہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ اللہ فرماتے ہیں: «مَجَّدَنِي عَبدِيْ» (میرے بندے نے میری عظمت بیان کی) ایک روایت میں ہے: «فَوَّضَ إلَى عَبدِي» (میرے بندے نے میرے سپرد کر دیا) جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے نے جو مانگا وہ اس کا ہوا۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ اللہ فرماتے ہیں: یہ میرے بندے کے لیے ہے اور اس نے جو مانگا وہ اس کا ہوا۔''[1]

صحیح مسلم میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی تو ایک آدمی آپ کے پیچھے ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴾ پڑھنے لگا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم میں سے کون پڑھ رہا تھا؟ ایک آدمی نے کہا: میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں سمجھا تم میں سے کوئی میرے ساتھ کھینچا تانی کر رہا تھا۔''[2] اس شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز میں سورت پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یا کسی دوسرے کو پڑھنے سے منع نہ کیا، لیکن یہ کہا: ''مجھے لگا تم میں سے کوئی میرے ساتھ کھینچا تانی کر رہا تھا۔''

مسند میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مجھ پر قرآن خلط ملط کر دیتے ہو۔[3] اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے عمل کو ناپسندیدہ قرار دیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھنے میں شریک ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قراءت کو خلط ملط کر دیتا۔ یہ کام اسی سے سرزد ہو سکتا ہے جو بلند آواز سے پڑھ کر دوسرے کو سنائے۔ دل میں پڑھنے والا اس کا مرتکب نہیں ہوتا۔ تو پہلا عمل لوگوں کو پریشان

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٨)

[3] مسند أحمد (٤٥١/١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١١٣/٢) میں کہا ہے کہ اسے احمد، ابو یعلیٰ اور بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے روات صحیح والے روات ہیں۔

کرنے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ امام کے پیچھے پڑھنے کی وجہ سے نہیں۔ جب امام خاموش ہو، اس وقت اس کے پیچھے پڑھنے کی ممانعت اس حدیث سے قطعاً نہیں نکلتی۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے پوچھا تھا: تم میں سے کون پڑھ رہا تھا؟ یعنی وہ کون پڑھنے والا تھا جو میرے ساتھ شریک ہو کر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے اپنے دل میں پڑھنے والے کو مراد نہیں لیا، کیوں کہ دل میں پڑھنے والا دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنتا۔ امام کے پیچھے پڑھنا اس وقت مکروہ ہوتا ہے جب وہ خاموشی میں رکاوٹ ہو جس کا حکم دیا گیا ہے یا وہ دوسروں کے لیے پریشانی کا باعث بنتا ہو۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھر نماز میں قرآن پڑھنے سے منع کی کوئی وجہ نہیں۔ حالتِ سر میں امام کے پیچھے پڑھنے والا چونکہ استماع کے بدلے میں قراءت کرتا ہے، اگر اس کو پڑھنے سے بھی منع کر دیا جائے تو وہ استماع اور قراءت دونوں سے محروم ہو جائے گا۔ مزید برآں اس حالت میں قراءت کے وجوب میں بھی مشہور اختلاف ہے، حالتِ جہر میں اس کے وجوب کے برعکس کہ اس میں اختلاف شاذ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ و دیگر صحابہ اس حدیث: ''میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا.....'' سے یہ سمجھے ہیں کہ یہ امام اور مقتدی دونوں کو شامل ہے، نیز وہ تمام اذکار جن کو آہستہ آواز میں امام کے لیے پڑھنا جائز ہے وہ سب مقتدی کے لیے بھی جائز ہیں، مثلاً رکوع و سجود کی تسبیحات، تشہد اور دعا۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ قراءت ذکر اور دعا سے افضل ہے تو کس معنی میں حالتِ سر میں مقتدی کے لیے قراءت کرنا جائز نہیں، جب کہ وہ امام کی سری قراءت سنتا ہے نہ اس پر آمین ہی کہتا ہے؟!

مزید برآں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

پھر فرمایا:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٥]

''اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی سے اور خوف سے اور بلند آواز کے بغیر الفاظ سے صبح و شام یاد کر اور غافلوں سے نہ ہو۔''

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کو بھی حکم ہے کہ وہ اپنے دل میں اللہ کا ذکر کریں، کیوں کہ جس حکم کے آپ ﷺ مخاطب ہیں، آپ کی امت بھی اسی حکم کی مخاطب ہے، جب تک کوئی تخصیص کی دلیل نہ ہو،

مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴾ [ق: ٣٩]

''اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر۔''

فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی۔''

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''نماز قائم کر سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک۔''

وغیرہ، یہ حکم امام، مقتدی اور اکیلے کو شامل ہے کہ وہ اپنے دل میں صبح اور پچھلے پہر اللہ کا ذکر کرے۔ صبح سے مراد نمازِ فجر اور پچھلے پہر سے مراد ظہر وعصر کی نمازیں ہیں۔ مقتدی کو حکم ہے کہ وہ اپنے دل میں اپنے رب کا ذکر کرے، لیکن جب وہ مستمع (سننے والا) ہو اس وقت سننے پر مامور ہے۔ جب مستمع نہ ہو اس وقت اپنے دل میں اپنے رب کا ذکر کرنے پر مامور ہے اور قرآن سب سے افضل ذکر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ [الأنبياء: ٥٠]

''اور یہ بابرکت نصیحت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴾ [طٰہٰ: ٩٩]

''اور یقیناً ہم نے تجھے اپنے پاس سے ایک نصیحت عطا کی ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ﴾ [طٰہٰ: ١٢٤]

''اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ ﴾ [الأنبياء: ٢]

''ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت نہیں آتی جو نئی ہو۔''

مزید برآں قراءت، ذکر یا دعا کے بغیر خاموشی، کوئی عبادت ہے نہ اس کا حکم ہی دیا گیا ہے، بلکہ یہ تو وسوسے

کا دروازہ کھول دیتی ہے، لہٰذا اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا خاموشی سے بہتر ہے اور قرآن کی تلاوت سب سے بہتر ہے۔ بنا بریں قرآن کی تلاوت باقی ہر طرح کے ذکر سے افضل ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''قرآن کے بعد افضل کلام درج ذیل کلمات ہیں اور وہ بھی قرآن ہی سے ہیں: سبحان اللّٰه، الحمد للّٰه، اللّٰه اکبر، لا الٰه الا اللّٰه'' (رواہ مسلم)[1] عبداللہ بن ابو اوفی روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں قرآن سے کچھ بھی یاد نہیں کر پاتا، لہٰذا آپ مجھے ایسے کلمات سکھا دیجیے جو اس کی جگہ کام آ جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہہ: «سُبحانَ اللّٰه، الحمدُ للّٰه، لا إلٰه إلا اللّٰه، اللّٰه أكبر ولا حول ولا قوة إلا باللّٰه» وہ آدمی کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! یہ سب تو اللہ کے لیے ہیں، میرے لیے کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہہ: «اللّٰهُمَّ ارحَمْنِي، وارزُقْنِي، وعافِنِي، وَاهْدِنِي»[1] جب وہ اٹھ کر گیا تو آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اکٹھے کر کے فرمایا: یہ اس طرح اپنے ہاتھوں کو خیر سے بھر کر لے گیا ہے۔'' (رواه أحمد و أبو داود، والنسائي)[2] حالتِ جہر میں فاتحہ کو واجب قرار دینے والے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔''[3] تاہم اس مسئلے پر قدیم و جدید زمانے میں علما کے ہاں بحث ہوتی رہی ہے۔ انھوں نے اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اس کے اثبات میں امام بخاری وغیرہ نے لکھا ہے تو نفی میں ابو مطیع بلخی اور کرام وغیرہما نے لکھا۔

تاہم جو ان ایک دوسرے کے مخالف گروہوں کی کتابوں میں غور کرتا ہے اس کے سامنے درمیانہ موقف واضح ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر مستقل لکھی جانے والی کتابیں عموماً دونوں مخالف اقوال کی صورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں، یعنی جو حالتِ سر میں بھی امام کے پیچھے قراءت فاتحہ سے روکتے ہیں اور دوسرے وہ جو امام کے پیچھے اس کی جہری قراءت سننے کے دوران میں بھی فاتحہ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔ امام بخاری ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے امام کے پیچھے حالتِ جہر میں بھی قراءت کے وجوب کی بھرپور تائید کی ہے۔ امام شافعی کا جدید قول اور ابن حزم کا مسلک بھی یہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امام بخاری کی کتب اور دلائل اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ کے قول کی تضعیف پر بھی مشتمل ہیں۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣٢) مسند أحمد (٣٥٣/٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٢٨٨_٢٦٥)

نماز میں سورت فاتحہ کی تکمیل کے لیے رکوع سے پیچھے رہنے والے کا حکم

سوال ایک شخص امام کے تکبیرِ تحریمہ کہہ چکنے کے بعد نماز میں شریک ہوا، پھر امام نے رکوع کیا مگر اس شخص نے امام کے ساتھ رکوع نہ کیا، بلکہ پہلے اپنی باقی سورت فاتحہ مکمل کی، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ سورت فاتحہ کو مکمل کیے بغیر رکعت پوری نہیں ہوتی، پھر اس نے رکوع کیا اور امام کے ساتھ مل گیا۔ امام اس دوران میں رکوع سے سجدے میں جا چکا تھا، اس حوالے سے فتویٰ درکار ہے۔

جواب مسبوق (نماز سے پیچھے رہ جانے والا) جب حسبِ امکان نماز میں شامل ہو اور قیام کے لیے اتنا وقت نہ ہو کہ وہ سورت فاتحہ پڑھ سکے، وہ رکوع میں شامل ہو جائے اور سورت فاتحہ مکمل نہ کرے۔ یہ ائمہ متبوعین کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ اس میں جو اختلاف منقول ہے، شاذ ہے۔ اگر وہ امکان کے باوجود تاخیر سے نماز میں شامل ہو اور قیام تھوڑا رہ جائے، پھر بھی فاتحہ پڑھنے کے لیے کافی ہو، مگر نہ پڑھے، جمہور علما کے نزدیک اس کی نماز جائز ہے۔ امام شافعی کے نزدیک فاتحہ پڑھنا واجب ہے، چاہے رکوع سے پیچھے رہ جائے۔ ان کے نزدیک خاص طور پر مسبوق سے قراءتِ فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے۔ اس انسان کو امام کے ساتھ رکوع کرنا چاہیے تھا اور فاتحہ مکمل نہیں کرنی چاہیے تھی، کیوں کہ یہ باتفاقِ ائمہ مسبوق ہے۔ اگر وہ شخص سورت فاتحہ کو واجب سمجھتے ہوئے اور تاویل کرتے ہوئے پہلے قراءت مکمل کرتا ہے اور امام سے پیچھے رہ جاتا ہے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی، جس طرح کوئی بھی انسان نیند، بھول یا بھیڑ کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

اس جیسے صاحبِ عذر پیچھے رہنے والے کے متعلق امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کے مذہب میں ہے کہ اگر اس کے لیے اس رکن یا واجب کو، جس سے پیچھے رہ گیا تھا، پورا کر کے امام کے ساتھ ملنا ممکن ہو جب امام اس سے پہلے ایک یا دو یا تین ارکان ادا کر چکا ہو، وہ اس رکعت میں امام کو پا لے تو اس کی نماز درست ہو گی، لہٰذا اس کی نماز بھی درست ہے، جس طرح کوئی انسان بھول کر ایک رکعت زائد پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ ایسے ہی اگر کوئی انسان جہالت یا تاویل کی بنا پر ایک رکعت زائد پڑھ لے تو اس کی نماز بھی باطل نہیں ہوتی۔ اس باب میں خطا کرنے والا بھولنے والے کا حکم رکھتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

امام سے پہلے اٹھنے اور بیٹھنے والے نمازی کا حکم

سوال جو امام سے پہلے سر اٹھاتا اور اس سے پہلے جھکتا ہے اور روکنے کے باوجود نہیں رکتا اس کی نماز کا کیا حکم ہے اور اس پر کیا عائد ہوتا ہے؟

---

[1] جامع المسائل (۸/۴۳۲-۴۳۳)

جواب امام سے سبقت لے جانا بالاتفاق حرام ہے۔ کسی کے لیے امام سے پہلے رکوع میں جانا یا رکوع سے سر اٹھانا یا سجدے میں جانا یا سجدے سے اٹھنا جائز نہیں۔ اس مسئلے میں احادیث شہرت کا درجہ رکھتی ہیں:

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے: ''رکوع اور سجدے میں مجھ سے آگے نہ بڑھو...۔''[1]

آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ جب وہ اللہ اکبر کہے تو اللہ اکبر کہو۔ جب رکوع کرے تو رکوع کرو۔ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس کے بدلے میں ہوا جب وہ ''سمع الله لمن حمده'' کہے تو کہو: ''ربنا ولك الحمد''، اللہ اس کو سن لے گا، جب وہ اللہ اکبر کہے اور سجدہ کرے تو اللہ اکبر کہو اور سجدہ کرو، امام تم سے پہلے سجدہ کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے، تو یہ اس کے بدلے ہوا۔''[2]

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو امام سے پہلے سر اٹھاتا ہے کیا اس کو یہ ڈر محسوس نہیں ہوتا کہ کہیں اللہ اس کا سر گدھے کے سر میں تبدیل نہ کر دے؟''[3] کیوں کہ مقتدی امام کی اقتدا کرتا ہے اور جو جس کی اقتدا کرتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ اگر وہ اس سے آگے بڑھے تو وہ گدھے کی طرح ہوگا جس کو اپنے کام کی سمجھ ہی نہیں ہوتی۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے: ''جو خطیب کے خطبہ دیتے وقت بولتا ہے وہ اس گدھے کی طرح ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہو۔''[4]

جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ سخت سزا اور تعزیر کا مستوجب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا جو امام سے سبقت لے جاتا تھا، انھوں نے اس کو مارا اور کہا: نہ تو نے اکیلے نماز پڑھی نہ اپنے امام کی اقتدا ہی کی۔

جب مقتدی سہواً امام سے سبقت لے جائے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوگی، لیکن وہ اتنی مقدار اس سے پیچھے رہے جتنی مقدار میں وہ امام سے آگے بڑھا، جس طرح صحابہ نے یہ حکم دیا، کیوں کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط ہوتی ہے۔ لہٰذا جو وہ سہواً امام سے پہلے کرتا ہے اس سے اس کی نماز باطل نہیں ہوتی، کیوں کہ اس نے نماز میں نماز کی جنس کا عمل سہواً کیا ہے۔ وہ یوں ہی سمجھا جائے گا جیسے اس نے سہواً رکوع یا سجدہ کیا ہو، اس کی وجہ سے سنت

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٦١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٦٣) صحيح الجامع (٧١٩٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٢٧)

[4] مسند أحمد (٢٣٠/١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٨٧/٢) میں کہا ہے کہ اس کے ایک راوی مجاہد بن سعید کو لوگوں نے ضعیف کہا ہے، جب کہ امام نسائی رحمہ اللہ نے ایک روایت میں اسے ثقہ قرار دیا ہے۔

اور اجماع کی روشنی میں نماز باطل نہیں ہوتی، لیکن جو کام وہ امام سے پہلے کرتا ہے وہ صحیح رائے کے مطابق کسی شمار میں نہیں آتا، کیوں کہ یہ وہ فعل ہے جو اس نے اس کی جگہ اور مقام پر نہیں کیا۔ امام کے فعل سے پہلے وہ مقتدی کے فعل کا وقت نہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی قبل از وقت نماز پڑھے یا امام کی تکبیرِ تحریمہ کہنے سے پہلے ہی تکبیرِ تحریمہ کہہ دے، اس سے وہ واجب ادا نہیں ہوگا جو اس کے ذمے ہوتا ہے، بلکہ ضروری ہے جب تکبیر کا وقت ہو اس وقت تکبیر کہے، یعنی مقتدی امام کی تکبیرِ تحریمہ سے پہلے تکبیرِ تحریمہ نہ کہے، بلکہ اس کے بعد کہے۔ اسی طرح مقتدی کا رکوع وسجدہ بھی امام کے رکوع وسجدہ کے بعد ہونا چاہیے، پہلے نہیں، چنانچہ مقتدی جو فعل امام سے پہلے سہواً کرتا ہے وہ معاف ہے، اسی لیے اس کو صحابہ اور ائمہ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اتنی دیر بعد اس فعل سے سبکدوش ہو، تاکہ وہ امام کی مقدار کے برابر ہو جائے، لیکن اگر کوئی جان بوجھ کر امام سے آگے بڑھتا ہے تو اس کی نماز باطل ہونے میں امام احمد کے مذہب میں دو معروف اقوال ہیں۔ جو باطل کہتے ہیں ان کی توجیہ یہ ہے کہ یہ شخص نماز میں عمداً اضافہ کرتا ہے جس سے نماز باطل ہو جاتی ہے، مثلاً اگر کوئی عمداً امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جاتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو نماز میں جان بوجھ کر ایک اضافی سجدہ یا رکوع کرتا ہے جس سے بلاشبہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ صحابہ نے ایسے شخص کے بارے میں کہا ہے کہ وہ اکیلا نماز پڑھتا ہے نہ امام کی اقتدا ہی کرتا ہے۔ تو جو شخص نہ اکیلا نماز پڑھتا ہے نہ امام کے ساتھ اس کی نماز نہیں ہوتی، لہٰذا ایسے نمازی کو امام سے سبقت لے جانے کی اپنی روش سے توبہ کرنی چاہیے۔ نماز عجلت میں پڑھنے اور اطمینان کا خیال نہ رکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کے پیشِ نظر اس کو سمجھائیں۔ اگر کوئی بھی یہ فریضہ ادا نہ کرے تو سارے لوگ گناہ گار ہوتے ہیں، لیکن اگر کچھ لوگ یہ فریضہ سرانجام دے دیں تو دیگر سے یہ ساقط ہو جاتا ہے۔

جو قانون اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس پر تعزیر جاری کرنے کا اختیار رکھتا ہو وہ یہ کام کرے اور جس کے بس میں صرف ترکِ تعلق کرنا ہو اور یہ اس کے لیے موثر ہو سکتا ہو، تاکہ وہ توبہ کرے تو وہ یہ کام کرے۔ واللہ أعلم[1]

صف کے پیچھے اکیلے کی نماز کا حکم

سوال جو شخص صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھتا ہے، کیا اس کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے سے متعلق وارد احادیث صحیح ہیں یا نہیں؟ ائمہ اربعہ کے علاوہ کچھ ائمہ جیسا کہ حماد بن سلیمان، ابن مبارک، سفیان ثوری اور اوزاعی ہیں۔ یہ اس کے قائل ہیں۔ کسی صاحب نے کہا: ان مذکورہ ائمہ کے قول کی کوئی حیثیت نہیں تو کیا جو تقلید

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۳۳۶۔۳۳۸)

کو جائز سمجھتا ہے اس کے لیے ان ائمہ کی تقلید کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح اس کے نزدیک ائمہ اربعہ کی تقلید جائز ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. کچھ علما کا قول ہے کہ صف کے پیچھے اکیلے شخص کی نماز صحیح نہیں ہوتی، کیوں کہ اس سے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دو احادیث مروی ہیں۔ آپ ﷺ نے صف کے پیچھے اکیلے نمازی کو نماز دہرانے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا صَلَاةَ لِفَذٍّ خَلْفَ الصَّفِّ»[1] ''صف کے پیچھے اکیلے نمازی کی نماز نہیں۔'' بہت سے ائمہ حدیث نے ان دونوں احادیث کو صحیح قرار دیا ہے اور ان دونوں کی سندیں قابلِ حجت ہیں، بلکہ ان دونوں احادیث کی مخالفت کرنے والے بہت سے مسائل میں ان دونوں سے کئی درجہ کمزور سندوں کی حامل احادیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، پھر ان دونوں احادیث میں کوئی ایسی بات بھی ذکر نہیں ہوئی جو نماز کے مقررہ اصول کے خلاف ہو، بلکہ ان احادیث میں جو حکم دیا گیا ہے وہ بہت سی مشہور نصوص اور مقررہ اصول کے عین مطابق ہے۔ باجماعت نماز کو باجماعت کہا ہی اس لیے جاتا ہے کہ نمازی فعلِ نماز میں زمان و مکان میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اگر وہ اجتماعِ مکانی یا اجتماعِ زمانی میں کچھ بے پروائی سے کام لیں اور اس کی خلاف ورزی کریں، مثلاً: سارے نمازی یا کچھ نمازی امام کے آگے کھڑے ہو جائیں تو یہ کام باتفاق ائمہ منع ہے۔ اسی طرح اگر نمازی کسی ترتیب کے بغیر علاحدہ علاحدہ کھڑے ہو جائیں، مثلاً ایک دوسرے کے پیچھے کھڑا ہو جائے اور کوئی دوسرا تیسرے کے پیچھے، تو یہ سب سے بڑا منکر اور شدید ترین ناپسندیدہ کام ہو گا۔

اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو دیکھیں تو آپ ﷺ نے مضبوط صفیں بنانے، صفوں کو درست اور سیدھا کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے، رخنے بند کرنے اور ترتیب کے ساتھ پہلی، پھر دوسری اور پھر تیسری صف مکمل کرنے اور اسی ترتیب کے ساتھ تمام صفیں بنانے کا حکم دیا ہے۔

آپ ﷺ نے یہ تمام احکام نمازیوں کے اس اجتماع اور اکٹھ کو ممکن حد تک بہترین اور منظم شکل میں رکھنے کے لیے اتنی تاکید کے ساتھ دیے ہیں۔ اگر صفوں کو اتنی مضبوطی سے بنانا واجب نہ ہوتا تو ہر کسی کے لیے ایک دوسرے کے پیچھے اور جہاں جی چاہتا ہو کھڑا ہونا جائز ہوتا اور یہ بات بچے بچے کو معلوم ہے کہ اس طرح کی بے ترتیب صفوں والی نماز مسلمانوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اگر یہ کام جائز ہوتا تو مسلمان اس کو ضرور کرتے، خواہ ایک مرتبہ ہی کرتے، بلکہ اسی طرح اگر مسلمان بے ترتیب صف بناتے، مثلاً ایک آگے کھڑا ہو جاتا اور دوسرا اس کے پیچھے تو یہ ایسا کام تھا کہ اس کی (نہی) ممانعت آپ سے معلوم ہے اور نہی تحریم کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ اگر مسلمان امام کے آگے نماز پڑھ لیتے تو یہ اس مذکورہ

---

[1] مسند أحمد (٢٢٨/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٩٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٥٤١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

صورت سے کم بہتر ہوتا۔ اگر جمہور علما امام کے آگے نماز کو صحیح اور درست نہیں کہتے، خواہ مطلق صحیح نہ کہیں یا کسی عذر کے بغیر تو صف بندی کے بغیر نماز کس طرح درست ہو سکتی ہے۔ قیاس اصول تو صف بندی کے وجوب اور اکیلے کی نماز کے صحیح نہ ہونے ہی کا تقاضا کرتا ہے جس طرح ان دونوں احادیث میں ذکر ہوا ہے، لیکن جن علما نے اس کی مخالفت کی ہے، یقینی بات ہے ان تک یہ احادیث قابلِ اعتماد انداز میں نہیں پہنچیں، بلکہ ممکن ہے انھوں نے اسے سنا ہی نہ ہو، یا یہ گمان ہو کہ یہ حدیث ضعیف ہے، جس طرح کچھ سے منقول ہے۔ جن علما نے اس حدیث کی مخالفت کی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر صف کے پیچھے اکیلی عورت کھڑی ہو تو اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ صحیح میں یہ حدیث ہے: ''حضرت انس اور لڑکے نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صف بنائی اور ان دونوں کے پیچھے بوڑھی عورت نے صف بنائی۔''[1] علما کا اتفاق ہے کہ اگر جماعت میں ایک ہی عورت ہو تو اس کا اکیلے کھڑے ہونا صحیح ہے جس طرح حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ امام بھی آگے اکیلا ہی کھڑا ہوتا ہے اور اس کی نماز بھی صحیح ہوتی ہے۔ ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرہ نے صف کے بغیر ہی پیچھے رکوع کر لیا تھا، پھر صف میں داخل ہوئے تو نبی اکرم ﷺ نے ان سے کہا: ''اللہ تمھارے شوق میں اضافہ فرمائے، آیندہ ایسا نہ کرنا۔''[2]

تاہم یہ دلائل کمزور ہیں جو مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر نہی کی دلیل کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے:

① مردوں کی صفوں کے پیچھے اکیلی عورت کا کھڑے ہونا سنت ہے اور اس کو اسی کا حکم ہے، اس لیے اس کا مردوں کی صفوں میں کھڑے ہونا مکروہ ہے، لیکن اکیلے آدمی کا صف کے پیچھے کھڑا ہونا مکروہ اور سنت کا ترک ہے تو منع کو مامور پر کس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح امام کا اکیلے کھڑا ہونا بھی سنت ہے، اس لیے یہاں بھی منع کو مامور پر قیاس کیا گیا ہے جو درست نہیں، صحیح قیاس مسکوت (جس کے بارے میں شریعت خاموش ہو) کو منصوص (جس کا حکم بیان ہوا ہو) پر قیاس کرنا ہوتا ہے، لیکن منصوص کو معارض منصوص پر قیاس کرنا بالاتفاق باطل ہے، مثلاً سود کو بیع پر قیاس کرنا، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

② عورت اس لیے صف میں اکیلی کھڑی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ کھڑی ہونے والی کوئی عورت نہیں ہوتی اور اس کے لیے مردوں کے ساتھ صف بنانا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے اگر اس کے ساتھ نماز میں کوئی عورت ہو تو اس کو اس کے ساتھ ہی کھڑے ہونا چاہیے۔ ایسی صورت میں عورت کا حکم بھی وہی ہے جو اکیلے کھڑے ہونے والے مرد کا ہے۔

اس سے ملتا جلتا مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب پہلی صف مکمل ہو چکی ہو اور آدمی کو صف کے پیچھے کھڑا ہونے کے علاوہ کہیں جگہ نہ ملے تو اس میں ان علما کے ہاں بھی اختلاف ہے جو اکیلے آدمی کی نماز کو باطل قرار دیتے ہیں، تاہم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥٠)

اس جگہ جو راجح بات معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس کی نماز درست ہوتی ہے، کیوں کہ نماز کے تمام واجبات عجز اور عدمِ استطاعت سے ساقط ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکرہ کی جو حدیث ذکر کی جاتی ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ انھوں نے امام کے رکوع سے سر اٹھانے سے پہلے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی تھی، انھوں نے جس طرح رکعت پائی اس کے ساتھ اس صف بندی کو بھی پا لیا، شریعت نے جس کا حکم دیا ہے۔ وہ اس شخص کی طرح ہیں جو اکیلا کھڑا ہو جائے، پھر کوئی دوسرا آ کر اس کے ساتھ صف بنا لے اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔ ابوبکرہ کی حدیث میں جو نہی ہے وہ یہ ہے: «ولا تَعُدْ» ''دوبارہ ایسا نہ کرنا'' اس میں یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے اس کو رکعت دہرانے کا حکم دیا ہو جس طرح اکیلے کی حدیث میں ہے۔ اس میں تو آپ ﷺ نے اس کو نماز دہرانے کا حکم دیا ہے۔ یہ مفصل ہے اور ابوبکر کی حدیث مجمل۔

حنبلی مذہب میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس نہی کو جاننے والے اور نہ جاننے والے میں فرق کیا جائے، لیکن یہ تفریق روا نہیں، کیوں کہ وہ اکیلا نماز پڑھنے والا اس نہی کو نہیں جانتا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس کو دہرانے کا حکم دیا تھا جس طرح آپ ﷺ نے اس دیہاتی کو نماز دہرانے کا حکم دیا تھا جو بار بار اطمینان کے بغیر خراب نماز پڑھ رہا تھا۔

رہا یہ سوال کہ مذکور ائمہ کے قول کی کچھ حیثیت ہے کہ نہیں تو یاد رہے کہ یہ مذکورہ ائمہ اسلام کے نامور ائمہ کے بھی سردار ہیں۔ سفیان ثوری اہلِ عراق کے امام تھے۔ وہ اکثر کے نزدیک ابن ابی لیلیٰ، حسن بن صالح بن حیی اور ابوحنیفہ وغیرہ جیسے اپنے تمام معاصرین سے عظیم تھے۔ ان کا مذہب آج تک خراسان میں موجود ہے۔ اوزاعی اہلِ شام کے امام تھے اور وہ چوتھی صدی تک انھی کے مذہب پر کاربند رہے ہیں، بلکہ اہلِ مغرب بھی مالکی مذہب کے مغرب میں دخول سے پہلے اوزاعی کے مذہب کے پیروکار تھے اور حماد بن ابوسلیمان ابوحنیفہ کے استاذ تھے۔ ان ائمہ کے ساتھ ساتھ امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کا مذہب آج بھی باقی ہے۔ جو داود بن علی اور اس کے پیروکاروں کا مذہب ہے، ان کا مذہب بھی آج تک باقی ہے۔ آج بھی لوگ اس قول کے خلاف اکٹھے نہیں، بلکہ مشرق و مغرب میں اس کے قائلین کی تعداد بے شمار ہے۔

کتاب و سنت میں کہیں ائمہ و مجتہدین کے درمیان فرق کرنے کا حکم نہیں۔ مالک، لیث بن سعد، اوزاعی اور ثوری، یہ سب اپنے اپنے زمانے کے امام تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی تقلید بھی اسی طرح ہے جس طرح دوسروں کی تقلید ہے۔ کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا ہے کہ اس عالم کی تقلید جائز ہے اس کی نہیں۔

اگر وہ قول جو ان ائمہ کا ہے، بعض ان علما کا بھی ہے جن کا مذہب آج باقی ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے قول کو ان کی تائید حاصل ہے اور ان کے مقابلے میں ان کے مخالفین ہم عصروں کو رکھا جائے، مثلاً ثوری اور اوزاعی کے مقابلے میں ابوحنیفہ اور مالک کو رکھا جائے تو امت کا اتفاق ہے کہ اگر مالک، اوزاعی، ثوری اور ابوحنیفہ میں اختلاف ہو تو دلیل کے بغیر یہ کہنا جائز نہیں کہ اس کا قول درست ہے اور اس کا غلط۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۳۹۳۔۴۰۰)

متفرق مسائل

عبادات میں زبان سے نیت کا حکم

سوال طہارت، نماز، روزے اور حج وغیرہ میں نیت کی کیا حیثیت ہے اور یہ کس طرح کی جائے، کیا نیت دل سے ہوتی ہے یا زبان سے اور بلند آواز سے کی جائے یا خاموشی سے؟

جواب الحمد للہ.

نیت کا مقام:

تمام ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ طہارت، نماز، روزے، زکات، حج، جہاد، غلام آزاد کرنے اور دیگر تمام عبادات میں نیت کا مقام اور جگہ دل ہے زبان نہیں، اگر کوئی انسان اپنی زبان سے اپنی دلی نیت کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو اس کے الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اس نیت کا اعتبار ہوتا ہے جو اس کے دل میں ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی زبان سے کسی نیت کا اظہار کرے، لیکن وہ نیت اس کے دل میں نہ ہو تو یہ (زبان سے بولنا) اس کو کفایت نہیں کرے گا، اس پر بھی ائمہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔

نیت، قصد و ارادے کی قبیل سے ہے، ایک عربی مقولہ ہے: "نَوَّاكَ اللّٰهُ بخير" ''اللہ تیرے ساتھ خیر کا قصد کرے۔'' فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ»[1] ''عملوں کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔''

''ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھی، اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی اور جس کی ہجرت دنیا کے لیے تھی کہ وہ اس کو مل جائے یا کسی عورت کے لیے تھی کہ اس کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے ہوگی جس کا اس نے قصد کیا ہوا ہے۔'' اس حدیث میں نیت سے رسول اللہ ﷺ کی مراد وہ نیت ہے جو دل میں ہوتی ہے، وہ نہیں جو زبان سے ادا کی جاتی ہے۔ اس بات پر بشمول ائمہ اربعہ تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۰۷)

اس حدیث کا سبب بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، اس کا سبب یوں ہے کہ ایک آدمی نے مکہ سے مدینہ اس غرض سے ہجرت کی کہ وہ امِ قیس نامی خاتون سے شادی کر سکے تو اس کو مہاجرِ امِ قیس یعنی امِ قیس کی خاطر ہجرت کرنے والا کہا جانے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ بات ذکر کی کہ یہ اس شخص کی دلی نیت تھی۔

با آوازِ بلند نیت کا حکم:

بلند آواز سے نیت کرنا بالاتفاق واجب ہے نہ مستحب، بلکہ بلند آواز سے نیت کرنے والا بدعتی اور شریعت مخالف شخص ہے۔ اگر وہ اس نقطہ نظر سے یہ کام کرے کہ ایسا کرنا شریعت کا حکم ہے تو وہ گمراہ اور جاہل ہے اور سزا و تعزیر کے قابل ہے۔ اگر وہ اچھی طرح واضح کر دینے اور بتا دینے کے باوجود اس پر اصرار کرتا ہے اور بالخصوص بلند آواز کے ساتھ بار بار یہ عمل کر کے دوسروں کو اذیت پہنچاتا ہے تو اس کو سخت سزا دینی چاہیے۔

یہ کسی امام یا عالم کا قول نہیں کہ جو بلند آواز سے نیت کرتا ہے، خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہو یا اکیلا ہو، وہ اس سے بہتر ہے جو آہستہ آواز کے ساتھ نیت کرتا ہے، بلکہ ائمہ اربعہ اور تمام ائمہ کے نزدیک آہستہ آواز کے ساتھ بھی بول کر نیت کرنا بالکل ضروری نہیں۔ کسی امام کا یہ قول نہیں کہ طہارت یا نماز یا روزے یا حج میں بول کر نیت کرنا واجب ہے۔

نماز پڑھنے والے کے لیے قطعاً ضروری نہیں کہ وہ اپنی زبان سے کہے: میں فجر کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ یا ظہر کی یا عصر کی، یا مغرب کی یا عشا کی، یا بطورِ امام پڑھ رہا ہوں یا مقتدی، یا فرض پڑھ رہا ہو یا نفل، یا اس طرح کی اور بات، بلکہ نیت کا دل میں ہونا ہی کافی ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے جو دلوں میں ہوتا ہے۔

اسی طرح غسلِ جنابت اور وضو کرتے وقت بھی دلی نیت ہی کافی ہوتی ہے۔ رمضان میں روزے دار کے لیے بھی بالاتفاق ضروری نہیں کہ وہ کہے میں کل روزہ رکھ رہا ہوں، بلکہ اس کو بھی دلی نیت ہی کافی ہو گی۔

نیت علم کے تابع ہوتی ہے:

نیت علم کے تابع ہوتی ہے جس کو علم ہو کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے لیے اس کی نیت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کو علم ہو کہ کل رمضان ہے اور وہ رمضان کے روزے رکھتا ہو تو اس کے لیے روزے کی نیت کرنا ضروری ہے۔ اگر اسے علم ہو کہ کل عید ہے تو اس رات وہ روزے کی نیت نہیں کرتا۔ اسی طرح نماز کا معاملہ ہے۔ اگر نمازی کو علم ہے کہ جو نماز کھڑی ہے وہ فجر کی ہے یا ظہر کی ہے اور اس کو یہ علم بھی ہے کہ وہ فجر یا ظہر کی نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ اس نماز کی نیت کرے گا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کو یہ تو علم ہو کہ یہ نماز جو کھڑی ہے فجر کی ہے اور وہ ظہر کی نیت کے لیے بیٹھا ہو! اسی طرح جب اس کو معلوم ہو کہ وہ بطور امام نماز پڑھ رہا ہے یا بطور مقتدی پڑھ رہا

ہے تو ضروری ہے کہ وہی اس کی نیت بھی ہو، کیونکہ نیت لازمی طور پر علم و اعتقاد کے تابع ہوتی ہے۔ جب انسان کو علم ہو کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اسی کی نیت کرے۔ اگر اس کو علم ہے کہ وہ ظہر کی نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو کہ جو نماز کھڑی ہے وہ ظہر ہی کی ہے تو اس کے علاوہ کسی دوسری نماز کا قصد ممتنع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سمجھتا ہو کہ نماز کا وقت تو نکل چکا ہے تو اس کی وہ نماز اس کو کفایت کر دے گی۔ اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ وقت نکل چکا ہے اور وہ وقت کے بعد اس نماز کی نیت کرے، پھر بعد میں اس کو معلوم ہو کہ اس نے وہ نماز وقت ہی پر پڑھی ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ اگر وہ جنازہ پڑھنے کا قصد کرتا ہے، خواہ وہ مرد کا ہو یا عورت کا، وہ مرد کا سمجھتا رہا، لیکن وہ عورت کا نکل آیا تو اس کی نیت کے خلاف اس کی نماز ہو جائے گی۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بول کر نیت کرنا کسی بھی امام کے نزدیک واجب نہیں۔

بول کر نیت کرنے میں شافعیہ کا اختلاف:

تاہم ایک متاخر شافعی امام نے شافعی مذہب میں اس کے واجب ہونے کی ایک صورت نکالی ہے، لیکن جمہور شافعیہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ اس کو اس بات سے غلطی لگی کہ امام شافعی نے کہا ہے: اس کو شروع میں بولنا ضروری ہے تو یہ غلط سمجھنے والا سمجھ بیٹھا کہ امام شافعی نے اس بات سے بول کر نیت کرنا مراد لیا ہے، لیکن تمام شافعیہ نے اس کو غلط قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ امام صاحب نے شروع میں تکبیر کو بولنا مراد لیا ہے، نیت کو بولنا نہیں۔

بول کر نیت کرنے کا حکم:

لیکن یہ سوال کیا بول کر نیت کرنا مستحب ہے کہ نہیں؟ تو اس میں فقہا کے دو معروف اقوال ہیں:

کچھ کے نزدیک بول کر نیت کرنا مستحب ہے، یہ ابو حنیفہ شافعی اور احمد کے اصحاب سے منقول ہے۔ ان کے نزدیک بول کر نیت کرنا زیادہ تاکید کا باعث ہے، اس لیے انھوں نے نماز، روزے اور حج وغیرہ میں بول کر نیت کرنے کو مستحب کہا ہے۔ دوسرے فقہا کے نزدیک بول کر نیت کرنا مستحب نہیں۔ یہ اصحابِ مالک اور اصحابِ احمد کا قول ہے اور مالک اور احمد سے بھی یہی منقول ہے۔ امام احمد سے پوچھا گیا کہ کیا آپ تکبیر سے پہلے کچھ کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ اور یہی درست بھی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تکبیر سے پہلے کچھ نہیں کہتے تھے اور طہارت، نماز، روزے، حج یا کسی بھی عبادت کے شروع میں بول کر نیت نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا کا عمل بھی یہی تھا۔ آپ ﷺ نے کسی کو بول کر نیت کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ جس صحابی کو آپ ﷺ نے نماز سکھائی اس سے کہا: اللہ اکبر کہہ! صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کا آغاز تکبیر

کے ساتھ کرتے، اس کے بعد الحمد للہ رب العالمین پڑھتے۔[1] معلوم ہوا کہ آپ ﷺ تکبیر سے پہلے بول کر نیت نہیں کرتے تھے، یا کوئی اور چیز بھی نہیں پڑھتے تھے اور آپ ﷺ نے کسی مسلمان کو یہ عمل سکھایا بھی نہیں تھا۔ اگر یہ عمل مستحب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اسے کرتے اور مسلمان اس کو اہمیت دیتے۔

حج کا آغاز تلبیہ سے:

اسی طرح حج کا معاملہ ہے۔ احرام کا آغاز تلبیہ کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمانوں کو حج کے شروع میں تلبیہ کہنے کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ضباعۃ بن زبیر سے کہا تھا: ''حج کر اور مشروط کر لے، اس طرح کہہ: "لَبّیك اللهم لبّیك، و محلي حیث حبستني"[2] جہاں تو نے مجھے روک دیا، وہی میرے احرام کھولنے کی جگہ ہوگی۔'' آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ تلبیہ کے بعد مشروط کر لے۔ آپ ﷺ نے کسی کو حکم نہیں دیا کہ وہ تلبیہ سے پہلے بھی کچھ کہے یا کہے: اے اللہ! میں حج، عمرہ کا ارادہ رکھتا ہوں، یا حج یا عمرے کا ارادہ رکھتا ہوں، یا کہے: اسے میرے لیے آسان کر دے اور قبول فرما، یا یہ کہے: میں نے دونوں کی نیت کی ہوئی ہے، یا یہ کہے کہ میں نے اللہ کے لیے احرام باندھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مختصر بات یہ ہے کہ تلبیہ سے پہلے کچھ بھی کہنے کا حکم نہیں، بلکہ حج میں تلبیہ کو نماز میں تکبیرِ تحریمہ کی اہمیت حاصل ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام علیہم السلام یہی کہا کرتے تھے: "فلان أهلَّ بالحج" ''فلاں نے حج کا تلبیہ پڑھا۔'' "فلان أَهَلَّ بالعمرة" ''فلاں نے عمرے کا تلبیہ پڑھا۔'' "أو أهل بهما جمیعاً" ''دونوں کا تلبیہ پڑھا۔'' جس طرح کہا جاتا ہے "کبر للصلاة" ''فلاں نے نماز کے لیے تکبیرِ تحریمہ کہی۔'' یعنی اِہلال کا مطلب ہوتا ہے بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا، آپ ﷺ اپنے تلبیہ میں کہا کرتے تھے: « لبیك حَجًّا و عمرةً »[3] ''میں حج اور عمرہ کے لیے حاضر ہوں۔'' آپ نے جو کرنا ہوتا اس کی نیت تلبیہ کے بعد کرتے، پہلے نہیں۔

لوگوں نے تکبیرِ تحریمہ، تلبیہ، طہارت او دیگر تمام عبادات کے شروع میں جو بول کر نیت کرنے کا عمل ایجاد کیا ہے، یہ بدعت میں شمار ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم نہیں دیا۔

بدعت کا مفہوم اور قباحت:

دو پہلوؤں سے مشروع عبادات میں ایسے اضافے کرنا جو رسول اللہ ﷺ سے منقول نہ ہو اور آپ ﷺ نے ان کا حکم نہ دیا ہو، بدعت کہلاتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ عبادات میں ان کے ترک پر مداومت کیا کرتے تھے، لہٰذا

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٩٨)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨٠١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٠٧، ١٢٠٨)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٣٢، ١٢٥١)

ان کو کرنا اور ان پر مداومت کرنا دو وجوہات سے بدعت اور گمراہی ہے: ایک اس اعتبار سے کہ اس کام کو کرنے والا اس کو شرعی حکم اور مستحب سمجھتا ہے، یعنی اس کو کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی وہ کام نہیں کیا ہوتا، لہٰذا ان کی بات کی حقیقت یہی ہوتی ہے کہ ہمارا یہ فعل رسول اللہ ﷺ کے فعل سے زیادہ کامل اور افضل ہے۔

ایک آدمی نے امام مالک بن انس سے میقات سے پہلے احرام باندھنے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: مجھے خدشہ ہے تو کسی فتنے کا شکار نہ ہو جائے۔ اس نے کہا: اس میں کیا فتنہ ہو سکتا ہے؟ بلکہ یہ تو اللہ کی اطاعت میں ہی کچھ میل زیادہ ہیں! انھوں نے جواب دیا: اس سے بڑھ کر اور کیا فتنہ ہوگا کہ اپنے دل میں یہ سمجھ بیٹھے کہ تجھے ایسی فضیلت حاصل ہو گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو بھی حاصل نہیں ہو سکی؟!

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي))[1] ''جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں۔''

ہر وہ شخص جو یہ سمجھتا ہے کہ کوئی سنت رسول اللہ ﷺ کی سنت سے افضل ہے، لہٰذا وہ سنتِ رسول چھوڑ کر اس کام میں دلچسپی رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے افضل کام کر رہا ہے تو اس کا آپ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں رہتا، کیونکہ بہترین کلام اللہ کا کلام اور بہترین سیرت رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ جب خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے تو یہ بات کہا کرتے تھے: جو یہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کی سیرت محمد ﷺ کی سیرت سے افضل ہے، وہ مبتلائے فتنہ، بلکہ گمراہ ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار اور تمام لوگوں پر آپ ﷺ کی حجت ثابت کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں فرما دیا ہے:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ نہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

نجات اتباعِ رسول میں ہے:

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو اپنی اتباع کا حکم دیا ہے اور انھیں یہ عقیدہ سکھایا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قرار دیے گئے واجب کو واجب اور مستحب کو مستحب سمجھیں اور اس سلسلے میں کوئی بھی آپ ﷺ سے افضل نہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا وہ آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ))[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٠)

''انتہا پسند ہلاک ہوئے۔'' آپ ﷺ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔ ''متنطعون'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس جگہ سختی کرتے ہیں جہاں سختی کا حکم نہیں۔ حضرت ابی بن کعب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ سنت میں اعتدال بدعت میں اجتہاد سے بہتر ہے۔

''نعمت البدعة هذه'' کا صحیح مفہوم:

کوئی شخص جماعت کے ساتھ تراویح پڑھنے کو بنیاد بنا کر بدعت کے لیے راہ نہیں نکال سکتا کہ جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''نعمت البدعة هذه'' ''یہ اچھی بدعت ہے۔'' کیونکہ یہاں لفظ بدعت سے شرعی بدعت نہیں، بلکہ لغوی بدعت مراد ہے۔ کوئی کہتا پھرے کہ صحابہ نے وہ کام کیا تھا جو وہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں نہیں کرتے تھے۔ یہ بدعت نہیں بلکہ شریعت میں سنت ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکالنا، کوفہ اور بصرہ وغیرہ کی طرح کے نئے شہر بسانا، قرآن کریم جمع کرنا، محکمہ دیوان قائم کرنا اور اس طرح کے دیگر کاموں کو بھی بدعت کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا، قیامِ رمضان کی سنت خود رسول اکرم ﷺ نے جاری کی تھی، آپ ﷺ نے چند راتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جماعت کے ساتھ تراویح پڑھائی، وہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں اکیلے بھی پڑھتے تھے اور جماعت کے ساتھ بھی، لیکن آپ ﷺ نے ایک جماعت پر ہمیشگی اختیار نہ کی کہ کہیں یہ فرض نہ ہو جائے، جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو اس وقت شریعت مقرر ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ان کو ایک امام ابی بن کعب کی زیرِ امامت نماز پڑھنے کے لیے جمع کیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر کے اس حکم کے مطابق تراویح جماعت کے ساتھ پڑھنا شروع کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین میں شمار ہوتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا ہے: ''میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت اختیار کرو اور اس کو ڈاڑھوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑو۔''[1] صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''نمازِ سفر دو رکعات ہیں، جس نے سنت کی مخالفت کی، اس نے کفر کیا۔''[2] یعنی جس نے یہ عقیدہ اور نظریہ رکھا کہ مسافر کے لیے سفر میں دو رکعات کافی نہیں ہوتیں، اس نے کفر کیا۔

بدعات کی قباحت کا دوسرا پہلو:

دوسرا اس اعتبار سے بھی وہ عملِ بد ہوتا ہے کہ وہ ایسے عمل پر مداومت اور ہمیشگی کرتا ہے جو اس عمل کے خلاف

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٤٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٧)

ہوتا ہے جس پر رسول اللہ ﷺ عبادات میں مداومت کرتے تھے، یہ بالاتفاق بدعت ہے، اگرچہ کوئی گمان کرنے والا گمان کرتا رہے کہ اس نے جو اضافہ کیا ہے اس میں بہتری ہے جس طرح بعض پہلے لوگوں نے عیدین کی نمازوں کے لیے اذان اور اقامت کو جاری کیا تھا، تو یاد رہے کہ ان کو اس سے منع کیا گیا اور ائمہ اسلام نے اس عمل کو ناپسند کیا تھا۔

اگر کوئی شخص طواف کی دو رکعات پر قیاس کرتے ہوئے سعی کے بعد بھی دو رکعات پڑھ لے، اس عمل کو بعض متاخر شافعیوں نے مستحب قرار دیا اور بعض متاخر حنبلیوں نے حاجی کے لیے مستحب قرار دیا کہ وہ جب مسجدِ حرام میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد سے آغاز کرے۔ ان لوگوں نے ائمہ اور سنت کی مخالفت کی ہے۔ سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص احرام باندھ کر مسجدِ حرام میں داخل ہو تو طواف سے آغاز کرے۔ رسول اللہ ﷺ جب مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا تھا، لیکن مقیم کے برعکس جو صرف نماز کے لیے آتا ہے، طواف کے لیے نہیں، یہ اگر تحیۃ المسجد پڑھ لے تو اچھا ہے۔

تحریم وتحلیل کا اختیار:

مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لیے دین مکمل کر دیا ہے اور اس نے آنحضرت ﷺ کے ذریعے امت پر اپنی نعمت کا اتمام کر دیا ہے، لہٰذا جو انسان کسی ایسے عمل کو واجب قرار دے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے واجب قرار نہیں دیا، یا مکروہ نہیں کہا تو وہ غلط ہے۔

تمام ائمہ دین کا اتفاق ہے کہ حرام وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول حرام قرار دیں اور دین بھی وہی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول دین قرار دیں۔ جو اس راہ سے نکلتا ہے وہ اللہ کے ساتھ لڑائی میں کود پڑتا ہے اور جو کسی ایسی بات کو دین قرار دیتا ہے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی اور اس کام کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام نہیں کہا، وہ اہلِ جاہلیت کا دین ہے جو رسول ﷺ کے مخالف تھے اور اللہ تعالیٰ نے سورت انعام اور سورت اعراف وغیرہما میں ان کی مذمت کی ہے، کیونکہ انھوں نے بھی اپنی طرف سے دین سازی کی اور حرام و حلال بنا لیے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔

بنا بریں اللہ پر ایمان رکھنے والوں کا دین یہ ہے کہ احکام کی پانچ صورتیں ہیں: واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام۔ یہ سارے احکام رسول اللہ ﷺ سے لیے جاتے ہیں۔ واجب وہی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول واجب کہیں اور حلال بھی وہی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول حلال کہیں۔ اب ان احکام میں کچھ ایسے ہیں جن پر ائمہ دین کا اتفاق ہے اور کچھ میں اختلاف، جس میں اختلاف ہو اس کو بھی اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف لوٹانے کا حکم ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [النساء: ٥٩]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔

جو انسان ایسی بات کہتا ہے جو جہالت اور ائمہ دین کی مخالفت پر مبنی ہو اس کو اس سے منع کیا جائے۔ اگر اصرار کرے تو اس کی تادیب کی جائے، جس طرح ایسے لوگوں کا علاج ہے۔ خلافِ شریعت کسی امامِ جہالت کی بات قبول نہیں کرنی چاہیے، چاہے علم میں اس کا کتنا ہی شہرہ ہو، کسی بزرگ کا قول ہے: "لا تنظر إلى عمل الفقيه ولكن سَلْه يُصَدِّقْكَ" "کسی فقیہ کے عمل کو نہ دیکھ، بلکہ اس سے پوچھ۔" واللہ أعلم [1]

غیر مسلک کا امام

سوال حنفیوں کی ایک جماعت کو ایک مدت سے شافعی امام نماز پڑھا رہا ہے، کیا اس کے پیچھے ان کی نماز درست ہے، نیز کیا یہ کام کرنے والا قابلِ تعزیر ہے؟

جواب اجتہادی مسائل میں اختلاف کے باوجود مسلمانوں کا ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا بلا اختلاف جائز ہے اور ائمہ سلف کا یہی مذہب ہے۔ صحابہ و تابعین نماز اور دیگر امور کے مسائل میں آپس کے اختلاف کے باوصف ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اگر امام کوئی ایسا کام کرتا ہے جس کی اجتہاد اجازت دیتا ہے، مقتدی اس میں اس کی پیروی کرے گا گو وہ اس کی رائے کے خلاف ہو، مثلاً کوئی قنوت کا قائل نہیں اور اس کو قنوت کے قائل امام کے پیچھے نماز پڑھنی پڑے تو علما کے صحیح تر قول کے مطابق وہ امام کے ساتھ قنوت کرے گا۔ ایسے ہی اگر امام وتر علاحدہ کر کے پڑھنے کا قائل ہو اور مقتدی ملا کر پڑھنے کا تو وہ امام کی پیروی ہی کرے گا، ایسے ہی اس کے عکس۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ» [2] "امام اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔"

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۲/۲۱۷۔۲۲۷)

(2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۰۱، ۱۰۶۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۱۱)

فرمایا:

«لَا تَخْتَلِفُوْا عَلَى أَئِمَّتِكُمْ» [1] ''اپنے ائمہ کی مخالفت نہ کرو۔''

لہٰذا سنت بھی یہی ہے اور مسلمانوں کا اتفاق بھی یہی ہے کہ مقتدی امام کی متابعت کی وجہ سے وہ کام بھی کرے گا جو اس کے لیے انفرادی صورت میں نماز پڑھتے ہوئے جائز نہیں ہوتا، مثلاً نماز سے پیچھے رہ جانے والا اگر امام کو رکوع میں پاتا ہے اور تکبیر کہہ کر رکوع میں شامل ہو جاتا ہے تو اس کی رکعت شمار ہوتی ہے، لیکن اگر سجدے میں پائے اور تکبیر کہہ کر سجدے میں شامل ہو جائے تو اس کی رکعت شمار نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مقتدی امام کے ساتھ اپنی طاق رکعت میں تشہد پڑھتا ہے۔ اگر اکیلے نماز پڑھتے ہوئے ایسا کرے تو اس پر بالاتفاق سجدہ سہو کرنا واجب ہو جاتا ہے، پھر اگر مقتدی بھول جائے اور امام نہ بھولے تو وہ اپنے بھولنے کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں کرتا، مگر امام بھول جائے اور مقتدی نہ بھولے تو اس کو امام کی اقتدا میں سجدۂ سہو کرنا پڑتا ہے۔

ہاں امام اگر اپنے اجتہاد کی بنا پر کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو مقتدی کے نزدیک واجب ہے یا ایسا کام کرتا ہے جو مقتدی کے نزدیک حرام ہے، مثلاً کوئی شافعی جو بسم اللہ کا قائل ہے، مالکی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے جو بسم اللہ کا قائل نہیں، یا خون نکلنے کی وجہ سے وضو ٹوٹ جانے کا قائل کوئی حنفی یا حنبلی خون سے وضو نہ ٹوٹنے کے قائل مالکی یا شافعی کے پیچھے نماز پڑھتا ہے تو اس طرح کے مسائل میں اگر مقتدی کو یقین ہو تو اس کی نماز ہونے یا ہونے سے متعلق علما کے دو مشہور اقوال ہیں اور یہ اختلاف شافعی، حنبلی اور حنفی مذہب میں ہے۔ اس کے پیچھے نماز صحیح ہونے میں مالکی مذہب کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں۔ جن اجتہادی مسائل میں نصوص کا تعارض ہو جائے ان میں امام احمد کا مشہور مذہب بھی یہی ہے۔ ایسے ہی امام شافعی سے مالکیہ کے پیچھے نماز پڑھنا ثابت ہے، حالانکہ ان کو ان کے بسم اللہ نہ پڑھنے کا علم تھا۔ ابو یوسف ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حالانکہ اس نے سینگی لگوائی اور امام مالک نے اس کو اس سے وضو نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیا۔

اس کی دلیل صحیح بخاری میں مروی یہ حدیثِ رسول ﷺ ہے، فرمایا: ''وہ تمھیں نماز پڑھاتے ہیں۔ اگر ان کی نماز صحیح ہو تو وہ تمھارے لیے بھی ہے اور ان کے لیے بھی۔ اگر غلطی کریں تو وہ تمھارے لیے تو ہے مگر ان کے خلاف جائے گی۔'' [2]

اس حدیث میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ اگر امام غلطی کرے تو وہ اس کے سر ہے، مقتدی کے سر نہیں۔ ایسے مسائل میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ امام سے غلطی ہوئی ہو تو آپ ﷺ کے بیان کے مطابق امام کی غلطی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

کا مقتدی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ اس جواب سے فقہا کی اس قیاس کی غلطی بھی عیاں ہو جاتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''مقتدی اگر امام کی نماز کے نہ ہونے کا عقیدہ اور سوچ رکھتا ہے تو اس کے پیچھے اس کی نماز ایسے شخص کے پیچھے نماز تصور ہو گی جس کی نماز وجود ہی نہیں رکھتی، مثلاً کوئی جان بوجھ کر بے وضو نماز پڑھے تو اس کی نماز کا وجود ہی نہیں ہوتا'' یہ غلط قیاس ہے، کیوں کہ یہاں مقتدی کو امام کے مجتہد ہونے کا علم ہے۔ اگر اس نے درست عمل کیا تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ اگر غلطی کی تو ایک اجر کا مستحق ہوگا اور اس کی غلطی معاف شدہ ہے۔ جب مقتدی کو یہ علم ہے کہ امام کو اس کام کا گناہ نہیں ملے گا تو وہ اس کی نماز کے باطل ہونے کا عقیدہ رکھے، یہ ناممکن ہے۔ گو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی نماز کو باطل سمجھے، جیسے اگر وہ کوئی ایسا کام کرے جس کے حرام یا واجب ہونے کا علم رکھتا ہو وہ اس کے دین اور کردار کے لیے تو عیب اور طعنہ بنے گا، لیکن اگر کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کی بنا پر ایسا کچھ کرتا ہے تو وہ اس کے دین اور کردار پر دھبہ نہیں بنتا۔

علی ہذا القیاس اگر تو اس نے بھول کر بے وضو نماز پڑھ لی، پھر نماز کے بعد اس کو علم ہوا تو مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک مقتدی نماز نہیں دہرائیں گے۔ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ ایسے ہی جو پانی نہ ہونے یا کسی مجبوری کی وجہ سے پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو اس سے وضو ساقط ہو جاتا ہے اور وہ جب تیمّم کے ساتھ نماز پڑھائے تو مالک، شافعی، احمد، ابو حنیفہ اور یوسف جیسے جمہور فقہا کے نزدیک وضو کر کے نماز پڑھنے والے اس کی اقتدا کریں گے۔ اس کی دلیل غزوۂ ذات السلاسل میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا اپنے ساتھیوں کو تیمّم کے ساتھ نماز پڑھانا ہے اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فعل بھی ہے۔ واللہ أعلم [1]

مخالف مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم اور امام مالک کے مذہب کی اہمیت

سوال ایک شافعی فقیہ نے کہا ہے کہ مالکی امام کے پیچھے نماز نہیں ہوتی اور اس نماز کو دہرانا ضروری ہے، کیا اس کی یہ بات درست ہے؟ اگر درست نہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟ فتویٰ عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب الحمد للہ. اس طرح کی بات مطلقاً کہنا بدترین برائی اور قبیح تر رائے ہے، علی الاطلاق یہ بات کہنے والا سخت تعزیر کا مستحق ہے، کیوں کہ یہ بات ان معزز ائمہ کی گستاخی پر منتج ہوتی ہے جس کے لیے شدید سزا ہے اور ایسا شخص گمراہ بدعتیوں کے زمرے میں آ جاتا ہے۔

امامِ مدینہ طیبہ، کہ جہاں سے سنت و شریعت کا آغاز ہوا اور علم و ایمان کے چشمے پھوٹے اور امامِ اعظم مالک بن انس کا مذہب تمام فقہی مذاہب سے زیادہ قدر و منزلت کا حامل ہے، یہاں تک کہ اہلِ مدینہ کا اجماع حجت ہے یا

---

[1] جامع المسائل (٨/٤٤٣-٤٤٧)

نہیں، فقہا کے درمیان ایک نزاعی حیثیت رکھتا ہے، مگر مدینہ طیبہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر کے فقہا کا اجماع بالاتفاق حجت نہیں۔ تاہم اہلِ مدینہ کے اجماع کے حجت ہونے کے بارے میں صحیح تر رائے یہ ہے کہ پہلے تین خلفائے راشدین حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں حجت تھا مگر حضرت علی مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گئے تھے۔

اہلِ مدینہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیمانے صاع اور سبزیوں کی زکات وصول نہ کرنے سے متعلق جو اجماع نقل کیا ہے حجت کا درجہ رکھتا ہے اور اسے تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح اس زمانے میں اہلِ مدینہ کا اجماع دوسرے بلاد کے علما کے اجماع پر فوقیت رکھتا ہے اور جب دو دلیلوں میں تعارض پیدا ہو جائے تو اسے دور کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو دلیل اہلِ مدینہ کے عمل کے مطابق ہو، راجح ہو گی۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ امام احمد اور ان کے محقق اصحاب سے بھی یہی منصوص و منقول ہے۔

امت کے علما و مشائخ، امرا، شاہان اور عوام کے دلوں میں امام مالک کی جو قدر و منزلت تھی ان کے ہم عصروں میں سے کسی کے حصے میں نہ آئی اور ان کے وقت میں امت میں ان سے بڑھ کر کوئی جلیل القدر عالم نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث بھی منقول ہے جس کا مصداق امام مالک کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

ان کے بعد آنے والے ائمہ مثلاً شافعی اور احمد وغیرہما ان کے اصول و قواعد کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور ان میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ اس بات پر بھی ان کا اتفاق تھا کہ اس زمانے میں روایت و درایت کے اعتبار سے اہلِ مدینہ کا مذہب دیگر تمام اسلامی علاقوں کے مذاہب سے زیادہ صحیح تھا۔

اس لیے اس طرح کی خبیث اور پراگندہ بات مطلقاً کہہ دینا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، صحابہ و تابعین اور اسلافِ امت فروعی مسائل اور نماز کے واجبات اور مبطلات میں اختلاف رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جو شخص اجتہادی مسائل میں فقہا کے اختلاف کی وجہ سے مختلف فقہی مذاہب کے اماموں کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکتا ہے وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔ اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی بابت کہا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ١٥٩]

''بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں۔''

فرمایا:

﴿ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ﴾ [آل عمران: ١٠٣]

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔''

نیز:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَٰتُ ﴾ [آل عمران: ۱۰۵]

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے۔''

ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات ہیں جو جماعت بندی اور اتفاق کا حکم دیتی ہیں اور اختلاف اور فرقہ پرستی سے روکتی ہیں۔

کتاب و سنت کی نصوص اور صحابہ و تابعین کے اجماع سے ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادی مسائل میں ولی امر کی پیروی کی جائے گی، وہ نماز پڑھانے والا امام ہو، حاکمِ وقت ہو، سپہ سالار ہو، یا زکات اکٹھی کرنے پر مامور نہ کہ ولی امر ان مسائل میں اپنے پیروکاروں کی فرماں برداری کرے گا، بلکہ اس کی فرماں برداری کرنا اور اس کی رائے کے لیے اپنی رائے چھوڑ دینا پیروکاروں کی ذمے داری ہے، کیوں کہ جماعت بندی اور باہمی اتفاق و الفت کی مصلحت اور اختلاف اور فرقے بندی کی مفسدت جزئی مسائل میں اختلاف سے زیادہ اہم ہے، اس لیے حکام اور ذمے دارانِ اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے فیصلے کی مخالفت درست نہیں۔ اس طرح کے خود ساختہ فقہا بعض فقہا کی غلط باتیں سن کر اس طرح کے شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اگر امام وہ واجب نماز ادا نہیں کرتا جو مقتدی کے مذہب میں واجب ہوتی ہے یا ایسا کام کرتا ہے جو مقتدی کے مذہب میں نماز کو فاسد کر دیتا ہے، تو کچھ فقہا کے نزدیک مقتدی کی نماز مطلقاً باطل ہو جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے ایسے امام کے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی جو واجباتِ نماز کے لیے وجوب کا مذہب نہیں رکھتا۔ یہ اطلاقات غلط، نیز پرانے اجماع اور ائمہ متبوعین کی نصوص اور ارشادات کے خلاف ہیں، مثلاً مقتدی کا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جس کے نزدیک جسم سے خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، یا جو شرم گاہ کو چھونے کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا قائل نہیں، یا قہقہہ مارنے کو وضو توڑنے والا عمل نہیں سمجھتا، جب کہ مقتدی کے نزدیک ان سارے امور کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہو اور نئے سرے سے کرنا ضروری ہو تو کیا ایسے امام کے پیچھے ایسے مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے؟ اس میں قطعی درست رائے یہی ہے کہ ان کی ایک دوسرے کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے۔ ائمہ کا مذہب یہی ہے، گو کچھ ضمنی مسائل میں ان کا اختلاف منقول ہے۔

امام شافعی ہمیشہ مدینہ اور مصر کے اماموں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اس وقت مالکی مذہب سے تعلق رکھتے تھے جو نہ بلند آواز بسم اللہ پڑھتے تھے نہ آہستہ آواز سے۔ اگر امام شافعی کسی شخص کو اپنی ان نمازوں پر اعتراض کرتے ہوئے پاتے جو انھوں نے اپنے استاد امام مالک اور دیگر مالکی ائمہ کے پیچھے پڑھیں، تو اس کو گمراہ اور خلافِ اجماع قرار دیتے۔

امام احمد کے نزدیک زیادہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ اگر امام اس وجہ سے وضو نہ کرے تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے؟ انھوں نے تعجب سے کہا: سبحان اللہ! یعنی سعید بن مسیّب اور مالک بن انس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جائے گی؟! یعنی یہ ائمہ کہ امت ان کے پیچھے نماز پڑھنے پر متفق تھی، سبیلین (پیشاب اور پاخانے کے مقامات) کے علاوہ جسم کے کسی بھی حصے سے خون نکلنے کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں تھے۔

ایسے ہی ابو یوسف نے جب (میرے خیال میں) ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا تو خلیفہ نے سینگی لگوائی۔ امام مالک نے اس کو اس کی وجہ سے وضو نہ ٹوٹنے کا فتویٰ دیا تو اس نے ازسر نو وضو کیے بغیر ہی نماز پڑھائی۔ قاضی ابو یوسف سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اس کے پیچھے نماز پڑھی؟ انھوں نے جواب دیا: سبحان اللہ! امیر المومنین کے پیچھے نماز نہ پڑھوں؟!

مقصد یہ تھا کہ مسلمان حکمرانوں کے پیچھے نماز نہ پڑھنا رافضہ، معتزلہ اور خوارج جیسے بدعتیوں کا کام ہے۔

ان ائمہ کے یہ ارشادات ایسے کسی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کی تائید نہیں کرتے جو مطلقاً ایسے امام کی اقتدا جائز قرار نہیں دیتا، جو ایسا فعل نہیں کرتا جو مقتدی کے مذہب میں واجب ہو۔

مزید وضاحت یوں بھی ہوتی ہے کہ امام اگر طہارت کرنا بھول جاتا ہے اور نماز پڑھانے کے بعد اس کو یاد آتا ہے کہ اس کو وضو یا غسل کرنا تھا تو اس صورت میں مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے اور قضا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ امام مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے اور خلفائے راشدین میں سے حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔ لہٰذا امام اگر نفسِ امر میں یعنی کسی مسئلے کے وجوب وغیرہ میں خطا پر ہے تو وہ بھولنے والے کے قائم مقام ہے۔ اور کتاب و سنت کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطا اور بھول معاف کر دی ہے، لہٰذا اگر ایسے امام کے پیچھے مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے، جس کے لیے ان کو دہرانا ضروری ہو تو ایسے امام کے پیچھے بالاولیٰ ہو گی جس کے لیے اسے دہرانا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ مقتدی کی نماز اگر امام کی نماز کے ساتھ مربوط نہیں، بلکہ دونوں اپنی اپنی نماز پڑھتے ہیں تو اس میں کوئی قابلِ گرفت بات نہیں۔ اگر اس کی نماز امام کی نماز کے ساتھ مربوط ہے تو امام اجتہادی مسائل میں قابلِ گرفت نہیں ہوتا، اس لیے اجتہاد کی وجہ سے اس کی نماز مقتدی کے نزدیک بھی صحیح ہے۔

یہاں غلط فہمی کی وجہ یہ خیال ہے کہ مقتدی امام کی نماز باطل سمجھتا ہے، حالانکہ اس طرح نہیں۔ امام جب اپنے معقول اجتہاد کے ذریعے نماز پڑھاتا ہے تو اس صورت میں اس کی نماز کو باطل نہیں، صحیح ہی قرار دیا جائے گا، جس طرح دیگر اجتہادی مسائل میں اس کے فیصلے کو درست قرار دیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت سے روکا جاتا ہے۔

جہاں تک بھول کر کوئی ممنوع کام کرنے کا تعلق ہے تو یہ اتنا سنگین نہیں، کیوں کہ امام مالک، شافعی اور ایک

روایت میں امام احمد کے نزدیک نماز میں بھول کر کوئی بات کر لینے کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی اور اسے دہرانا بھی لازم قرار نہیں دیتے۔ امام اگر کوئی ممنوع کام تاویل کی بنا پر کرتا ہے تو یہاں غلطی اور خطا کا شکار بھولنے والے کی طرح ہے۔ اس وجہ سے جب اس کے لیے خود اپنی نماز دہرانا ضروری نہیں تو اس کی اقتدا کیوں درست نہیں؟

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يُصَلُّوْنَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصَابُوْا فَلَكُمْ، وَإِنْ أَخْطَأُوْا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ »[1]

''وہ تمھارے لیے بھی نماز پڑھتے ہیں۔ اگر درست پڑھائیں تو تمھارے لیے ہوگی۔ اگر غلطی کریں تو تمھارے لیے ہوگی اور ان کے خلاف۔''

یہ امام کے غلطی کرنے کی صورت میں خود ہی ذمے دار ہونے اور مقتدیوں کی براءت پر صریح نص ہے۔ مجتہد کی زیادہ سے زیادہ یہی غلطی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی ایسے واجب کو چھوڑ کر خطا کا مرتکب ہوتا ہے جسے واجب نہیں سمجھتا یا کوئی ایسا ممنوع فعل کرتا ہے جسے ممنوع نہیں سمجھتا۔ اس لیے جس مومن کو یہ صحیح اور صریح حدیث پہنچ جائے اس کے لیے اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔

امام احمد اور ابو داود نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے، کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَمَّ النَّاسَ فَأَصَابَ الْوَقْتَ وَأَتَمَّ الصَّلَاةَ فَلَهُ وَلَهُمْ، وَمِنِ انْتَقَصَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعَلَيْهِ وَلَا عَلَيْهِمْ »[2]

''جس نے لوگوں کو امامت کروائی، درست وقت پر مکمل نماز پڑھائی، وہ اس کے لیے بھی ہے اور ان کے لیے بھی، اور جس نے ان میں کسی چیز میں کمی کی تو وہ اس کے سر ہوگی، ان کے سر نہیں۔''

ابن ماجہ میں سہل بن سعد سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْإِمَامُ ضَامِنٌ، فَإِنْ أَحْسَنَ فَلَهُ وَلَهُمْ، وَإِنْ أَسَاءَ يَعْنِيْ: فَعَلَيْهِ وَلَا عَلَيْهِمْ »[3]

''امام ضامن ہے، اگر اس نے احسن طریقے سے نماز پڑھائی تو اس کے لیے بھی ہوگی اور ان کے لیے بھی، اگر خرابی کی، تو وہ اس کے سر ہوگی، ان کے سر نہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٨٣) صحيح الجامع (٦١٠١)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٨١) السلسلة الصحيحة (١٧٦٧)

ان صحیح اور صریح احادیث کے ساتھ پرانا اجماع شامل ہو کر ان کو مزید تقویت پہنچا دیتا ہے اور ان تینوں بہترین صدیوں میں تمام بلادِ اسلامیہ میں ان پر عمل ہوتا رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی کچھ آہستہ بسم اللہ پڑھتے تھے، کچھ بلند آواز سے اور کچھ سرے سے نہیں پڑھتے تھے اور اپنی اپنی رائے کو ترجیح دینے کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ نماز میں بسم اللہ بلند آواز سے پڑھنے کے متعلق سب سے عمدہ دلیل جس پر قائلین کا انحصار ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ جب وہ مدینہ آئے تو انھوں نے نماز پڑھاتے وقت پہلی رکعت میں سورت فاتحہ اور بعد والی سورت سے پہلے بسم اللہ نہ پڑھی۔ صحابہ نے لقمہ دیا تو انھوں نے دوسری رکعت میں پڑھی۔ امام شافعی نے کتاب ''الام'' میں اس اثر پر اعتماد کیا ہے، لیکن اس میں ان صحابہ کا ان کے پیچھے نماز پڑھنے پر اتفاق ثابت ہوتا ہے، اگرچہ انھوں نے پہلی رکعت میں بسم اللہ نہ پڑھی اور انھوں نے ان کے نہ پڑھنے پر تنبیہ بھی کی۔

جو خود ساختہ فقیہ مذہب یہ کہتا ہے کہ ایسے امام کی اقتدا درست نہیں جو مخالف مذہب کا ہو، اس سے مقتدی کی نماز داغدار ہو جاتی ہے، وہ درحقیقت فرقہ پرست، بدعتی اور رافضہ، معتزلہ اور خوارج کی قبیل سے ہے جو اہلِ سنت سے جدا ہو کر فرقے بندی اور بدعت میں داخل ہو گئے۔

ایسے فتاویٰ کے نتیجے میں کچھ گمراہ لوگ رفع الیدین کرنے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ کوئی تھوڑے پانی سے وضو کرنے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ کوئی معمولی سی نجاست کی وجہ سے وضو نہ کرنے والے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ ایسے گمراہ کن فتووں کا تقاضا ہے ایک مذہب کے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ شاگرد استاذ کے پیچھے نہ پڑھے۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نہ پڑھے۔ علی و عثمان رضی اللہ عنہما کے پیچھے نہ پڑھے۔ اور مہاجر انصاری کے پیچھے نہ پڑھے اور انصاری مہاجر کے پیچھے۔ مسلمان کو معلوم ہونا چاہیے یہ گمراہ کن مذاہب ہیں۔ گو کچھ لوگ ان میں مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں، تاہم یہ مختصر سا فتویٰ تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

صاحبانِ اقتدار ایسی گمراہ کن بدعتوں سے روکیں۔ ان کو پھیلانے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کریں۔ اگر اختلافی مسائل کو عام کرنے میں عمومی فساد کا خدشہ ہو تو عام کرنے والوں کو سزا ملنی چاہیے، جس طرح تاویل کرتے ہوئے نبیذ پینے والے، تاویل کی بنا پر بغاوت کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ مقصود جماعت بندی برقرار رکھنا اور فرقے پرستی کا خاتمہ ہے۔

یہ تین اصول، جن پر اس واجب کا دار و مدار ہے، اسلام کے جلیل القدر اور عظیم ترین اصول ہیں:

1. اجتہادی مسائل میں ائمہ کی غلطی قابلِ گرفت نہیں ہوتی اور اللہ کے ہاں ان کی غلطی معاف ہوتی ہے۔
2. اتفاق و اتحاد کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

3 حد سے تجاوز کرنے والوں کی سزائیں متعین ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام پر فرمان جاری کیا:

«لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ »[1]

''عصر کی نماز ہر ایک بنی قریظہ میں پڑھے۔''

انھیں عصر کا وقت راستے میں ہو گیا۔ کچھ نے کہا: ہم تو بنی قریظہ ہی میں نمازِ عصر پڑھیں گے۔ انھوں نے غروبِ آفتاب کے بعد نماز پڑھی۔ کچھ نے کہا: آپ کا مقصود نماز کے وقت کی تعیین نہیں تھی، لہٰذا انھوں نے راستے میں نماز پڑھ لی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے کسی پر اعتراض نہ کیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ان کے اجتہاد کو برقرار رکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس کو برقرار رکھنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔[2]

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے پیچھے نماز کا حکم

سوال کیا چار فقہی مذاہب کے ماننے والوں کی نماز ایک دوسرے کے پیچھے ہو جاتی ہے، بالخصوص جب امام اور مقتدی کا بہت سے مسائلِ نماز میں اختلاف ہو؟

جواب الحمد لله. ہاں، ایک دوسرے کے پیچھے ان کی نماز ہو جاتی ہے۔ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد ائمہ اربعہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، حالانکہ ان مذکورہ اور دیگر مسائل میں ان کا اختلاف تھا۔ سلف میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ جو اس کا انکار کرتا ہے وہ بدعتی، گمراہ، کتاب وسنت اور اجماعِ امت وائمہ کا مخالف ہے۔

صحابہ کرام، تابعین اور ان کے بعد علما میں سے کچھ بسم اللہ پڑھتے تھے، کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ بلند آواز سے پڑھتے تھے، کچھ آہستہ پڑھتے تھے۔ کچھ فجر میں قنوت کرتے تھے، کچھ نہیں کرتے تھے۔ کچھ سینگی لگوا کر خون پھوٹنے اور قے کی صورت میں وضو کرتے تھے، کچھ نہیں کرتے تھے۔ کچھ شرمگاہ کو ہاتھ لگ جانے کی وجہ سے اور شہوت کے ساتھ عورت کو چھونے کی وجہ سے وضو کرتے تھے، کچھ نہیں کرتے تھے۔ کچھ نماز میں قہقہہ لگانے کی صورت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٠) مسلم میں عصر کی نماز کے بجائے ظہر کا ذکر ہے۔

[2] جامع المسائل (٢٧١/٥۔٢٨٠)

میں وضو کرتے تھے، کچھ نہیں کرتے تھے۔ کچھ اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کر کے نماز پڑھتے تھے، کچھ اونٹ کا گوشت کھانے کی وجہ سے وضو نہیں کرتے تھے اور پہلے وضو کے ساتھ ہی نماز پڑھتے تھے۔ ان اختلافات کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔

ابو حنیفہ اور ان کے ہم مذہب، اسی طرح شافعی بھی مدینہ کے مالکی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، گو وہ بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے نہ آہستہ آواز ہی سے۔ مامون الرشید نے سینگی لگوائی اور نماز پڑھائی، اس کو امام مالک نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ اس کی وجہ سے وہ وضو نہ کرے، اس کے پیچھے قاضی ابو یوسف حنفی نے نماز پڑھی اور نماز نہ دہرائی۔ امام احمد کے نزدیک سینگی لگوانے اور نکسیر پھوٹنے کی صورت میں وضو لازم ہو جاتا ہے، ان سے پوچھا گیا: اگر امام نماز پڑھا رہا ہو اور اس سے خون نکل رہا ہو تو کیا آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے؟ انھوں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں سعید بن مسیّب اور مالک کے پیچھے نماز نہ پڑھوں؟

قصہ مختصر! ان مسائل کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

مقتدی کو معلوم نہ ہو کہ اس کے امام نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں مقتدی امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ اس پر تمام سلف اور ائمہ اربعہ وغیرہ کا اتفاق ہے۔ اس میں متقدمین کے ہاں کوئی اختلاف نہیں، البتہ بعض متعصب متاخرین نے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان کا گمان ہے کہ حنفی کے پیچھے نماز درست نہیں، خواہ وہ سارے واجباتِ نماز بجا لائے، کیوں کہ وہ ان کے وجوب کا قائل نہیں۔ اس اختلاف کرنے والے کے اختلاف کو معتبر ماننا تو ایک طرف رہا، اس سے توبہ کروانی چاہیے، جس طرح بدعتیوں سے توبہ کروائی جاتی ہے۔ مسلمان عہدِ نبوی اور عہدِ خلفا میں ہمیشہ ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھتے چلے آئے ہیں۔ اکثر ائمہ فرائض اور سنن میں کوئی فرق نہیں کرتے، بلکہ وہ شرعی نماز پڑھتے ہیں۔ اگر نماز کے فرائض اور سنتوں کا علم رکھنا ہر ایک کے لیے فرض ہو تو اکثر مسلمانوں کی نمازیں باطل ٹھہریں اور کوئی احتیاط ممکن نہ ہو، کیوں کہ ان فرائض اور سنتوں میں سے اکثر میں اختلاف ہے اور ان کے دلائل پوشیدہ ہیں۔ دین پسند شخص کے لیے زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ اختلاف میں احتیاط برتے اور دو اقوال میں سے ایک کو قطعیت کے ساتھ اختیار نہ کرے، کیوں کہ اگر ایک قول میں قطعیت لازم ہو تو اکثر لوگوں کے لیے اس کی قطعیت ثابت کرنا ممکن نہ ہو، بلکہ یہ جو جس قول پر اصرار کر رہا ہے اس کے پاس بھی بعض فقہا کی تقلید کے سوا کوئی سند نہیں۔ اگر ان سے ان شرعی دلائل کا مطالبہ کیا جائے جو اس کے امام

کے قول کو صحیح اور دوسرے کے قول کو غلط ثابت کرتی ہوں تو وہ ایسا کرنے سے عاجز آ جائے گا، لہٰذا اس جیسے شخص کا اختلاف کسی شمار میں نہیں آتا، کیوں کہ وہ اہلِ اجتہاد سے تعلق نہیں رکھتا۔

دوسری صورت:

مقتدی کو یقین ہو کہ امام نے جو فعل کیا ہے وہ اس کے نزدیک جائز نہیں، مثلاً: وہ اپنی شرمگاہ کو چھوئے، یا بیوی کو شہوت کی نظر سے دیکھے، یا سینگی لگوائے، یا فصد لگوائے، یا قے کرے، اس کے بعد وضو کے بغیر نماز پڑھا دے تو اس صورت میں بڑا مشہور اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس مقتدی کی نماز درست نہیں، کیوں کہ وہ اپنے امام کی نماز کے باطل ہونے کا نظریہ رکھتا ہے۔ یہ کچھ حنفی، شافعی اور حنبلی فقہا کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس مقتدی کی نماز درست ہے۔ یہ جمہور سلف کا قول ہے۔ امام مالک کا مذہب اور شافعی مذہب، حنبلی مذہب، بلکہ حنفی مذہب میں بھی دوسرا قول ہے۔ امام احمد کے اکثر اقوال اسی پر دلالت کرتے ہیں اور یہی صحیح بھی ہے، کیوں کہ صحیح وغیرہ میں یہ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے: «يُصَلُّونَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصابُوا فَلَكُمْ وَلَهُمْ، وإِنْ أَخْطاؤُا فَلَكُمْ وعَلَيْهِمْ»[1] ''وہ (امام) تمھارے لیے نماز پڑھتے ہیں، اگر وہ درست پڑھیں تو تمھارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی اور اگر غلطی کریں تو وہ ان کے سر ہو گی، لیکن تمھاری نماز ہو جائے گی۔'' اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بیان کر دیا ہے کہ امام کی غلطی مقتدی کو متاثر نہیں کرتی اور اس تک متعدی نہیں ہوتی، کیوں کہ مقتدی کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ امام جو کرتا ہے وہ اس کے لیے جائز ہوتا ہے اور امام کے فعل کا مقتدی پر گناہ نہیں ہوتا، وہ مجتہد ہوتا ہے یا مقلد مجتہد۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی غلطی معاف کی ہوئی ہے، لہٰذا وہ اس کی نماز کے صحیح ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، اس لیے اگر وہ اس نماز کو نہ دہرائے تو وہ گناہ گار نہیں ہوتا، بلکہ اگر اس جیسا شخص (مجتہد) کوئی فیصلہ کرے تو اس کے فیصلے کو نافذ کرنا لازمی ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ اگر امام اپنے اجتہاد سے کوئی فعل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی کا مکلّف بنایا ہوا ہے جو اس کے اختیار اور وسعت میں ہے اور مقتدی وہ کرتا ہے جو اس پر کرنا فرض ہوتا ہے اور دونوں کی نماز صحیح ہوتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں اور ظاہری افعال میں امام کے ساتھ موافقت حاصل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مقتدی امام کی نماز کے باطل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، غلط ہے، کیوں کہ مقتدی یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ امام پر جو واجب تھا اس نے وہ کیا جو اس کی غلطی ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کی ہوئی ہے اور اس وجہ سے اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

امام اور مقتدی غلطی کر لیں۔ امام غلطی سے سلام پھیر دے اور مقتدی امام کی متابعت کے جواز میں سلام پھیر دے، جس طرح جب رسول اللہ ﷺ نے دو رکعات پڑھ کر سہواً سلام پھیر دی اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والے مسلمانوں نے بھی سلام پھیر دی، حالانکہ ان کو علم تھا کہ آنحضرت ﷺ نے دو رکعات پڑھ کر سلام پھیری ہے، اسی طرح اگر امام سہواً پانچ رکعات پڑھ لے اور مقتدی بھی اس کے پیچھے پانچ رکعات پڑھ لیں، جس طرح جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو پانچ رکعات پڑھا دیں تو انھوں نے آنحضرت ﷺ کی متابعت کی، حالانکہ ان کو علم تھا کہ آپ ﷺ نے پانچ رکعات پڑھا دی ہیں، کیوں کہ وہ امام کی متابعت کو جائز سمجھتے تھے لہٰذا جب اس حالت میں مقتدی کی نماز صحیح ہوتی ہے تو اس صورت میں کیوں صحیح نہیں ہوگی جس میں اکیلا امام غلطی کرتا ہے؟ پھر علما کا اتفاق ہے کہ اگر امام غلطی سے سلام پھیر دے اور مقتدی اس کی متابعت میں سلام نہ پھیرے اس کی نماز باطل نہیں ہوگی، اسی طرح اگر امام غلطی سے پانچ رکعات پڑھا دے، لیکن مقتدی پانچویں رکعت میں اس کی اقتدا نہ کرے تو پھر بھی اس کی نماز باطل نہیں ہوگی اس سے معلوم ہوا کہ امام جو فعل غلطی سے کرتا ہے اس سے مقتدی کی نماز کا باطل ہونا لازم نہیں آتا۔ واللہ أعلم[1]

حنفی کی غیر حنفی کی اقتدا میں نماز

سوال ایک حنفی شخص نے کہیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور آہستہ آواز سے نیت کی پھر ہر تکبیر میں رفع الیدین بھی کیا ہے تو وہ جاہل ہے، کیونکہ اس کا یہ عمل جب فقیہ مذہب کے علم میں آیا تو اس نے کہا: یہ کام تیرے مذہب میں جائز نہیں۔ تو اس میں بدعتی ہے اور متذبذب ہے۔ تو نے اپنے امام کی اقتدا کی نہ اپنے مذہب کی راہ ہی پر چلا۔ اس نے جو کام کیا اس سے اس کی نماز میں کوئی نقص واقع ہوگا؟ اور اس نے سنت یا اپنے امام کی مخالفت کی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب الحمد للہ. جس نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے آہستہ آواز سے نیت کی ہے تو وہ جاہل ہے، کیونکہ بلند آواز سے نیت کرنا امام ابو حنیفہ کے مذہب میں یا کسی امام کے مذہب میں واجب ہے نہ مستحب، بلکہ سب کے نزدیک اس کا یہ عمل سنت کے مخالف ہے۔ امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی، احمد اور تمام ائمہ کا مذہب تو یہ ہے کہ جب کوئی شخص دل میں نیت کرے اور زبان سے آہستہ یا بلند آواز میں نہ بولے تو اس کی نیت درست ہوگی، بلکہ کسی امام کے نزدیک بھی بول کر نیت کرنا فرض نہیں۔

جہاں تک ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا مسئلہ ہے، حتی کہ سجدے میں بھی تو یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں، لیکن تکبیرِ افتتاح کے ساتھ رفع الیدین کرنے پر امت کا اتفاق ہے۔

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۳۷۳۔۳۷۸)

رفع الیدین کا حکم:

رکوع جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنا اکثر فقہائے کوفہ سے معروف نہیں جن میں ابراہیم نخعی، ابو حنیفہ اور سفیان ثوری وغیرہ شامل ہیں، لیکن اکثر شہروں کے فقہا اور علمائے آثار کے ہاں یہ عمل معروف ہے، کیونکہ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور و منقول ہے۔ امام اوزاعی، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابو عبید اسی کے قائل ہیں اور امام مالک سے ایک روایت بھی رفع الیدین کرنے ہی کی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، جب رکوع جاتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے، لیکن سجدے میں جاتے وقت اور دو سجدوں کے درمیان ہاتھ نہ اٹھاتے۔[1] یہ عمل صحیح بخاری میں حضرت مالک بن حویرث، وائل بن حجر اور ابو حمید ساعدی کی احادیث میں بھی مروی ہے۔ یہ جن دس صحابہ سے مروی ہے ان میں ایک ابو قتادہ ہیں۔ حضرت علی، حضرت ابو ہریرہ اور دیگر کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ نماز میں رفع الیدین نہیں کرتا تو وہ اس کو کنکری مارتے۔ عقبہ بن عامر کا قول ہے: ہر اشارے کی یعنی رفع الیدین کی دس نیکیاں ملتی ہیں۔

فقہائے کوفہ کی دلیل:

فقہائے کوفہ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رفع الیدین نہیں کیا کرتے تھے، لیکن وہ صحیح سنت کے پہنچنے سے پہلے معذور ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ فقیہ ہیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کو سنت کی تعلیم دینے کے لیے وہاں روانہ کیا تھا، لیکن رفع الیدین کی احادیث بہت سے صحابہ سے محفوظ اور منقول ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہیں بھی یہ صراحت نہیں فرمائی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تکبیرِ تحریمہ کے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے، اس کے بعد نہیں۔ لیکن اہلِ کوفہ نے ان کو دیکھا کہ وہ نماز کے آغاز میں تو رفع الیدین کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں نہیں کرتے تھے، اس سے انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ رفع الیدین صرف آغاز میں ہے، لیکن انسان بھول سکتا ہے، غافل بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ نماز میں تطبیق (رکوع کے دوران میں دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر گھٹنوں پر رکھنے کے بجائے گھٹنوں کے درمیان رکھنا) کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، لہٰذا وہ جب نماز پڑھتے تو رکوع کے دوران میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے درمیان رکھتے۔ یہ شروع اسلام کا حکم تھا اور بعد میں منسوخ ہو گیا، لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو یہ یاد نہیں رہ سکا۔ نیز یہ بھی اہم بات ہے کہ اختلافی رفع الیدین نماز کو توڑنے والی چیزوں میں شامل نہیں۔ رفع الیدین کے بغیر نماز جائز ہے، لیکن رفع الیدین افضل اور زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۰۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹۰)

تقلید و تلفیق کا حکم:

اگر کوئی شخص امام ابو حنیفہ یا امام مالک یا امام شافعی یا امام احمد کا مقلد ہے اور دیکھتا ہے کہ کچھ مسائل میں دوسرے امام کا مذہب دلائل کے اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے، اس لیے وہ اس کو اختیار کر لیتا ہے تو اس کا یہ طرزِ عمل لائقِ تحسین ہے۔ اس سے اس کے دین میں کوئی عیب اور نقص پیدا نہیں ہوتا اور نہ اس کی عدالت وصداقت ہی ساقط ہوتی ہے، بلکہ یہ حق کے زیادہ قریب اور اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ محبوب عمل ہے۔ اس شخص کے عکس جو نبی اکرم ﷺ کو چھوڑ کر کسی متعین امام کی اندھی اور تعصب پر مبنی تقلید کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس مخصوص امام کا قول ہی، اس کے قول کو چھوڑ کر جو اس کے مخالف ہے، درست ہے اور قابلِ تقلید ہے۔ جو شخص یہ سوچ رکھتا ہے وہ جاہل اور گمراہ ہے، بلکہ کافر بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ائمہ اربعہ میں سے صرف کسی ایک مخصوص امام کی اتباع اور تقلید کرنا فرض ہے تو ایسے شخص سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کرے تو صحیح ورنہ قتل کر دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی عامی کے لیے کسی بھی امام کی تقلید جواز کی حد تک ہے، لیکن زید، عمرو، کی تخصیص کیے بغیر۔ تاہم اگر کوئی یہ کہے کہ عام لوگوں پر فلاں یا فلاں امام کی تقلید فرض اور واجب ہے تو یہ بات کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا۔

جو شخص اماموں سے محبت وعقیدت رکھتا ہے اور ان میں سے جس کا عمل اس کو سنت کے مطابق لگتا ہے وہ اس کی تقلید کر لیتا ہے تو یہ شخص اس معاملے میں درست سمت پر گامزن ہے، بلکہ ان لوگوں سے بہتر ہے جو اس طرح نہیں کرتے۔ اس شخص کو بطورِ مذمت متذبذب نہیں کہا جا سکتا، بلکہ قابلِ مذمت متذبذب وہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے، نہ کافروں کے ساتھ۔ کبھی مومنوں کی طرف جھکتا ہے اور کبھی کافروں کی طرف، جیسے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے:

منافقانہ تذبذب کی مذمت:

﴿ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٤٢﴾ مُذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ﴾ [النساء: ١٤٢، ١٤٣]

''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔ اس کے درمیان متردد ہیں، نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی راستہ نہ پائے گا۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو کبھی ادھر منہ مارتی ہے کبھی ادھر۔''[1] یہ ہیں وہ متذبذب اور دگرگوں منافق جن کی اللہ اور اس کے رسول نے مذمت کی ہے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ [المنافقون: ۱]

''جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ بلاشبہہ یقیناً تو اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ بلاشبہہ تو یقیناً اس کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔''

مسلمانوں کی باہمی محبت:

مسلمان ان کے عکس ہوتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ ﴾ [المجادلة: ۲۲]

''تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی روح کے ساتھ قوت بخشی ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ﴾ [الحجرات: ۱۰]

''مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔''

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانوں کی آپس کی محبت رحم دلی اور شفقت کی مثال جسم کی مثال ہے۔ جب ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''[2] صحیحین کی ایک دوسری حدیث میں ہے: ''مومن مومن کے لیے عمارت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو باندھ کر رکھتا ہے۔''[3] فرمانِ نبوی ہے: ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس کو کسی کے سپرد کرتا

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۸٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٥۸٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٥۸٥)

ہے نہ اس پر ظلم ہی کرتا ہے۔''[1] اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اتفاق کے ساتھ اور مل جل کر رہنے کا حکم دیا ہے اور اختلاف اور فرقے بندی سے منع کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۤىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾

[آل عمران: ۱۰۲،۱۰۶]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب تم دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ اور لازم ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن کچھ چہرے سفید ہوں اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔''

اندھی تقلید کی مذمت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''اہلِ سنت والجماعت کے چہرے روشن ہوں گے اور اہلِ بدعت اور فرقہ پرستوں کے چہرے کالے ہوں گے۔'' ائمہ دین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے منہاج اور راستے پر قائم ہیں اور صحابہ آپس میں متفق اور متحد تھے، اگرچہ طہارت، یا نماز یا حج یا طلاق یا میراث وغیرہ کے مسائل کی بعض فروع میں ان کا اختلاف تھا، لیکن ان کا اجماع قطعی دلیل ہے، جو انسان باقی ائمہ کو چھوڑ کر صرف کسی ایک مخصوص امام کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ ایسے ہی ہے جیسے سارے صحابہ کو چھوڑ کر صرف کسی ایک کا نام لیوا بن جائے، جس طرح رافضی خلفائے ثلاثہ اور جمہور صحابہ کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۳۱۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۵۸۰)

چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت و عقیدت رکھتا ہے، خارجی حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما پر طعن و تنقید کرتا ہے۔ یہ سب بدعتیوں اور خواہش پرستوں کے طریقے ہیں۔ کتاب و سنت میں ان کی مذمت ذکر ہوئی ہے۔ یہ لوگ شریعت مخالف اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھنے والے ہیں، لہٰذا جو انسان صرف کسی ایک امام کا مقلد جامد اور متعصب بن جاتا ہے وہ ان مذکورہ لوگوں سے مشابہت رکھتا ہے، چاہے وہ امام مالک کا متعصب مقلد ہو یا امام شافعی کا، یا امام ابوحنیفہ کا یا امام احمد کا یا کسی دوسرے امام کا۔

یہ متعصب مقلد علم و دین میں اس امام اور دیگر ائمہ کی قدر سے جاہل ہوتا ہے، لہٰذا یہ ظالم جاہل ٹھہرتا ہے، جب کہ اللہ علم اور عدل کا حکم دیتا ہے اور ظلم و جہالت سے منع کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴾ [الأحزاب: ٧٢، ٧٣]

''اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بلاشبہہ وہ ہمیشہ سے بہت ظالم، بہت جاہل ہے۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور (تاکہ) اللہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔''

صاحبین کا طرزِ عمل:

دیکھیے قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی، امام ابوحنیفہ کے سب لوگوں سے زیادہ تابعدار اور ان کے قول کو سب سے بہتر جانتے تھے۔ ان دونوں نے بے شمار مسائل میں اپنے امام کی مخالفت کی ہے۔ جب ان کے سامنے واجب اتباعِ سنت اور حجت واضح ہو جاتی تو وہ اپنے امام کی بات کی پروا نہ کرتے۔ اس کے باوجود وہ اپنے امام کی تعظیم کرتے تھے۔ ان دونوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متذبذب تھے، بلکہ خود امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کوئی بات کہتے، پھر ان کے سامنے ایسی دلیل اور حجت واضح ہو جاتی جو ان کی بات کے خلاف ہوتی تو وہ اس کو چھوڑ دیتے۔ ان کو بھی متذبذب نہیں کہا جا سکتا۔ انسان ہمیشہ علم و ایمان کا طالب رہتا ہے۔ جب اس کو کوئی علمی بات معلوم ہو جو پہلے معلوم نہیں تھی تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ وہ متذبذب نہیں ہوتا، بلکہ ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور اللہ اس کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴾ [طٰهٰ: ١١٤] ''اور کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔''

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اہلِ ایمان اور علما کے ساتھ محبت و عقیدت رکھے، حق کا متلاشی رہے اور جہاں حق ملے اس کی پیروی کرے۔ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ائمہ میں سے جو اجتہاد کرتا ہے، اگر اس کا اجتہاد درست ہو تو

اس کو دوہرا اجر ملتا ہے، اگر اس کا اجتہاد درست نہ ہو تو اس کو اجتہاد کا اجر ملتا ہے اور اس کی غلطی معاف ہوتی ہے۔

اہلِ ایمان کو چاہیے کہ اپنے امام کی پیروی کریں، جب وہ ایسا کام کرے جو جائز ہو، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَام لِيُؤْتَمَّ بِهِ »[1] ''امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔''

فروعی مسائل میں وسعت:

چاہے وہ رفع الیدین کرے یا نہ کرے، اس سے ان کی نمازوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد یا کسی بھی امام کے نزدیک ان کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ اگر امام رفع الیدین کرے، مقتدی نہ کرے یا مقتدی اور امام نہ کرے، اس سے دونوں کی نمازوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی انسان کسی وقت رفع الیدین کرے، کسی وقت نہ کرے تو اس سے بھی اس کی نماز پر کوئی اعتراض نہیں آتا۔ یہ کسی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کچھ علما کے قول کو امتیازی علامت بنا کر اس کی پیروی کو لازمی قرار دے اور دوسرے سے منع کرے جب کہ وہ بھی سنت کے مطابق ہو، بلکہ ہر وہ بات جو سنت میں مذکور ہو اس میں وسعت ہوتی ہے۔ اذان اور اقامت کی مثال ہی لے لیں، صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دوہری اذان اور اکہری تکبیر کہنے کا حکم دیا۔''[2] صحیح بخاری و مسلم ہی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''آپ ﷺ نے حضرت ابو محذورہ کو اذان کی طرح (دوہری) اقامت سکھائی۔''[3] لہٰذا جو دوہری اقامت کہتا ہے، اس کا عمل بھی صحیح ہے اور جو اکہری کہتا ہے اس کا عمل بھی درست ہے۔ لیکن جو ان میں سے صرف ایک کو لازمی اور واجب قرار دے لیتا ہے وہ غلط اور گمراہ ہے۔ پھر جو شخص صرف اس بنا پر اپنے ہم مسلک سے محبت اور دوسرے سے عداوت رکھتا ہے، وہ بھی غلط اور گمراہ ہے۔

مذہبی تعصب کی مذمت:

مشرق کے ممالک میں تاتاریوں کے تسلط کا ایک سبب یہی مذہبی گروہ بندی اور مذاہب کی باہم جنگ بھی ہے۔ شافعی مقلد حنفی کو دین سے خارج حنفی کا مقلد شافعی کو بے دین، احمد کا مقلد اپنے مخالف کو اسلام دشمن اور افریقہ و مغرب کے علاقوں میں امام مالک کا مقلد دوسرے کو اسلام سے باہر قرار دیتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس ساری فرقے پرستی اور اختلاف سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٩)

یہ سب باطل پرست، متعصب، گمان کے پیروکار اور اپنی خواہشات کے بے دام بندے ہیں جو راہِ ہدایت سے منحرف ہیں اور مذمت وسزا کے مستحق ہیں۔

صحابہ و ائمہ دین کی راہ پکڑنا اور اتفاق و اتحاد سے رہنا دین کے اصول میں شامل ہے۔ اس میں جو اختلافی فروعی مسائل ہیں وہ خفیف درجے کے ہیں۔ فروع کی حفاظت کے نام پر اصولِ دین کو تار تار کرنا کسی طور روانہیں۔ یہ اکثر متعصب مقلد چند ایک کو چھوڑ کر کتاب و سنت سے صرف نام کی حد تک ہی واقف ہوتے ہیں، بلکہ ضعیف احادیث یا فاسد آرا یا بزرگوں کی سچ اور جھوٹ کا احتمال رکھنے والی کہانیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اگر یہ کہانیاں سچی بھی ہوں تب بھی وہ بزرگ معصوم عن الخطاء نہیں۔ یہ لوگ غیر مصدقہ اقوال سے استناد کرتے ہیں، جن کے قائل بھی غیر معصوم بزرگ ہوتے ہیں، لیکن نبی صادق اور پیغمبر معصوم کی مصدقہ احادیث کو چھوڑ دیتے ہیں، جو ثقہ راویوں اور معتبر علما نے کتبِ صحاح میں جمع کی ہیں!

ان احادیث کو نقل کرنے والے بالاتفاق مصدقہ راوی ہیں اور جس سے نقل کرتے ہیں وہ معصوم ذات ہے جو اپنی خواہش سے نہیں بولتا، بلکہ جو بولتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وحی کے مطابق بولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر اپنے نبی کی اطاعت واتباع فرض کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النساء: ٦٥]

''پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔

نیز فرمایا:

﴿ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [النور: ٦٣]

''سو لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اس کا حکم ماننے سے پیچھے رہتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ نہ آ پہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آ پہنچے۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے سارے مسلمان بھائیوں کو ان اقوال و افعال، طریقوں اور نیتوں کی توفیق دے جو اس کی محبت و رضا پر مشتمل ہیں۔ واللّٰہ أعلم، والحمد للّٰہ وحدہ۔[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٢٤٥_٢٥٥)

چند اختلافی مسائل میں افضلیت کا پہلو

سوال کچھ اختلافی مسائل سے متعلق فتویٰ درکار ہے جو افضلیت کے پہلو سے ایک طالبِ عبادت کے لیے الجھن کا باعث بنتے ہیں، وہ مسائل یہ ہیں:

1. جہری نماز میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا افضل ہے یا چھوڑنا افضل؟
2. فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت کرنا افضل ہے یا چھوڑنا افضل یا کبھی کبھار مصلحت وضرورت کے پیشِ نظر کر لینا؟ اسی طرح وتر میں بھی؟
3. نماز لمبی کرنا اور نماز کے تمام اجزا کو مقدار و معیار میں برابر رکھنا افضل ہے یا موجودہ زمانے کے معمول کے مطابق تخفیف کرنا؟
4. سفر میں قصر اور ہمیشہ جمع کرنا افضل ہے یا کبھی کبھی ضرورت کے تحت کرنا؟
5. کیا ساری رات کا قیام سنت ہے یا بدعت؟ یا کچھ وقت قیام کرنا ساری رات کے قیام سے افضل ہے؟
6. تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنا افضل ہے یا وقفے وقفے سے؟ نیز وصالِ صوم کا حکم کیا ہے؟
7. کیا ہمیشہ کھردرا لباس پہننا اور خستہ روٹی کھانا افضل ہے یا کبھی کبھی؟
8. سفر میں سنتیں پڑھنا افضل ہے یا چھوڑنا؟ یا کچھ پڑھ لینا اور کچھ چھوڑ دینا؟ اسی طرح سفر میں نوافل کا کیا حکم ہے؟
9. سفر میں روزہ رکھنا بہتر ہے یا چھوڑنا؟
10. اگر پانی نہ ملے یا بیماری کی وجہ سے اس کا استعمال ناممکن ہو یا سخت ٹھنڈ کی وجہ سے اس کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ ہو یا اس جیسی کوئی صورت ہو تو کیا تیمّم کرنا چاہیے یا نہیں اور کیا مذکورہ صورتوں میں تیمّم وضو کا قائم مقام ہوگا؟
11. اگر رمضان کا چاند مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے واضح نہ ہو تو رمضان کا روزہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟ یا جو دل چاہے کر لیا جائے، یا ایک کام کرنا ہی مستحب ہے؟

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام افعال، احوال، اقوال، حرکات وسکنات اور عبادات و عادات کے تمام معاملات میں جن کاموں پر ہمیشگی کی ہے، کیا ان سب پر ہمیشگی کرنا امت کے ہر فرد کے حق میں سنت ہے یا مراتب اور اہلِ رتبہ کے حسبِ حال مختلف حکم رکھتا ہے؟ فتویٰ دے کر اللہ تعالیٰ کے ہاں ماجور ہوں۔

جواب الحمد للہ، عبادات کی صفات سے متعلق ان اختلافی مسائل کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم:

وہ امور جن دونوں کا سنت ہونا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جو ان دونوں میں سے ایک کام بھی کر لے تو گناہ گار نہیں ہوگا، لیکن علما بعض اوقات افضل میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ قراءت کے قائم مقام ہے۔ علما کا اتفاق ہے کہ مسلمانوں میں جو مشہور قراءات ہیں، انسان ان میں سے جو قراءت چاہے پسند کر سکتا ہے، خواہ کوئی ایک قراءت کسی سبب سے اختیار کر لے۔

رسول اللہ ﷺ سے قیام اللیل میں جو نماز کا آغاز کرتے وقت اور تشہد کے آخر میں پڑھی جانے والی مختلف دعائیں منقول ہیں وہ اسی باب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ ساری انواع رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور سب بالاتفاق جائز ہیں، لیکن آپ نے ان میں سے جس کا حکم دیا ہے وہ ہمارے لیے اس سے افضل ہے جو آپ نے خود کیا ہے، مگر اس کا حکم نہیں دیا۔

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی ایک تشہد میں بیٹھے تو چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہوئے کہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّم، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ»[1]

ان الفاظ کے ساتھ دعا کرنا آپ ﷺ کی اس دعا کے الفاظ کے ساتھ دعا کرنے سے افضل ہے جو آپ خود کیا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّيْ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»[2]

حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اپنی نماز کے آخر میں یہ دعا کیا کرتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے پہلی کا حکم دیا ہے۔ جس کے وجوب میں علما کا اختلاف ہے وہ اس سے زیادہ تاکیدی اور اہمیت رکھتا ہے جس کا حکم آپ ﷺ نے نہیں دیا اور علما نے اس کے وجوب میں اختلاف نہیں کیا۔ اسی طرح وہ دعا جو آپ اکثر بار بار کیا کرتے تھے، مثلاً:

«رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ»[3]

یہ اس سے زیادہ موکد ہے جو اس طرح نہ ہو، یعنی کبھی کبھی ہو۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٩، ٧٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٠)

دوسری قسم:

وہ امور جن دونوں کو بجا لانے سے بالاتفاق عبادت صحیح ہو اور کرنے سے گناہ نہ ہو، لیکن افضل کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل کیا تھا؟ اس میں علما اختلاف کرتے ہیں۔ فجر کی نماز اور وتر میں قنوت کا مسئلہ بلند آواز سے "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا اور استعاذہ وغیرہ کس طرح ہونا چاہیے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر مسائل اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔

سب فقہا کا اتفاق ہے جو بلند آواز سے "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" پڑھتا ہے اس کی نماز صحیح ہوتی ہے اور جو آہستہ آواز سے پڑھتا ہے اس کی نماز بھی صحیح ہوتی ہے۔ جو فجر کی نماز میں قنوت کرتا ہے اس کی نماز بھی صحیح ہوتی ہے جو نہیں کرتا اس کی بھی صحیح ہوتی ہے۔ وتر میں قنوت کا معاملہ بھی یہی ہے۔

البتہ "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنے کے واجب ہونے میں اختلاف ہے اور جمہور کے نزدیک اسے پڑھنا واجب نہیں، پھر اس کے مستحب ہونے میں اختلاف کیا گیا ہے اور جمہور کے نزدیک اسے پڑھنا مستحب ہے۔ پھر اس صورت میں فقہا نے اختلاف کیا ہے جب امام کوئی ایسا کام چھوڑ دے جو مقتدی کے نزدیک واجب ہو، مثلاً وہ "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" نہ پڑھے اور مقتدی اس کے وجوب کا قائل ہو یا وہ مسِ ذکر کی وجہ سے وضو نہ کرے، جب کہ مقتدی کے نزدیک اس کی وجہ سے وضو کرنا واجب ہو یا امام مردار کی رنگی ہوئی کھال پر نماز پڑھائے، جب کہ مقتدی کے نزدیک دباغت اور رنگنے کی وجہ سے چمڑا پاک نہ ہوتا ہو، یا امام سینگی لگوا کر وضو نہ کرے مگر مقتدی حجامہ (سینگی) کی وجہ سے وضو کا قائل ہو تو ان جیسے مسائل میں قطعی اور صحیح رائے یہ ہے کہ اس امام کے پیچھے ایسے مقتدی کی نماز صحیح ہوتی ہے، چاہے اس کا امام نفسِ مسئلہ میں غلطی پر ہو، کیوں کہ صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"وہ تمھارے لیے نماز پڑھاتے ہیں۔ اگر وہ درست ہوں تو تمھارے لیے بھی ہے ان کے لیے بھی۔ اگر غلطی پر ہوں تو تمھارے لیے ہے اور ان کے خلاف۔"[1]

مسئلہ قنوت:

اسی طرح اگر مقتدی کسی ایسے امام کی اقتدا کرتا ہے جو فجر میں یا وتر میں قنوت کرتا ہے تو وہ اس کے ساتھ قنوت کرے، خواہ وہ رکوع سے پہلے قنوت کرے یا رکوع کے بعد، اگر وہ امام قنوت نہ کرتا ہو تو وہ مقتدی بھی اس کے ساتھ نہیں کرے گا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

اگر امام کسی چیز کو مستحب سمجھتا ہو مگر مقتدی اسے مستحب نہ سمجھتے ہوں تو وہ محض اتفاق اور یکجہتی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیتا ہے تو اچھا کام کرتا ہے، اس کی مثال وتر ہے، اس کے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

1. بعض اہلِ عراق کے نزدیک وتر مغرب کی طرح تین متصل رکعات ہیں۔
2. بعض اہلِ حجاز کے نزدیک وتر ایک رکعت ہے جو اپنے سے پہلے سے جدا اور منفصل ہو۔
3. حنابلہ اور شوافع وغیرہما کے ظاہر مذہب کے مطابق دونوں امور جائز ہیں اور یہی صحیح ہے۔ گو یہ اس کو ماقبل سے جدا کرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر امام جدا کرنے کا قائل ہو مگر مقتدی مغرب کی طرح وتر پڑھنے پر عمل کرتے ہوں تو امام ان کی قلبی تالیف کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے تو اچھا عمل کرتا ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا: ''اگر تیری قوم زمانۂ جاہلیت کے قریب نہ ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر زمین کے ساتھ ملا دیتا اور اس کے دو دروازے بناتا، ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے۔''[1]

آپ ﷺ نے صرف لوگوں کے تنفر کے خدشے کے پیشِ نظر وہ کام چھوڑ دیا جو آپ ﷺ کے نزدیک افضل تھا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص بلند آواز کے ساتھ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنے کا قائل ہو اور وہ ایسے لوگوں کی امامت کروائے جو اسے مستحب نہ سمجھتے ہوں یا اس کے عکس معاملہ ہو تو وہ اس کی موافقت کرے تو اچھا اقدام کرتا ہے۔ فقہا نے افضل میں اختلاف کیا ہے، یہ ان کے اپنے فہمِ سنت کے مطابق ہے۔

اہلِ عراق کا ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک ماہ تک قنوت کیا تھا، اس کے بعد منسوخی کی بنا پر چھوڑ دیا۔ اس بنا پر ان کی رائے ہے کہ فرض نمازوں میں قنوت کرنا منسوخ ہو چکا ہے۔ اہلِ حجاز کا ایک گروہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک قنوت کرتے رہے، پھر ان میں سے کچھ کی رائے ہے کہ آپ ﷺ رکوع سے پہلے قنوت کرتے تھے اور کچھ کا خیال ہے کہ آپ ﷺ رکوع کے بعد قنوت کرتے تھے۔

صحیح قول تیسرا ہے جو جمہور علمائے حدیث اور اکثر ائمۂ اہلِ حجاز کا اختیار کردہ ہے اور صحیحین وغیرہ میں بھی یہی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مہینے تک رعل، ذکوان اور عصیہ قبیلے کے خلاف قنوت کیا، اس کے بعد اس قنوت کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک مدت کے بعد، غزوہ خیبر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کے بعد قنوت کیا، آپ اپنے قنوت میں یہ دعا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَعَيَّاشَ بْنَ أَبِيْ رَبِيْعَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٣)

بِمَكَّةَ، اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ »[1]

''اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام اور کمزور مومنوں کو نجات دے، اے اللہ! مضر پر اپنی پکڑ سخت کر اور ان پر قحطِ یوسف کی طرح خشک سالی مسلط کر۔''

اگر قنوت منسوخ ہو چکا ہوتا تو آپ ﷺ اس دوسری مرتبہ اس پر عمل نہ کرتے۔ صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب اور عشا میں بھی قنوت کیا ہے۔

سنن میں مروی ہے کہ آپ ﷺ پانچوں نمازوں میں قنوت کرتے تھے مگر زیادہ فجر میں کرتے۔ تاہم آپ فجر یا غیر فجر میں قنوت پر مداومت نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''آپ ﷺ نے رکوع کے بعد ایک مہینے سے زیادہ قنوت نہیں کیا۔''[2] وہ حدیث جو حاکم وغیرہ سے ربیع بن انس عن انس سے روایت کی ہے کہ « مَا زَالَ يَقْنُتُ حَتّٰى فَارَقَ الدُّنْيَا »[3] ''آپ مسلسل قنوت کرتے رہے، تا آنکہ آپ نے دنیا چھوڑ دی۔'' یہ رکوع سے پہلے قنوت کرنے کے سیاق میں کہی گئی ان کی بات ہے۔ یہ حدیث اگر صحیح حدیث کے معارض ہوتی تو قابلِ توجہ نہ ہوتی، کیوں کہ ربیع بن انس صحیح کے راویوں سے نہیں، جب یہ اس کے معارض بھی نہیں تو پھر کس طرح اس کو چھوڑا جا سکتا ہے؟ اس کا صرف یہ مفہوم ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز میں ہمیشہ لمبا قیام کرتے تھے (قنوت کا مطلب قیام ہے) اگر یہ بات کہی جائے کہ آپ ہمیشہ فجر کی نماز میں رکوع سے پہلے یا رکوع کے بعد کوئی دعا کرتے تھے جو سنی جاتی یا نہ سنی جاتی تو یہ قطعاً لغو بات ہے، جو صحیح احادیث پر غور کرتا ہے، اس کو بدیہی طور پر اس کا علم ہو جاتا ہے اور اس کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو صحابہ اور تابعین ضرور اسے نقل کرتے اور آپ ﷺ کے معمول کے مطابق کیے جانے والے قنوت کو ہم تک نقل کرنے میں سستی نہ کرتے جو ہمارے لیے بھی جائز ہوتا، حالانکہ انھوں نے آپ کا وہ قنوت نقل کر دیا ہے جو بعینہٖ جائز نہیں، بلکہ اس کی نظیر جائز ہے، کیوں کہ وہ متعین افراد جن کے خلاف آپ نے بددعا کی تھی، اب ان مخصوص افراد کے خلاف بددعا کرنا بالاتفاق جائز نہیں، بلکہ اس کی نظیر اور ملتی جلتی حالت جائز ہے، لہٰذا جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت اترے تو اس وقت مسلمانوں کے لیے دعا اور کافروں کے خلاف بددعا کرنا فجر اور دیگر نمازوں میں جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب عیسائیوں کے خلاف لڑتے تو اسی طرح قنوتِ نازلہ کرتے اور کہتے: ''اللهم العن الكفرة أهل الكتاب'' ''اے اللہ! کافر اہلِ کتاب پر لعنت کر۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٧)

[3] سنن الدارقطني (٣٩/٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٠١/٢) السلسلة الضعيفة (١٢٣٨)

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی جنگ کے موقع پر کافروں کے خلاف بددعا کی تو جو قنوت کرنا چاہے اس کو چاہیے کہ ہر اترنے والی مصیبت کے حسبِ حال جو دعا مناسب ہو کرے۔ اگر جن مومنوں کے لیے دعا کرے اور جن کافروں کے خلاف بددعا کرے، ان کا نام بھی لے لے تو بہتر ہے۔

جہاں تک قنوتِ وتر کا مسئلہ ہے تو اس بارے میں علما کے تین اقوال ہیں:

1. ایک قول ہے: یہ کسی حالت میں مستحب نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے وتر میں قنوت کی دعا کرنا ثابت نہیں۔
2. دوسرا قول ہے: یہ سارا سال مستحب ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے، کیوں کہ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو قنوتِ وتر کی دعا سکھائی۔
3. تیسرا قول ہے: رمضان کے آخری نصف میں قنوتِ وتر کیا جائے، جس طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قنوت وتر نماز میں کی جانے والی جائز دعا کی قبیل سے ہے، جو چاہے کرے، جو چاہے نہ کرے، جس طرح تین، پانچ اور سات وتر پڑھنا اختیاری ہے اور تین ملا کر پڑھنا اور علاحدہ پڑھنا اختیاری ہے۔ اسی طرح قنوت کی دعا بھی اختیاری ہے۔ جو چاہے کرے، جو چاہے نہ کرے۔ اگر رمضان میں قیام اللیل کی امامت کروائی جائے اور سارا مہینا دعائے قنوت کرتا رہے تو بہتر ہے۔ اگر آخری نصف حصے میں کرے تو بھی بہتر ہے۔ اگر کسی حالت میں نہ کرے، پھر بھی بہتر ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود قیامِ رمضان کی تعداد متعین نہیں کی، مگر آپ ﷺ رمضان یا غیر رمضان میں تیرہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، لیکن آپ رکعات لمبی کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی امامت میں قیام اللیل کا حکم دیا تو وہ ان کو بیس رکعات پڑھاتے اور تین وتر، وہ رکعات کی تعداد میں جس قدر اضافہ کرتے، اسی قدر قراءت میں تخفیف کرتے، کیوں کہ رکعت طویل کرنے کی نسبت اس میں مقتدیوں کے لیے زیادہ تخفیف ہے۔ سلف کا ایک گروہ چالیس رکعات قیام کرتا اور تین وتر پڑھتا، کچھ چھتیس رکعات اور تین وتر پڑھتے، یہ سب جائز ہے۔ رمضان میں ان میں جو کیفیت اختیار کر لی جائے، وہی بہتر ہے۔ افضل نمازیوں کے حالات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر وہ لمبا قیام کرنے کی سکت رکھتے ہوں تو تیرہ رکعات کا قیام افضل ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان خود قیام کرتے تھے، یہ سب سے زیادہ افضل ہے۔ اگر وہ اس کی سکت نہ رکھتے ہوں تو بیس رکعات کا قیام افضل ہے۔ اکثر مسلمانوں کا عمل بھی یہی ہے۔ یہ دس اور چالیس کے درمیان ہے۔ اگر چالیس رکعات پڑھیں تو یہ بھی جائز ہے۔ ان میں سے کچھ مکروہ نہیں۔ امام احمد وغیرہ نے یہ واضح الفاظ میں کہا ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامِ رمضان کی رکعات کی تعداد متعین کی ہے،

ان میں اضافہ کیا جائے نہ کمی، اس نے غلطی کھائی ہے۔ اگر قیام کی تعداد سے متعلق یہ وسعت ہے تو دعائے قنوت کی وجہ سے قیام میں اضافہ کرنے یا دعائے قنوت نہ پڑھنے کے متعلق یہ گمان کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ یہ سب جائز اور اچھا ہے۔ بعض اوقات بندہ تازہ دم ہوتا ہے۔ اس وقت عبادت کو لمبا کرنا اس کے حق میں افضل ہوتا ہے۔ کبھی تازہ دم نہیں ہوتا۔ اس وقت تخفیف اس کے حق میں افضل ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی نماز معتدل ہوتی تھی۔ جب قیام طویل کرتے تو رکوع سجدہ بھی لمبا کرتے۔ جب قیام میں تخفیف کرتے تو اس وقت رکوع سجدے میں بھی تخفیف کرتے۔ فرض نمازوں، قیام اللیل اور نمازِ کسوف وغیرہ میں آپ ایسے ہی کیا کرتے تھے۔

علما نے اختلاف کیا ہے کہ کیا لمبا قیام کرنا افضل ہے یا زیادہ رکوع سجدے کرنا یا دونوں ہی برابر ہیں؟ یہ تین اقوال ہیں۔ صحیح تر قول یہ ہے یہ دونوں برابر ہیں۔ قیام قراءت کے ساتھ خاص ہوتا ہے جو ذکر اور دعا سے افضل ہے۔ سجدہ بذاتِ خود قیام سے افضل ہے، لہٰذا جب آدمی لمبا قیام کرے تو اس کو چاہیے رکوع، سجدے کو بھی لمبا کرے۔ یہ ہے وہ طولِ قنوت جو آپ ﷺ نے اس سوال کے جواب میں ذکر کیا تھا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: « طُولُ الْقُنُوتِ » ''جس میں لمبا قنوت ہو۔'' قنوت کا مطلب ہے عبادت کو دائمی اور طویل رکھنا، خواہ قیام کی حالت ہو یا رکوع کی حالت یا پھر سجدے کی حالت، اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا ﴾ [الزمر: ۹]

''(کیا یہ بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرنے والا ہے۔''

اللہ نے حالتِ سجود میں بھی اس کو قانت کا نام دیا ہے، جس طرح حالتِ قیام میں ﴿ قٰنِتٌ ﴾ کہا ہے۔

بسم اللہ کا مسئلہ:

اب آتے ہیں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی طرف۔ اس میں کچھ شک نہیں کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' بلند آواز سے پڑھتے تھے اور کچھ آہستہ آواز سے یا بالکل نہیں پڑھتے تھے، جو بلند آواز سے پڑھتے تھے ان میں سے اکثر بھی کبھی بلند آواز سے پڑھتے تھے اور کبھی آہستہ آواز سے، کیوں کہ ذکر سے متعلق سنت کبھی آواز پست رکھنا ہوتا ہے اور کبھی مقتدیوں کو تعلیم دینے جیسی کسی مصلحتِ راجحہ کے پیشِ نظر آواز بلند کرنا۔ صحیح میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جنازے میں سورت فاتحہ بلند آواز سے پڑھی، تاکہ لوگوں کو سکھائیں کہ یہ سنت ہے۔

نمازِ جنازہ میں قراءت سے متعلق تین اقوال ہیں:

① ابو حنیفہ اور مالک کے مذہب میں یہ کسی حالت میں مستحب نہیں۔

② بعض اصحاب شافعی اور احمد کے نزدیک نمازِ جنازہ میں سورت فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

③ سورت فاتحہ پڑھنا سنت ہے، اگر کوئی نہ پڑھے، بلکہ قراءت کے بغیر دعا کرے تو جائز ہے اور یہی درست ہے۔

صحیح میں ثابت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: "الله أكبر، سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالىٰ جدك ولا إلٰه غيرك"[1] وہ اکثر مرتبہ بلند آواز سے یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے۔ علما کا اتفاق ہے کہ ان الفاظ کو بلند آواز سے پڑھنا معمول کے مطابق سنت نہیں، لیکن آپ سکھانے کے لیے آواز بلند کرتے تھے۔ اس لیے کچھ صحابہ سے منقول ہے کہ وہ کبھی بلند آواز سے تعوذ بھی پڑھا کرتے تھے، اگر کوئی صحابی دعائے استفتاح اور تعوذ با آواز بلند پڑھ لیتا تھا اور صحابہ اس کو اس پر برقرار رکھتے تھے تو با آواز بسم اللہ پڑھنے کا اس قبیل سے ہونا زیادہ مناسب ہے اور یہ کہ کبھی با آواز بلند کسی راجح مصلحت کے پیشِ نظر پڑھنا جائز ہو، لیکن علمائے حدیث کے ہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دعائے استفتاح اور تعوذ با آواز بلند نہیں پڑھا، بلکہ صحیح میں ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو تکبیر اور قراءت کے درمیان خاموش دیکھتا ہوں، اس میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں پڑھتا ہوں:

«اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنْ خَطَايَايَ كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»[2]

سنن میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قراءت سے پہلے تعوذ پڑھا کرتے تھے۔ بسم اللہ کو با آواز بلند پڑھنا تعوذ کو با آوازِ بلند پڑھنے سے زیادہ قوی ہے، کیوں کہ یہ قرآن کی ایک آیت ہے۔ علما نے اس کے واجب ہونے میں اختلاف کیا ہے، گو انھوں نے استفتاح اور تعوذ کے وجوب میں بھی اختلاف کیا ہے، اس میں مذہبِ احمد وغیرہ میں دو اقوال ہیں، لیکن ان میں اختلاف بسم اللہ کے اختلاف سے کمزور ہے۔

اس کے وجوب کے قائل علما افضل اور اکثر ہیں، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا با آوازِ بلند پڑھنا ثابت نہیں، صحاح اور سنن میں با آوازِ بلند پڑھنے کی کوئی ایک صحیح اور صریح حدیث نہیں، با آوازِ بلند پڑھنے کی تمام صریح احادیث

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٨)

ضعیف، بلکہ موضوع ہیں، اس لیے جب دارقطنی نے اس مسئلے پر مصنف تصنیف کی تو ان سے پوچھا گیا: کیا اس مسئلے میں کوئی صحیح حدیث ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نبی اکرم ﷺ سے تو ثابت نہیں، لیکن صحابہ سے جو ثابت ہے وہ صحیح بھی ہے اور ضعیف بھی۔ اگر رسول اللہ ﷺ ہمیشہ باآوازِ بلند پڑھا کرتے تو صحابہ نقل کرتے اور خلفا کو بھی اس کا علم ہوتا۔ لوگ خلافت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس سے متعلق نہ پوچھتے۔ خلفائے راشدین، اموی خلفا اور عباسی خلفا سب اس کے ترک پر متفق نہ ہوتے۔ اہلِ مدینہ جو تمام شہروں سے زیادہ آپ ﷺ کی سنت کا علم رکھتے تھے، وہ آہستہ یا بلند آواز کے ساتھ کلی طور پر اس کے ترک کے قائل نہ ہوتے۔ صحیح احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ قرآن کی ایک آیت ہے، لیکن فاتحہ یا کسی اور سورت کا حصہ نہیں۔

اس میں بھی علما کا اختلاف ہے کہ کیا یہ قرآن کی آیت ہے؟ یا ہر سورت کی کچھ آیت ہے، یا قرآن میں صرف سورت نمل میں ہے یا یہ کتاب اللہ کی ایک آیت ہے جو قرآن کریم میں لکھی گئی، لیکن سورتوں سے نہیں؟ یہ تین اقوال ہیں، تیسرا قول اوسط ہے، دلائل اس پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس کو قرآن کریم میں لکھنا اس کے قرآن میں سے ہونے پر دلالت کرتا ہے اور ان کا اس کو اس کے مابعد کی سورت سے جدا رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کا حصہ نہیں۔ صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ ﷺ نے پڑھا:

« بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③ ﴾ [الكوثر:١۔٣] »[1]

صحیح میں ہے کہ فرشتہ پہلی وحی لے کر آیا، اس نے کہا:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤ ﴾ [العلق:١۔٥]

یہ پہلی وحی تھی جو نازل ہوئی اور اس سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل نہیں ہوئی تھی۔[2]

سنن میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کی ایک سورت ہے، جس کی تیس آیات ہیں۔ اس نے ایک آدمی کی سفارش کی، حتی کہ اس کی مغفرت ہوگئی، یہ ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ ہے۔''[3] یہ بسم اللہ کے بغیر تیس آیات بنتی ہیں۔

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٠٠)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣)

③ سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٨٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٧٨٦) صحیح الجامع (٢٠٩١)

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں نصف تقسیم کیا، ایک نصف میرا ہے اور دوسرا میرے بندے کا، میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا، جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ اللہ کہتا ہے: میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ اللہ کہتا ہے: میرے بندے نے میری تعریف کی، جب کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ اللہ کہتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی، جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ اللہ کہتا ہے: یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان دو نصف ہیں، میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا، جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ اللہ کہتا ہے: یہ سب میرے بندے کے لیے ہیں اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔"[1]

یہ صحیح حدیث اس بات میں صریح ہے کہ بسم اللہ فاتحہ کی آیت نہیں اور کوئی صحیح صریح حدیث اس کے معارض ومخالف نہیں۔ حدیث سے اس باب میں جو سب سے عمدہ بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو فاتحہ سے پہلے پڑھنا چاہیے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اس کی ایک آیت ہے، اس لیے کچھ قراء سورت کے شروع میں اس کو پڑھتے تھے اور کچھ نہیں پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کام جائز ہیں، لیکن جو پڑھتا ہے وہ افضل کام کرتا ہے۔ اسی طرح جو ہر سورت کے شروع میں اس کو پڑھتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو نہیں پڑھتا، کیوں کہ پڑھنے والا وہ الفاظ پڑھتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصحف میں لکھے ہیں۔ فرض کریں، صحابہ نے محض تبرکاً ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھی ہے اور تبرکاً ہی پڑھنا چاہیے، کیوں کہ صحابہ ایسے الفاظ قرآن میں نہیں لکھ سکتے جن کو پڑھنا ناجائز ہو، بلکہ انھوں نے مصحف کو ہر اس چیز سے خالی کر دیا تھا جو قرآن سے نہیں تھی، حتی کہ انھوں نے فاتحہ کے آخر میں "آمین" بھی نہیں لکھی۔ سورتوں کے نام اور پانچ پانچ، دس دس کی تقسیم بھی نہیں لکھی، درآنحالیکہ نماز میں آمین کہنا نمازی کے لیے سنت ہے، تو جو چیز پڑھنا جائز ہی نہ ہو وہ اس کو کس طرح قرآن میں لکھ سکتے ہیں، حالانکہ انھوں نے وہ چیز بھی نہیں لکھی جو نمازی قرآن کے علاوہ کہہ سکتا ہے؟! پس شرعی دلائل کو اکٹھا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کتاب اللہ کا حصہ ہے، لیکن ہر سورت کا حصہ نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پڑھنے کی نفی نہیں کی گئی۔ اس حدیث کے الفاظ میں ہے: "میں نے ان میں سے کسی کو بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔"

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹۵)

یا ’’وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔‘‘ ایک روایت میں ہے: ’’وہ قراءت کے شروع اور آخر میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ذکر نہیں کرتے تھے۔‘‘[1]

یہ روایات بلند آواز سے پڑھنے کی نفی کرتی ہیں، کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اسی کی نفی کی ہے، جس کا انھیں علم تھا، لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آہستہ آواز میں پڑھتے تھے، یہ کہنا تو ممکن ہی نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر کہتے ہی قراءت شروع کر دیتے تھے اور اس تکبیر اور قراءت کے دوران میں خاموش نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے کہا: میں تکبیر اور قراءت کے درمیان آپ کو خاموش دیکھتا ہوں، اس میں آپ کیا کہتے ہیں؟[2]

جس عالم نے حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کی تاویل آہستہ آواز میں پڑھنے کی نفی کی صورت میں کی ہے، وہ اس بات کے مقابل ہے جس نے کہا ہے: انس کی مراد یہ تھی وہ نماز کا آغاز سورت فاتحہ سے کرتے تھے، کسی دوسری سورت سے نہیں، یہ تاویل بھی کمزور ہے، کیوں کہ اس کا علم اتنا عام ہے کہ لوگ ہمیشہ سے ایسے ہی کرتے آئے ہیں۔ حجاج بن یوسف جیسے امرا، جنھوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں، وہ کسی بھی سورت سے پہلے سورت فاتحہ پڑھا کرتے تھے، اس میں کسی نے اختلاف کیا ہے اور نہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یا کسی بھی فقیہ سے اس سے متعلق کبھی سوال ہی ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صاحبین سے نقل کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ جس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان کو شک تھا، پتا نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ پڑھتے تھے یا نہیں۔ پڑھتے تھے تو اس کی روایت صحیح روایات کے موافق ہے، کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جہری پڑھنے کی نفی کی ہے، لیکن ان کو سراً پڑھنے کا علم نہیں تھا۔

سفر میں سنتوں کا مسئلہ:

سفر میں سنتیں پڑھنا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے جس میں علما کے اتفاق کے ساتھ دونوں کام کرنے جائز ہیں۔ علما کا اتفاق ہے جو چاہے پڑھ لے، جو چاہے چھوڑ دے۔ وہ نماز جسے پڑھنا اور چھوڑنا جائز ہو، کبھی انسان کے لیے ضرورت کی وجہ سے اسے پڑھنا افضل ہوتا ہے اور کبھی چھوڑنا افضل، جب کسی ایسے کام میں مشغول ہو جو نفل سے افضل ہو، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فجر کی سنتوں اور وتر کے سوا دیگر معمول کی سنتیں نہیں پڑھتے تھے۔ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں سو گئے اور فجر نہ پڑھ سکے اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے طلوع ہونے کے بعد فرض بھی پڑھے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۱۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹۹)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۱۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۹۸)

اور سنتیں بھی۔ آپ ﷺ اپنی سواری پر بھی نفل پڑھ لیا کرتے تھے، چاہے اس کا منہ کسی بھی جہت کی طرف ہوتا، آپ ﷺ اس پر وتر بھی پڑھ لیتے، لیکن سواری پر فرض نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یہ سب صحیح میں ثابت ہے۔ البتہ سفر میں ظہر سے پہلے اور بعد کی سنتیں اسی طرح مغرب کی سنتیں بھی آپ ﷺ سے منقول نہیں۔

علما نے فرائض کے ساتھ پڑھی جانے والی سنن رواتب، یعنی معمول کی سنتوں میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ ان کی کوئی تعداد متعین نہیں کرتے، کچھ نے ضعیف، بلکہ اہلِ علم کے نزدیک موضوع روایات کو بنیاد بنا کر ان کی تعیین کی ہے، مثلاً ظہر سے پہلے چھے اور ظہر کے بعد چار سنتیں، عصر سے پہلے چار سنتیں اور عشا سے پہلے اور بعد میں چار چار سنتیں مقرر کی ہیں۔

اس مسئلے میں درست رائے یہ ہے، جو صحیح احادیث میں ثابت ہے، اسے لیا جائے اور جو ان کے معارض ہے، اسے نہ لیا جائے۔ صحیح میں تین احادیث ثابت ہیں:

1. ایک عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث، وہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے ظہر سے پہلے دو رکعات اور ظہر کے بعد دو رکعات، مغرب کے بعد دو رکعات، عشا کے بعد دو رکعات اور فجر سے پہلے دو رکعات یاد کیں۔''[1]

2. دوسری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعات پڑھا کرتے تھے۔ یہ صحیح میں بھی ہے اور باقی ساری صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی طرح ہے۔ صحیح میں بھی اسی طرح ہے۔ ترمذی میں ایک صحیح روایت ہے: ''آپ ﷺ نے ظہر سے پہلے دو رکعات پڑھیں۔''

3. تیسری حدیث حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ایک دن اور رات میں فرض کے علاوہ بارہ رکعات نفل پڑھیں، اللہ جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔''[2] سنن میں اس کی تفسیر اس طرح ذکر ہوئی ہے: ''چار ظہر سے پہلے اور دو اس کے بعد، دو مغرب کے بعد، دو عشا کے بعد اور دو فجر سے پہلے۔''[3]

اس صحیح حدیث میں آپ ﷺ نے بارہ رکعات پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ دونوں صحیح احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ فرائض کے ساتھ دس رکعات پڑھتے تھے یا بارہ۔ آپ رات کے قیام میں گیارہ رکعات پڑھتے تھے، یا تیرہ۔ اگر دن رات کی فرض اور نفل رکعات کی مجموعی تعداد دیکھی جائے تو تقریباً چالیس رکعات بنتی ہیں۔ آپ ﷺ دن کی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٢٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٣٦٢)

نمازوں میں مغرب کی نماز طاق عدد میں پڑھتے تھے اور رات کی نمازوں میں وتر طاق عدد میں پڑھتے تھے۔ صحیح میں آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ثابت ہے: ''دو اذانوں (اذان اور اقامت) کے درمیان نماز ہے۔ دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ (اس خدشے کے پیشِ نظر کہ لوگ اسے سنت ہی نہ بنا لیں) تیسری مرتبہ کہا: جو چاہے اس کے لیے ہے۔''[1]

صحیح میں مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ان کو دیکھتے اور منع نہ کرتے۔ اگر مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان نفل پڑھنا جائز ہے تو عصر کی اذان و اقامت اور عشا کی اذان و اقامت کے درمیان نفل پڑھنا بطریقِ اولیٰ جائز ہوگا، کیوں کہ مغرب کو جلدی پڑھنا بالاتفاق سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عصر، مغرب اور عشا سے پہلے نفل پڑھنا جائز ہے اور یہ ان رواتب، یعنی معمول کی سنتوں میں شامل نہیں، جن کو آپ ﷺ نے نہ اپنے قول کے ذریعے متعین کیا نہ اپنے نفل کے ساتھ۔ ان پر ہمیشگی ہی کی۔ جس نے یہ گمان کیا ہے یہ دو رکعات سنت تھیں اور آپ عصر سے پہلے پڑھتے تھے، اسی لیے آپ نے عصر کے بعد انھیں قضا کر کے پڑھا تو اس کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ ظہر کی دو رکعات تھیں جو آپ نہ پڑھ سکے تو عصر کے بعد ان کو قضا کر کے پڑھا، جو آپ ظہر کے بعد پڑھتے تھے، لہٰذا وہ عصر سے پہلے ہی ہوتی تھی اور آپ ﷺ نے عصر کے بعد ظہر کی دو رکعات ہی قضا پڑھی تھیں۔ اذان و اقامت کے درمیان نوافل یا چاشت وغیرہ کے نوافل جیسے جائز نوافل ذکر قراءت اور دعا وغیرہ جیسے دیگر تمام نوافل کی طرح ہی ہیں جو بعض اوقات اس شخص کے حق میں مستحب ہوتے ہیں جو ان سے زیادہ افضل کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ جو ان سے افضل کسی کام میں مشغول ہو اس کے لیے وہ مستحب نہیں ہوتے۔

تھوڑے عمل پر ہمیشگی کرنا کبھی کبھی زیادہ عمل کرنے سے افضل ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا ہر عمل دائمی ہوتا تھا۔

آدمی اگر روزانہ قیام اللیل میں کچھ رکعات پڑھنے کا التزام کرے اور انھیں نہ چھوڑے، اگر تازہ دم ہو تو رکعات کو طویل کرے، اگر تھکا ہوا ہو تو تخفیف کرے، اگر کبھی رات کو نہ پڑھ سکے تو اس کے بدلے میں صبح پڑھے، یہ مستحب عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگر کبھی رات کے وقت سوئے رہتے اور قیام اللیل نہ کر سکتے تو دن کے وقت بارہ رکعات پڑھ لیتے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اپنے حزب، یعنی ورد کو نہ کر سکے اور سویا رہے، وہ صبح فجر کی نماز سے لے کر ظہر کے درمیان درمیان اسے پڑھ لے تو وہ اس کے لیے ایسے ہی لکھا جائے گا، گویا اس نے رات کو پڑھا۔''[2]

''چاشت کی نماز'' بھی اسی باب سے تعلق رکھتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم رکھنے والوں کا اتفاق ہے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٣٨)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٤٧)

کہ آپ ﷺ اس پر ہمیشگی نہیں کرتے تھے۔ جس فقیہ کا یہ خیال ہے کہ چاشت کی دو رکعات آپ ﷺ پر فرض تھیں، اس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ حدیث جو وہ ذکر کرتے ہیں کہ ''تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں اور تم پر نفل وہ یہ ہیں: وتر، فجر کی رکعات اور چاشت کی دو رکعات۔'' یہ موضوع ہے، بلکہ صحیح حدیث میں ثابت ہے، جس کے معارض اور مخالف کوئی روایت نہیں، آپ ﷺ چاشت کے وقت عارضی سبب کی وجہ سے نماز پڑھتے تھے، اس وقت کی وجہ سے نہیں، مثلاً: آپ ﷺ رات کو سوئے رہے تو دن کے وقت بارہ رکعات پڑھ لیں، مثلاً: چاشت کے وقت کسی سفر سے آئے تو مسجد میں داخل ہوئے تو نماز پڑھ لی، مثلاً: فتح مکہ کے دن آپ نے آٹھ رکعات پڑھیں، اس نماز کو وہ نمازِ فتح کا نام دیتے تھے۔ امرا جب کوئی شہر فتح کرتے تو یہ نماز پڑھتے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ فتح کیا، تب یہ نماز پڑھی تھی، اگر قیام اللیل کی طرح اس کا سبب محض وقت ہوتا تو آپ ﷺ فتح مکہ کے ساتھ اس کو خاص نہ کرتے، یہی وجہ ہے کہ کچھ صحابہ چاشت کی نماز نہیں پڑھتے تھے، لیکن صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میرے خلیل (ﷺ) نے مجھے تین کاموں کی وصیت کی: ایک ہر مہینے میں تین روزے رکھنا، دوسرے چاشت کی دو رکعات پڑھنا اور تیسرے سونے سے پہلے وتر پڑھنا۔''[1] مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''ہر روز چاشت کی دو رکعات۔''[2]

صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صبح کے وقت ہر آدمی کے جوڑوں پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔ ہر مرتبہ سبحان اللہ کہنا ایک صدقہ ہے۔ ہر مرتبہ الحمدللہ کہنا ایک صدقہ ہے۔ ہر مرتبہ لا إلہ إلا اللہ کہنا ایک صدقہ ہے۔ ہر مرتبہ اللہ اکبر کہنا ایک صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا ایک صدقہ ہے۔ برائی سے روکنا ایک صدقہ ہے اور چاشت کے وقت کی دو رکعات ان سب سے کفایت کر دیتی ہیں۔''[3]

صحیح مسلم میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اہلِ قبا کے پاس آئے۔ وہ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''نمازِ اوابین اس وقت ہے جب چاشت کے وقت اونٹ کے بچوں کو گرمی لگنے لگے۔''[4] ساری صحیح احادیث اور ان جیسی دیگر احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ چاشت کے وقت کی نماز پسندیدہ اور اچھی ہے۔

یہ بات باقی رہ گئی ہے کہ اس پر ہمیشگی کرنا افضل ہے، جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، یا رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے ہمیشگی نہ کرنا افضل ہے؟ اس میں فقہا نے اختلاف کیا ہے، لیکن یہ کہنا زیادہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢١، ٧٢٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٨)

قرینِ صحت ہے کہ جو قیام اللیل پر ہمیشگی کرتا ہو، یہ اس کو چاشت کی نماز پر ہمیشگی کرنے سے کفایت کر جاتا ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا، جو قیام اللیل سے سویا رہتا ہے، اس کے لیے چاشت کی نماز قیام اللیل کا بدل ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی وصیت کی تھی تو یہ وصیت اسی کو کی جاتی ہے، جس کو قیام اللیل کی عادت نہ ہو، ورنہ رات کو قیام کرنا جس کا معمول ہو وہ عموماً رات کو بیدار ہو جاتا ہے اور اس کے لیے رات کے آخر میں وتر پڑھنا افضل ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو خدشہ ہو کہ وہ آخر شب بیدار نہیں ہو سکے گا، وہ رات کے شروع میں وتر پڑھ لے۔ جس کو آخر شب میں اٹھنے کی حرص ہو وہ رات کے آخر میں وتر پڑھے، کیوں کہ رات کے آخری وقت پڑھی جانے والی نماز میں حاضری ہوتی ہے، اس کی گواہی دی جاتی ہے اور یہ افضل ہے۔''[1]

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: فرض کے بعد کون سی نماز افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیام اللیل۔''[2]

تیسری قسم:

وہ دو امور جن کا سنتِ رسول ہونا ثابت ہے، لیکن کچھ علما نے ایک قسم کو حرام کہا ہے یا مکروہ، اس کے دو اسباب ہیں: ان کو وہ حدیث نہیں پہنچی، یا انھوں نے اس کی کوئی کمزور تاویل کی ہے، ان جیسے امور میں درست یہی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے جو سنت مقرر کی ہے وہی مسنون ہے، اس میں سے کسی چیز سے منع نہیں کیا جائے گا، گو ایک دوسرے سے افضل ہو، اس کی مثال تشہدات کی انواع ہیں۔ صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تشہد بھی ثابت ہے اور صحیح مسلم میں ابو موسیٰ کا تشہد بھی آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے، دونوں کے الفاظ ایک دوسرے کے قریب ہیں اور صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا تشہد بھی ثابت ہے۔

سنن میں ابن عمر، عائشہ اور جابر رضی اللہ عنہم کا تشہد ثابت ہے۔ موطا وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے منبرِ رسول پر لوگوں کو تشہد سکھایا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس تشہد کے سوا کچھ نہیں سکھا سکتے تھے جو جائز نہ ہو، اس لیے محقق ائمہ کے نزدیک ان تمام الفاظ کے ساتھ تشہد پڑھنا جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی مکروہ نہیں۔ اصحابِ احمد میں سے جس نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کو اختیار کرنا واجب ہے، اس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

دوسری مثال: اذان اور اقامت کے الفاظ۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۵۵)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۳)

صحیح میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کے کلمات دو دو مرتبہ دہرانے اور تکبیر میں ایک ایک مرتبہ کہنے کا حکم دیا گیا اور صحیح میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو محذورہ کو اذان اور اقامت سکھائی، اذان میں ترجیع کی، یعنی شہادتین دو مرتبہ کہی اور اقامت دوہری کہی،[1] اس حدیث کے بعض طرق میں ہے، شروع میں چار مرتبہ اللہ اکبر کہا، یہ سنن میں ہے اور بعض میں ہے دو مرتبہ اللہ اکبر کہا، یہ صحیح مسلم میں ہے۔ سنن میں ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی وہ اذان جو عبداللہ بن زید سے مروی ہے، اس میں ترجیع اور دوہری اقامت مذکور نہیں۔ ابو محذورہ اور بلال رضی اللہ عنہ دونوں کی اذان سنت ہے، موذن اذان میں ترجیع کرے یا نہ کرے، اقامت اکہری کہے یا دوہری دونوں عمل ہی مستحسن اور سنت کے مطابق ہیں۔ جو ترجیع کو واجب اور لازمی یا مکروہ اور منع کہتا ہے یہ دونوں ہی غلط ہیں، اسی طرح جو اکہری اقامت کو مکروہ یا دوہری اقامت کو مکروہ کہتا ہے وہ بھی غلط ہے، ایک کو اختیار کر لینا اجتہادی مسئلہ ہے، جس طرح بعض قراءتوں کو چھوڑ کر بعض کو اختیار کر لینا اور بعض تشہدات کو چھوڑ کر بعض کو اختیار کر لینا۔

تیسری مثال: نمازِ خوف کی انواع جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی، اسی طرح استسقا کی انواع، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز کے بغیر دعائے استسقا کی اور ایک مرتبہ صحرا میں نکلے اور صحابہ کو دو رکعات پڑھائیں، صحابہ نماز کے بغیر بھی دعائے استسقا کیا کرتے تھے، خلفائے راشدین نے بھی اسی طرح کیا، تو یہ سب جائز اور مستحسن ہے۔

سفر میں روزے کا مسئلہ:

رمضان میں مسافر کا روزہ رکھنا اور چھوڑنا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں امور کے جواز پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ سلف و خلف کے ایک گروہ کی رائے ہے کہ مسافر کے لیے رمضان میں روزہ رکھنا جائز ہی نہیں، اگر وہ روزہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت نہیں کرے گا۔ ان کا خیال ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے کی اجازت اس حدیث سے منسوخ ہے: «لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ»[2] ''سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔'' لیکن صحیح وہی ہے جو ائمہ کا مذہب ہے۔ اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کو سفر میں روزہ رکھنے کی اجازت دینے کے منافی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نیکی ہونے کی نفی کی ہے، جائز اور مباح ہونے کی نہیں اور فرض جائز مباح نوع کو کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے، اگر مکلّف مامور بہ کو بجا لائے۔ سفر میں اس کے نیکی نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح کوئی شخص کوئی نمکین چیز کھا کر اپنی پیاس بڑھا لے اور روزہ رکھ لے یا روزہ رکھ کر سورج کے سامنے بیٹھ جائے تو کہا جائے گا کہ سورج میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔ اسی لیے سفیان بن عیینہ نے کہا تھا: ''اس کا معنی ہے: جس نے روزہ رکھا ہو وہ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۷۹)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۴٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۱۵)

اس سے زیادہ نیک نہیں، جس نے نہیں رکھا۔''

اس میں روزہ نہ رکھنے کے افضل ہونے کی دلیل ہے، آپ ﷺ کی زندگی کا آخری عمل یہی تھا۔ آپ ﷺ نے پہلے سفر میں روزہ رکھا، پھر نہ رکھا۔ جو سمجھتا رہا ہے سفر میں روزہ رکھنا دین میں کمی ہے وہ بدعتی اور گمراہ ہے۔ اگر کوئی اس پہلو سے اپنے اوپر روزے کے وجوب اور روزہ چھوڑنے کی حرمت کا عقیدہ رکھے تو سلف و خلف کے ایک گروہ نے اس کو اعادہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ صحیح میں ہے کہ حمزہ بن عمرو نے آپ ﷺ سے پوچھا اور کہا: میں ایسا آدمی ہوں کہ زیادہ روزے رکھتا ہوں، کیا سفر میں روزہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو چھوڑ دے تو اچھا ہے، اگر رکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔''[1] اگر آدمی کے لیے سفر میں روزہ رکھنا آسان ہو یا موخر کرنا تو جو اس کے لیے نسبتاً آسان ہو وہ کر لے، وہی بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے آسانی چاہتے ہیں، تنگی نہیں، اگر سفر میں روزہ رکھنا تاخیر کرنے سے زیادہ پرمشقت ہو تو تاخیر افضل ہے۔ مسند میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ أَنْ يُؤْخَذَ بِرُخَصِهِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ تُؤْتَى مَعْصِيَتُهُ »[2]

''اللہ تعالیٰ جس طرح یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو اختیار کیا جائے اسی طرح یہ بھی ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جسارت کی جائے۔''

اس کو ابن خزیمہ یا کسی دوسرے محدث نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ان صحاح کا مرتبہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے کم تر ہے۔

ابر آلود دن کا روزہ:

جہاں تک مطلع ابر آلود ہونے کے دن روزہ رکھنے کا مسئلہ ہے، یعنی چاند دیکھنے میں بادل رکاوٹ بن جائے یا شعبان کی تیسویں رات انتہائی سیاہ ہو تو کچھ صحابہ احتیاطاً روزہ رکھ لیتے تھے اور کچھ نہیں رکھتے تھے، ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے اس دن روزہ رکھنا واجب قرار دیا ہو بلکہ جنھوں نے رکھا انھوں نے احتیاط اور تلاش کے طریق سے رکھا اس مسئلے میں ان سے جو آثار منقول ہیں وہ صریح ہیں جس طرح عمر، علی، معاویہ، عبداللہ بن عمر اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔

علما نے اس میں اختلاف کیا ہے اور ان کے کچھ اقوال ہیں۔ کچھ مالکی، شافعی اور حنبلی علما کے نزدیک اس دن روزہ رکھنا نہی تحریمی ہے یا تنزیہی، کچھ حنبلی علما اس دن روزہ رکھنا واجب کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک دونوں امور جائز ہیں۔ مطلع فجر ابر آلود ہونے کی صورت میں کھانے پینے سے رک جانے کے قائم مقام، امام احمد سے بھی یہی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢١)

[2] مسند أحمد (١٠٨/٢) صحيح الجامع (١٨٨٦)

منصوص ہے۔ وہ احتیاطاً اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی میں اس دن روزہ رکھ لیتے تھے، لیکن واجب خیال کرتے ہوئے نہیں، جس طرح دیگر ان تمام کاموں کا حکم ہے، جن کا واجب ہونا مشکوک ہو تو ان کو احتیاطاً کر لینا مستحب ہوتا ہے، مگر وجوباً نہیں۔

اگر آدمی اس دن معلق نیت کر کے روزہ رکھے، یعنی یہ نیت کرے کہ اگر وہ دن رمضان کا دن ہوا تو وہ روزہ اس کو کفایت کرے گا، اگر نہ ہوا تو نہیں کرے گا اور نفلی ہو جائے گا، پھر جب اس دن کا رمضان سے ہونا ثابت ہو گیا تو اکثر علما کے نزدیک اس دن کا روزہ اس شخص کو کفایت کر جائے گا۔ یہ ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور امام احمد سے ایک صحیح تر روایت، کیوں کہ نیت علم کے تابع ہے۔ جو شخص جو کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کا علم رکھتا ہو تو وہ اپنے اختیار کے بغیر اس کی نیت کر سکتا ہے۔ اگر اس کو اس چیز کا علم نہ ہو تو پھر اس کا قصد کرنا ممتنع ہے، لہٰذا جس کو علم ہی نہیں کہ وہ دن رمضان کا ہو گا، اس سے بالجزم رمضان کے روزے کا قصد کرنا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

سفر میں نمازِ قصر اور جمع کرنے کا مسئلہ:

سفر میں نماز قصر کرنا اور دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھنا بھی اسی بات سے تعلق رکھتا ہے۔ سفر میں نماز قصر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ جاریہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں چار رکعات والی نماز صرف دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ضرورت کے وقت سفر میں دو نمازوں کو اکٹھا کرتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دو نمازوں کو جمع کرنا آپ کے قصر کی طرح نہیں تھا، بلکہ قصر سنتِ راتبہ، یعنی معمول کی سنت تھی اور جمع عارضی رخصت۔ جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر میں ظہر یا عصر یا عشا کی چار رکعات پڑھنا نقل کیا ہے، اس کا بیان غلط ہے، کیوں کہ یہ بات نہ کسی صحیح حدیث میں مذکور ہے نہ ضعیف ہی میں۔ تاہم کچھ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں نماز قصر کرتے اور میں پوری پڑھتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ چھوڑتے اور میں رکھتی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا کرتی ہو، اے عائشہ۔"[1] اس سے کچھ علما کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھتے اور چھوڑتے اور قصر کرتے اور پوری پڑھتے تھے، مگر یہ بات کسی راوی نے بھی نقل نہیں کی بلکہ یہ حدیث جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل منقول ہے، باطل ہے، کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہو یا کوئی دوسرا جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں ہوتا وہ آپ جیسی نماز ہی پڑھتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کبھی کسی نے عرفات یا مزدلفہ میں یا کسی دوسرے مقام میں چار رکعات نہیں پڑھیں، بلکہ تمام مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دو

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٥٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے منکر کہا ہے۔

رکعات ہی پڑھا کرتے تھے۔ آپ ﷺ حج کے ایام میں منیٰ میں قیام پذیر تھے اور اس اثنا میں لوگوں کو دو رکعات ہی پڑھاتے رہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اپنی خلافت کے ابتدائی سالوں میں دو رکعات ہی پڑھاتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ امور کی بنا پر جو ان کی رائے کے مطابق چار رکعات پڑھنے کا تقاضا کرتے تھے۔ انھوں نے چار رکعات پڑھانا شروع کر دیں تو لوگوں نے آپ سے اختلاف کیا، کچھ نے ان کی حمایت کی اور کچھ نے مخالفت۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خاص طور پر عرفات اور مزدلفہ میں نمازیں اکٹھی پڑھائیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہیں، لیکن اس کے علاوہ دوسرے سفروں میں جب آپ ﷺ نے سفر جاری رکھنا ہوتا تو مغرب کو عشا تک موخر کرتے اور دونوں کو اکٹھی کر کے پڑھتے، ظہر کو عصر کے وقت تک موخر کرتے اور دونوں کو اکٹھا پڑھتے۔ اس لیے علما کے دو اقوال میں سے صحیح تر قول کے مطابق سفر میں قصر جائز ہے، خواہ قصر کی نیت کرے یا نہ کرے، اسی طرح جمع کرنا بھی جائز ہے، چاہے پہلی نماز کے ساتھ اس کی نیت کرے یا نہ کرے، کیوں کہ صحابہ نے جب عرفات کے مقام پر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے ظہر کی دو رکعات پڑھیں، پھر عصر کی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز کا آغاز کرتے وقت ان کو جمع کی نیت کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ صحابہ کو علم ہی تھا کہ آپ جمع کرنے والے ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنے دیگر اسفار میں ایسا کبھی نہیں کیا تھا، پھر آپ ﷺ نے اپنے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں کسی کو خواہ وہ اہلِ مکہ سے ہوں یا کسی دوسرے علاقے سے، علاحدہ ہونے اور دونوں نمازوں کی چار رکعات پڑھنے یا عصر کو موخر کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ سب نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔

سفر میں قصر کے جواز پر علما کا اتفاق ہے اور ایک شاذ قول کے سوا اس کے افضل ہونے پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ اسی طرح ایک شاذ قول کے سوا اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ سفر میں ہر نماز کو، کسی ایسے سبب کے بغیر جو جمع کرنے کا شدید تقاضا کرے، اس کے وقت پر پڑھنا ہی افضل ہے۔

قصر اور جمع کا سبب:

قصر کا خاص سبب سفر ہے، اس لیے سفر کے علاوہ کسی صورت میں قصر جائز نہیں۔ جمع کا سبب حاجت اور عذر ہے۔ اگر اس کی ضرورت اور حاجت ہو تو آدمی چھوٹے یا لمبے سفر میں جمع کر سکتا ہے، بارش، بیماری وغیرہ جیسے اسباب کی وجہ سے بھی جمع کرنا جائز ہے، کیوں کہ اس کا مقصود امت سے حرج اور تنگی دور کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے سفر میں پڑاؤ کے دوران میں صرف ایک مرتبہ جمع کرنا ثابت ہے، اس لیے جمع کے قائلین، یعنی مالک، شافعی اور احمد نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا پڑاؤ ڈالنے اور مہمان بننے والے مسافر کے لیے اس دوران میں جمع کرنا جائز ہے یا

نہیں؟ امام مالک اور ایک روایت میں احمد نے اس سے منع کیا ہے اور شافعی اور ایک روایت میں احمد نے اس کو جائز کہا ہے، امام ابوحنیفہ نے مزدلفہ اور عرفات کے سوا ہر جگہ سے منع کیا ہے۔

افضل حج:

حج تمتع، قِران اور اِفراد بھی اسی باب سے تعلق رکھتے ہیں۔

ائمہ اربعہ اور جمہور امت تینوں کے جواز کے قائل ہیں۔ سلف اور خلف کے ایک گروہ نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ تمتع کے سوا کوئی صورت جائز نہیں۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے ہم رائے علمائے حدیث اور شیعہ کا مذہب ہے، بنی امیہ کا ایک گروہ اور ان کے پیروکار تمتع سے منع کرتے تھے، بلکہ تمتع کرنے والے کو سزا دیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج میں علما کا اختلاف ہے کہ آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا یا قِران یا اِفراد؟ پھر ان میں سے کون سی قسم افضل ہے، اس میں بھی اختلاف ہے۔ اصحابِ احمد کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ تمتع کیا اور احرام کھول دیا تھا۔ ایک دوسرے گروہ کا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرے کا احرام باندھا اور اس وقت تک حج کا احرام نہ باندھ لیا جب تک عمرے کا طواف اور سعی نہ کر لی۔ اصحابِ مالک اور شافعی کا گروہ خیال کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ اِفراد کیا تھا اور اس کے پیچھے عمرہ کیا۔ اصحابِ ابوحنیفہ کے ایک گروہ کی رائے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ قِران کیا تھا اور اس میں دو طواف اور دو مرتبہ سعی کی، ایک گروہ کا گمان ہے کہ آپ نے مطلق احرام باندھا تھا، یہ سب خطا پر مبنی اقوال ہیں۔ صحابہ سے یہ مروی نہیں، بلکہ صحابہ کی عام روایات متفق ہیں، جس نے اس مسئلے میں ان کی طرف اختلاف منسوب کیا ہے تو یہ ان کے احکام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے، کیوں کہ صحابہ نے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج تک عمرے سے فائدہ اٹھایا۔ عام صحابہ نے اسی طرح نقل کیا ہے، کئی ایک صحابہ اور دیگر نے یہ نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجِ قران کیا تھا اور دونوں کا اکٹھا احرام باندھا تھا۔ یہ بھی انھوں نے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حج کے ساتھ عمرہ کیا تھا۔ اس پر بھی ان کا اتفاق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے بعد عمرہ نہیں کیا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے حج کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے عمرہ نہیں کیا تھا اور انھوں نے بھی حیض کی وجہ سے کیا تھا۔

کتاب و سنت اور صحابہ کی زبان میں لفظ ''متمتع'' اس شخص پر بولا جاتا ہے جو حج کے مہینوں میں حج عمرے کو باہم کرے، خواہ اس نے دونوں کا اکٹھا احرام باندھا ہو یا پہلے عمرے کا احرام باندھا ہو، پھر اس میں حج کو داخل کر لیا، یا عمرے کا احرام کھولنے کے بعد حج کا احرام باندھا ہو، یہ متاخرین کے عرف میں تمتع خاص ہے۔ اگر حاجی نے عمرہ پورا کرنے کے بعد احرام کھولنے سے پہلے حج کا احرام باندھ لیا، کیوں کہ وہ قربانی ساتھ لے کر آیا تھا یا قربانی نہیں لے

کر آیا تھا۔ اس کو وہ کبھی تمتع خاص کرنے والا متمتع اور قِران کرنے والا کہتے ہیں اور کبھی کہتے ہیں یہ تمتع خاص میں داخل نہیں، بلکہ قارِن یعنی قِران کرنے والا ہے۔

یہ جو میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ قِران کو بھی تمتع کہتے ہیں، صحیح احادیث میں اس کا صراحت سے ذکر ہوا ہے۔ یہ جو نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تمتع کیا تھا، ان میں سے کچھ نے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجِ اِفراد کیا، یعنی آپ نے حج کے اعمال علاحدہ ادا کیے اور قربانی ساتھ لانے کی وجہ سے احرام نہ کھولا، تو آپ نے ایسا تمتع نہیں کیا تھا جس میں احرام کھولا، اس لیے اس جہت سے آپ حجِ اِفراد کرنے والے ٹھہرے۔

جو حج کے مہینوں میں آئے اور قربانی ساتھ نہ لائے اس کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول دے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے صحابہ کو یہی حکم دیا تھا جو قربانی ساتھ نہیں لائے تھے، آپ ﷺ نے ان سب کو تمتع کا حکم دیا تھا، جو قربانی ساتھ لائے اس کے لیے قِران افضل ہے، جس طرح خود رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا، جو ایک سفر میں عمرہ کرے اور دوسرے سفر میں حج کرے یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرے اور حج تک مکہ میں قیام کرے تو اس کے لیے قِران یا تمتع کی نسبت اِفراد کرنا افضل ہے، اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

چوتھی قسم:

اس قسم میں علما نے اختلاف کیا ہے۔ اگر ایک عالم نے ایک چیز کو واجب یا مستحب کہا ہے تو دوسرے نے اس کو حرام کہا ہے اور سنت ان میں سے صرف ایک قول پر دلالت کرتی ہے، دونوں کو جائز قرار نہیں دیتی۔ یہ قسم چاروں اقسام میں سے سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہے۔ پہلی تینوں اقسام میں سنت نے دونوں امور کو جائز کہا ہے۔

سورت فاتحہ:

اس قسم کی مثال جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنا ہے، اس سے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

1. جب امام بلند آواز سے پڑھ رہا ہو اور مقتدی سن رہا ہو تو اس حالت میں مقتدی کے لیے نہ سورت فاتحہ پڑھنا جائز ہے نہ کچھ اور۔ یہ جمہور سلف و خلف کا قول ہے، مالک، ابو حنیفہ اور احمد کا مذہب بھی یہی ہے اور شافعی کا ایک قول بھی۔
2. دونوں امور (پڑھنا اور نہ پڑھنا) جائز ہیں، مگر پڑھنا افضل ہے۔ یہ اوزاعی، اہلِ شام اور لیث بن سعد سے مروی ہے اور اصحابِ احمد کے ایک گروہ و دیگر کا اختیار کردہ قول ہے۔
3. قراءت کرنا واجب ہے، یہ امام شافعی کا دوسرا قول ہے۔

جمہور کا قول ہی صحیح ہے، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٤]

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

امام احمد کا قول ہے: لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز (کے بارے) میں اتری۔ صحیح میں حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا، وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوْا، وَإِذَا كَبَّرَ وَرَكَعَ فَكَبِّرُوْا وَارْكَعُوْا، فَإِنَّ الْإِمَامَ يَرْكَعُ قَبْلَكُم، وَيَرْفَعُ قَبْلَكُمْ فَتِلْكَ بِتِلْكَ » [1]

''امام اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ اللہ اکبر کہے تو اللہ اکبر کہو، جب پڑھے تو خاموش رہو، جب تکبیر کہہ کر رکوع کرے تو تکبیر کہہ کر رکوع کرو، امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے رکوع سے اٹھتا ہے، تو یہ اس کے بدلے ہوا'' الخ

یہی الفاظ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ امام مسلم نے کہا ہے کہ یہ الفاظ ثابت ہیں۔ جب امام پڑھ رہا ہو تو اللہ اور اس کے رسول نے اس کے سامنے خاموش رہنے اور توجہ سے سننے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو امام کی اقتدا سے قرار دیا ہے۔ جو امام کے سامنے خاموش نہیں رہتا، وہ اس کی اقتدا نہیں کرتا۔ یہ تو معلوم ہے کہ امام مقتدی کی خاطر بلند آواز سے پڑھتا ہے، اس کے لیے مقتدی اس کی دعا پر ''آمین'' کہتا ہے۔ اگر وہ اس کی قراءت توجہ سے نہیں سنے گا تو اس کا بلند آواز سے پڑھنا بے سود اور ضائع ٹھہرے گا۔ پھر یاد رہے کہ امام کی پیروی کی مصلحت اکیلے کو دیے گئے احکام کی مصلحت پر فوقیت رکھتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مقتدی امام کو جس حالت میں پائے، اسی حالت میں اس کی پیروی کرتا ہے۔ اگر امام تشہد میں بیٹھا ہو یا سجدے یا رکوع میں ہو تو وہ بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ یہ سب متابعت کی وجہ سے ہے تو وہ اس کی قراءت کو کیوں نہیں سنے گا؟ حالانکہ اس کی قراءت سننے سے اس کو پڑھنے کی مصلحت حاصل ہو جاتی ہے، کیوں کہ سننے والے کو بھی پڑھنے والا جیسا اجر ہی ملتا ہے۔ اس کی مزید تفہیم اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب امام جہری نماز میں سورت فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھے تو مقتدی کے لیے اس کے ساتھ ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ اس پر سب فقہا کا اتفاق ہے۔ اگر اس کو خاموشی سے سننے سے پڑھنے کا اجر حاصل نہ ہوتا تو امام کی قراءت توجہ سے سننے کے بجائے اس کا خود پڑھنا افضل ہوتا۔ اگر اس کو خاموش رہنے سے پڑھنے کا اجر ملتا ہے تو پھر اس کو پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١١)

اگر نماز سری ہو یا مقتدی امام سے اتنا دور ہو کہ اس کی آواز سن نہ رہا ہو یا بہرہ ہو یا اس طرح کی کوئی صورت ہو تو کیا اس کو پڑھنا چاہیے یا پھر بھی خاموش ہی رہنا چاہیے، یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے اور اس میں صحیح رائے یہ ہے وہ ان جگہوں پر پڑھے، کیوں کہ وہ سن نہیں رہا، جس سے اس کو پڑھنے کا مقصود حاصل ہو، اگر خود پڑھے گا تو اس کو پڑھنے کا اجر ملے گا۔ اگر خاموش رہے گا تو پڑھنے والا ہوگا نہ سننے والا، کیوں کہ نماز میں بالکل ساکت اور خاموش رہنا نہ کچھ پڑھنا اور نہ کچھ سننا مطلوب بھی نہیں اور قابلِ تعریف بھی نہیں، بلکہ نماز کے تمام افعال میں اللہ کا ذکر کرنا ضروری ہے، خواہ وہ قراءت کی صورت میں ہو، تسبیح کی صورت میں یا دعا کی صورت میں یا ذکر کو سننے کی صورت میں۔

یہ بھی ایک رائے ہے کہ امام تو صرف مقتدی سے فرض قراءت کا بوجھ اتارتا ہے، مقتدی کا خود اپنے لیے پڑھنا زیادہ کامل، زیادہ مفید، اس کے دل کی اصلاح کا زیادہ ضامن اور اللہ کے حضور اس کے درجات کو زیادہ بلند کرنے کا سبب ہے اور انصات یعنی خاموشی سے سننے کا حکم بھی تو صرف جہری نمازوں میں ہے، سری نمازوں میں نہیں، کیوں کہ سری نمازوں میں کوئی سنائی دی جانے والی آواز ہوتی ہی نہیں، جسے خاموشی سے سنا جائے۔

سبب سے تعلق رکھنے والی نمازوں کا مسئلہ:

وہ نمازیں جو کسی سبب سے تعلق رکھتی ہوں وہ بھی اسی چوتھی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، مثلاً: فجر اور عصر کے بعد تحیۃ المسجد یعنی مسجد میں آنے کی وجہ سے نماز پڑھنا، کچھ علما اسے مستحب کہتے ہیں اور کچھ مکروہ تحریمی یا تنزیہی۔ سنت کی رو سے اس کو مستحب ہونا چاہیے یا مکروہ۔ مستحب کہنے والوں کا قول زیادہ صحیح ہے۔ یہ شافعی اور ایک روایت میں احمد کا مذہب ہے۔ ان کے اصحاب کے ایک گروہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ ان اوقات میں منع کرنے والی احادیث جیسے کہ ''فجر کے بعد کوئی نماز نہیں حتی کہ سورج طلوع نہ ہو جائے اور عصر کے بعد کوئی نماز نہیں حتی کہ سورج غروب نہ ہو جائے۔''[1] عموم مخصوص کا حکم رکھتی ہیں، جن سے بالاتفاق نمازِ جنازہ کو خاص کیا گیا ہے اور نہ پڑھے جانے والی نمازوں کی قضا دینے کی تخصیص بھی اس حدیث سے ہوتی ہے، جس میں ہے: ''جس نے سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے صبح کی نماز سے ایک رکعت پالی، اس نے صبح (کی نماز) پالی۔''[2]

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے عصر کے بعد ظہر کی سنتیں پڑھیں، آپ ﷺ نے مسجدِ خیف میں دو لوگوں کو دیکھا جنھوں نے فجر کی نماز نہیں پڑھی تھی تو ان سے کہا: ''جب تم دونوں اپنے گھروں میں نماز پڑھو،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٥)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

پھر مسجد میں آؤ اور وہاں جماعت ہو رہی ہو تو اس میں شریک ہو جاؤ، وہ تمھارے لیے نفل ہو جائے گی۔'' [1] آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: ''اے بنی عبد مناف! کسی کو اس گھر کا طواف کرنے اور یہاں دن اور رات کی کسی بھی گھڑی میں نماز پڑھنے سے نہ روکو۔'' [2] اس نص سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عموم سے یہ صورت نکل جاتی ہے۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان: ''جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو دو رکعات پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔'' [3] عام حکم ہے، اس سے کوئی صورت خاص نہیں کی، اس لیے مخصوص عموم کے ساتھ اس کی تخصیص جائز نہیں، بلکہ عموم محفوظ عموم مخصوص سے اولیٰ ہے۔

مزید یہ کہ جب امام منبر پر خطبہ دے رہا ہو اس وقت نماز پڑھنا فجر اور عصر کے بعد نماز پڑھنے سے زیادہ سنگین ہے، مگر صحیح میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم میں سے کوئی ایک جب مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعات پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔'' [4] اگر آپ ﷺ نے اس ممنوع وقت میں دو رکعات پڑھنے کا حکم دیا ہے تو اس ممنوع وقت میں پڑھنا اولیٰ ہو گا، کیوں کہ جن احادیث میں منع آیا ہے ان میں سے کچھ میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں: «لَا تَتَحَرَّوْا بِصَلَاتِكُمْ» [5] ''اپنی نماز پڑھنے کے لیے ان اوقات کی جستجو نہ کرو۔'' لہٰذا نماز کے لیے ان اوقات کی تلاش منع ہے، کیوں کہ کچھ علما کا کہنا ہے، ان اوقات میں نماز پڑھنا نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔

سلف صالحین میں سے کچھ نے مطلقاً عصر کے بعد نفل پڑھنا جائز کہا ہے اور انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے، کیوں کہ ان اوقات میں نماز سے ممانعت کفار سے مشابہت اختیار کرنے کے ذریعے کو روکنے کے لیے تھی تو جو سدِ ذریعہ کی وجہ سے ممنوع ہو وہ مصلحتِ راجحہ کے پیشِ نظر کرنا جائز ہوتا ہے، مثلاً وہ نماز جو کسی سبب سے تعلق رکھتی ہو اور سبب نکلنے کے ساتھ وہ بھی نکل جائے تو اگر اس کو اس وقت ادا نہ کیا جائے تو مصلحت نکل جائے گی۔ وقتِ منع مطلق نوافل کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ انسان دن رات نماز میں مصروف نہیں رہتا، اس لیے نہی میں مصلحت نکل جانے کا خدشہ نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت اس کو پڑھنے میں مفسدت ہوتی ہے، اس نفل کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٥٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٦٦، ٦٦٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٠٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٥)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٨)

برخلاف جو کسی سبب سے متعلق ہو، مثلاً سجدۂ تلاوت، سورج اور چاند گرہن کی نماز۔ پھر اگر طواف کی رکعات اس وقت میں پڑھنا جائز ہے، حالانکہ طواف کو موخر کرنا ممکن ہوتا ہے تو جس کے نکل جانے کا خدشہ ہو، اس کو اس وقت پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

ہمارے اصحاب کا ایک گروہ صرف موکدہ سنتوں کی قضا کا قائل ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی دو سنتوں کی قضا کی ہے۔ آپ ﷺ سے فجر کی سنتوں کی قضا ادا کرنے کی رخصت بھی منقول ہے۔ تو کہا جائے گا اگر موکدہ سنتوں کی قضا جائز ہے، حالانکہ اس کو موخر کیا جا سکتا ہے تو سورج گرہن، سجدۂ تلاوت اور تحیۃ المسجد کی نماز، جس کا سبب نکل جاتا ہو، اس کو پڑھنا اولیٰ ہو گا، بلکہ اس وقت میں فرض کی قضا ادا کرنا بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے، حالانکہ اس کی قضا میں تاخیر مستحب بھی ہو سکتی ہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خیبر کے موقع پر فجر کی نماز قضا ہونے کی صورت میں اس کو پڑھنے میں تاخیر کی تھی اور فرمایا تھا: ''اس وادی میں ہمارے پاس شیطان آیا ہے۔''[1] اگر جس میں تاخیر ممکن ہو اس کو وقتِ منع میں ادا کرنا جائز ہے تو جس میں تاخیر ممکن نہ ہو اور اس میں تاخیر مستحب بھی نہ ہو اس کو پڑھنا اولیٰ ہو گا۔ ان مسائل کی تفصیل اس جواب میں ممکن نہیں۔

دن کو روزہ رکھنے اور رات کو قیام کرنے کا مسئلہ:

رات کو قیام کرنے اور دن کو روزہ رکھنے کے معاملے میں افضل طریقہ رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے جو صحیح میں ثابت ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''افضل قیام داود علیہ السلام کا قیام ہے، وہ آدھی رات سوتے، ایک تہائی حصہ قیام میں گزارتے اور چھٹا حصہ سوتے۔ افضل روزہ داود علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑتے اور دشمن سے آمنا سامنا ہونے کی صورت میں راہِ فرار اختیار نہ کرتے۔''[2]

صحاح میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے کہا: ''میں ضرور سارا دن روزہ رکھوں گا، ضرور رات کو قیام کروں گا اور ضرور ہر روز قرآن پڑھوں گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: ''ایسا نہ کر، اگر تم نے ایسا کیا تو آنکھیں گہری ہو جائیں گی، نفس اکتا جائے گا، لیکن ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھ، یہ تمھارا سارے سال کا روزہ ہے۔'' یعنی نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ انھوں نے کہا: ''میں اس سے بہتر کی طاقت رکھتا ہوں۔'' وہ مسلسل زیادہ کا تقاضا کرتے رہے، حتی کہ آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''ایک دن روزہ رکھ اور ایک دن چھوڑ۔'' انھوں نے کہا: ''میں اس سے بہتر کی طاقت رکھتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے افضل کوئی نہیں۔'' تلاوت سے متعلق آپ ﷺ نے ان سے کہا:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٨٠)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٣٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٥٩)

''مہینے میں ایک مرتبہ قرآن پڑھ لیا کر۔'' وہ اسے بھی بڑھواتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے کہا: ''سات دن میں ایک مرتبہ۔'' آپ ﷺ نے ان کو بتایا: ''بہترین قیام داود علیہ السلام کا قیام ہے۔'' پھر کہا: ''تجھ پر تیرے نفس، تیرے اہل اور تیری بیوی کا حق ہے، ہر ایک صاحبِ حق کو اس کا حق دے۔''[1]

آپ ﷺ نے ان کے لیے وضاحت فرمائی کہ اس عمل پر ہمیشگی بدن اور نفس میں تبدیلی کر دے گی اور جان، اہل وعیال اور بیوی کے حقوق ادا کرنے میں رکاوٹ بنے گی، جن کا اجر زیادہ ہے۔

افضل عمل کا ضابطہ:

افضل جہاد اور افضل عمل صالح وہ ہے جس میں رب کی فرماں برداری زیادہ ہو اور وہ بندے کے لیے بھی زیادہ مفید ہو۔ اگر وہ کام بندے کے لیے نقصان دہ ہو اور اس کو وہ عمل کرنے سے روکے جو اس سے زیادہ فائدہ مند ہو تو وہ صالح نہیں رہتا۔ صحیح میں ثابت ہے کہ ایک شخص نے کہا: ''میں روزہ رکھوں گا اور کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں قیام کروں گا اور بالکل نہیں سوؤں گا۔ تیسرے نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا، ایک نے کہا: میں شادی نہیں کروں گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ، لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں، قیام بھی کرتا ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی کرتا ہوں اور گوشت کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے منہ موڑا، وہ مجھ سے نہیں۔''[2]

آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ اس جیسا فاسد زہد اور فاسد عبادت آپ ﷺ کی سنت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ جس نے اس جیسی عبادت میں دلچسپی دکھائی اور آپ کی سنت سے منہ موڑا پھر اس عبادت کو آپ ﷺ کی سنت سے بہتر خیال کیا تو وہ آپ ﷺ سے نہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''سبیل اور سنت کو اختیار کرو، جو بندہ سبیل اور سنت پر قائم رہتے ہوئے تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتا ہے، پھر اللہ کے خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو جس طرح درخت سے سوکھے پتے جھڑ جاتے ہیں، اس طرح اس کی غلطیاں جھڑ جاتی ہیں، جو بندہ سبیل وسنت پر قائم رہتے ہوئے تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور خشیتِ الٰہی کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں، اس کو کبھی آگ نہیں چھوئے گی۔ سبیل وسنت کی راہ میں اعتدال سے چلنا سبیل وسنت کے خلاف چلنے کی کوشش اور (اجتہاد) سے بہت بہتر ہے، لہٰذا پوری کوشش کرو، تمھارے افعال اجتہاد کی صورت میں ہوں یا اعتدال کی صورت میں انبیا کے منہاج اور سنت کے مطابق ہی رہیں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:

"اقتصاد في السنة خير من اجتهاد في البدعة"

''سنت میں اعتدال بدعت میں اجتہاد سے بہتر ہے۔''

تسلسل سے روزہ رکھنے کا مسئلہ:

اگر کوئی شخص عید الفطر، عید الاضحیٰ اور ایامِ منیٰ کو چھوڑ کر تسلسل کے ساتھ روزے رکھے تو اس عمل کے بارے میں اختلاف ہے۔ فقہا اور عباد کے ایک گروہ نے اس کو مستحب کہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک دن چھوڑ کر ایک دن روزہ رکھنے سے بہتر اور افضل ہے۔ دوسرا گروہ اسے افضل نہیں کہتا، مگر اسے بلا کراہت جائز کہتا ہے۔ انھوں نے سال کا نصف حصہ روزہ رکھنے کو اس سے افضل قرار دیا ہے اور صومِ دہر، یعنی سال بھر روزہ رکھنے کی ممانعت کی حدیث کو منع کے ایام میں روزہ رکھنے والے پر محمول کیا ہے۔ تیسرا قول ان اصحاب کا ہے جنھوں نے اس کو ترکِ اولیٰ یا مکروہ کہا ہے اور یہی درست ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث، عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کو اس سے منع کرنا اور فرمانا: ''جس نے صومِ دہر رکھا اس نے روزہ رکھا نہ افطار ہی کیا۔''[1] وغیرہ اس مسئلے میں صریح ہیں کہ یہ عمل جائز نہیں۔ جس نے صومِ دہر کو اس مفہوم پر محمول کیا ہے کہ اس سے پانچ ایام (عیدین و ایامِ تشریق) کا روزہ مراد ہے، اس نے غلط کہا ہے، کیوں کہ صومِ دہر سے صرف پانچ ایام کا روزہ مقصود و مراد نہیں، کیوں کہ ان پانچ دنوں میں روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر کوئی ان دنوں کے علاوہ کسی دن روزہ نہیں رکھتا تو ان دنوں میں روزہ رکھنے سے اس وجہ سے منع نہیں کیا جائے گا کہ ان دنوں روزہ رکھنا صومِ دہر ہے۔ یہ کہاں معقول ہے کہ تین سو دنوں سے زیادہ روزے رکھنے سے منع کیا جائے اور مراد صرف پانچ ہوں؟ یہ تو ایسے ہی ہے، جیسے کوئی کہے: مسجد میں جتنے لوگ ہیں، سب کو میرے پاس لا اور یہ کہہ کر اس نے ان سے صرف پانچ لوگ مراد لیے ہوں!

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ یہ بھی بیان کی اور فرمایا اگر تو ایسا کرے گا تو آنکھیں دھنس جائیں گی اور نفس ملال محسوس کرے گا۔ یہ کیفیت تب ہی پیدا ہوتی ہے جب تسلسل سے روزہ رکھا جائے، صرف پانچ دن روزہ رکھنے سے ایسا نہیں ہوتا۔

مزید یہ کہ صحیح میں ہے: ایک سائل نے صومِ دہر کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے صومِ دہر رکھا اس نے روزہ رکھا نہ چھوڑا۔'' اس نے کہا: جو دو دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کون اس کی طاقت رکھتا ہے؟! اس نے پوچھا: جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن چھوڑے؟ فرمایا: کاش! میں

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۵۹)

اس کی طاقت رکھتا، پھر اس نے پوچھا: جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے؟ فرمایا: یہ بہترین روزہ ہے۔'' انھوں نے آپ سے صومِ دہر (سارا سال روزہ رکھنا) کے متعلق پوچھا، پھر سال کے دو تہائی روزے کے متعلق، پھر ایک تہائی روزے کے متعلق، پھر اس کے نصف کے متعلق، وہ احادیث جن میں ہے: ہر مہینے کے تین دنوں کا روزہ صیامِ دہر کے برابر ہے۔[1] ''جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال کے چھے روزے رکھے، گویا اس نے دہر (سال بھر) کے روزے رکھے، نیکی کا اجر دس گنا ہے۔''[2] وغیرہ، ان سے آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ جس نے یہ کام کیے اس کو دوگنا اجر کے ذریعے کسی مفسدت کے حصول کے بغیر سال بھر کے روزوں کا اجر ملے گا۔ اگر کوئی رمضان کے بغیر ہر مہینے تین روزے رکھتا ہے تو اس کو سال بھر کے روزوں کا اجر ملتا ہے۔ جو رمضان کے ساتھ شوال کے چھے روزہ رکھتا ہے اس کو ان دونوں کو جمع کرنے کی وجہ سے صومِ دہر کا اجر ملتا ہے۔ اگر کوئی راجح معارض نہ ہوتو قیاس یہی چاہتا ہے کہ سارا وقت اور زمانہ روزے کی عبادت میں صرف ہو۔ راجح معارض رسول اللہ ﷺ نے بیان کر دیا ہے اور وہ روزے سے اولیٰ اور زیادہ ضروری کو ضائع کرنا ہے، اس میں مفسدتِ راجحہ حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ روزے کی مصلحت حاصل کرنے کے بجائے راجح مفسدت حاصل کرنے کے ساتھ واجب یا مستحب مصلحتِ راجحہ کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے نہی کی حکمت بیان کر دی اور فرمایا: ''جس نے سال بھر روزہ رکھا، اس نے روزہ رکھا نہ چھوڑا۔''[3] کیوں کہ روزہ رات کے روزے کی طرح اس کی عادت بن جاتی ہے۔ وہ اس روزے سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو گویا نہ اس نے روزہ رکھا نہ افطار ہی کیا۔

جس نے کسی صحابی سے تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنا نقل کیا ہے اس نے ان اقوال میں سے ایک قول اختیار کیا ہے۔ اسی طرح جس بزرگ سے ہمیشہ ساری رات قیام کرنا اور عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھنا منقول ہے، پھر اسے سنت قرار دینا، حالانکہ یہ اکثر باتیں ضعیف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: تم اصحابِ محمد سے زیادہ روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے ہو، حالانکہ وہ تم سے بہتر تھے۔ انھوں نے کہا: ابوعبدالرحمان! کیوں؟ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کیوں کہ وہ دنیا سے بے رغبتی رکھتے تھے اور آخرت میں رغبت۔ البتہ سال کے کسی حصے میں تسلسل سے روزہ رکھنا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ آپ کبھی اتنے تسلسل سے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

روزے رکھتے کہ کہنے والا کہتا: آپ روزہ نہیں چھوڑیں گے اور جب چھوڑنے پر آتے تو کہنے والا کہتا: آپ روزہ نہیں رکھیں گے۔ اسی طرح کچھ ساری راتوں کا قیام بھی سنن میں مذکور ہے، مثلاً: رمضان کے آخری عشرے کا قیام یا کبھی کبھی کسی رات کا قیام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیا کرتے تھے۔ صحیح میں ہے: ''جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا تہبند کس لیتے، اپنے گھر والوں کو جگاتے اور ساری رات بیداری میں گزارتے۔''[1]

سنن میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات ایک آیت کے ساتھ صبح تک قیام کیا اور وہ یہ ہے:

﴿ إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ [المائدة: ١١٨]

''اور اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔''

تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثر قیام رات کے درمیان ہوتا۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو جاتا، جس طرح ایک رات عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے، ایک رات عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اور ایک رات حذیفہ بن یمان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام اللیل کیا۔ آپ کبھی ایک رکعت میں بقرہ، نساء اور آل عمران پڑھتے، قیام کے برابر رکوع کرتے، رکوع میں ''سبحان ربي العظيم''[2] پڑھتے، رکوع سے اٹھتے تو اتنی ہی دیر قومہ کرتے اور اس میں پڑھتے: ''لربي الحمد، لربي الحمد''[3] قیام کے برابر سجدہ کرتے اور اس میں ''سبحان ربي الأعلىٰ، سبحان ربي الأعلىٰ''[4] پڑھتے، سجدے کے برابر بیٹھتے اور کہتے: ''رب اغفر لي، رب اغفر لي''[5] پھر سجدہ کرتے۔

روزے میں وصال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو روزے میں وصال سے منع کیا اور ان کو صرف سحری تک وصال کی رخصت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے متعلق بتایا کہ آپ ان جیسے نہیں۔ عبادت کا ذوق اور محنت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٧٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٦٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٤٢/٢) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٢)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٦٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٤٢/٢) میں اسے صحیح کہا ہے۔

رکھنے والے صلحا کا ایک گروہ وصال کرتا، ان میں سے کچھ ایک ماہ تک نہ کچھ کھاتے نہ پیتے، کچھ دو دو ماہ بغیر کھائے پیئے گزار دیتے، لیکن ان میں سے اکثر اپنے فعل پر نادم ہوئے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ اللہ کی طرف لے جانے والی راہ سے واقف ہیں، سب سے زیادہ تمام لوگوں کے خیر خواہ ہیں، ساری مخلوق سے افضل ہیں، سب سے زیادہ اللہ کے فرمانبردار اور اس کے تابع فرمان ہیں۔

سنت مخالف اعمال کا نتیجہ:

وہ احوال جو سنت مخالف اعمال کے نتیجے میں ظاہر ہوں، قابلِ تعریف نہیں ہوتے، چاہے ان میں کشف کی کیفیت ہو یا تاثیرات۔ اس باب سے واقفیت رکھنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ ناجائز عبادات، ناجائز طریقے سے کمائی گئی دولت اور ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ملکیت کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اموال کی طرح، اگر انسان توبہ کر کے ان کا تدارک نہ کرے تو اس کے لیے کسی نقصان کا باعث بن سکتے ہیں۔ پھر کبھی انسان غلط اجتہاد کر بیٹھتا ہے تو اس کی غلطی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔ کبھی گناہ کرتا ہے تو کسی دوسری نیکی کی وجہ سے اس کا گناہ مٹ جاتا ہے یا وہ کسی آزمایش میں پڑ جاتا ہے جو اس کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہے، کبھی ان احوال کے سلب ہو جانے کی صورت میں اس کو سزا ملتی ہے۔ اگر سنت میں دیے گئے حکم کو چھوڑے اور جس سے منع کیا گیا ہے، اس کو کرنے پر اصرار کرے تو کبھی اللہ اس سے فرائض کی توفیق سلب کر کے اس کو سزا دیتا ہے، بلکہ کبھی وہ فاسق یا کسی بدعت کا داعی بن جاتا ہے۔ اگر کبائر پر اصرار کرے تو اس سے ایمان سلب ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے، کیوں کہ بدعات ہمیشہ انسان کو چھوٹے جرم سے بڑے کی طرف لے جاتی ہیں، بلکہ الحاد اور زندیقیت تک لے جاتی ہیں۔ کئی اصحابِ کشف اور تاثیرات کے ساتھ اس طرح ہو چکا ہے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ سنت سفینۂ نوح کی طرح ہے۔ جو اس میں سوار ہو گیا بچ گیا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا غرق ہو گیا۔ زہری کا قول ہے: ہمارے پہلے علما کہا کرتے تھے: سنت کو تھامنے میں نجات ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اکثر کشف یا تاثیر وغیرہ جیسے احوال کے حاملین ان چیزوں کو کافروں یا بدکاروں کی معاونت یا دیگر گناہوں میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ غیر شرعی عبادات کا نتیجہ ہے، جس طرح جو حرام ذرائع سے مال کماتا ہے تو شاید ہی اللہ کی نافرمانی کے علاوہ کسی جگہ خرچ کرتا ہے۔

بدعت کی انواع و اہلِ تصوف کی گمراہیاں اور شرعی تصوف:

بدعت کی دو انواع ہیں: اقوال و اعتقادات میں بدعت اور افعال و عبادات میں بدعت۔ دوسری قسم میں ضمناً پہلی قسم بھی شامل ہے اور پہلی میں دوسری بھی۔

علم ونظر سے نسبت رکھنے والے اگر کتاب وسنت کو نہ تھامیں تو ان کے متعلق پہلی قسم سے ہونے کا خدشہ ہوتا ہے اور عبادت ونظر اور ارادت وغیرہا سے نسبت رکھنے والے اگر کتاب وسنت کو نہ تھامیں تو ان کے متعلق دوسری قسم سے ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اللہ نے ہمیں ہر نماز میں یہ پڑھنے کا حکم دیا ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ [الفاتحة: ٥، ٦]

''ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہودی غضب شدہ ہیں اور عیسائی گمراہ۔''[1] سفیان بن عیینہ کا قول ہے: سلف کہا کرتے تھے: ''علما میں سے جو خراب ہو جائے، اس میں یہود کی مشابہت ہے اور عبادت گزاروں میں سے جو خراب ہو جائے اس میں عیسائیوں کی مشابہت ہے۔''

اسلاف کہا کرتے تھے: ''فاجر عالم اور جاہل عابد کے فتنے سے ڈرو۔ ان دونوں کا فتنہ ہر ایک مبتلائے فتنہ کے لیے فتنہ ہے۔ طالب علم اگر طلبِ علم کے ساتھ اوامر ونواہی میں کتاب وسنت کو نہیں تھامتا تو گمراہی میں پڑ جائے گا۔''

اگر اہلِ ارادت کی ارادت میں فرض علم کا حصول اور کتاب وسنت کو تھامنا شامل نہیں تو وہ ضلال (گمراہی) اور بغی (بغاوت) میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر آدمی شرعی علم تو حاصل کرے، مگر واجبات پر عمل نہ کرے تو وہ بھٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اگر فرض علم کے بغیر شرعی عبادت اختیار کرے تو گمراہ ہوتا ہے۔ گمراہی عیسائیوں کی علامت ہے اور بغی یہودیوں کی نشانی، حالانکہ دونوں امتوں میں گمراہی بھی ہے اور بغاوت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اہلِ ارادت، اہلِ عبادت، اہلِ طریقت اور اہلِ سلوک میں سے جو لوگ اوامر ونواہی میں شریعت کی راہ سے ہٹے ہوتے ہیں، ایسے فنا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مامور اور ممنوع میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اور بس اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

شرعی فنا یہ ہے کہ بندہ اللہ کی عبادت، فرمانبرداری، اس پر توکل کرنے، اس سے مانگنے اور اس کے خوف میں اتنا فنا ہو جائے کہ ان تمام امور میں ہر ماسوا سے بے پروا ہو جائے۔ یہی دین اور عبادت کو ایک اللہ کے لیے خالص کرنا ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور یہی وہ دینِ اسلام ہے جو انبیا لے کر آئے اور کتابوں میں اتارا گیا۔

نیز دیکھیے جو اہلِ علم ونظر متکلمین اور محققین شریعت سے منحرف ہوئے وہ جبر وقدر اور نفی واثبات کی ایسی وادیوں میں گم ہوئے کہ مآلِ کار شک وحیرت ان کا مقدر ٹھہرا۔ پہلا گروہ (صوفیہ وغیرہ) شطحات کو حرفِ آخر سمجھ بیٹھا،

---

[1] مسند أحمد (٣٧٨/٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٢٠٢)

یہ (اہلِ علم) حق کی تصدیق نہیں کرتے اور وہ باطل کو سچ کہتے ہیں، لیکن دین تمام ظاہری اقوال و اعمال اور تمام باطنی معارف و احوال میں رسول اللہ ﷺ کے احکام و نواہی کی فرماں برداری اور آپ ﷺ کی دی گئی تمام خبروں کی تصدیق ہی سے محقق شکل میں سامنے آتا ہے۔

جو شخص مطلق شب بیداری اور بھوک کو اعلیٰ قرار دیتے ہوئے ان دونوں کاموں کی تلقین کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔ قابلِ تعریف شب بیداری اور بھوک شرعی شب بیداری اور شرعی بھوک ہی ہے۔

افضلیت کا دائرہ:

شرعی شب بیداری نماز، ذکر، تلاوت، علمی کاموں کی تدریس، مطالعہ اور تحریر وغیرہ جیسی دیگر عبادات پر مشتمل ہوتی ہے اور معیار افضل ہر شخص کے ذاتی احوال کی نسبت سے مختلف ہوتا ہے۔ کچھ علما کہتے ہیں: حدیث لکھنا نفل نماز سے افضل ہے۔ کسی شیخ کا کہنا ہے: میں رات کے وقت تنہائی میں دو رکعات پڑھوں جہاں مجھے کوئی نہ دیکھ رہا ہو، یہ سو حدیث لکھنے سے افضل ہے۔ کوئی دوسرا کہتا ہے: فلاں فلاں کام افضل ہیں۔ تو افضل لوگوں کے حالات کے پیشِ نظر مختلف ہوتا ہے۔ کچھ افعال ایسے ہوتے ہیں جو افضل جنس سے تعلق رکھتے ہیں، پھر کسی وقت وہ مرجوح یا ممنوع ہو جاتے ہیں، مثلاً نماز تلاوتِ قرآن سے افضل ہے، تلاوت ذکر سے افضل ہے، ذکر دعا سے افضل ہے، مگر فجر اور عصر کے بعد نیز دورانِ خطبہ جیسے ممنوعہ اوقات میں نماز پڑھنا منع ہے۔ ان اوقات میں تلاوت یا ذکر یا دعا یا سماعتِ تلاوت میں مشغول ہونا نماز سے افضل ہے۔

ایسے ہی تلاوت ذکر سے افضل ہے، مگر رکوع اور سجدے میں ذکر مشروع ہے، تلاوت نہیں۔ نماز کے آخر میں دعا مشروع ہے۔ تلاوت اور ذکر نہیں۔ کبھی کسی شخص کا دین مفضول (کم فضیلت والا عمل) پر کاربند رہنے سے درست رہتا ہے افضل پر نہیں تو اس کے لیے وہی افضل ہوگا، مثلاً حج عورتوں کے لیے جہاد سے افضل ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے نماز کی نسبت تلاوت زیادہ فائدے مند ہوتی ہے۔ کچھ کے لیے ذکر تلاوت سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کچھ کے لیے ضرورت کی وجہ سے دعا میں تگ و دو ایسے ذکر سے افضل ہوتی ہے جس کو کرتے وقت وہ غافل رہے، بلکہ ایک ہی شخص کے لیے کبھی ایک عبادت افضل ہوتی ہے کبھی دوسری۔ علاحدہ علاحدہ ہر شخص کے حالات جاننا، پھر اس کے لیے افضل تجویز کرنا کسی ایک کتاب میں ذکر کرنا ممکن نہیں، بلکہ بندے کے پاس ہدایت اور روشنی ہونی چاہیے جو اس کو بتاتی رہے کہ اس کے لیے کیا زیادہ صالح اور مناسب ہے۔ اللہ ہر طلبِ صادق رکھنے والے کے لیے راستہ کھول دیتا ہے۔ صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:

«اللَّهُمَّ رَبَّ جِبْرِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ، فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ اهْدِنِي لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ، إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ»[1]

کھانا اور لباس:

بہترین سیرت رسول اللہ ﷺ کی سیرت ہے۔ کھانے میں آپ ﷺ کی عادت یہ تھی کہ جب آپ کو بھوک لگتی تو جو میسر آتا کھا لیتے۔ موجود کو رد نہ کرتے اور مفقود کی تلاش میں تکلف نہ کرتے۔ اگر روٹی اور گوشت حاضر کیا جاتا تو تناول فرما لیتے، اگر پھل، گوشت اور روٹی پیش کی جاتی تو کھا لیتے۔ اگر اکیلی کھجور یا اکیلی روٹی دی جاتی تو وہ بھی کھا لیتے۔ اگر میٹھا یا شہد پیش کیا جاتا تو اس کو بھی چکھ لیتے۔ آپ ﷺ کو میٹھا اور ٹھنڈا مشروب زیادہ پسند تھا۔ تر کھجور کے ساتھ ترکاری بھی کھا لیتے۔ اگر آپ کے پاس دو طرز کا کھانا پیش کیا جاتا تو یہ نہ کہتے: میں دو طرح کا کھانا نہیں کھاتا۔ میٹھے اور لذیذ کھانے سے بھی ہاتھ نہیں روکتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا دو دو تین تین ماہ گزر جاتے اور آپ ﷺ کے گھر میں چولہا نہ جلایا جاتا۔ آپ صرف کھجور اور پانی استعمال کرتے۔ کبھی بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے مبارک پیٹ پر پتھر بھی باندھتے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر جی چاہتا تو کھا لیتے، ورنہ چھوڑ دیتے۔ آپ ﷺ کے دستر خوان پر سانڈے کا گوشت کھایا گیا، مگر آپ ﷺ نے اس کو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا: ''یہ حرام نہیں، لیکن ہماری زمین کا جانور نہیں، اس لیے مجھے اس سے گھن محسوس ہوتی ہے۔''[2]

لباس کا معاملہ بھی اس طرح تھا۔ آپ ﷺ قمیص پہنتے اور عمامہ باندھتے۔ چادر اور تہبند باندھتے۔ جبہ اور گریبان دار پہنتے اور روئی اور اون وغیرہ کا کپڑا استعمال کرتے۔ آپ نے سفر میں اون کا جبہ پہنا ہے۔ یمن وغیرہ کا درآمدی کپڑا بھی پہنتے جو اکثر روئی سے بنا ہوتا۔ مصر کا قباطی کپڑا بھی پہنتے جو کتان سے بنایا جاتا تھا۔ اس معاملے میں آپ کی سنت کا یہی تقاضا ہے کہ انسان کے علاقے میں جو کھانا اور لباس میسر ہو وہی استعمال کرے۔ یہ ہر ملک کے لحاظ سے متنوع اور مختلف ہوتا ہے۔

آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کچھ لوگوں نے گوشت خوری چھوڑنے اور مجرد زندگی گزارنے کے لیے عہد کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٦٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٥٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤٦)

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾

[المائدة: ٨٧، ٨٨]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو۔''

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ کو پتا چلا کہ کچھ لوگوں نے عہد کیا ہے، ایک نے کہا: میں روزہ رکھوں گا اور کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں قیام اللیل کروں گا اور رات بھر نہیں سوؤں گا۔ تیسرے نے کہا: میں شادی ہی نہیں کروں گا۔ چوتھے نے کہا: میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں روزہ رکھتا بھی ہوں، چھوڑتا بھی ہوں، سوتا بھی ہوں، قیام بھی کرتا ہوں، شادی بھی کرتا ہوں، گوشت بھی کھاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے بے رغبتی کی وہ مجھ سے نہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾

[البقرة: ١٧٢]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے حلال کھانے اور اللہ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا جو پاکیزہ اور حلال اشیا کو حرام کرتا ہے وہ زیادتی کرنے والا ہے۔ جو شکر نہیں کرتا وہ بے پروا اور اللہ کے حق کو ضائع کرنے والا ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ بندے سے پسند کرتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کھائے تو اس پر اللہ کی تعریف کرے، پانی کا ایک گھونٹ پیئے تو اس پر اللہ کی تعریف کرے۔''[2] ترمذی وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھا کر شکر کرنے والا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کی طرح ہے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٤)

[3] صحيح البخاري (٢٠٧٨/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٦٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٥٥)

یہ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ زندگی تھا جو تمام طرح کے طریقوں سے زیادہ درست اور اعتدال کا مظہر ہے۔ اس سے انحراف دو صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے:

1 فرائض و واجبات سے منہ موڑنے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے جیسی شہوات (خواہشات) میں حد سے تجاوز کرنے والے، حالانکہ اللہ کا فرمان ہے:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٣١]

''کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴾ [مریم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد ایسے نالائق جانشین ان کی جگہ آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے تو وہ عنقریب گمراہی کو ملیں گے۔''

2 حلال اور پاکیزہ اشیا کو اپنے اوپر حرام کرنے والے اور رہبانیت کی بدعت کے پیروکار، حالانکہ اسلام میں رہبانیت (ترکِ دنیا) نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴾

[المائدۃ: ٨٧]

''وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ [المؤمنون: ٥١]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔''

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے جو حکم رسولوں کو دیا ہے، مومنوں کو بھی وہی دیا ہے۔'' پس فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ ﴾ [المؤمنون: ٥١]

''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۷۲]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔''

پھر ایک آدمی کا ذکر کیا، جس نے لمبا سفر کیا، اس کے بال پراگندہ اور وہ خود غبار سے اٹا ہوا آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا: اے رب! اے رب! اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور حرام سے پرورش پانے والا، اس کی دعا کیسے قبول ہو!''[1] ہر حلال طیب (پاکیزہ) ہے اور ہر طیب حلال۔ اللہ نے ہمارے لیے طیبات حلال کیے ہیں اور خبائث حرام، لیکن وہ طیب مفید اور لذیذ ہونے کے پہلو سے ہے۔

اللہ نے ہمارے لیے ہر وہ چیز کھانا حرام کیا ہے جو ہمیں نقصان پہنچاتی ہے اور ہمارے لیے ہر وہ چیز جائز کی ہے جو ہمارے لیے مفید ہے، مگر اہلِ کتاب کے برخلاف ان کے اپنے اوپر ظلم کرنے کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں بھی حرام کر دی گئیں جو ان کے لیے حلال تھیں، ان پر طیبات کو حرام کرنا بطور سزا تھا، محمد ﷺ نے ہمارے لیے طیبات میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں کی۔

شرعی تکلیف میں پنہاں حکمت:

کھانے پینے، لباس، بھوک اور شکم سیری جیسے معاملات میں ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، لیکن بہترین عمل وہی ہے جس میں اللہ کی فرمانبرداری بھی زیادہ ہو اور وہ بندے کے لیے بھی زیادہ مفید ہو۔ کبھی یہ دو کاموں میں سے آسان ترین ہوتا ہے اور کبھی مشکل ترین۔ ہر مشکل زیادہ فضیلت والا اور ہر آسان مفضول یعنی کم فضیلت والا نہیں ہوتا۔ شریعت جب ہمیں سخت اور مشکل کام کا حکم دیتی ہے تو اس میں محض نفس کو تکلیف دینا مطلوب نہیں ہوتا، بلکہ اصل مطلب وہ مفاد ہوتا ہے جو اس میں پنہاں ہوتا ہے، مثلاً جہاد جس سے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۶]

''تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔''

حج چھوٹا جہاد ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عمرے میں کہا تھا:

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۱۵)

«أَجْرُكِ عَلٰى قَدْرِ نَصَبِكِ »[1] ''تمھارا اجر اتنا ہی ہوگا جس قدر تمھاری مشقت ہوگی۔''

اللہ تعالیٰ نے جہاد کے متعلق فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [التوبة: ١٢٠]

''یہ اس لیے کہ بے شک وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

کسی راجح مفاد و منفعت کے بغیر ویسے ہی نفس اور بدن کو تکلیف دینا ہماری شریعت میں کوئی جگہ نہیں رکھتا، بلکہ اللہ نے ہمیں اسی کام کا حکم دیا ہے جو ہمارے لیے مفید ہوتا ہے اور اسی کام سے منع کیا ہے جو ہمارے لیے نقصان رساں ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے: ''تم آسانی کرنے والے بھیجے گئے ہو، تنگی کرنے والے نہیں۔''[2] جب آپ ﷺ نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ کو یمن بھیجا تو ان سے کہا: ''آسانی کرنا، تنگی نہ کرنا۔ خوش خبری دینا، نفرت نہ دلانا۔''[3] آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''یہ دین آسان ہے۔ جو بھی اس میں مشکل راہ اختیار کرے گا یہ اس پر غالب آ جائے گا۔ صبح شام اور رات کے آخری پہر سے مدد لے کر عبادت کرو۔ میانی چال چلتے رہو۔ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔''[4] ایک حدیث میں ہے: ''اللہ کو سب سے زیادہ پسند دین آسان حنیفیت ہے۔''[5]

انسان کو اگر جہاد اور حج وغیرہ میں سردی، گرمی یا بھوک پیاس وغیرہ برداشت کرنی پڑے تو یہ قابلِ تعریف ہے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾ [التوبة: ٨١]

''اور انھوں نے کہا گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دے جہنم کی آگ کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ سمجھتے ہوتے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٣٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩)

[5] صحيح البخاري (٢٢/١) مسند أحمد (٢٣٦/١) اس کی سند میں محمد بن اسحاق مدلس ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کفارات یہ ہیں: ناپسندیدہ حالات میں وضو کرنا، مسجدوں کی طرف جاتے وقت زیادہ قدم اٹھانا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، فرمایا: یہ رباط (جہاد) ہے۔ یہ رباط ہے۔''[1]

کسی شرعی مفاد کے بغیر انسان کا سردی گرمی برداشت کرنا، ننگے پاؤں یا ننگے سر چلنا یا اس طرح کا کوئی کام جو لوگوں کی نگاہ میں مجاہدۂ نفس وغیرہ کی شکل ہے، اگر اس میں انسان کا کوئی ذاتی فائدہ یا اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کا کوئی پہلو نہ ہو تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں، بلکہ صحیح میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک شخص کو دھوپ میں کھڑے دیکھا تو پوچھا: یہ کون ہے؟ بتایا گیا: یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے دھوپ میں کھڑا رہنے، سائے میں نہ جانے، کسی سے بات نہ کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس سے کہو: بیٹھے، سائے میں جائے، بات کرے، مگر اپنا روزہ پورا کرے۔''[2]

اسی وجہ سے آپ ﷺ نے دائمی خاموشی سے منع کیا، بلکہ جائز وہ ہی ہے جو آپ ﷺ نے فرما دیا ہے کہ ''جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو، اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔''[3] تو اچھی بات کرنا، اس سے خاموش رہنے سے بہتر ہے، لیکن برائی سے خاموش رہنا اسے بولنے سے زیادہ بہتر ہے۔

نماز میں سنتِ رسول اور اس کا اہتمام:

امام کے لیے اس طرح نماز پڑھانے کی جستجو کرنا افضل عمل ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو پڑھاتے تھے، بلکہ آپ ﷺ نے ائمہ کو یہی حکم دیا ہے۔ صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے مالک بن حویرث اور اس کے ساتھی سے کہا: ''جب نماز کا وقت ہو جائے تو اذان کہو، پھر اقامت کہو اور تم میں سے ایک امامت کروائے اور اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔''[4]

صحیح میں منقول ہے کہ آپ ﷺ فجر کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیات تک پڑھتے تھے۔ یہ تقریباً پونا یا نصف پارہ بنتا ہے۔ آپ ﷺ طوالِ مفصل سورتیں پڑھا کرتے تھے، مثلاً: سورت قاف، سورت الم السجدۃ، سورۃ الملک، سورۃ المومنون، سورۃ الصافات وغیرہا۔

آپ ﷺ ظہر کی نماز میں اس سے تقریباً تیس آیات کم پڑھتے تھے۔ عصر میں اس سے بھی کم اور مغرب میں

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

اس سے بھی کم، مثلاً: قصارِ مفصل سورتیں پڑھتے تھے اور عشا میں سورت شمس اور لیل جیسی سورتیں پڑھتے تھے۔

آپ ﷺ کبھی نماز لمبی کرتے اور اس سے زیادہ پڑھتے، بلکہ مغرب میں بھی کبھی سورت اعراف، کبھی سورت طور اور کبھی سورت مرسلات پڑھتے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فجر کی نماز میں سورت بقرہ پڑھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فجر میں سورت ہود اور سورت یوسف وغیرہما پڑھتے۔

آپ ﷺ کبھی سفر یا کسی دوسری وجہ سے نماز مختصر بھی کر دیتے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نماز شروع کرتا ہوں اور اسے لمبا کرنا چاہتا ہوں، مگر کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں، کیوں کہ مجھے علم ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی ماں پر کیا گزرتی ہے۔''[1] بلکہ یہاں تک مروی ہے: ''آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فجر کی نماز میں سورت تکویر اور زلزال پڑھی۔''[2]

اس لیے امام کو چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کرنے کی جستجو میں رہے۔

اگر مقتدی اس کی نماز کے عادی نہ ہوں، بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اس سے دور بھاگنا شروع کریں تو امام کو چاہیے بتدریج آہستہ آہستہ ان کو اس کا عادی بنائے۔ ابتدا ہی اس طرح نہ کرے کہ لوگ نماز ہی سے بھاگنا شروع کر دیں۔ بس حسبِ امکان سنت کی پیروی کرے۔ جائز مقدار سے زیادہ لمبی نماز پڑھانا امام کو زیب نہیں دیتا، البتہ اگر مقتدیوں کا یہ انتخاب ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔ صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں کو نماز پڑھائے وہ ان پر تخفیف کرے، کیوں کہ ان میں بیمار بھی ہوتے ہیں، بوڑھے بھی اور ضرورت والے بھی۔''[3] صحیحین میں ہے: ''جب تم میں سے کوئی امام بنے تو ہلکی پھلکی نماز پڑھائے، جب خود پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے۔''[4]

آپ ﷺ رکوع و سجود اور ان کے درمیانی وقفے کو بہت لمبا کیا کرتے تھے۔ صحیح میں ہے: آپ ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اتنا قومہ کرتے کہ کہنے والا کہتا: شاید آپ بھول چکے ہیں۔ جب سجدے سے سر اٹھاتے تو اتنا لمبا قعدہ کرتے کہ کہنے والا کہتا کہ شاید آپ بھول چکے ہیں۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٦٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٦٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧٢)

سنن میں ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مشابہ قرار دیا۔ حضرت عمر رکوع اور سجدے میں تقریباً دس مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے۔ اس لیے امام کو چاہیے اکثر وہی عمل کرے جو رسول اللہ ﷺ اکثر کیا کرتے تھے۔ اگر مصلحت کا تقاضا طویل کرنے کا ہو تو طویل کرے اور مختصر کرنے کا ہو تو مختصر کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ کبھی معمول سے زیادہ لمبی کر لیتے تھے اور کبھی زیادہ کم۔

بے وضو ہوتے ہی وضو کرنا:

بے وضو ہوتے ہی وضو کر لینے سے متعلق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے، بریدہ بن حصیب سے مروی ہے: ایک صبح رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو بلوایا اور پوچھا: اے بلال! تم کس عمل کی وجہ سے جنت میں مجھ سے آگے آگے تھے؟ میں جب جنت میں داخل ہوا تو تیرے قدموں کے چلنے کی آہٹ اپنے آگے آگے سنتا رہا۔ میں گزشتہ رات جنت میں داخل ہوا تو اپنے سامنے تیرے چلنے کی آہٹ سنی۔ میں ایک بلند محل کے پاس سے گزرا جو سونے کا بنا ہوا تھا اور چوکور شکل میں تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک عربی کا ہے۔ میں نے کہا: میں عربی ہوں۔ یہ کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: امتِ محمد کے ایک فرد کا ہے۔ میں نے کہا: میں محمد ہوں۔ یہ کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: عمر بن خطاب کا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے جب بھی اذان دی ہے دو رکعات ضرور پڑھی ہیں، جیسے ہی میرا وضو ٹوٹتا ہے، میں فوراً وضو کر لیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ مجھ پر اللہ کے لیے دو رکعات پڑھنا لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان دونوں پر عمل کرتے رہنا۔''[1] امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

یہ حدیث بے وضو ہوتے ہی وضو کر لینے کے مستحب ہونے کا تقاضا کرتی ہے اور صحیح میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کے معارض نہیں، جس میں ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے۔ آپ ﷺ نے قضائے حاجت کی۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے پاس کھانا لایا گیا تو آپ ﷺ سے کہا گیا: کیا آپ وضو نہیں فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نماز تھوڑے ہی پڑھ رہا ہوں کہ وضو کروں۔''[2] یہ حدیث وجوبِ وضو کی نفی کرتی ہے اور صرف کھانا کھانے کے لیے وضو کے مامور ہونے کی تردید کرتی ہے۔ ہم کسی عالم کو نہیں جانتے جس نے کھانے کے لیے وضو کرنا مستحب کہا ہو، البتہ اگر کوئی حالتِ جنابت میں ہو تو علاحدہ بات ہے۔

بلکہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے مکروہ یا مستحب ہونے میں بھی اختلاف ہے اور اس میں دو اقوال ہیں: امام احمد سے دونوں ہی مروی ہیں۔ مستحب سمجھنے والے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے استدلال کرتے

[1] مسند أحمد (٣٥٤/٥) صحيح الجامع (٧٨٩٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧٤)

ہیں، جس میں ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں نے تورات میں پڑھا ہے: کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد وضو کرنا (ہاتھ دھونا) کھانے میں برکت کا باعث ہے۔"[1] مکروہ قرار دینے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں۔ وہ کھانے سے پہلے وضو نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ یہ یہودیوں کا عمل ہے، اس لیے ان سے مشابہت اختیار کرنا مکروہ ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث کو کچھ نے ضعیف کہا ہے۔ یہ بھی توجیہ پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ اسلام کے شروع کا واقعہ ہو، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ان کاموں میں اہلِ کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے جن میں آپ کو کوئی حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ پہلے ان کی موافقت میں بال سیدھے چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد مانگ نکالنا شروع کی۔ مدینہ تشریف لانے پر اسی وجہ سے عاشورا کا روزہ رکھنے کا آغاز بھی کیا، پھر اپنی وفات سے پہلے فرمایا: "اگر میں آیندہ سال زندہ رہا تو ضرور نو محرم کا روزہ رکھوں گا۔"[2] یعنی دسویں محرم کے ساتھ یہودیوں کی مخالفت کی وجہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے معمولات پر مواظبت کا مسئلہ:

رہا یہ سوال کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے جن عبادات اور معمولات میں ہمیشگی فرمائی ہے ان پر ہمیشگی کرنا سنت ہے یا یہ معمول پسند افراد کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے؟

اس سوال کے جواب میں کہا جائے گا: ہمیں جس کام کا حکم دیا گیا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری ہے۔ ہمیں ہر اس کام میں آپ ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے جس کے کرنے کا حکم آپ ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں تیس سے زیادہ مقامات پر آپ ﷺ کی فرمانبرداری کا ذکر کیا ہے، ارشاد فرمایا ہے:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ ﴾ [النساء: ٨٠]

"جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی۔"

فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ﴾ [النساء: ٦٤]

"اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔"

جو آپ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اس کے لیے سعادت اور خوش بختی کو یہ کہہ کر لازم کر دیا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٤٦) ضعيف الجامع (٢٣٣١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٤)

﴿ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ [النساء: ٦٩]

''تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہدا اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں۔''

اسی طرح ایک اور آیت میں خوش بختی کو آپ ﷺ کی فرمانبرداری اور بدبختی کو آپ ﷺ کی نافرمانی کے ساتھ معلق کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [النساء: ١٣، ١٤]

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

آپ ﷺ اپنے خطبے میں کہا کرتے تھے:

«مَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَعْصِهِمَا فَإِنَّهُ لَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ وَلَا يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا» [1]

''جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتا ہے، ہدایت پا جاتا ہے اور جو ان دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ صرف اپنی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے، اللہ کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔''

تمام انبیا نے اللہ کی عبادت، تقویٰ خداوندی اور خشیتِ الٰہی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی فرمانبرداری کی دعوت بھی دی ہے، نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴾ [نوح: ٣]

''کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو۔''

شرعی اوامر میں رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری ہی وہ اصل اور بنیاد ہے جس پر ہر مسلمان کو اعتماد کرنا چاہیے، وہی سعادت کا سبب اور اس کو چھوڑنا بدنصیبی کا باعث ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٧٠)

آپ ﷺ جو حکم دیتے ہیں اس میں آپ ﷺ کی فرمانبرداری کرنا اس میں ہمارے لیے اس فعل میں آپ ﷺ کی موافقت کرنے سے زیادہ ضروری اور اولیٰ ہے، جس کی پیروی کرنے کا حکم آپ نے نہیں دیا اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ علما کے ہاں اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ ﷺ کا حکم آپ کے فعل سے زیادہ تاکیدی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کا فعل آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص ہو، وہ مستحب بھی ہوسکتا ہے، لیکن آپ ہمیں جو حکم دیتے ہیں وہ دین کا حصہ ہے جس کی اتباع حکمِ خداوندی ہے۔

آپ ﷺ کے کچھ افعال ایسے ہیں، جن کے پیروی کرنے کا حکم ہمارے علم میں ہے، مثلاً: آپ ﷺ کا فرمان ہے: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»[1] ''اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔'' ایک مرتبہ منبر پر نماز پڑھائی تو فرمایا: ''یہ میں نے اس لیے کیا ہے، تاکہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز جان لو۔''[2] حج کے متعلق فرمایا: «خُذُو عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»[3] ''حج کا طریقہ مجھ سے سیکھ لو۔''

کچھ افعالِ رسول ایسے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ عادت اور معمول کے طور پر کیا کرتے تھے، وہ ہمارے لیے مباح ہیں البتہ یہ کہ کوئی ایسی دلیل ہو جو ان کے آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کرتی ہو، مثلاً اللہ نے فرمایا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾ [الأحزاب: ٣٧]

''پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے تجھ سے اس کا نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں کوئی تنگی نہ ہو، جب وہ ان سے حاجت پوری کر چکیں۔''

اس آیت میں اللہ نے آپ ﷺ کو اپنے لے پالک کی بیوی سے شادی کی اجازت دی، تاکہ لے پالک بیٹوں کی بیویوں سے شادی کے معاملے میں مسلمانوں سے حرج اور مشقت اٹھا دی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ جو آپ ﷺ نے کیا وہ ہمارے لیے کرنا بھی مباح ہے۔

جہاں آپ ﷺ کے لیے کوئی حکم خاص کیا، وہاں فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤٤)

[3] صحح مسلم، رقم الحديث (١٢٩٩)

﴿وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ [الأحزاب: ٥٠]

''اور کوئی بھی مومن عورت اگر وہ اپنا آپ نبی کو ہبہ کر دے، اگر نبی چاہے کہ اسے نکاح میں لے لے۔ یہ خاص تیرے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔ بے شک ہم نے جان لیا ہے جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور ان عورتوں کے بارے میں فرض کیا جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں، تاکہ تجھ پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے۔''

جو عورت اپنے آپ کو رسول کے سامنے پیش کر دے، جب اللہ نے آپ کے لیے اس سے شادی کرنا حلال کیا تو بیان کر دیا یہ خالص آپ کے لیے ہے، مومنوں کے لیے نہیں، اس لیے رسول کے سوا کوئی شخص مہر کے بغیر کسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: کیا روزے دار اپنی بیوی کو بوسہ دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے اس سے کہا: ''اس (ام سلمہ رضی اللہ عنہا) سے پوچھ۔'' انھوں نے بتایا: رسول اللہ ﷺ ایسا کرتے ہیں۔ اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے سب خلاف اولیٰ کام معاف کر رکھے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''یاد رہے، خدا کی قسم! میں تم سب سے زیادہ پرہیز گار اور خوفِ خدا رکھنے والا ہوں۔''[1]

یہاں آپ ﷺ نے اپنے فعل سے جواب دیا تو معلوم ہوا کہ امت کے لیے بھی یہ کام جائز ہے۔ اس لیے جمہور علما کا یہ مذہب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو کوئی حکم دے یا کسی کام سے منع کرے تو اس میں آپ ﷺ امت کے لیے نمونہ ہیں، جب تک اس کے آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے خصائص:

رسول اللہ ﷺ کے کچھ خصائص ایسے ہیں جو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں کوئی امتی آپ ﷺ کی اقتدا نہیں کر سکتا، کیوں کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں، مثلاً آپ ﷺ اپنے ہر حکم اور ہر نہی میں واجب الطاعت ہیں، چاہے آپ ﷺ کے حکم کا سبب اور جہت معلوم نہ ہو، حتی کہ اگر آپ ﷺ کسی کو قتل کرنے کا حکم دیں تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ حق آپ کے بعد کسی کو حاصل نہیں، بلکہ والیانِ ریاست اور علما کی فرمانبرداری بھی اسی وقت تک کی جائے گی جب تک وہ کوئی ایسا حکم نہ دیں جو آپ ﷺ کے حکم کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٠٨)

نے ان کی فرمانبرداری آپ کی فرمانبرداری کے ضمن میں رکھی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ [النساء: ۵۹]

''اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں۔''

یہاں فرمایا: رسول کی فرمانبرداری کرو اور اولو الامر کی بھی، کیوں کہ اولی الامر کی فرمانبرداری آپ کی فرمانبرداری کے تابع ہے۔ کوئی مستقل یا مطلق حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ صرف رسول کی ذات ہے جس کی فرمانبرداری مستقل اور مطلق حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ ﴿ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ۸۰] اس لیے اللہ نے فرمایا: ﴿ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [النساء: ۵۹] لہٰذا اگر رسول ہمیں کوئی حکم دیتا ہے تو اس پر عمل کرنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے، خواہ ہمیں آپ کے جہت امر کا علم ہو یا نہ ہو۔ آپ ﷺ کی فرمانبرداری اللہ کی فرمانبرداری ہے۔ آپ ﷺ کی فرمانبرداری کسی طور پر اللہ کی نافرمانی نہیں ہو سکتی، مگر آپ ﷺ کے برخلاف کسی دوسرے کی فرمانبرداری اللہ کی نافرمانی ہو سکتی ہے؟

علما نے آپ ﷺ کے کئی خصائص ذکر کیے ہیں جن میں سے کچھ آپ کے لیے وجوب، کچھ حرمت اور کچھ تکریم سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں، پھر ان میں سے کچھ اتفاقی ہیں اور کچھ اختلافی۔

آپ ﷺ امت کے امام تھے۔ آپ ہی ان کے فیصلے کرتے۔ آپ ہی ان میں تقسیم کرتے۔ آپ ہی ان کو ساتھ لے کر لڑائیوں میں شریک ہوتے۔ آپ ہی حدود نافذ کرتے۔ لوگوں کے حقوق دلواتے اور نماز پڑھاتے۔ تو ہر مرتبے اور مرحلے میں آپ ﷺ کی اقتدا اس مرتبے کے مطابق ہی ہو گی۔

نماز اور حج کا امام نماز اور حج میں آپ ﷺ کی اقتدا کرے گا۔ غزوے کا امیر غزوے میں آپ ﷺ کی اقتدا کرے گا۔ حدود نافذ کرنے والا حدود نافذ کرنے میں آپ ﷺ کی اقتدا کرے گا اور فیصلہ سنانے والا یا فتویٰ دینے والا ان امور میں آپ ﷺ کی اقتدا کرے گا۔

افعالِ رسول کا حکم:

آپ ﷺ کے افعال سے تعلق رکھنے والے کچھ امور میں اختلاف ہے کہ آیا وہ آپ ﷺ کے خصائص سے تعلق رکھتے ہیں یا امت ان پر عمل کر سکتی ہے، مثلاً: جب لوگوں کو آپ ﷺ کے علاوہ کوئی دوسرا نماز پڑھا رہا تھا تو آپ ﷺ نماز میں بطور امام شامل ہوئے۔ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں خیانت کرنے والے اور خودکشی کرنے والے کا جنازہ نہ پڑھا۔ اسی طرح اگر آپ ﷺ نے کوئی کام کسی سبب کی وجہ سے کیا، ہمیں اس سبب کا علم ہو گیا تو

اس کام میں ہمارے لیے آپ ﷺ کی اقتدا کرنا ممکن ہوتا ہے، مگر جب ہمیں سبب کا علم نہ ہو سکے یا سبب کوئی اتفاقی امر ہو تو اس مسئلے میں علما نے اختلاف کیا ہے، مثلاً آپ نے سفر میں کسی جگہ پڑاؤ ڈالا تو کچھ علما اسی جگہ پڑاؤ ڈالنا مستحب سمجھتے ہیں، جس طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کیا کرتے تھے۔ یہ علما کہتے ہیں: فعل میں موافقت قابلِ تحسین ہے، چاہے آپ کا وہ اتفاق ہی تھا۔ ہم نے تو آپ ﷺ کی مشابہت کی غرض سے وہ کیا ہے۔ کچھ علما کہتے ہیں: متابعت اس وقت مستحب ہے جب ہم اس کو اسی وجہ سے کریں جس وجہ سے آپ ﷺ نے کیا۔ اگر آپ ﷺ نے اتفاقاً وہ کام کیا ہے تو جس کا قصد آپ نے نہیں کیا ہمیں بھی اس کا قصد و ارادہ کرنے کا حکم نہیں، اس لیے اکثر مہاجرین و انصار اس طرح نہیں کرتے تھے، جس طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کیا کرتے تھے۔

مزید یہ کہ آپ ﷺ کی اقتدا کبھی نوعِ فعل میں ہوتی ہے، کبھی جنسِ فعل میں۔ آپ ﷺ کبھی ایسے معنی کی وجہ سے فعل کرتے جو اس نوع کے ساتھ خاص نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس کو اور دیگر کو عمومی طور پر شامل ہوتا تھا ایسی صورت میں وہ عام کام مشروع اور جائز ہوا۔ اس کی مثال آپ ﷺ کا سینگی لگوانا ہے۔ آپ ﷺ کو جسم سے فاسد خون نکالنے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ اب اس میں آپ ﷺ کی پیروی کرنا کیا سینگی لگوانے کے ساتھ خاص ہے یا مقصود مفید طریقے سے خون کا اخراج ہے؟ یہ تو معلوم ہے کہ آپ ﷺ کو اسوہ بنانا مشروع ہے۔ اگر علاقہ گرم ہو تو وہاں خون جلد تک آ جاتا ہے۔ اس صورت میں حجامہ یعنی سینگی لگوانا ہی مصلحت کا تقاضا ہے۔ اگر علاقہ ٹھنڈا ہو تو وہاں خون رگوں کے اندر چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں فصد کے ذریعے اس کا اخراج ہی مصلحت کا تقاضا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا تیل لگانے کا معاملہ ہے، کیا اس سے بالذات تیل مقصود ہے یا بال سنوارنا اور کنگھی کرنا؟ اگر علاقہ مرطوب ہو، وہاں کے باشندے گرم پانی سے غسل کرتے ہوں تو انھیں تیل کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ تیل ان کی جلد اور بالوں کے لیے اذیت کا باعث بنتا ہے۔ ان کے لیے وہی مشروع اور جائز ہے جو ان کے لیے بال سنوارنے کے لیے زیادہ مناسب ہو اور یہ تو معلوم ہے کہ دوسرا کام یعنی تیل لگانا زیادہ مشابہ ہے۔

کھانے پینے اور پہننے میں عرف کا لحاظ:

اسی طرح آپ ﷺ تر کھجور بھی کھاتے، خشک بھی اور جَو کی روٹی وغیرہ بھی جو آپ ﷺ کے علاقے کی غذا تھی۔ تو کیا آپ ﷺ کا اسوہ اختیار کرنے سے مراد بالخصوص تر کھجور، خشک کھجور اور جو کی روٹی کھانا ہے، حتی کہ جن کے علاقوں میں کھجور نہ ہوتی ہو یا وہ جو کے بجائے گندم یا چاول استعمال کرتے ہوں، وہ بھی کھجور اور جو ہی کھائیں؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرا عمل ہی مشروع ہے، کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ممالک فتح کیے تو وہی غذا کھاتے جو

اس علاقے میں استعمال ہوتی اور وہی لباس پہنتے جو اس علاقے میں پہنا جاتا تھا اور انھوں نے کبھی وہاں مدینہ طیبہ کی غذا اور لباس کا اہتمام اور قصد نہیں کیا۔ اگر یہ دوسرا ان کے لیے افضل ہوتا تو وہ یقیناً افضل کو اختیار کرنا زیادہ پسند کرتے۔

صدقہ فطر میں علما کا اختلاف بھی درحقیقت اسی پر مبنی ہے۔ اگر اہلِ علاقہ کھجور اور جو کو بطور غذا استعمال نہیں کرتے تو کیا وہ گندم یا چاول جیسی اپنی غذا سے صدقہ فطر نکالیں گے یا کھجور اور جو ہی سے؟ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر نکالنا فرض کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« فَرَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَدَقَةَ الْفِطْرِ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ عَلَى كُلِّ صَغِيْرٍ أَوْ كَبِيْرٍ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى حُرٍّ أَوْ عَبْدٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ »[1]

رسول اللہ ﷺ نے ہر چھوٹے بڑے مرد عورت اور آزاد اور غلام مسلمان پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو صدقہ فطر فرض کیا ہے۔ اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں اور دونوں احمد سے روایات ہیں۔ اکثر علما کا کہنا ہے کہ اس علاقے کی غذا سے نکالا جائے گا اور یہی صحیح ہے، اللہ تعالیٰ نے کفارے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ ﴾ [المائدة: ٨٩]

''درمیانے درجے کا، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔''

چادر اوڑھنا اور تہبند باندھنا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زیادہ تر چادر اوڑھتے اور تہبند باندھتے تو کیا چادر اوڑھنا اور تہبند باندھنا افضل ہے، خواہ قمیص بھی ساتھ ہو؟ یا چادر اور ازار کی ضرورت کے بغیر صرف قمیص اور شلوار پہننا؟ اس میں بھی علما کا اختلاف ہے، لیکن دوسرا بالکل واضح ہے۔ یہ وسیع باب ہے۔ یہ نوع آپ ﷺ کے فعل اور صحابہ کے فعل کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ان بہت سے امور کے ساتھ بھی خاص نہیں جن کا آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا اور جن سے منع کیا۔ اس کو کوئی فقہا ''تنقیح المناط'' کا نام دیتے ہیں۔ اس سے مراد ہے حکم کسی مخصوص و متعین چیز میں ثابت ہو مگر اس کے ساتھ خاص نہ ہو، بلکہ حکم اس میں بھی ثابت ہو اور اس کے علاوہ دوسری چیز میں بھی، پس وہاں ''مناطِ حکم'' (حکم کی علت) جاننے کی ضرورت ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ گھی میں چوہیا گر گئی۔ آپ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو اور اس کے اردگرد کو پھینک دو اور اپنا گھی کھا لو۔''[2] اس پر تو اتفاق ہے کہ یہ حکم اس چوہیا اور اس گھی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ حکم ان دونوں کے علاوہ میں بھی ثابت اور عام ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣)

اجتہاد کی اصل: تحقیقِ مناط، تنقیح مناط اور تخریجِ مناط:

اب رہی وہ مناط اور علت جس پر حکم معلق ہے کہ وہ کیا ہے؟ یہاں اہلِ علم کے گروہ کا خیال ہے کہ حکم گھی میں گرنے والی چوہیا کے ساتھ مختص ہے، جو اس طرح ہو اس کو وہ مطلقاً نجس قرار دیتے ہیں، لیکن اگر گھی میں کتا یا پیشاب اور پاخانہ گر جائے تو اس کو نجس نہیں کہتے۔ اسی طرح اگر تیل وغیرہ میں چوہیا گر جائے تو اس کو بھی نجس نہیں کہتے۔ یہ قول قطعاً غلط ہے۔ یہ قیاس کے حجت ہونے پر مبنی نہیں، کیوں کہ جس قیاس میں اختلاف ہوتا ہے وہ تخریجِ مناط ہے، جس کا مطلب ہے موردِ نص (سیاقِ نص) کا حکم کے ساتھ خاص ہونے کا جواز۔ اگر اس کا اختصاص جائز ہے تو حکم کا موردِ نص اور غیر موردِ نص کے مابین مشترک ہونا بھی جائز ٹھہرتا ہے۔ دریں صورت قیاس کو معتبر سمجھنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ اصل اور فرع کے درمیان جو مشترک ہے وہی مناطِ حکم، یعنی حکم کی علت ہے، جس طرح اس حدیث میں ہے: سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر، چاندی کو چاندی کے بدلے نہ بیچو مگر برابر، جَو کو جَو کے بدلے نہ بیچو مگر برابر، نمک کو نمک کے بدلے نہ بیچو مگر برابر۔"[1]

جب آپ ﷺ نے ان جیسی اصناف میں تفاضل یعنی بڑھا کر بیچنے سے منع کیا تو ممکن ہے کہ ممانعت کسی مشترک معنی اور مختص معنی کی وجہ سے ہو۔ جب آپ ﷺ سے گھی میں گرنے والی چوہیا کی بابت پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اس مخصوص مسئلے کے متعلق جواب دیا اور اس میں کوئی پوشیدگی نہیں کہ حکم اس کے ساتھ ہی خاص نہیں تھا۔ اسی طرح تمام مخصوص قضایا اور مسائل کی صورت ہے، مثلاً: ایک دیہاتی نے آپ ﷺ سے کہا: میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کر لیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس کو ایک غلام آزاد کرنے یا مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنے کے ساتھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم دیا تو یہ حکم اسی دیہاتی کے ساتھ خاص نہیں تھا اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لیکن کیا آپ ﷺ کا یہ حکم اس کا روزہ افطار کرنے کی وجہ سے تھا، یا رمضان میں جماع کی وجہ سے، یا جماع کے ساتھ افطار کرنے کی وجہ سے، یا جنس اعلیٰ کے ساتھ افطاری کی وجہ سے؟ یہاں علت متعین کرنے میں علما نے اختلاف کیا ہے۔ اسی طرح ایک شخص نے عمرے کا احرام باندھا، اس پر جبہ پہنا جو زعفران نما خوش بو سے معطر تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے کہا: "اپنا جبہ اتار، زعفران کے اثرات دھو اور اپنے عمرے میں وہی کر جو تو اپنے حج میں کر رہا تھا۔"[2]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے زعفران کے خوش بو ہونے کی وجہ سے دھونے کا حکم دیا تھا، تاکہ احرام والے کو ہر طرح کی خوش بو دھونے کا حکم دیا جائے یا اس کے زعفران ہونے کی وجہ سے کہ جو آدمی کے لیے منع

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٨٧)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٤٦٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٨٠)

ہے، جس کی بنیاد پر زعفران آدمی کے لیے بالکل منع ہو، خواہ وہ احرام کی حالت میں ہو یا غیر احرام میں؟ اس طرح جب بریرہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنی شادی باقی رکھنے اور ختم کرنے کا اختیار دیا، کیوں کہ اس کا خاوند غلام تھا۔ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ یہ حکم بھی صرف بریرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خاص نہیں تھا، لیکن کیا اختیار اس وجہ سے دیا کہ وہ جب آزاد ہوئی تو چونکہ غلام کی منکوحہ تھی، اس لیے ناقص کے ماتحت کامل ہوئی۔ اگر آزاد کے ماتحت ہوتی تو اختیار نہ دی جاتی۔ یا اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے نفس کی مالک بن گئی، اس لیے اس کو اختیار دیا گیا، چاہے خاوند آزاد ہو یا غلام؟ اس میں علما کا اختلاف ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع باب ہے اور ہر اس حکم کو شامل ہے جو کسی مخصوص فرد کے ساتھ متعلق ہو اور یہ بھی علم ہو کہ یہ اسی کے ساتھ خاص نہیں، اس لیے وہاں اس مناط اور علت کو جاننے کی ضرورت ہوگی جس کے ساتھ حکم تعلق رکھتا ہے۔ اس کو کچھ قیاس کہتے ہیں، کچھ قیاس نہیں کہتے، اس لیے ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اس کو وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں قیاس استعمال نہیں کرتے۔

درست یہ ہے کہ یہ اختلافی قیاس سے تعلق نہیں رکھتا، جس طرح تحقیق مناط (مناط اور علت کی تحقیق) بھی بالاتفاق اختلاف قبول کرنے والے امور میں داخل نہیں، یہ تینوں انواع یعنی تحقیقِ مناط، تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط، اجتہاد کی اصل ہیں۔

پہلی نوع: تحقیقِ مناط:

نص اور اجماع پر عمل کیا جائے، کیوں کہ حکم ایسے وصف کے ساتھ معلق و مربوط ہوتا ہے کہ مخصوص و معین شخص پر حکم لگانے کی صورت میں اس میں اس وصف کا پایا جانا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے، جس طرح یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے میں سے عادل اور پسندیدہ گواہ کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے، لیکن ہر گواہ کی تعیین ممکن نہیں، اس لیے مخصوص و متعین گواہوں کا عادل و پسندیدہ ہونا معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی، اسی طرح اللہ نے میاں بیوی کو معروف کے مطابق معاشرت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے: ''عورتوں کا نان و نفقہ اور لباس معروف کے مطابق ہے۔''[1] اب ہر خاوند کی تعیین ممکن نہیں تو متعین خاوندوں میں دیکھنا پڑے گا، پھر کچھ فقہا کے بقول شریعت میں بیوی کا نفقہ مقرر ہے، لیکن درست موقف جمہور ہی کا ہے کہ اس میں عرف سے رجوع کیا جائے گا، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند سے کہا تھا: ''اتنا لے لے جو تیرے اور تیری اولاد کے لیے عرف کے مطابق کافی ہو۔''[2]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۱۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۰۹۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱٤)

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ﴾ [الأنعام: ۱۵۲]

''اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔''

اب اس مال کو ایک مخصوص منافع کی بنیاد پر اس تاجر کو دینے میں غور و فکر باقی رہ جاتا ہے کہ آیا یہ اس سے تعلق رکھتا ہے جو احسن ہے یا نہیں؟ ایسے ہی فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ ﴾ [التوبة: ٦٠]

''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں۔''

اب اس مخصوص و متعین فرد سے متعلق سوال باقی رہتا ہے۔ آیا یہ قرآن میں مذکور فقرا و مساکین کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟ اللہ نے عموماً شراب اور سود حرام کیا ہے۔ اب مخصوص و معین شراب کے خمر ہونے میں سوال باقی رہتا ہے۔ اس نوع پر تمام مسلمانوں بلکہ کل عقلا کا اتفاق ہے کہ شارع کے لیے ہر شخص کے لیے علاحدہ علاحدہ حکم بیان کرنا ممکن ہی نہیں، وہ تو عام کلام کرتا ہے اور ہمارے نبی ﷺ کو جامع کلمات عطا ہوئے ہیں۔

دوسری نوع: تنقیحِ مناط:

اسے ''تنقیحِ مناط'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے حکم تو مخصوص افراد کے لیے صادر ہو مگر انھی کے ساتھ خاص نہ ہو، اس جیسی نوع سے متعلق درست یہی ہے کہ یہ قیاس سے تعلق نہیں رکھتی، کیوں کہ نص پر ان کا اتفاق ہوتا ہے، بلکہ یہاں مخصوص ہی اس کی نوع پر نص ہے، لیکن اس کی نوع جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھی میں چوہیا گرنے کا مسئلہ اسی باب سے تعلق رکھتا ہے، حکم اس چوہیا، اس گھی یا مدینہ کی چوہیا اور مدینہ کے گھی کے ساتھ خاص نہیں، لیکن سائل نے گھی میں گرنے والی چوہیا کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب دیا، مگر وہ جواب اس حیثیت سے نہیں دیا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ یا اس کے سوال کے ساتھ خاص ہے۔ اگر کوئی دوسرا سوال کرتا ہے تو اس کو بھی وہی جواب دیتے، پھر یہ کہ لفظ چوہیا اور لفظ گھی رسول اللہ ﷺ کے الفاظ نہیں کہ آپ ﷺ ہی نے حکم اس کے ساتھ معلق کیا ہو، بلکہ یہ اُس سائل کے الفاظ ہیں جس نے اپنے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتایا تھا، جس طرح اس دیہاتی نے کہا تھا کہ اس نے رمضان میں اپنی بیوی سے جماع کیا، اگر وہ اپنی لونڈی سے جماع کرتا تو حکم یہی ہوتا۔ اسی طرح ایک دوسرے صحابی نے کہا: میں نے چاند کی روشنی میں اس کی پازیب دیکھی تو اس پر کود پڑا .....'' اگر یہ اس کے بغیر بھی یہ کام کر لیتا تو حکم پھر بھی وہی ہونا تھا۔

اس طرح کے مسئلے میں درست موقف مشہور ائمہ ہی کا ہے کہ اس میں حکم خبیث چیز کے ساتھ معلق ہے جسے

اللہ نے حرام کیا ہے۔ جب وہ گھی وغیرہ جیسی مائع اشیا میں گرے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے طیبات (پاکیزہ اشیا) حلال کی ہیں، خبائث (گندی اشیا) حرام۔ اگر ہم اس معنی کے ساتھ حکم معلق کریں تو ہم نے کتاب وسنت کی اتباع کی، لہٰذا اگر خبیث طیب میں گر جائے تو خبیث اور اس کے اردگرد کے حصے کو پھینک دیا جائے گا اور طیب کو کھا لیا جائے گا، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے۔

یہ جواب ان مسائل کی تفصیلات کا متحمل نہیں، لیکن یہاں اس لیے تنبیہ کرنا پڑی کہ رسول اللہ ﷺ کے افعال میں آپ ﷺ کی اقتدا اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کا تعلق لوگوں کے اجتہاد، استدلال، علم و حکمت اور فقہ کے ساتھ ہے اور لوگوں میں سب سے زیادہ پیروی کا حق دار وہی ہے جو احکام کو ان معانی کے ساتھ معلق کرتا ہے جس کے ساتھ شارع علیہ السلام نے معلق کیے ہیں۔

حکم کو دلالتِ خطاب یا دلالتِ قیاس سے اخذ کرنے کا مسئلہ:

اس جگہ لوگوں کا تفاوت اور اختلاف ہے کہ کیا اس کو خطابِ (کلام) شارع سے اخذ کیا جائے یا قیاسی معانی سے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خطابِ شارع بندوں کے افعال کے اکثر احکام کو شامل نہیں، بلکہ وہ قیاس کے محتاج ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے بندوں کے افعال کے تمام احکام نص سے ثابت ہیں۔ انھوں نے ظاہر کے ساتھ چمٹے رہنے میں اس درجہ اسراف سے کام لیا ہے کہ خطاب کے مفہوم (مخالف) وتنبیہ کا بھی انکار کر دیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَآ أُفٍّ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''تو ان دونوں کو ''اف'' مت کہہ۔''

تو ان کے بقول اس سے صرف اُف نہ کہنے کی نہی ہی ثابت ہوتی ہے۔ اس سے مارنے اور گالی نکالنے کی نہی ثابت نہیں ہوتی۔ انھوں نے تنقیحِ مناط کا انکار کیا ہے۔ الفاظ میں ایسے ظاہر کا دعویٰ کیا ہے جس پر وہ دلالت ہی نہیں کرتے۔ کچھ لوگ دلالۃ النص نامکمل یا خبرِ واحد ہونے کی وجہ سے کبھی قیاس سے کام لیتے ہیں اور کچھ لوگ نص اور قیاس کو ایک دوسرے کے مخالف قرار دے کر نص کو فوقیت دیتے ہیں اور تناقض کا شکار ہوتے ہیں۔ ہم نے کسی دوسری جگہ بیان کیا ہے۔ صحیح دلائل میں تناقض نہیں ہوتا، لہٰذا صحیح عقلی اور شرعی دلائل میں تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر دلالتِ قیاس اور دلالتِ خطاب بھی صحیح ہو تو اس میں بھی تناقض نہیں ہوتا۔

صحیح قیاس دو متماثل کے درمیان برابری قائم کرنے کی حقیقت ہے۔ یہی وہ عدل ہے جو اللہ نے کتابوں میں نازل کیا اور رسولوں کو دے کر مبعوث کیا اور رسول کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا جو خلافِ عدل ہو۔ وہ دو متماثل اور ایک طرح کی اشیا کے بارے میں دو مختلف احکام نہیں دیتا۔ اس طرح نہیں ہوتا کہ رسول ایک چیز کو حرام کہے اور اسی کی نظیر کو حلال کہے۔

وہ عام مقامات جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں قیاس نص کے مخالف ہے اور وہاں نص کا حکم خلافِ قیاس ہے، ہم نے ان پر غور کیا تو اس نتیجے تک پہنچے کہ جسے شارع علیہ السلام نے اس کی نظائر سے کسی حکم کے ساتھ خاص کیا ہے تو اس وجہ سے خاص کیا ہے کہ وہ ایسے وصف کے ساتھ مختص ہے جو اس حکم کے ساتھ اس کے اختصاص کو لازم کرتا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے بیع عرایا کو اندازے کے ساتھ اس کی مثل کے ساتھ فروخت کرنے کے جواز کے ساتھ خاص کیا ہے، کیوں کہ بیع کی حاجت بھی ہے اور پورا پورا ماپنا بھی ناممکن ہے، اور حاجت جب اصل ناممکن ہو تو بدل کی طرف منتقل ہونے کو لازم کر دیتی ہے، لہٰذا ضرورت اور حاجت کے وقت اندازہ ماپنے کے قائم مقام ہوتا ہے، جس طرح حاجت کے وقت مٹی پانی کے قائم مقام اور مردار ذبح شدہ کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جو عالم کہتا ہے کہ قرض، یا اجارہ، یا قرض دینا یا مساقات یا مزارعت وغیرہا خلافِ قیاس ہے، اگر اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ یہ افعال ایسی خصوصیات کے ساتھ مخصوص ہیں جو تقاضا کرتی ہیں جو ان جیسا نہ ہو، اس کا حکم بھی ان کے حکم کے مخالف ہو تو اس نے سچ کہا ہے۔ یہی قیاس کا تقاضا ہے۔ اگر اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ دو متماثل اور ایک ہی جیسے افعال دو مختلف حکم رکھتے ہیں تو یہ خطا اور غلطی ہے جس سے انبیا تو ایک طرف رہے، ان کے رتبے سے کم رتبہ رکھنے والی شخصیات بھی منزہ ہیں۔

یاد رہے معارض و مخالف قیاسات فاسد قیاسات ہوتے ہیں، جیسے ان لوگوں کا قیاس جنھوں نے کہا: ''إنما البیع مثل الربا'' یا ان لوگوں کا قیاس جنھوں نے کہا: ''تم وہ کھاتے ہو جو تم اپنے ہاتھوں سے مارتے ہو، جس کو اللہ مارتا ہے اس کو نہیں کھاتے، یعنی مردار؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓـئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ﴾

[الأنعام: ۱۲۱]

''اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا تو بلاشبہہ تم یقیناً مشرک ہو۔''

شاید جس کو اللہ نے فہم و علم سے نوازا ہو، ان عام احکام کو شرعی خطاب کا مدلول دیکھے گا جو صحیح شرعی قیاس کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے۔

اسی طرح شرعی خطاب کی غایت و انتہا اس عدل کی مطابقت میں پنہاں ہے جو صحیح قیاس کا مطلوب ہوتا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو پھر مخصوص افراد و احوال سے متعلق گفتگو اور بحث خاص نظر و فکر اور اللہ سے ہدایت طلبی کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ نے بندے کو ہر نماز میں ﴿ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ

عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ﴾ کہنے کا حکم دیا ہے، بندے کو اس دعا کی حقیقت پذیری کے لیے پوری محنت کرنی چاہیے، تاکہ انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین جیسے خوش صحبت طبقے میں شامل ہو سکے۔[1]

اکیلے نمازی کو امام بنانے کا حکم

سوال ایک آدمی جماعت کے ساتھ ایک رکعت پاتا ہے، جب امام سلام پھیرتا ہے تو وہ اپنی رکعت پوری کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ اس دوران میں ایک آدمی آتا ہے جو اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی اقتدا میں نماز پڑھتا ہے، کیا اس مقتدی کی اقتدا جائز ہے؟

جواب پہلے کی نماز میں امام احمد وغیرہ کے مذہب میں دو اقوال ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس جیسا عمل جائز ہے اور یہی اکثر علما کا قول ہے۔ اگر یہ امام امامت کی نیت کرے اور مقتدی اقتدا کی، لیکن اگر مقتدی اقتدا کی نیت کر لے، لیکن امام امامت کی نیت نہ کرے تو اس میں بھی دو اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ اس کی امامت صحیح ہے۔ یہ امام شافعی و مالک کا قول ہے اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی امامت درست نہیں۔ یہ امام احمد کا مشہور قول ہے، کیونکہ پہلا آدمی پہلی نماز میں مقتدی تھا، پھر امام کی سلام کے ساتھ وہ اکیلا بن گیا۔ اب اگر یہ بعد میں آنے والا اس کی اقتدا کرتا ہے تو یہ پہلا اکیلا، امام بن جائے گا، جس طرح نبی اکرم ﷺ جو پہلے اکیلے نماز پڑھ رہے تھے اور بعد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شامل ہونے پر امام بن گئے۔ یہ کام نفل نماز میں تو درست ہے جس طرح اس حدیث میں ذکر ہوا ہے، لیکن فرض مین اختلاف ہے۔ تاہم صحیح یہ ہے کہ یہ فرض و نفل دونوں میں جائز ہے، کیونکہ امام انفرادی حالت سے زیادہ امامت میں التزام کرتا ہے اور منفرد کے امام بننے میں اصلاً کوئی ممانعت نہیں، برخلاف اول۔ واللہ أعلم[2]

﴿ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ﴾ کی صحیح تفسیر

سوال ایک آدمی جمعے کی نماز ادا کرنے کے لیے تیز تیز چل کر مسجد آیا۔ کچھ لوگوں نے اس کے اس عمل کو غلط قرار دیا اور اس کو آرام سے آنے کا کہا، لیکن اس نے جواب میں یہ آیت پڑھ دی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ﴾[الجمعة: ٩] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو۔“ تو صحیح کیا ہے؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٢٦٤۔٣٣٥)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٢٥٧)

سعی کا مفہوم:

جواب اس آیت میں جس سعی کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد دوڑ کر آنا نہیں۔ صحیح بخاری میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ، وَآتُوهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةَ، فَمَا أَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوا »[1]

"جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم بھاگ کر نہ آؤ، بلکہ چل کر آؤ، تم پر اطمینان طاری ہو، جو نماز میں تمھیں مل جائے، اسے پڑھ لو اور جو رہ جائے اس کو پورا کر لو۔"

ائمہ کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں لفظ سعی عمل اور فعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ﴾ [الليل: ٤] "بے شک تمھاری کوشش یقیناً مختلف ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا ﴾ [بني إسرائيل: ١٩]

"اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی، جو اس کے لائق کوشش ہے۔"

مزید فرمایا:

﴿ إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ﴾ [المائدة: ٣٣]

"ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں۔"

فرعون کے بارے میں فرمایا:

﴿ ثُمَّ أَدْبَرَ يَسْعَىٰ ﴾ [النازعات: ٢٢] "پھر واپس پلٹا، دوڑ بھاگ کرتا تھا۔"

سورت جمعہ کی آیت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کے ساتھ پڑھا ہے: "فامضوا إلى ذكر الله" "اللہ کے ذکر کی طرف چلو۔" جمعہ میں جس سعی کا حکم ہے اس سے مراد جمعہ کے لیے نکلنا اور جانا ہے۔

اسم جنس کی تعمیم و تخصیص اور اشتراکِ لفظی:

لفظ سعی اصل میں اسم جنس ہے۔ جب کوئی اسم عام ہو اور دو انواع پر بولا جاتا ہو تو اس صورت میں اہلِ عرف ایک نوع کو علاحدہ نام دے دیتے ہیں اور وہ اسم عام دوسری نوع کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے، جیسے لفظ "ذوی الارحام"،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٢، ٦٠٣)

تمام رشتے داروں پر بولا جاتا ہے۔ عصبہ اور اصحاب الفروض بن کر وراثت سے حصہ پانے والوں پر بھی اور عصبہ اور اصحاب الفروض بننے کے بغیر حصہ پانے والوں پر بھی۔ جب اصحاب الفروض اور عصبہ کو ممتاز اور علاحدہ کر دیا گیا تو فقہا کی اصطلاح میں ذوالارحام ایسے رشتے داروں پر بولنے کے لیے خاص ہو گیا جو عصبہ اور اصحاب الفروض میں شمار نہیں ہوتے۔

اسی طرح لفظ ''جائز'' واجب اور لازم افعال وعقود پر بھی بولا جاتا ہے اور غیر لازم افعال وعقود پر بھی۔ جب کچھ اعمال کو وجوب کے ساتھ خاص کر دیا گیا اور کچھ عقود کو لزوم کے ساتھ تو لفظ جائز ان کی اصطلاح دوسری نوع کے لیے مخصوص ہو کر باقی رہ گیا۔

لفظ ''خمر'' کی کہانی بھی یہی ہے۔ ہر شراب کو خمر کہا جاتا ہے، لیکن جب ایسی شراب کو جو انگور کے علاوہ کسی دوسری چیز سے تیار ہو، نبیذ کا نام دے دیا گیا تو لفظِ خمر عرفِ فقہا میں انگور کی شراب کے ساتھ مخصوص ہو گیا، حتیٰ کہ کچھ علما نے تو یہاں تک گمان کر لیا ہے کہ کتاب وسنت میں لفظ خمر سے مراد صرف انگور کی شراب ہے، جبکہ اس کے عموم پر دلالت کرنے والی احادیث متواتر ہیں۔

اشتراکِ لفظی اور غلط فہمی:

تاہم اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ اس پیدا ہونے والے اشتراک کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اس آیت میں لفظ سعی کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ یہ لفظ اصل میں عام ہے جو ہر اس فعل کے لیے بولا جاتا ہے جس میں جانے اور چلنے کا مفہوم ہو۔ قرآن میں بھی اسی سعی کا حکم ہے۔ کبھی ایک قسم کو مشی (چلنے) کے نام کے ساتھ خاص کر لیا جاتا ہے اور ایسی صورت میں لفظ سعی دوسری نوع کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے۔ یہی وہ سعی ہے جو دوڑ کر آنے کے معنی میں ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے (جس طرح مذکورہ بالا حدیث میں ذکر ہوا ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کو ''فامضوا'' کے لفظ سے پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے: اگر میں ''فاسعوا'' پڑھتا تو بھاگ کر آتا۔ اگر یہ ان کا قول صحیح ثابت ہو تو اس کا معنی ہو گا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لفظ خاص ہے، جس کا معنی صرف دوڑنا ہے۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی اسی سے ملتا جلتا مفہوم رکھتی ہے، کیونکہ سعی میں مخصوص جگہ پر تیز تیز چلا جاتا ہے۔ یہاں لفظ سعی اس معنی میں خاص ہے۔ بسا اوقات صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگانے کو بھی سعی کہا جاتا ہے، لیکن یہ اس اعتبار سے ہو گا کہ یہاں سعی کا کچھ حصہ سعی خاص، یعنی دوڑ کر چلنے پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۲۵۹۔۲۶۱)

پہلی صف کی فضیلت اور اس سے دور رہنے کی مذمت

سوال کچھ لوگ جب مسجد میں آتے ہیں تو صفوں کو مکمل کرنے کے بجائے ستونوں کے قریب بیٹھ جاتے ہیں اور پہلی صفوں کو چھوڑ دیتے ہیں، کیا یہ عمل جائز ہے؟

پہلی صف کی فضیلت:

جواب صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! فرشتے اپنے رب کے پاس کیسے صفیں بناتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے پہلی صفیں مکمل کرتے ہیں اور صف میں ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔''[1]

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ اذان اور پہلی صف کا کیا ثواب ہے، پھر اگر انھیں اس کے لیے بھرپور کوشش کرنی پڑے تو وہ اس سے گریز بھی نہ کریں۔''[2]

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''مردوں کی بہترین صفیں پہلی ہیں اور بدترین آخری۔''[3] ان احادیث کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں جو ترتیب کے ساتھ پہلے پہلی صف، پھر دوسری، پھر تیسری اور اسی طرح تمام صفوں کو مکمل کرنے کی ترغیب پر مشتمل ہیں۔ بنا بریں جو شخص پہلے مسجد میں آتا ہے، لیکن پہلی صف میں نہیں بیٹھتا وہ شریعت کی مخالفت کرتا ہے۔ جب اس کے ساتھ ساتھ فضول باتوں یا دیگر مکروہ کاموں میں مشغول ہو جائے تو یہ اس سے بھی برا ہے۔ مساجد کو ایسے کاموں سے بچانا چاہیے۔ ایسا شخص تعظیمِ عبادات ترک کرتا ہے اور شرعی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو عبرت ناک سزا دینی چاہیے۔ واللہ أعلم[4]

غلط فاتحہ پڑھنے والے کی نماز کا حکم

سوال جو سورت فاتحہ میں غلطی کرتا ہے، کیا اس کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب سورت فاتحہ پڑھنے میں ایسی غلطی کرنا جس سے معنی پر کچھ اثر نہ پڑتا ہو، خواہ وہ نماز پڑھنے والا اکیلا ہو یا امام، اس کی نماز صحیح ہوتی ہے، مثلاً کوئی شخص اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبَّ (زبر کے ساتھ) رَبِّ (زیر کے ساتھ) یا رَبُّ (پیش

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣٠)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٩٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣٧)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٠)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٢٦١۔٢٦٢)

کے ساتھ) پڑھتا ہے یا اَلْحَمْدُ کو اَلْحَمْدِ (زیر کے ساتھ) پڑھتا ہے یا عَلَیْهِمْ (زیر کے ساتھ) عَلَیْهُمْ (پیش کے ساتھ) پڑھتا ہے تو اس طرح کی غلطی وہ غلطی شمار نہیں ہوتی جس سے معنی بدل جاتا ہے۔ وہ غلطی جس سے معنی بدل جاتا ہے، مثلاً کوئی شخص پڑھتا ہو: "صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتُ عَلَیْهِمْ" اور اس کو علم ہو کہ اَنْعَمْتُ (پیش کے ساتھ) متکلم کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے: میں نے انعام کیا تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوتی، لیکن اگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اس کو اس طرح پڑھنے سے معنی بدل جاتا ہے، لیکن وہ یہی سمجھتا ہو کہ یہ حاضر کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے: جن پر تُو نے انعام کیا تو ایسے شخص کی نماز صحیح ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔[1]

دعائیہ الفاظ میں اِعرابی غلطی کا حکم

سوال ایک آدمی نے ملحون دعا کی، یعنی زیر زبر کی غلطی کی۔ دوسرے نے کہا: اللہ ایسی دعا قبول نہیں کرتا، کیا ایسا ہی ہے؟

جواب جس نے یہ بات کہی ہے وہ گناہ گار، نیز کتاب وسنت اور سلف کے مذہب کے مخالف ہے۔ جو شخص خلوصِ دل سے جو دعا کرتا ہے، اللہ اسے سنتا ہے، خواہ اس میں زیر زبر کی غلطی ہو یا وہ ایک دم صحیح ہو۔ مذکورہ بات کی کوئی اصلیت نہیں، بلکہ اگر زیر زبر کی غلطی سے محفوظ الفاظ کے ساتھ دعا کرنا دعا مانگنے والے کی عادت نہ ہو تو اس کو اس کے لیے تکلف نہیں کرنا چاہیے۔ کسی بزرگ کا قول ہے: جب اعراب، یعنی زیر زبر کی غلطی سے درست رکھنا مدِنظر ہو تو خشوع جاتا رہتا ہے۔

یہ اسی طرح مکروہ ہے جس طرح دعا میں تکلف کے ساتھ مسجع اور الفاظ کی موزونیت پر دھیان دینا مکروہ ہے۔ اگر تکلف کے بغیر یہ پیدا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، کیوں کہ دعا کی اصل دل ہے اور زبان دل کے تابع ہے۔ جو شخص اپنی دعا میں اپنی زبان کو درست رکھنے پر توجہ دیتا ہے، اس کی دلی توجہ میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے، اس لیے مجبور انسان جب دعا کرتا ہے تو دل سے کرتا ہے اور وہ الفاظ اسی وقت اس کی زبان سے جاری ہوتے ہیں۔ اس نے وہ الفاظ پہلے سے تیار کر کے نہیں رکھے ہوتے۔ یہ ہر مومن اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ دعا عربی میں بھی جائز ہے، غیر عربی میں بھی، کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ دعا کرنے والے کے ارادے اور مقصود سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی زبان درست نہ بھی کر سکے تو اللہ تعالیٰ تو مختلف زبانوں میں کی جانے والی دعاؤں سے اٹھنے والے آواز کے ہنگم اور شور کے درمیان سے ہر ایک کی حاجتوں کو جانتا ہے۔[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۴۴۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۴۴۵)

نبی اکرم ﷺ سے نمازِ مغرب وغیرہ میں سورت اعراف یا انعام پڑھنے کا ثبوت

سوال کیا رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب یا کسی دوسری نماز میں پوری سورت اعراف یا انعام پڑھی ہے، اگر یہ مسند احمد میں ہے تو کیا صحیح ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للّٰہ، ہاں صحیح میں ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے مغرب میں سورت اعراف پڑھی،[1] لیکن آپ ﷺ نے اس پر ہمیشگی نہیں کی۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اس نماز میں سورت مرسلات پڑھی[2] اور دوسری مرتبہ سورت طور۔ یہ سب صحیح ہے۔ واللّٰہ أعلم[3]

رکوع کے بعد رفع الیدین

سوال کیا رکوع کے بعد رفع الیدین کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے؟

جواب الحمد للّٰہ، ائمہ کے اتفاق کے ساتھ نماز باطل نہیں ہوتی، بلکہ اکثر ائمہ کے نزدیک یہ مستحب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت دس صحابہ کرام، جیسے کہ عبداللہ بن عمر، مالک بن حویرث، وائل بن حجر، ابو حمید ساعدی، ابو قتادہ انصاری، حضرت علی اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے ثابت ہے اور مشہور کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ جمہور علما کے نزدیک مستحب ہے۔ شافعی، احمد اور ایک روایت میں امام مالک کا مذہب ہے۔ ابو حنیفہ نے کہا ہے: یہ مستحب نہیں، لیکن یہ نہیں کہا کہ اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ واللّٰہ أعلم[4]

سجدے کے لیے جھکنے کی کیفیت

سوال نماز میں سجدہ کرتے وقت پہلے ہاتھ رکھنے چاہییں یا گھٹنے؟

جواب علما کا اتفاق ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں جائز ہے، چاہے نمازی گھٹنے پہلے رکھ لے یا ہاتھ، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ افضل صورت کون سی ہے؟ امام ابو حنیفہ، شافعی اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا قول ہے کہ گھٹنے پہلے رکھنا افضل ہے، جب کہ امام مالک اور امام احمد کی دوسری روایت کے مطابق ہاتھ پہلے رکھنا افضل ہے۔ حدیث میں دونوں صورتیں مذکور ہیں۔ سنن میں ہے کہ ''آپ ﷺ جب نماز پڑھتے، پہلے اپنے گھٹنے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨١٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦٦)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٤٥)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٤٦)

رکھتے، پھر ہاتھ اور جب اٹھتے تو پہلے ہاتھ اٹھاتے، پھر گھٹنے۔"[1] سنن ابو داود وغیرہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی ایک جب سجدہ کرے تو اونٹ کے بیٹھنے کی طرح نہ بیٹھے، لیکن اپنے ہاتھ رکھے، پھر گھٹنے۔"[2] اس کے خلاف بھی روایت موجود ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو گیا تھا۔ واللہ أعلم[3]

تیسری رکعت میں رفع الیدین کا حکم

سوال کیا پہلی دو رکعات سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرنا مستحب ہے؟ کیا اس پر نبی اکرم ﷺ یا کسی صحابی کا عمل تھا؟

جواب

رفع الیدین کے مواقع:

ہاں، یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم رکھنے والے محققین کے نزدیک مندوب و مستحب عمل ہے۔ امام احمد اور امام شافعی کا قول بھی یہی ہے۔ صحاح اور سنن میں یہ عمل ثابت ہے۔

صحیح بخاری، ابو داود اور نسائی میں حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے اور ہاتھ اٹھاتے۔ جب رکوع کرتے تو رفع الیدین کرتے۔ جب "سمع الله لمن حمده" کہتے تب بھی رفع الیدین کرتے اور جب دو رکعات پڑھ کر اٹھتے تو اس وقت بھی رفع الیدین کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کو مرفوع بیان کیا ہے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فرض نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے اور اپنے کندھوں کے برابر رفع الیدین کرتے۔ جب آپ قراءت مکمل کر لیتے اور رکوع کرتے تو اس وقت بھی ایسا ہی کرتے۔ جب رکوع سے اٹھتے تب بھی ایسا ہی کرتے۔ جب آپ ﷺ نماز میں بیٹھے ہوتے تو اس وقت کسی موقع پر رفع الیدین نہ کرتے اور جب دو رکعات پڑھ کر تیسری کے لیے اٹھتے تو اس وقت بھی رفع الیدین کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔" (رواه أحمد و أبو داود وابن ماجه والترمذي)[5] امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حسن حدیث ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٣٥٧) میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٩١) صحيح الجامع (٥٩٥)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٤٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٠)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٤٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٦٤)

ابوحمید ساعدی سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کا جو بیان مروی ہے اس میں بھی یہی بات مذکور ہے کہ "جب آپ ﷺ دوسجدوں (دو رکعات) سے اٹھتے تو اللہ اکبر کہتے اور کندھے کے برابر رفع الیدین کرتے، جس طرح نماز کے آغاز میں کرتے تھے۔" (رواہ أحمد و أبو داود والترمذي والنسائي)[1]

یہ احادیث صحیح اور ثابت ہیں۔ ان کے علاوہ آثارِ صحابہ بھی موجود ہیں۔ ان کے مقابلے میں کوئی ایسی روایت نہیں جو ان کے معارض ہو، راجح ہونا تو ایک طرف رہا۔ واللہ أعلم[2]

تشہد پڑھے بغیر تیسری رکعت کے لیے اٹھ جانا

سوال امام نے چار رکعات والی نماز پڑھائی، دوسری رکعت میں تشہد پڑھنا بھول گیا اور تیسری کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی مقتدی نے سبحان اللہ کہا، لیکن وہ نیچے نہ بیٹھا، بلکہ اس نے اپنی نماز مکمل کی اور سجدۂ سہو کر کے سلام پھیری۔ نماز کے بعد کسی نے کہا: امام کو بٹھا دینا چاہیے تھا، تو کسی نے کہا: اگر وہ بیٹھ جاتا تو نماز باطل ہو جاتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سا عمل درست ہے؟

جواب اس مذکورہ سوال میں امام کا عمل درست تھا۔ رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح منقول ہے۔ جس نے کہا کہ اس کو بٹھا دینا چاہیے تھا۔ اس کی بات غلط ہے، بلکہ امام نے جو عمل کیا وہی درست ہے۔ جس نے یہ کہا کہ اگر وہ بیٹھ جاتا تو اس کی نماز باطل ہو جاتی، اس کے متعلق علما کے دو اقوال ہیں: امام شافعی اور احمد سے منقول ایک روایت کے مطابق ایسے شخص کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر وہ قراءت کرنے سے پہلے پہلے بیٹھ جائے تو تب اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ یہ امام احمد سے مشہور روایت ہے۔ واللہ أعلم[3]

پانچویں رکعت کے لیے اٹھ جانے کا حکم

سوال ایک امام پانچویں رکعت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، لوگوں نے سبحان اللہ کہا، لیکن اس نے ان کی بات پر توجہ نہ دی اور سمجھتا رہا کہ وہ بھولا نہیں۔ ایسی صورت میں کیا مقتدی اس کے ساتھ کھڑے ہوں یا نہ ہوں؟

جواب اگر وہ لاعلمی میں اس کے ساتھ کھڑے ہو جائیں، پھر ان کی نماز باطل نہیں ہوگی، لیکن اگر ان کو علم ہو، پھر ان کو چاہیے کہ وہ امام کی متابعت نہ کریں، بلکہ بیٹھ کر انتظار کریں اور اس کے ساتھ ہی سلام پھیریں یا اس سے پہلے پھیر لیں، لیکن انتظار زیادہ بہتر ہے۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٣٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٦٢)
[2] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٥٢_٤٥٣)
[3] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٥٢)
[4] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٥٣)

فرضوں کے بعد دعا کا مسئلہ

سوال دعا فرائض کے بعد کی جائے یا سنتوں کے بعد یا نماز میں تشہد کے بعد؟

جواب

دعا کا مقام:

رسول اللہ ﷺ کی قولی اور عملی سنت یہی تھی کہ آپ ﷺ نماز میں تشہد کی حالت میں سلام پھیرنے سے پہلے دعا کیا کرتے تھے اور اسی کا حکم بھی دیتے تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ تشہد کے بعد کہتے: «اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»[1] صحیح بخاری ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے تشہد کے بعد اسی دعا کو پڑھنے کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ یہ دعا بھی پڑھتے تھے: «اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ»[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے نماز میں مانگنے کے لیے کوئی دعا ہی سکھا دیجیے تو آپ ﷺ نے انھیں یہ دعا سکھائی: «اَللّٰھُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيْراً وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْلِي مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمِ»[3]

ان کے علاوہ بھی بہت سی دعائیں ہیں جو صحیح احادیث میں مذکور ہیں اور آپ ﷺ تشہد کے بعد اور سلام پھیرنے سے پہلے وہ دعائیں کیا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ سجدے میں بھی دعا کیا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو دعا کرتے۔ نماز کے آغاز میں بھی آپ ﷺ دعا کرتے تھے، لیکن یہ کسی صحابی نے نقل نہیں کیا کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے مقتدی سلام پھیرنے کے بعد دعا کرتے تھے، بلکہ سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ اللہ کا ذکر کرتے، سُبْحَانَ اللّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اللّٰهُ أَكْبر اور لَا إِلٰه إِلَّا اللّٰه پڑھتے، جس طرح صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ واللّٰہ أعلم[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٥)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٤٨٠-٤٨١)

نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا حکم

سوال نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ.

نماز کے بعد اجتماعی دعا، ہاتھ اٹھانے اور منہ پر پھیرنے کا حکم:

نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے مقتدی نمازِ پنجگانہ کے بعد دعا نہیں کیا کرتے تھے، جس طرح یہ آج کچھ لوگوں کا وتیرہ ہے۔ نیز یہ کسی صحابی سے بھی منقول نہیں اور کسی امام نے اس عمل کو مستحب نہیں کہا۔ اگر کسی نے امام شافعی سے اس کا استحباب نقل کیا ہے تو اس کو غلطی لگی ہے، کیونکہ ان کی کتابوں میں ان کے الفاظ اس کی نفی کرتے ہیں، اسی طرح امام احمد اور دیگر ائمہ کے نزدیک بھی یہ مستحب نہیں۔ تاہم کچھ حنبلی اور حنفی علما، فجر اور عصر کے بعد دعا کرنے کو مستحب کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ ان دونوں نمازوں کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہوتی تو اس کے عوض دعا کر لینا مستحب ہے۔ کچھ شافعی علما پانچوں نمازوں کے بعد دعا کو مستحب کہتے ہیں، لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جو دعا نہیں کرتا اس کی مذمت نہیں کی جا سکتی، بلکہ جو دعا نہ کرنے کی مذمت کرتا ہے وہ بالاتفاق غلط ہے، کیونکہ اس جگہ اس کو کرنے کا حکم نہیں، یہ اس جگہ واجب ہے نہ مستحب، اس لیے نہ کرنے والے کی نسبت جو کرتا ہے وہ قابلِ مذمت ہے، کیونکہ ایسے عمل پر ہمیشگی کر لینا جس پر رسول اللہ ﷺ نمازِ پنجگانہ میں نہیں کرتے تھے، جائز نہیں بلکہ مکروہ ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز سے پہلے دعا کرنے کی روش اختیار کرے، یا پہلی رکعت میں ہمیشہ قنوت کرنا شروع کر دے، پانچوں نمازوں میں ہمیشہ قنوت کرنا شروع کر دے یا دعائے استفتاح بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دے۔ یہ سب کام مکروہ ہیں، گو نبی اکرم ﷺ نے کبھی پانچوں نمازوں میں قنوت کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی بلند آواز سے دعائے استفتاح کر لیتے تھے۔ ایک آدمی نے بھی رسول اللہ ﷺ کے پیچھے اس کو بلند آواز سے پڑھا تھا اور آپ ﷺ نے اس کو کچھ نہیں کہا تھا، لیکن اس سے یہ نہیں نکلتا کہ جو کام کبھی کیا جا سکتا ہو اس پر ہیشگی کر لینی چاہیے۔

اگر امام اور مقتدی کسی ضرورت کے پیشِ نظر کبھی نماز کے بعد دعا کر لیں تو یہ سنت کے مخالف نہیں، لیکن اس پر ہیشگی کر لینا سنت کے مخالف ہے۔ احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں سلام پھیرنے سے پہلے دعائیں کیا کرتے تھے اور اسی کا حکم بھی دیتے تھے، جس طرح تفصیل گزر چکی ہے۔ نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ جب وہ سلام پھیر دیتا ہے تو مناجات سے باہر نکل آتا ہے تو سائل کا مناجات کی حالت میں اپنے رب سے مانگنا، مناجات سے نکل آنے کے بعد مانگنے کی نسبت زیادہ مناسب ہے، کیونکہ مثال کے طور پر اگر کوئی کسی بادشاہ

وغیرہ کو مخاطب کرتا ہے تو موقع کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اسی وقت مانگے، نہ کہ چلے جانے کے بعد۔ معلوم ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد امام اور مقتدی کا اجتماعی دعا کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں، کیونکہ یہ اگر آپ ﷺ کی سنت ہوتی تو صحابہ، تابعین، پھر ائمہ وعلما، نقل کرتے، جس طرح انھوں نے آپ ﷺ کے وہ تمام اذکار ذکر کیے ہیں جو آپ ﷺ نمازوں کے بعد کیا کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ کیا آپ ﷺ دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے تو یہ بات بہت سی احادیث میں منقول ہے، لیکن دعا کرنے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرنے کے متعلق ایک یا دو احادیث ہیں، جو نا قابلِ حجت ہیں۔ واللہ أعلم [1]

نمازِ پنج گانہ کے بعد اجتماعی دعا کا حکم

سوال کیا نمازِ پنج گانہ کے بعد امام اور مقتدیوں کا اجتماعی دعا مانگنا مسنون ہے یا غیر مسنون؟

جواب الحمد للہ. قرآن وسنت میں نمازِ پنج گانہ کے بعد امام اور مقتدیوں کو اجتماعی دعا مانگنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا اور نہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام نے اس کو مستحب ہی کہا ہے۔ لیکن اگر کوئی اکیلا انسان نماز کے بعد دعا مانگے، چاہے وہ امام ہو یا مقتدی یا منفرد، تو یہ جائز ہے۔ تاہم نماز کے اندر اور سلام پھیرنے سے پہلے دعا کرنا افضل ہے، جس طرح صحیح احادیث میں اس کا ذکر ہوا ہے، کیوں کہ نمازی خدا سے مناجات کر رہا ہوتا ہے، لہٰذا جب انسان خدا کی طرف متوجہ ہو اس حالت میں دعا کرنا نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنے سے زیادہ بہتر ہے، سلام پھیرنے کے بعد مسنون اذکار کرنا سنت ہے، مثلاً: ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر اور آخر میں لا إله إلا الله پڑھنا۔ واللہ أعلم [2]

نماز میں دعا کا اصل مفہوم

سوال حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "مجھے رسول اللہ ﷺ نے ہر نماز کے پیچھے معوذات پڑھنے کا حکم دیا۔" [3] حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «جَوْفِ اللَّيْلِ الْأَخِيرِ، ودُبر الصَّلَوَات المَكْتُوبَةِ» [4] "رات کے آخری حصے میں اور فرض نمازوں کے پیچھے۔" حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۵۱۲۔۵۱۴)

[2] جامع المسائل (۷/۳۱۷۔۳۱۸)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۵۲۳) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۰۳) سنن النسائي، رقم الحديث (۱۳۳۶)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۴۹۹) صحيح الترغيب والترهيب (۲/۱۳۱)

اور کہا: ''اے معاذ، اللہ کی قسم! میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تو ہر نماز کے پیچھے یہ دعا پڑھنا نہ چھوڑنا: « اَللّٰھُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ »[1] یہ ساری احادیث بیان کرتی ہیں کہ نماز سے نکلنے (فارغ ہونے) کے بعد دعا سنت ہے۔ آپ سے اس مسئلے پر تفصیلی فتویٰ درکار ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جواب

نماز کے بعد اجتماعی دعا کی حیثیت:

الحمد للّٰہ رب العالمین. صحاح، سنن اور مسانید میں معروف و مشہور احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اپنی نماز کے پیچھے (بعد میں) لیکن اس سے نکلنے سے پہلے دعا کیا کرتے تھے اور اپنے صحابہ کو بھی اس کی تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے مقتدی سب نماز سے فارغ ہونے اور نکلنے کے بعد، فجر میں یا عصر میں یا کسی بھی نماز میں اجتماعی دعا کیا کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کا جو عمل ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ سلام پھیرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے، اللہ کا ذکر کرتے اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد فوراً انھیں بھی ذکر کی تعلیم دیتے۔

نماز کے بعد کا عمل:

صحیح حدیث میں ہے، آپ ﷺ اٹھ کر جانے سے پہلے تین مرتبہ استغفر اللہ کہتے اور یہ دعا پڑھتے: « اَللّٰھُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ، تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ »[2] صحیح بخاری و مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے ہے کہ آپ ﷺ کہتے: « لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہُ لَا شَرِیْکَ لَہُ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ، اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ »[3] صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''نبی اکرم ﷺ درج ذیل کلمات پڑھتے: « لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہُ لَا شَرِیْکَ لَہُ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ إِلَّا بِاللّٰہِ، لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِیَّاہُ لَہُ النِّعْمَۃُ وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنِ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ »[4] صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٣) صحيح الجامع (٧٩٦٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩١، ٥٩٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٤)

''رسول اللہ ﷺ کے عہد میں لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے۔''[1] ایک روایت کے الفاظ ہیں: ''ہم (سلام کے بعد) اللہ اکبر کے آواز سنتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا کہ آپ ﷺ کی نماز ختم ہو گئی ہے۔''[2]

بعد از نماز اذکار کی انواع:

رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد جن اذکار کی تعلیم دیتے تھے ان کی کچھ انواع ہیں:

1 ''آپ ﷺ تینتیس (۳۳) مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس (۳۳) مرتبہ الحمد للہ تینتیس (۳۳) مرتبہ اللہ اکبر کہتے اور لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو علىٰ كل شيئٍ قدير کہہ کر سو (۱۰۰) کا عدد مکمل کرتے۔'' (رواہ مسلم)[3]

2 آپ ﷺ یہ چاروں اذکار پچیس پچیس مرتبہ کرتے۔ (رواہ مسلم)

3 آپ ﷺ پہلے تین اذکار تینتیس مرتبہ کرتے، اس کی دو صورتیں ہیں:

① ہر ایک ذکر تینتیس تینتیس مرتبہ کرتے۔

② ہر ایک ذکر کو گیارہ گیارہ مرتبہ کرتے۔ جب کہ تینتیس مرتبہ کرنے کا ذکر متفق علیہ حدیث میں ہے۔

4 آپ ﷺ تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہہ کر سو کی گنتی مکمل کرتے۔

5 آپ ﷺ یہ تینوں اذکار دس دس مرتبہ کرتے، یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، اور یہی مناسب بھی ہے، کیونکہ نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرتے وقت دعا کرنا اور اس سے مانگنا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد مانگنے سے زیادہ مناسب اور قرینِ قیاس ہے۔ جہاں تک نماز کے بعد کا تعلق ہے تو وہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بقول آئینے کو جلا بخشنے کے بعد صاف کرنے کی طرح ہے، کیونکہ نماز نور اور روشنی ہے۔ وہ دل کو اسی طرح چمکاتی اور اجلا اجلا بنا دیتی ہے جس طرح آئینے کو چمکایا جاتا ہے لہٰذا اس کے بعد ذکر آئینے کو صاف کرنے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۞ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الانشراح: ۷، ۸]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۰۵)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۸۳)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۹۷)

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴾ کی تفسیر:

اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ جب آپ دنیا کے مشاغل سے فارغ ہو جائیں تو عبادت میں مگن ہو جائیں اور اپنے رب کی طرف راغب و متوجہ ہو جائیں۔ عید کے دن کچھ لوگوں کے پاس سے قاضی شریح کا گزر ہوا جو کھیل رہے تھے۔ اس نے کہا: تم کیوں کھیل رہے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم فارغ تھے۔ اس نے کہا: کیا فارغ کو یہ حکم ہے؟ اللہ فرماتے ہیں:

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الانشراح: ۷، ۸]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

اس آیت کی کچھ نسبت درج ذیل آیت کو بھی ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝٢ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝٣ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝٤ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝٥ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝٦ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝٧ ﴾ [المزمل: ۱۔۷]

''اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو قیام کر مگر تھوڑا۔ آدھی رات (قیام کر)، یا اس سے تھوڑا سا کم کر لے۔ یا اس سے زیادہ کر لے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ یقیناً ہم ضرور تجھ پر ایک بھاری کلام نازل کریں گے۔ بلاشبہہ رات کو اٹھنا (نفس کو) کچلنے میں زیادہ سخت اور بات کرنے میں زیادہ درستی والا ہے۔ بلاشبہہ تیرے لیے دن میں ایک بہت لمبا کام ہے۔''

یعنی دن کو آنا جانا لگا رہتا ہے اور رات میں آپ فارغ ہوتے ہیں ﴿ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ ﴾ صحیح قول کے مطابق نیند کے بعد ہوتی ہے۔ نَشَأَ کا مطلب ہے نیند کے بعد قیام کرنا۔ جب آدمی نیند کے بعد قیام کرتا ہے تو دل کی زبان سے لگاوٹ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت دل تمام اشغال اور خیالات سے خالی ہوتا ہے، پھر سونے کے ساتھ تھکاوٹ بھی دور ہو جاتی ہے، اس لیے اس کو اللہ نے ﴿ أَقْوَمُ ﴾ قرار دیا ہے۔

پہلی آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ﴿ إِذَا فَرَغْتَ ﴾ ''جب تو نماز سے فارغ ہو جائے۔'' ﴿ فَانْصَبْ ﴾ ''تو دعا میں مشغول ہو جا'' ﴿ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ یہ قول صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن نماز کے آخر میں دعا سے مانع ہے، بالخصوص جب نبی اکرم ﷺ کو اس کا حکم تھا تو اللہ نے جو آپ ﷺ کو حکم دیا آپ ﷺ کے لیے اس کی پابندی کرنا لازم تھا، لیکن آپ ﷺ سے نماز میں جو دعا کرنا صحیح احادیث میں منقول ہے وہ نماز سے فارغ ہونے اور نکلنے سے پہلے کے وقت ہے، فارغ ہونے کے بعد نہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے کہا: ''تم میں سے کوئی

ایک جب تشہد پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ سے چار چیزوں سے پناہ مانگے اور یہ الفاظ کہے: «اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»[1]

تشہد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث میں یہ الفاظ مذکور ہیں: «ثُمَّ لِيَتَخَيَّرْ من الدعاء أَعْجَبَهُ إليه»[2] پھر یعنی تشہد پڑھ لینے کے بعد جو دعا کرنا چاہے کرے۔'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہ نے رات کی نماز میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا کرنا ذکر کیا ہے تو وہ نماز کے اندر ہے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہیں۔

بنا بریں سورت انشراح کی مذکورہ آیت کی تفسیر کے متعلق یہ رائے: "إِذَا فَرَغْتَ (مِنَ الصَّلَاةِ) فَانْصَبْ (فِيْ الدُّعَاءِ)'' ''جب تو نماز سے فارغ ہو جائے تو دعا میں مگن ہو جا'' اس سے ملتی جلتی بات ہی ہے جو کسی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کے ذکر کے وقت کہی کہ "فإذا فعلت ذلك فقد قضيت صلاتك، فإن شئت أن تقوم فقم، وإن شئت أن تقعد فاقعد'' ''جب تم نے یہ کرلیا تو تیری نماز پوری ہوگئی، اگر تو چاہے تو کھڑا ہو جا، چاہے تو بیٹھا رہے۔'' یہ اضافہ خواہ کلامِ رسول میں ہو یا حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں ادراج کرنے والے کی بات، جس طرح کچھ ائمہ حدیث کا خیال ہے۔ اس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ اس بات کے قائل نے اس کو نماز کا اختتام اور اس کے ساتھ اس کا پورا ہو جانا قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس مفسر نے اس آیت میں فراغت کو فراغتِ نماز قرار دیا ہے، حالانکہ اس آیت: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ کی یہ تفسیر کہ ''جب تو نماز سے فارغ ہو جائے'' ضعیف قول اور کمزور رائے ہے، کیونکہ ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ﴾ میں مطلق فراغت کا ذکر ہے۔ اگر فارغ سے فارغِ عبادت مراد لیا جائے تو دعا بھی عبادت ہے اور اگر نماز کے ساتھ اشغالِ دنیا سے فراغت مراد ہو تو اس طرح نہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ نماز میں دعا بھی کی جاتی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں دعا کیا کرتے تھے۔

نماز میں دعا:

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعائے استفتاح میں یہ کلمات کہا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِي وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِي مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَايَ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»[3] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی پڑھا

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۸۹۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۸۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۸۰۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۰۲)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۰۰۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۹۸)

کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّيْ وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعاً، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِيْ لِأَحسن الْأَخْلَاقِ فَإِنَّهُ لَا يَهْدِيْ لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْت وَاصْرِفْ عَنِّيْ سيئها، فَإِنَّهُ لَا يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَها إِلَّا أَنْتَ»[1]

صحیح بخاری میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے اس وقت بھی دعا کرتے، بلکہ کیا نفل اور کیا فرض، رکوع و سجود میں بھی آپ ﷺ سے دعا کرنا منقول ہے۔ پھر نماز کے آخر میں آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ دعا کرنا مروی ہے، صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی دعا سکھا دیجیے جو میں نماز میں پڑھا کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْماً كَثِيْراً وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمِ»[2] جب دعا نماز میں خاص کر نماز کے آخر میں مشروع اور جائز ہے تو یہ تفسیر کس طرح کی جا سکتی ہے کہ جب تو نماز سے فارغ ہو جائے تو دعا میں مگن ہو جا، کیونکہ جس کام سے آپ فارغ ہوئے وہ اسی کے نظیر ہے، جس کا آپ ﷺ کو حکم دیا گیا۔ آپ ﷺ نماز میں بھی دعا ہی میں مشغول تھے، فارغ تو نہیں تھے۔ پھر یہ بات بھی کوئی مسلمان نہیں کہتا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنا نماز کے اندر دعا کرنے سے زیادہ تاکیدی اور قوی ہے، آگے دیکھیے اگر ﴿ فَانْصَبْ ﴾ سے مراد دعا میں مشغول ہونا ہوتا تو ﴿ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ دعا اللہ ہی سے ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو چیزوں کا حکم دیا، ایک یہ کہ جب آپ اپنے اشغال اور مصروفیات سے فارغ ہو جائیں تو عبادت میں لگ جائیں اور دوسرے یہ کہ آپ کی رغبت اور توجہ صرف اپنے رب کی طرف ہو، کسی غیر کی طرف نہیں، جس طرح ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ میں ذکر ہوا ہے، ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ ﴿ فَانْصَبْ ﴾ کے موافق ہے اور ﴿ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ ﴿ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ کے مناسب و مطابق ہے۔ اسی طرح یہ آیت بھی ہے: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ، ﴿ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴾ [الرعد: ٣٠] اسی معنی میں ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ [هود: ٨٨] اسی معنی میں مسجد میں داخل ہونے کی یہ دعا ہے: «اللهم اجعلني من أوجه من توجه إليك، وأقرب من تقرب إليك، وأفضل من سألك ورغب إليك»

ایک دوسرے اثر میں یہ الفاظ منقول ہیں: "وإليك الرغباء والعمل"

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٥)

قرآن کریم میں دعا کی انواع:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی دو انواع مذکور ہیں: ایک دعائے عبادت اور دوسری دعائے رغبت و سوال۔ سورت انشراح کی اس آیت: ﴿ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ میں دعا کی یہ دو انواع بہم مذکور ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴾ [الجن: ۱۹]

''اور یہ کہ بلاشبہہ بات یہ ہے کہ جب اللہ کا بندہ کھڑا ہوا، اسے پکارتا تھا تو وہ قریب تھے کہ اس پر تہ بہ تہ جمع ہو جائیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ ﴾ [المؤمنون: ۱۱۷]

''اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے، جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا حساب صرف اس کے رب کے پاس ہے۔''

اس معنی کی آیات بے شمار ہیں۔

دبر الصلاۃ سے مراد:

لفظ ''دبر الصلاۃ'' (نماز کے پیچھے) سے کبھی نماز کا پچھلا حصہ اور کبھی پچھلے حصے سے متصل حصہ مراد ہوتا ہے، جس طرح دبرِ انسان، انسان کا پچھلا حصہ ہوتا ہے، لفظ ''عقب'' بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایڑھی کو عقب کہا جاتا ہے جو پیچھے ہوتی ہے تو ''دبر الصلاۃ'' میں مذکور دعا سے مراد یا تو نماز کے آخری حصے میں دعا کرنا ہے، تاکہ بقیہ احادیث کی مطابقت ہو جائے یا اس سے مراد آخری حصے سے متصل حصے میں دعا کرنا ہے۔ یہ تشہد کے بعد ہوگا جس طرح اس کو یعنی تشہد کو نماز کا اختتام اور اس سے فراغت بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس وقت صرف سلام ہی بچتی ہے جو نماز کے منافی ہوتی ہے، یعنی اگر کوئی انسان عمداً سلام پھیر دے تو نماز باطل ہو جاتی ہے، لیکن وہ تمام اذکار جو نماز میں مشروع اور جائز ہوتے ہیں ان میں سے کوئی ذکر کر دیا جائے تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی یا یہ دعا مطلق ہو یا مجمل، تاہم اسے نماز کے بعد مخصوص کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو عام منقول دعائیں ہیں وہ سب سلام پھیرنے سے پہلے کی ہیں، لہٰذا کسی مجمل لفظ کے ساتھ کوئی سنت نکالنا جو صریح الفاظ کے ساتھ متواتر سنت کے خلاف ہو، جائز نہیں۔

سلام کے بعد کے احوال:

سلام کے بعد فقہا کے تین احوال و اقوال ہیں: ایک یہ کہ امام کو سلام پھیرنے کے بعد مقتدیوں کی طرف منہ کر

کے ذکر یا دعا وغیرہ کے لیے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سلف صالحین امام کے لیے نماز کے بعد مستقلاً قبلہ رخ ہو کر بیٹھے رہنا ناپسند کرتے تھے۔ اس سے انھوں نے یہ سمجھا کہ امام کو اپنی جگہ سے اٹھ جانا چاہیے، حالانکہ انھیں معلوم نہیں کہ جب امام مقتدیوں کی طرف منہ کرتا ہے تو اس سے یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، یہ کچھ مالکیہ کرتے ہیں۔ کچھ کی رائے میں سلام پھیرنے کے بعد امام اور مقتدی دعا کریں، پھر ان میں کچھ اس کو پانچوں نمازوں میں عام رکھتے ہیں اور کچھ صرف فجر اور عصر کی نماز کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ یہ کچھ شافعیوں اور کچھ حنبلیوں سے منقول ہے، لیکن ان سب کے پاس کوئی حدیث نہیں۔ ان کا تمسک اور استدلال زیادہ سے زیادہ مجمل لفظ سے ہے یا قیاس سے، مثلاً کچھ کہتے ہیں کہ چونکہ عصر اور فجر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہوتی، اس لیے ان نمازوں میں دعا کرنا مستحب ہے، تاہم رسول اللہ ﷺ کی صحیح اور ثابت، بلکہ متواتر سنت کسی مجمل یا قیاس کی محتاج نہیں۔

سوال میں مذکور احادیث کی وضاحت اور اجتماعی دعا کی تردید:

سوال میں جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی گئی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے ہر نماز کے پیچھے معوذات پڑھنے کا حکم دیا، یہ نماز سے فراغت کے بعد ہے اور جو حدیثِ ابو امامہ ذکر ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رات کے آخری حصے میں اور فرض نمازوں کے پیچھے۔''[2] اس کو سلام کے بعد کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ سلام سے ماقبل کو بھی ضروری شامل ہے، اگر کہا جائے کہ یہ نماز کے ماقبل اور مابعد کو عام ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلام پھیرنے کے بعد امام اور مقتدی کا اجتماعی دعا کرنا سنت ہے، جس طرح یہ سلام سے پہلے بھی لازم نہیں آتا، بلکہ اگر کوئی سلام کے بعد انفرادی دعا کرے تو یہ سنت کے مخالف نہیں، اسی طرح آپ ﷺ نے جو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا وہ سلام سے پہلے کو بھی شامل ہے اور بعد کو بھی جس طرح ابھی ذکر ہوا ہے، کیونکہ حضرت معاذ امام تھے اور اپنے لوگوں کو امامت کروایا کرتے تھے، جس طرح رسول اللہ ﷺ امام تھے، آپ ﷺ نے ان کو معلم بنا کر یمن بھیجا تھا، اگر یہ دعا: «اَللّٰھُمَّ أَعِنِّيْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[3] امام اور مقتدیوں کے لیے اجتماعی طور پر کرنے کا حکم ہوتا تو آپ اس طرح سکھاتے: ''اللهم أعنا على ذكرك'' ''اے اللہ! ہماری اعانت کر، اپنے ذکر و شکر اور حسنِ عبادت پر'' یعنی جمع کے صیغے کے ساتھ۔ جب آپ ﷺ نے یہ واحد کے صیغے کے ساتھ سکھائی تو معلوم ہوا یہ امام اور مقتدی کے لیے جمع کے صیغے کے ساتھ مشروع نہیں۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧١)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٩٩) صحيح الترغيب والترهيب (١٣١/٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٣) صحيح الجامع (٧٩٦٩)

اس کی وضاحت صحیح بخاری میں مروی حضرت براء بن عازب کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو آپ کی دائیں طرف کھڑے ہونا پسند کرتے کہ آپ ﷺ ہماری طرف اپنا چہرہ کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا، آپ ﷺ یہ دعا کر رہے تھے: «رَبِّ قِنِي عَذَابَكَ يوم تَبْعَثُ عِبادَكَ»[1] ''اے میرے رب! مجھے اس دن اپنے عذاب سے بچانا جس دن تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا۔'' آپ ﷺ کی یہ دعا بھی واحد کے صیغے کے ساتھ ہے جس طرح معاذ کی حدیث میں واحد کا صیغہ مذکور ہے اور آپ دونوں ہی امام تھے۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ مقتدیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھتے اور جمع کا صیغہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ احکام کے بارے میں کتب تصنیف کرنے والے بعض اہلِ علم نے حضرت معاذ کی اس حدیث کو تمام احادیث کی مطابقت میں نماز میں سلام پھیرنے سے پہلے کی دعاؤں میں نقل کیا ہے، صحیح مسلم اور سنن ثلاثہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی آخری تشہد سے فارغ ہو تو عذابِ جہنم، عذابِ قبر، زندگی اور موت کے فتنے اور مسیح دجال کے فتنے، ان چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے۔[2]

سلام سے پہلے کی دعائیں:

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کو یہ دعا اس طرح سکھاتے جس طرح قرآن کی کوئی آیت سکھاتے، وہ دعا یہ ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ»[3]

سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے پوچھا: تو نماز میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: تشہد پڑھتا ہوں، پھر کہتا ہوں: ''اللهم إني أسألك الجنّة وأعوذبك من النار''، لیکن اللہ کی قسم آپ جیسی یا معاذ جیسی گنگناہٹ اچھے طریقے سے نہیں کرسکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہماری گنگناہٹ بھی انہی دو باتوں کے گرد ہوتی ہے۔ (رواه أبو داود وأبو حاتم في صحيحه)[4] اس سے جو ظاہر مفہوم نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ ان دونوں کی گنگناہٹ بھی نماز میں تشہد کے بعد ہی ہوتی تھی، تاکہ اس نے جو بات کہی اس کی نظیر بن سکے۔

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں کہتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۰۹)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۹۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۸۸)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۹۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۸۸)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۹۲، ۷۹۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۹۱۰) صحيح الجامع (۳۱۵۸)

الثُّبَاتَ فِي الْأَمْرِ، وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ، وَأَسْأَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ، وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ قَلْباً سَلِيْماً، وَلِسَاناً صَادِقاً، وَأَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ» (رواه النسائي)[1] یہ بھی صیغہ واحد کے ساتھ ہی ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں یہ دعا مانگا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ» کسی نے آپ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ اکثر چٹی سے پناہ مانگتے ہیں، کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا: ''کیونکہ انسان جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔''[2]

احکام کا مصنف لکھتا ہے: ظاہر ہے یہ احادیث بتاتی ہیں کہ یہ دعائیں تشہد کے بعد ہوتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے جو ابھی ذکر ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی یہی بات کشید ہوتی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت سعد بن وقاص سے مروی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو یہ کلمات استاد کی طرح سکھایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ساتھ نماز کے پیچھے پناہ مانگا کرتے تھے۔ وہ کلمات یہ ہیں: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُرَدَّ إِلٰى أرذل العمر، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ»[3]

نسائی میں حضرت ابوبکر سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے پیچھے کہا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ، وَعَذَابِ الْقَبْرِ»[4] نسائی ہی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میرے پاس ایک یہودن آئی اور کہنے لگی: پیشاب کے چھینٹوں کی وجہ سے عذابِ قبر ہوگا۔ میں نے کہا: تو جھوٹ کہتی ہے۔ وہ کہنے لگی: نہیں ضرور ہوگا، ہم تو اس کی وجہ سے کپڑے اور جلد کاٹ دیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے نکلے، ہماری آوازیں بلند ہو رہی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ لے دے کس بات پر ہو رہی ہے؟ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بات بتائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے سچ کہا ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے پیچھے یہ دعا کرنا شروع کر

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٠٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٠٤) ضعيف الجامع (١١٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٦٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٩٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٤٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٣/٣٥٦) میں اسے صحیح کہا ہے۔

دی: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَمِيكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ أَجِرْنِي مِنْ حَرِّ النَّارِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ»[1] احکام کا مصنف کہتا ہے: تینوں احادیث میں جو نماز کے پیچھے کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد سلام سے پہلے ہے، تاکہ ان احادیث اور پہلے ذکر کردہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کی احادیث کے درمیان تطبیق اور موافقت پیدا کی جا سکے۔

میں کہتا ہوں: مصنف کی یہ بات درست ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث صحیح بخاری میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ ایک یہودن ان کے پاس آئی اور اس نے عذابِ قبر کا ذکر کیا اور کہا: اللہ تجھے عذابِ قبر سے پناہ دے پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عذابِ قبر کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، عذابِ قبر حق سچ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے نہیں دیکھا کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز بھی پڑھی ہو اور عذابِ قبر سے پناہ نہ مانگی ہو۔[2]

تاہم اس موضوع کی احادیث ایک دوسری کی مطابقت میں ہیں، جس طرح ذکر ہوا۔ واللہ أعلم[3]

اذکار کے لیے انگلیوں اور تسبیح کا استعمال

سوال تسبیحات کو انگلیوں پر گننا بہتر ہے یا تسبیح کے دانوں، گٹھلیوں، کنکریوں یا اس جیسی دیگر چیزوں پر؟

جواب تسبیحات کو انگلیوں پر گننا سنت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین سے کہا تھا: «سَبِّحْنَ، وَاعْقِدْنَ بِالأَصَابِعِ، فَإِنَّهُنَّ مَسْؤُولَاتٌ مُسْتَنْطَقَاتٌ»[4] ''سبحان اللہ کہو اور انگلیوں پر شمار کرو، کیونکہ ان سے پوچھا جائے گا اور ان کو بولنے کی قوت دی جائے گی۔''

تسبیح کا جواز اور ریاکاری کی مذمت:

کچھ صحابہ سے یہ منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک زوجہ محترمہ کو کنکریوں کے ساتھ سبحان اللہ گنتے ہوئے دیکھا تو ان کو اس پر برقرار رکھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ وہ بھی کنکریوں کے ساتھ تسبیحات گنتے تھے۔ تسبیح کی جو موجودہ شکل ہے جس میں موتی یا دانے ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہوتے ہیں، یہ کچھ فقہا کے نزدیک مکروہ ہے اور کچھ کے نزدیک نہیں۔ تاہم اگر اس کے استعمال میں نیت اچھی ہو تو پھر یہ بہتر ہے، مکروہ نہیں، لیکن اس کو بلاضرورت پکڑے رکھنا یا گردن میں لٹکا کر لوگوں کو دکھانا یا ہاتھ وغیرہ میں پہنے رکھنا، ریاکاری، یا ریاکاری

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٤٥) السلسلة الصحيحة (١٥٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٦)

[3] مجموع الفتاوىٰ (٢٢/٤٩٢_٥٠٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٨٣) صحيح الجامع (٤٠٨٧)

کے گمان یا ریا کاروں کی مشابہت کے زمرے میں آتا ہے۔ پہلا کام یعنی ریا کاری حرام ہے اور دوسرا کام کم از کم مکروہ ضرور ہے، کیونکہ نماز، روزے، ذکر اور تلاوت جیسی خالص عبادات میں ریا کاری کبیرہ گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴾ [الماعون: ٤۔٧]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ [النساء: ١٤٢]

''بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم۔''

فرائض میں ریا کاری کا مظاہرہ کرنے والے کی قباحت اور بدنصیبی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، اللہ اس کو سزا دے گا، کیونکہ یہ خالص اسی کی عبادت نہیں کرتے، ارشاد ہے:

﴿ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ﴾ [البينة: ٥]

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکات دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۚ ﴾

[الزمر: ٢،٣]

''بلاشبہہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، پس اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہو۔ خبردار! خالص دین صرف اللہ ہی کا حق ہے۔''

نوافل، نماز، روزے، ذکر اور تلاوت میں ریا کاری کرنے والے کے متعلق صرف یہ گمان نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس کے صرف اعمال ضائع ہوتے ہیں، بلکہ وہ مذمت اور سزا کا مستحق بھی بن جاتا ہے، کیونکہ یہ عبادات اللہ

کے لیے خاص ہیں، جو مسلمان کے علاوہ کسی سے قبول نہیں کی جاتیں، اس لیے ان کو کسی ایسی صورت میں ادا کرنا جائز نہیں جس سے کوئی ایسا پہلو نکلتا ہو جو رضائے الٰہی اور قربِ خداوندی کے حصول کے علاوہ ہو، لیکن ایسے کاموں کے عکس جن میں بندے کی مصلحت اور مفاد بھی ہو، مثلاً: تعلیم دینا، امامت کروانا وغیرہ۔ واللہ أعلم [1]

باجماعت نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کا حکم

سوال کیا ہر باجماعت نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنا مستحب ہے یا نہیں، نماز میں رسول اللہ ﷺ کا فعل کیا ہوتا تھا؟

جواب الحمد لله.

آیت الکرسی کی حدیث ضعیف ہے:

نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کا ذکر جس حدیث میں آیا ہے وہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے، اس لیے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں اسے روایت نہیں کیا گیا، لہٰذا اس سے شرعی حکم ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ آپ کے صحابہ اور خلفا، نماز کے بعد بلند آواز سے آیت الکرسی یا کوئی دوسری قرآن کی آیت نہیں پڑھا کرتے تھے۔ بنا بریں امام اور مقتدی کا ہمیشہ مل کر بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھنا بلاشبہہ بدعت اور مکروہ عمل ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے امام اور مقتدی، نماز کے بعد ہمیشہ بلند آواز سے سورت فاتحہ پڑھنا شروع کر دیں یا سورت بقرہ کی آخری آیات کو ورد بنا لیں یا امام اور مقتدی ہمیشہ فرض کے بعد باجماعت دو رکعات پڑھنے کا عمل شروع کر دیں تو بلاشبہہ یہ سب بدعات ہیں، لیکن اگر امام اپنے دل میں آیت الکرسی پڑھے یا کوئی مقتدی پڑھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس کو پڑھنا نیک عمل ہے، پھر اس میں اسلام کے شعائر میں کوئی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوتی۔

نماز کے بعد کے اذکار:

جس طرح انسان نماز کے بعد ورد کے طور پر قرآن پڑھتا ہے یا ذکر کرتا ہے یا دعا کرتا ہے تو یہ بھی اس میں شامل ہے۔ تاہم نماز کے بعد جو اذکار صحیح احادیث سے ثابت ہیں وہ درج ذیل ہیں:

صحیح بخاری میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد کہا کرتے تھے: «لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٍ، اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ» [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۵۰۶-۵۰۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۰۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۹۳)

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کہا کرتے تھے: « لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ »[1]

آپ ﷺ ہر نماز کے بعد تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، تینتیس مرتبہ اللہ اکبر اور ایک مرتبہ « لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٍ »[2] کہہ کر سو کی گنتی مکمل کرتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب میں اللہ اکبر کی آواز سنتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ اب نماز ختم ہو گئی ہے۔ تو یہ وہ اذکار ہیں جو نماز کے بعد کیے جاتے ہیں اور صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ واللہ أعلم[3]

مسنون اذکار کو چھوڑ کر خود ساختہ اذکار و اوراد کا حکم

سوال کیا جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت مسنون اذکار و اوراد چھوڑ کر اپنی طرف سے اذکار بناتا ہے، سنت کی خلاف ورزی نہیں کرتا؟

جواب الحمد لله رب العالمین. اس میں کوئی شک نہیں کہ دعائیں اور اذکار افضل عبادتیں ہیں اور عبادتیں رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور توقیف پر مبنی ہوتی ہیں، خواہشِ نفس اور بدعت سازی پر نہیں۔ جو ذکر و دعا کی جستجو رکھتا ہو اس کے لیے نبوی دعاؤں اور اذکار کی تلاش و جستجو سب سے افضل ہے۔ جو اس راہ پر چلتا ہے امن اور سلامتی کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کو جو فوائد و نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ احاطہ انسان میں آ سکتے ہیں، نہ نوکِ زبان پر۔ ان اذکار کے سوا جو اذکار ہیں، وہ حرام بھی ہو سکتے ہیں، مکروہ بھی اور شرکیہ بھی کہ اکثر لوگ ان کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے، تاہم ان کی تفصیل طوالت طلب ہے۔

کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ غیر مسنون اذکار اور دعاؤں کو اپنی طرف سے مسنون بنا کر عبادت کا درجہ دے اور لوگ نمازِ پنج گانہ کی طرح ان پر مواظبت اور ہیشگی کرنا شروع کر دیں۔ یہ دین میں بدعت سازی ہے، جس کی اجازت اللہ نے قطعاً نہیں دی۔ البتہ اگر کوئی انسان کچھ مخصوص الفاظ کے ساتھ کبھی خود دعا کرتا ہے اور لوگوں کے لیے اس کو سنت اور طریقہ نہیں بناتا تو یہ اور بات ہے۔ اس سے متعلق جب معلوم نہ ہو کہ یہ دعا کسی حرام معنی پر مشتمل ہے،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٩٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٩٧)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٢/٥٠٨-٥١٠)

تب تک اس کو یقین کے ساتھ حرام کہنا جائز نہیں، لیکن کبھی اس میں اس کا احتمال ہوسکتا ہے اور انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح کی دعا ہے جو اس وقت انسان کی زبان پر جاری ہوتی ہے جب وہ مجبور اور ضرورت مند ہوتا ہے۔

غیر شرعی اور غیر مسنون ورد اور ذکر اختیار کرنا ایسا کام ہے جس سے منع کیا جانا چاہیے، نیز شرعی دعاؤں اور اذکار میں صحیح مقاصد اور بلند مطالب غایت درجہ موجود ہیں، ان اذکار کو چھوڑ کر خود ساختہ اور بناوٹی اذکار یا تو کوئی جاہل اختیار کرسکتا ہے یا افراط پسند یا حد سے تجاوز کرنے والا۔[1]

نماز میں موذی حشرات کو مارنے کا حکم

سوال نماز میں موذی حشرات کو مارنے کا کیا حکم ہے؟

جواب نبی اکرم ﷺ نے نماز میں سانپ اور بچھو اور ان دو کالی چیزوں کو مار دینے کا حکم دیا ہے۔[2]

امام احمد وغیرہ کا قول ہے کہ انسان کے لیے نماز میں سانپ یا بچھو کو مارنے کے لیے کسی جگہ سے جوتا لانا اور پھر اس کو واپس رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح نمازی جن افعال کو کرنے کی ضرورت محسوس کرے، کرسکتا ہے جس طرح درج ذیل احادیث سے ثابت ہوتا ہے:

- صحیحین میں حدیث ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو منبر پر نماز پڑھائی، آپ قیام اور رکوع اسی پر کرتے، پھر اترتے اور سجدہ زمین پر کرتے، پھر چڑھتے اور اس پر قیام کرتے، تاکہ لوگ آپ کو دیکھ کر آپ کی نماز سیکھ سکیں۔''[3]
- صحیح بخاری میں ہے: ''آپ ﷺ اپنی نواسی اُمامہ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے۔''[4]
- ایک حدیث میں ہے: ''آپ ﷺ سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے تھے کہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے۔ آپ کے ساتھ ہی صفیں بھی پیچھے ہٹ گئیں۔ آپ ﷺ نے کوئی چیز پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کیا۔''[5]
- صحیح میں ہے: ''آپ ﷺ نے نمازی کے آگے سے گزرنے والے کو روکنے کا حکم دیا اور فرمایا: اگر وہ رکنے سے انکار کردے تو وہ اس سے لڑے، کیوں کہ اس کے ساتھ اس کا قرین (شیطان) ہوتا ہے۔''[6]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۵۱۰۔۵۱۱)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (۹۲۱) سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۹۰) سنن النسائي، رقم الحديث (۱۲۰۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۲٤٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸۷۵) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤۹٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤۳)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۱٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (۹۰۱)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥۰٦)

- آپ ﷺ نے فرمایا: ''گذشتہ رات شیطان نے میری نماز کاٹنے کے لیے مجھ سے زور آزمائی کی۔ میں نے اس کو پکڑ کر خوب دبوچا، یہاں تک کہ اس کا لعاب میرے ہاتھ پر بہہ گیا۔ میں نے اس کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھنے کا ارادہ کر لیا، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی۔''[1]
- ایک حدیث میں ہے: ''آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے دروازہ کھولنے کے لیے چلے۔''[2]
- اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر پردہ اٹھا دیا جائے اور تو میری قراءت کی آواز سن لے تو یہی تیرے لیے اجازت ہے ہے، إلا یہ کہ میں تم کو منع کر دوں۔''[3]

ان تمام سنتوں سے نمازی کے لیے ایسے تمام افعال کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے جن کا نماز سے تعلق نہیں ہوتا، مگر ضرورت کی وجہ سے ان کو نماز میں روا رکھا گیا ہے اور ان سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ ابو برزہ اپنے گھوڑے کے ساتھ نماز پڑھتے۔ جب وہ ایک قدم آگے رکھتا تو وہ بھی آگے ہو جاتے، تاکہ وہ گھوڑا ان کے آگے نہ ہو جائے۔[4] امام احمد کہتے ہیں: اگر نمازی اس طرح کرے جس طرح ابو برزہ نے کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام احمد وغیرہ کے ظاہر مذہب کے مطابق اس کو تین قدموں یا تین افعال کے ساتھ محدود و مقید نہیں کیا جا سکتا جس طرح سنت سے ثابت ہوتا ہے۔ جو شافعی اور حنبلی علما تین قدموں کی پابندی لگاتے ہیں یہ اس صورت میں ہے جب وہ متصل ہوں، اگر متفرق ہوں تو تین سے زیادہ مرتبہ بھی جائز ہے۔ اگر تین سے زیادہ متصل نہ ہو۔ واللہ أعلم[5]

نماز میں وسوسوں سے چھٹکارا پانے کے اسباب

سوال نماز میں آنے والے وسوسات کی کیا حد ہے؟ ان سے چھٹکارہ پانا اور نماز میں دل حضوری پیدا کرنا کیسے ممکن ہے؟

جواب الحمد للہ.

وسوسوں کی قسمیں:

وسوسات کی دو انواع ہیں: ایک وہ نوع جو نماز میں تدبر کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ یہ خیالات اور اندیشے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٤١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٠١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٠٦) السلسلة الصحيحة (٢٧١٦)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٧٦)

[5] جامع المسائل (٧/٩٧-٩٩)

ہوتے ہیں۔ اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ لیکن جس کی نماز ان سے بھی محفوظ ہو اس کی نماز اس سے بہر طور افضل ہے جو ان میں مبتلا ہو۔ پہلا شخص اللہ کے مقرب بندوں کے حال سے مشابہ ہے اور دوسرا اعتدال پر چلنے والوں کے حال کے مشابہ۔

دوسری نوع وہ ہے جو فہم و تدبر اور دل حضوری کی راہ میں رکاوٹ ہو اور بندے کو غافل کر دے۔ اس قسم کا وسوسہ بلاشبہہ ثواب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ ابو داود میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اپنی نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے حصے میں وہ آدھی لکھی جاتی ہے یا تیسرا حصہ یا چوتھا حصہ یا پانچوں حصہ یا چھٹا حصہ .... یا دسواں حصہ۔''[1] اس حدیث سے معلوم ہوا بسا اوقات انسان کے نامہ اعمال میں اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ لکھا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''تیری نماز وہی ہے جو تو نے سمجھ کر ادا کی ہے۔''

کیا وسوسے سے نماز ٹوٹتی ہے؟

لیکن کیا وسوسے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور دوبارہ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل ہے۔ اگر نماز میں غفلت کم اور دل حضوری زیادہ ہو تو دہرانا لازم نہیں، اگرچہ ثواب میں کچھ کمی ہی ہو، کیونکہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ سہو سے نماز ٹوٹتی نہیں۔ جو نقصان ہوا ہوتا ہے اس کو دو سجدوں کے ذریعے پورا کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر غفلت زیادہ اور دل حضوری کم ہو تو اس میں علما کے دو اقوال ہیں: ایک کے مطابق باطن میں نماز درست نہیں، گو ظاہر میں درست ہی ہو، کیونکہ نماز کا مقصود حاصل نہیں ہوا۔ یہ دکھاوے کی نماز کے مشابہ ہے جس سے انسان باطن میں بالاتفاق بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ابوعبداللہ بن حامد اور ابو حامد غزالی وغیرہ کا قول ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ نماز سے بری الذمہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس پر دوبارہ پڑھنا لازم نہیں، گو اس کو کوئی اجر یا ثواب نہیں ملتا، جس طرح کوئی روزے دار روزہ رکھ کر بھی جھوٹ اور جھوٹ پر عمل نہیں چھوڑتا، جس کو روزے سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا، یہ امام احمد اور دیگر ائمہ سے منقول ہے۔ انھوں نے بخاری و مسلم کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب موذن اذان دیتا ہے تو شیطان الٹے قدم بھاگتا ہے اور اس کی ہوا خارج ہو جاتی ہے، تاکہ وہ اذان نہ سن سکے، جب اذان مکمل ہو جاتی ہے تو وہ واپس آتا ہے۔ جب اقامت ہوتی ہے پھر بھاگ جاتا ہے۔ جب اقامت پوری ہو جائے پھر واپس آتا ہے، تاکہ بندے اور اس کے نفس کے درمیان خیالات پیدا کرے۔ وہ کہتا ہے: فلاں فلاں باتیں یاد کرو۔ اس کو وہ باتیں بھی یاد آ جاتی ہیں جو بالکل بھول چکی ہوتی ہیں۔ وہ اس میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھ لی ہے۔ جب تم میں سے کسی کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩٦) صحيح الجامع (٦١٢٦)

یہ حالت ہو تو وہ دو سجدے کرے۔''[1]

اس حدیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ نے بتایا کہ شیطان انسان کو نماز میں وہ تمام بھولی باتیں یاد کرواتا ہے جو اس کے گمان میں بھی نہیں ہوتیں اور وہ اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ اس کو یاد ہی نہیں رہتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے اور کتنی پڑھنی ہے، تو آپ ﷺ نے ایسی حالت میں دو سجدے کرنے کا حکم دیا، لیکن دوہرانے کا حکم نہیں دیا، پھر آپ ﷺ نے قلیل و کثیر میں بھی کوئی فرق نہیں کیا۔

یہی قول احادیث کے زیادہ قریب اور اعتدال پر مبنی ہے، کیونکہ احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر و ثواب حضورِ قلب کے ساتھ مشروط ہے، لیکن یہ ظاہری اور باطنی طور پر نماز کو دہرانے کے لیے ضروری اور واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ فرائض میں جو اس طرح کی کمی واقع ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے نوافل کے اہتمام کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''قیامت کے دن سب سے پہلے بندے کا حساب نماز سے شروع کیا جائے گا۔ اگر وہ پوری ہوئی تو صحیح، ورنہ کہا جائے گا: اس کے نوافل دیکھو۔ اگر نوافل ہوئے تو ان سے فرائض کو مکمل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح سارے اعمال میں کیا جائے گا تو یہ تکمیل مطلقاً نقص کو شامل ہے۔

وسوسوں کا علاج:

اس میں کوئی شک نہیں کہ وسوسات جتنے کم ہوں نماز اتنی ہی کامل ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرتا ہے، پھر اس طرح دو رکعات پڑھتا ہے کہ ان میں اپنے نفس سے باتیں نہیں کرتا، اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف سے ایسی دل حضوری کے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ وہ جب نماز میں مگن ہو جاتے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے، تاہم اس بیماری پر دو طرح سے قابو پایا جا سکتا ہے:

ایک یہ کہ بندہ نماز میں جو کہتا ہے، دعا پڑھتا ہے، تلاوت کرتا ہے، رکوع و سجود کرتا ہے، اس پر تدبر کرے، اس کو اچھی طرح سمجھے اور یہ خیال حاضر رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح مناجات کر رہا ہے جس طرح اس کو دیکھ رہا ہے۔ احساس یہی ہے کہ بندہ اس طرح عبادت کرے، گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ خیال ضرور رہے کہ وہ تو دیکھ رہا ہے، پھر جیسے جیسے بندے کو نماز کی لذت حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے ایسے ایسے اس کی نماز کی طرف توجہ اور انجذاب گہرا ہو جاتا ہے۔ یہ ہر ایک انسان کی قوتِ ایمان کے مطابق ہوتا ہے۔ ایمان کو تقویت پہنچانے والے اسباب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٩)

بہت زیادہ ہیں، ان کو اختیار کیا جائے۔ نماز رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین تھی۔

بہر کیف انسان کے دل میں اللہ کی معرفت، محبت، خشیت، اخلاص، خوف، امید اور تصدیق وغیرہ کا درجہ ایک نہیں ہوتا۔ لوگ ان دلی اعمال میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، لیکن جو بندہ جتنا زیادہ قرآن میں تدبر کرتا ہے، اس کو سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ناموں، صفتوں اور عظمتوں کو پہچانتا ہے، اسی قدر وہ اس کی عبادت میں ڈوبتا اور منہمک ہوتا ہے، اس کے دل میں اپنے معبود کے لیے وہ اضطرار اور انجذاب پیدا ہوتا ہے جو دنیا کی ہر لذت سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ کیفیت اللہ کی اعانت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ جب دل میں اللہ کے علاوہ کوئی اور بھی معبود رہتا ہو تو وہ خراب ہو جاتا ہے اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ بندے کی مدد نہ کرے تو اس کی اصلاح ممکن نہیں رہتی۔

وسوسات کو دور کرنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ ان تمام اسباب اور عوارض کو دور کیا جائے جو وسوسات کو جنم دیتے ہیں۔ بندہ اپنے دل کو فضولیات میں تفکر کرنے سے روکے اور دل کو نماز سے غافل کرنے والی دلکشیوں سے پاک کرے، کیونکہ انسان کے دل میں جس قدر زیادہ شبہات اور خواہشات ہوتی ہیں، اسی قدر زیادہ اس میں وسوسات جنم لیتے ہیں۔ تاہم جو انسان اللہ کے ذکر اور نماز کی طرف توجہ کرتا ہے، وسوسات کا اسی کی طرف رخ کرنا قابلِ فہم ہے، کیونکہ شیطان اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، تاہم بندے کو صبر اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے، نماز اور ذکر میں مشغول رہنا چاہیے اور تنگ دل ہو کر ان کے سامنے شکست خوردہ ہو کر گرنا نہیں چاہیے، کیونکہ انسان جب ثابت قدمی اختیار کرتا ہے تو یہ وسوسات دم توڑ جاتے ہیں، آخر کو شیطان کا مکر ضعیف ہی ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴾ [النساء: ۷٦]

''بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔'' واللّٰہ أعلم.[1]

سلام پھیرنے سے پہلے وضو توڑنے والے کی نماز کا حکم

سوال اگر نمازی سلام پھیرنے سے پہلے وضو توڑ دے تو؟

جواب اگر نمازی سلام پھیرنے سے پہلے وضو توڑ دے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی، وہ فرض ہو یا غیر فرض۔[2]

نماز میں ہنسنے کا حکم

سوال کیا ہنسنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؟

جواب تبسم سے نماز نہیں ٹوٹتی، لیکن قہقہہ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہے، تاہم امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک قہقہے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٦١١-٦١٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۲/٦١٣)

سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن وضو کر لینا ہی مستحب ہے، کیونکہ آدمی گناہ کرتا ہے اور خلافِ معمول کام کرتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب تو یہ ہے کہ قہقہے کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ واللہ أعلم[1]

نماز پڑھنے والے کو باآوازِ بلند سلام کہنے کا حکم

سوال کوئی انسان مسجد میں داخل ہو اور اندر نماز ہو رہی ہو تو کیا وہ بلند آواز سے السلام علیکم کہہ سکتا ہے؟

جواب اگر نمازی اچھے طریقے سے اشارے کے ساتھ جواب دینا جانتا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں سلام کہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشارے سے جواب دے دیا کرتے تھے۔ لیکن اگر خدشہ ہو کہ نمازی لاعلمی کی بنا پر بول کر جواب ہی نہ دے دے تو ایسی صورت میں نمازی کو کسی پریشانی میں ڈالنا مناسب نہیں کہ وہ اپنی فرض نماز چھوڑ دے۔[2]

مقتدی کے آگے سے گزرنے کا حکم

سوال مقتدی کے آگے سے گزرنا، امام یا اکیلے نماز پڑھنے والے کے آگے سے گزرنے کی طرح ہے یا نہیں؟

جواب منع کا تعلق امام اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے آگے سے گزرنے سے ہے۔ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ واللہ أعلم[3]

حفظِ قرآن افضل ہے یا طلبِ علم؟

سوال حفظِ قرآن افضل ہے یا طلبِ علم؟

جواب حفظ قرآن بہت سے ایسے علوم سے افضل ہے جنھیں لوگ علم کا نام دیتے ہیں، لیکن یا وہ باطل ولغو ہوتا ہے یا قلیل الفائدہ۔ نیز جو انسان دینی علوم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے بھی حفظِ قرآن سے آغاز کرنا زیادہ بہتر اور مفید ہے، کیوں کہ یہ تمام علومِ دینیہ کی اصل اور بنیاد ہے، لیکن بہت سے بدعتی اور غیر عرب، علمِ کلام، علمِ مناظرہ، اختلافی اور نادر فروعی مسائل کے علم، غیر ضروری تقلید، غیر مفید اور غیر ثابت غرائب الحدیث اور بے دلیل ریاضیات اور اس طرح کے دیگر فضول علوم میں مشغول رہتے ہیں اور حفظِ قرآن کو چھوڑ دیتے ہیں جو ان سب سے اہم ہے، تاہم اس مسئلے میں کچھ تفصیل ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٦١٤/٢٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (٦٢٥/٢٢)

[3] مجموع الفتاویٰ (٦٢٦/٢٢)

قرآن کریم سے مطلوب اس کے معانی کو سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر حافظِ قرآن کا یہ ارادہ و ہمت نہ ہو تو وہ اہلِ علم اور اہلِ دین میں شمار نہیں ہوگا۔ واللہ أعلم [1]

حفظ و تلاوت افضل ہے یا دیگر اذکار

سوال قرآن کریم کو حفظ کرنا اور اس کی تلاوت کرنا افضل ہے یا دیگر اذکار میں مشغول رہنا زیادہ بہتر ہے؟

جواب الحمد للہ. اس مسئلے کا جواب دو قواعد پر مبنی ہے:

پہلا قاعدہ:

پہلا قاعدہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت اپنی ذات کے اعتبار سے اذکار کی ذات اور انواع سے افضل ہے، جس طرح جنسِ ذکر جنسِ دعا سے افضل ہے۔

صحیح مسلم میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''قرآن کے بعد افضل کلام چار باتیں ہیں (یہ قرآن ہی سے ہیں) سبحان اللہ کہنا، الحمد للہ کہنا، لا الہ الا اللہ کہنا اور اللہ اکبر کہنا۔'' [2]

جامع ترمذی میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو قرآن کریم کی تلاوت میرے ذکر اور مجھ سے دعا کرنے سے مصروف رکھے، میں اس کو مانگنے والوں سے زیادہ بہتر عطا کروں گا۔'' [2]

سنن میں مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں قرآن سے کچھ لینے، یعنی یاد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، [3] مجھ کو کچھ سکھا دیجیے جو مجھے نماز کے لیے کافی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہہ! سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، اللہ اکبر۔'' اس لیے نماز میں قراءت واجب تھی، ائمہ کرام اسی وقت ذکر کو اختیار کرنے کا کہتے ہیں جب انسان قراءت کرنے سے عاجز ہو اور بدل، مبدل منہ سے کم تر ہی ہوتا ہے۔

نیز قراءت و تلاوت کے لیے طہارتِ کبریٰ (بڑی طہارت) شرط ہے، لیکن ذکر و دعا کے لیے نہیں۔ لہٰذا جس کام کے لیے اکمل حالت کی شرط ہو وہ افضل ہی ہوتا ہے، مثلاً: نماز کے لیے دونوں طہارتوں کی شرط ہے تو یہ محض تلاوت سے افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «واعْلَموا أنَّ خَيْرَ أعمالِكُم الصَّلاةُ» [5] ''جان لو

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٥٤-٥٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٦) السلسلة الضعيفة (١٣٣٥)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٩٢٤) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل میں اسے حسن کہا ہے۔

[5] موطأ للإمام مالك (١/٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٧) مسند أحمد (٥/٢٧٦) السلسلة الصحيحة (١١٥)

تمھارے اعمال میں سب سے بہتر نماز ہے۔'' اس لیے علما نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ افضل بدنی عبادت نماز ہے۔

نیز جس میں قرآن لکھا ہو اس کو طاہر اور پاکیزہ شخص ہی چھو سکتا ہے۔ علما کا اجماع ہے کہ تلاوت افضل ہے۔ تاہم کچھ شیوخ اور بزرگوں نے ذکر کو ترجیح دی ہے۔ ابو حامد غزالی کا خیال ہے کہ ذکر منتہی درجے کے عبادت گزار کے لیے راجح ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ذکر مبتدی یعنی ابتدائی درجے کے سالک کے لیے زیادہ راجح ہے اور یہی قرین صواب ہے۔ اس کی تحقیق و تفصیل دوسرے قاعدے کے تحت آئے گی۔

دوسرا قاعدہ:

جو اس طرح ہے کہ عملِ مفضول (جو افضل نہ ہو) بعض اوقات کسی قرینے کی وجہ سے افضل بن جاتا ہے۔ اس کی دو انواع ہیں۔ ایک قسم تو سب کے لیے جائز ہے اور دوسری قسم لوگوں کے احوال کے بدلنے کے ساتھ بدلتی ہے:

پہلی قسم: پہلے کی مثال یہ ہے کہ اس کے ساتھ کسی وقت، جگہ یا افضل عمل کا قرینہ وابستہ ہو جائے، مثلاً: فجر اور عصر کے بعد اور دیگر ممنوعہ اوقاتِ نماز میں تلاوت، ذکر اور دعا افضل ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ جگہیں جہاں نماز پڑھنا منع ہوتی ہے، مثلاً: غسل خانہ، اونٹوں کا باڑہ اور قبرستان، وہاں ذکر اور دعا نماز سے افضل ہیں۔ ایسے ہی جنبی کے لیے ذکر اور بے وضو کے لیے تلاوت اور ذکر نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ تو جس وقت افضل عمل کرنے میں کوئی مفسدت حاصل ہو سکتی ہو اس وقت مفضول ہی افضل بلکہ مشروع ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن کریم کی تلاوت منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''مجھے رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ رکوع میں اپنے رب کی تعظیم کرو اور سجدے میں دعا میں لگ جاؤ۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ تمھاری دعا قبول کر لی جائے۔''[1]

رکوع اور سجدے میں تلاوت کرنے کے مکروہ ہونے پر تو علما کا اتفاق ہے، البتہ نماز باطل ہونے میں اختلاف ہے۔ اس میں دو اقوال ہیں۔ اس میں حقیقت میں قرآن کریم کی تعظیم اور تقدیس مقصود ہے کہ خضوع اور ذلت کی حالت میں اس کی تلاوت نہ کی جائے، جس طرح جنازے کے ساتھ اس کی تلاوت مکروہ ہے اور اکثر علما نے حمام اور غسل خانے وغیرہ میں بھی تلاوتِ قرآن کو مکروہ ہی جانا ہے۔

تشہد کے بعد کا وقت دعا کا وقت ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت خود بھی دعا کیا کرتے تھے اور دعا کا حکم بھی دیتے تھے، بلکہ اس وقت دعا کا حکم ہے ذکر اور تلاوت کا نہیں۔ اسی طرح میدانِ عرفات و مزدلفہ میں طواف

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٧٩)

کے وقت اور جمرے کو کنکریاں مارتے وقت بھی دعا اور ذکر کا حکم ہے۔ البتہ اس میں علما کا اختلاف ہے کہ آیا طواف کے دوران میں تلاوت کرنا مکروہ ہے یا نہیں۔

دوسری قسم: دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی افضل عمل کرنے سے عاجز ہو، خواہ وہ اس کے اصل سے عاجز ہو، مثلاً کوئی قرآن یاد ہی نہ کر سکتا ہو، جس طرح ایک دیہاتی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تھا اور اس نے اس کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا تھا۔ یا وہ اس کو کما حقہ ادا کرنے سے عاجز ہو، لیکن مفضول عمل کو کما حقہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، لہٰذا جس نے یہ بات کہی ہے کہ ذکر تلاوت سے افضل ہے، اس کے پیشِ نظر یہی بات تھی۔ کبھی کوئی سالک بلکہ عارف بھی اپنے حال، ذوق اور وجہ سے آگاہ کر دیتا ہے لیکن وہ جو بات ذکر کرتا ہے وہ لوگوں کے لیے کوئی عمومی نہیں ہوتی معرفت میں کئی مخصوص اور جزئیاتی احوال سے سامنا ہو جاتا ہے۔ عام اور کلی چیزوں کا ذکر علم میں ہوتا ہے، چنانچہ بعض اوقات کوئی مبتدی سالک ذکر میں اتنی قوتِ ایمان، جمعیتِ قلب، سکون، نور، ہدایت اور وسوسات کا مقابلہ کرنے کی قوت پاتا ہے جو تلاوتِ قرآن میں نہیں پاتا، بلکہ ممکن ہے جب وہ قرآن پڑھے تو اس کو سمجھ نہ سکے، یا اس کا دل حاضر نہ ہو، وہ اس کے فہم سے غافل ہو اور وہ وسوسات اور خیالات کی آماجگاہ بن جائے۔ اسی طرح کچھ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو تلاوت میں وہ حضوری، فہم اور تدبر حاصل ہوتا ہے جو نماز میں نہیں ہوتا، بلکہ نماز میں اس کے عکس حالت رہتی ہے، لہٰذا ہر وہ عمل جو افضل ہو، ہر ایک کے لیے وہی مشروع نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کے لیے وہی مشروع ہوتا ہے جس کو وہ بہتر طریقے سے ادا کر سکتا ہے اور وہ اس کے حق میں افضل بن جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے روزے کی نسبت صدقہ کرنا افضل ہوتا ہے تو کچھ کے لیے اس کے عکس، اگرچہ جنسِ صدقہ افضل ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے جہاد کی نسبت حج افضل ہوتا ہے، جیسے عورتیں ہیں اور جو جہاد سے عاجز ہوں، اگرچہ جنسِ جہاد افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''حج ہر کمزور کا جہاد ہے۔''[1] اس کی مثالیں متعدد ہیں۔ اگر ان دونوں قاعدوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ان جیسے مسائل کا جواب معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بنا بریں وہ اذکار جو مخصوص اوقات میں متعین ہوں، وہ ان اوقات میں تلاوتِ قرآن سے افضل ہوتے ہیں، مثلاً: جب موذن اذان دے رہا ہو اس وقت اس کا جواب دینا اس وقت تلاوت کرنے کی نسبت افضل ہے۔ اسی طرح صبح شام اور رات کے اذکار ان اوقات میں دیگر اعمال پر مقدم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی رات کو اٹھے اور وہ تلاوت کر سکتا ہو تو یہ اس کے لیے افضل ہے، ورنہ وہی عمل کرے جو کر سکتا ہو، لیکن نماز ان دونوں سے افضل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے پہل جب تہجد فرض تھی تو اس

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٠٢) صحيح الجامع (٣١٧١)

کو منسوخ کر کے تلاوت کا حکم دے دیا گیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ ﴾ [المزمل: ۲۰]

''بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ یقیناً تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو۔''[1]

رات کے وقت نماز افضل ہے یا تلاوت

سوال جب کوئی شخص رات کے وقت اٹھے تو اس کے لیے نماز پڑھنا افضل ہے یا تلاوتِ قرآن؟

جواب نماز، نماز کے باہر تلاوت کرنے سے افضل ہے۔ یہ بات ائمہ علما سے منصوص ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« اِسْتَقِيمُوا وَلَنْ تُحْصُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّ خَيْرَ أَعْمَالِكُمُ الصَّلَاةُ، وَلَنْ يُحَافِظَ عَلَى الْوُضُوءِ إِلَّا مُؤْمِنٌ »[2]

''استقامت اختیار کرو اور تم کبھی (نیک اعمال) شمار نہیں کر سکتے، جان لو! تمھارے اعمال میں سے بہترین عمل نماز ہے، اور وضو کی محافظت مومن کے سوا کوئی نہیں کرتا۔''

تاہم جس کو نماز کی نسبت تلاوت میں زیادہ نشاط، تدبر اور فہم حاصل ہوتا ہو، اس کے لیے وہی افضل ہے جو اس کے لیے انفع یعنی زیادہ مفید ہو۔[3]

تلاوت افضل ہے یا ذکر و تسبیح

سوال ایک شخص ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے تلاوتِ قرآن افضل ہے یا ذکر و تسبیح؟

جواب بالجملہ تلاوتِ قرآن ذکر سے افضل ہے اور ذکر دعا سے افضل ہے، لیکن کبھی بعض حالات میں مفضول فاضل سے افضل ہو جاتا ہے، جس طرح نماز ان سب سے افضل ہے، مگر پانچ ممنوعہ اوقاتِ نماز اور خطبہ کے وقت،

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۵۶-۶۱)

[2] موطأ للإمام مالك (۱/۳٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۷۷) مسند أحمد (٥/۲۷٦) السلسلة الصحيحة (۱۱٥)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۳/٦۲)

تلاوت، ذکر اور دعا نماز سے افضل ہوتے ہیں۔ رکوع و سجود میں تسبیح کرنا تلاوت سے افضل ہے اور آخری تشہد ذکر سے افضل ہے۔ کچھ لوگ اپنے احوال کے لحاظ سے مفضول سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ ان کا دل ان پر زیادہ مرکوز ہوتا ہے۔ ان اعمال میں زیادہ شرح صدر حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر ان کو کرنے کی زیادہ قوت پاتے ہیں، مثلاً کسی کو کسی وقت ذکر میں یہ سب کیفیات حاصل ہوتی ہیں اور تلاوت میں نہیں ہوتیں، لہٰذا وہ جو عمل زیادہ کاملیت کے ساتھ کر سکتا ہو اس کے لیے وہ اس سے افضل ہے، جسے وہ ناقص ادا کرے، خواہ وہ افضل کی نوع سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح آدمی کبھی افضل عمل کرنے سے عاجز ہوتا ہے، لہٰذا وہ جسے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہی اس کے لیے افضل ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم [1]

قرآن کے احترام میں کھڑا ہونا، اسے چومنا اور اس سے فال نکالنا

سوال قرآن کریم کے سامنے احتراماً کھڑے رہنا، اس کو چومنا یا اس سے فال نکالنا کیسا ہے؟

جواب الحمد للّٰہ. قرآن کریم کے احترام میں کھڑے ہونے اور اسے چومنے کے حوالے سے ہمارے پاس اسلافِ امت کا کوئی قول منقول نہیں ہے۔ امام احمد سے قرآن کریم کو چومنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نے اس کے بارے میں کوئی قول نہیں سنا۔'' لیکن حضرت عکرمہ بن ابو جہل سے مروی ہے کہ وہ جب قرآن کھولتے تو اس پر اپنا چہرہ رکھتے اور کہتے: ''یہ میرے رب کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے۔'' قرآن کے احترام میں کھڑا ہونا سلف کی عادت نہیں تھی۔ اسی طرح آپس میں ایک دوسرے کے احترام میں کھڑا ہونا بھی ان کے معمول میں شامل نہیں تھا۔ البتہ کوئی شخص کہیں گیا ہوتا اور طویل غیر موجودگی کے بعد آتا تو اس طرح کی صورتِ حال میں کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا جاتا، اسی لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محترم اور محبوب کوئی شخص نہ تھا۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام میں کھڑے نہیں ہوتے تھے، کیوں کہ انھیں اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپسندیدگی معلوم تھی۔'' لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ہر معاملے میں اسلافِ امت کی پیروی کریں اور جہاں وہ کھڑے ہوتے تھے، لوگ بھی وہیں کھڑے ہوں۔

اگر لوگ ایک دوسرے کے احترام میں کھڑے ہونے کے عادی ہوں تو اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ اس عادت کے ہوتے ہوئے قرآن کے احترام میں نہ کھڑا ہونا قابلِ تعریف نہیں بلکہ مذمت کے زیادہ لائق ہے، کیوں کہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۶۲۔۶۳)

لوگ ایک دوسرے کے احترام میں کھڑے ہوں مگر قرآن کے احترام میں کھڑے نہ ہوں جو زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ عزت اور مقدس ہے، بے حد معیوب ہے۔ نیز کوئی ناپاک قرآن کو چھو نہیں سکتا درآں حالیکہ لوگوں کی ناپاکی میں ایک دوسرے کو چھو لیتے ہیں، پھر قرآن کی تعظیم اللہ کے شعائر اور مقدسات کی تعظیم بھی ہے، اسی لیے قرآن کے احترام میں کھڑے ہونے کو کچھ بڑے فقہا کے ہاں بنظرِ استحسان دیکھا گیا ہے۔

جہاں تک قرآن سے فال نکالنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں اسلافِ امت سے کچھ بھی منقول نہیں، لیکن اس میں متاخرین کا اختلاف ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ نے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے اور ابن بطہ سے فال نکالنا نقل کیا ہے اور دوسروں سے اس کی کراہت نقل کی ہے۔ یہ وہ فال نہیں جو رسول اللہ ﷺ کو پسند تھی، آپ فال یعنی نیک شگونی پسند کرتے تھے اور طیرہ (بد فالی یعنی بدشگونی) ناپسند کرتے تھے۔

وہ فال جو رسول اللہ ﷺ کو پسند تھی وہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کوئی کام کرتے یا اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس کا ارادہ کرتے تو اچھی اور خوش کن بات سننا پسند کرتے، مثلاً: اگر سنتے یا نجیح (اے کامیاب) یا مفلح (اے فلاح پانے والے) یا سعید (اے خوش بخت) یا منصور (اے مدد کیے گئے) وغیرہ وغیرہ، مثلاً آپ ﷺ کو سفرِ ہجرت میں ایک آدمی ملا، آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یزید (زیادہ کرنا) آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: «یا أبا بکرٍ! یَزِیدُ أمرُنَا» ''اے ابوبکر! ہمارا معاملہ زیادہ ہو جائے گا۔''

طِیَرَة (بدشگونی) یہ ہے، مثلاً کوئی شخص اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے کوئی کام کرے یا اس کا ارادہ کرے تو کسی سے ناپسندیدہ لفظ سنے، مثلاً: ''یہ کام پورا نہیں ہوگا'' ''اس میں کامیابی نہیں ملے گی'' وغیرہ، وہ ان الفاظ سے بدشگونی لے کر اپنا کام چھوڑ دے تو یہ منع ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت معاویہ بن حکم سلمی سے مروی ہے: ''میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم میں کچھ لوگ نحوست پکڑتے ہیں، یعنی بدشگونی لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اس کو اپنے دل میں محسوس کرے تو یہ تم کو (عمل کرنے سے) نہ روکے۔''[1] اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ بدشگونی انسان کے ارادے اور اس کی راہ میں حائل ہو، آپ ﷺ نیک فالی کی پسندیدگی اور بد فالی کی ناپسندیدگی کے ساتھ ساتھ، اللہ سے استخارہ کرنے، اس پر توکل کرنے اور شرعی اسباب اختیار کرنے کا طریقہ اپناتے تھے۔ آپ ﷺ نے نیک فالی کو اپنے کام اور ارادے کا باعث اور محرک بنایا نہ بدفالی کو اس میں رکاوٹ تسلیم کیا، نیک فالی کو بنیاد بنا کر کوئی کام کرنا اور بدفالی کو مدِنظر رکھ کر کسی کام سے رک جانا، یہ اہلِ جاہلیت کا شیوہ تھا جو تیروں سے قسمت کا حال جاننے کی کوشش

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٧)

کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دو آیات میں تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا حرام قرار دیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے لوگ جب کسی کام کا ارادہ کرتے تو تیر گھماتے، ایک پر ''ہاں'' لکھا ہوتا دوسرے پر ''ناں'' اور تیسرا بے نشان ہوتا۔ اگر ''ہاں'' والا نکل آتا تو اس کو اچھائی کی علامت سمجھ کر وہ کام کر گزرتے۔ اگر ''ناں'' والا نکل آتا تو اس کو برائی کی علامت سمجھ کر اس کام کا ارادہ ترک کر دیتے اور اگر بے نشان تیر نکل آتا تو پھر دوبارہ قسمت آزمائی کرتے۔ اب کوئی کنکریوں کے ذریعے، جَو کے دانوں کے ذریعے، کسی لوح کے ذریعے، کسی لکڑی کے ذریعے، حروفِ ابجد کے ذریعے یا اشعار کے ذریعے (جس طرح فارسی کا دیوانِ حافظ اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے) یا کسی بھی ایسے ذریعے سے فال نکال کر اور استخارہ کر کے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنائے یا اس سے باز آ جائے، یہ تمام تیروں سے قسمت نکالنے کی مختلف اشکال ہی ہیں جو اسلام میں حرام ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق سے استخارہ کرے، عقل مند لوگوں سے مشورہ کرے اور شرعی دلائل کے ذریعے ان اعمال کو معلوم کرے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند اور ناپسند ہیں۔ انسان یہ تمام کام کبھی تو اس نیت سے کرتا ہے کہ جو وہ کر رہا ہے اس کا اچھا یا برا ہونا معلوم کر لے اور کبھی اس لیے کرتا ہے کہ کیا اس کو ماضی یا مستقبل میں کوئی فائدہ پہنچ سکے گا یا نہیں، یہ دونوں مقاصد ہی غیر شرعی اور ناجائز ہیں۔ واللّٰہ أعلم [1]

چاند اور سورج گرہن کی تعیین میں ماہرینِ فلکیات کی آرا کی حقیقت اور نماز کا طریقہ

سوال اگر ماہرینِ فلکیات پیش گوئی کریں کہ اس مہینے کی چودہ تاریخ کو چاند گرہن لگے گا یا انتیس تاریخ کو سورج گرہن لگے گا، کیا ان کی بات سچ سمجھی جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو کیا نماز پڑھی جائے یا محض تسبیح پر اکتفا کیا جائے، نیز نمازِ کسوف یا خسوف کا طریقہ کیا ہے؟

جواب کسوف (سورج گرہن) اور خسوف (چاند گرہن) کے مقرر اوقات ہیں جس طرح ہلال کے طلوع کا وقت مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں، سردی گرمی میں اور سورج چاند کے چلنے کے تمام توابع میں ایک معمول جاری کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٣٣]

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے، سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

نیز فرمایا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣/ ٦٥۔٦٨)

﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ [يونس: ٥]

''وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا کیا مگر حق کے ساتھ۔''

مزید فرمایا:

﴿ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴾ [الرحمٰن: ٥] ''سورج اور چاند ایک حساب سے (چل) رہے ہیں۔''

اور فرمایا:

﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦]

''صبح کو پھاڑ نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبردست غالب، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کردہ اندازہ ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ [البقرة: ١٨٩]

''وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔''

ایک جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ﴾ [التوبة: ٣٦]

''بے شک مہینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [يٰس: ٣٧-٤٠]

''اور ایک نشانی ان کے لیے رات ہے، ہم اس پر سے دن کو کھینچ اتارتے ہیں تو اچانک وہ اندھیرے میں

رہ جانے والے ہوتے ہیں۔ اور سورج اپنے ایک ٹھکانے کے لیے چل رہا ہے، یہ اس سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے کا اندازہ ہے۔ اور چاند، ہم نے اس کی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ دوبارہ پرانی (کھجور کی) ٹیڑھی ڈنڈی کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج، اس کے لیے لائق ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آنے والی ہے اور سب ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک یہ معمول اور سنت مقرر کی ہے کہ ہلال مہینے کی تیسویں رات یا اکتیسویں رات پیدا ہوتا ہے اور مہینا تیس دنوں کا ہوتا ہے یا انتیس دنوں کا۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ مہینا اس سے کم کا بھی ہوسکتا ہے یا زیادہ کا بھی وہ غلطی کا شکار ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ معمول بھی جاری کیا ہے کہ سورج گرہن اس وقت لگتا ہے جب چاند مہینے کی آخری رات میں یا دو راتوں میں پوشیدہ رہتا ہے اور چاند گرہن اس وقت لگتا ہے جب وہ بدر یعنی ماہ کامل بن رہا ہوتا ہے، اس کا بدر بننے کا وقت ایامِ بیض (روشن دن) ہیں جن میں روزہ رکھنا مستحب ہے اور یہ چاند کی تیرھویں چودھویں اور پندرھویں رات ہوتی ہے۔ چاند کو انھی راتوں میں گرہن لگتا ہے۔ سورج اور چاند کی راتیں حسبِ معمول ہوتی ہیں۔ جو ان کو جانتا ہے اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کب سورج گرہن لگے گا اور کب چاند گرہن۔ اسی طرح جس کو معلوم ہو کہ مہینے کے کتنے دن گزر چکے ہیں، اس کو پتا ہوتا ہے کہ ہلال فلاں رات کو یا اس سے پہلے ایک رات کو پیدا ہوگا۔

ہلال کے معمول کا علم تو عام علم ہے۔ تقریباً ہر کسی کو اس کا علم ہوتا ہے۔ لیکن چاند گرہن اور سورج گرہن کے معمول کا علم اسی کو ہوتا ہے جو ان دونوں کے چلنے کا حساب رکھتا ہے۔ جو ان کا حساب رکھتا ہے اور پھر اس کے مطابق پیشین گوئی کرتا ہے، اس کی یہ پیشین گوئی نہ علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ایسی باتوں سے جن میں سچائی کی نسبت جھوٹ کا احتمال زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ ثابت علم کے بغیر بات اور غیر صحیح بنیاد پر اعتماد ہے۔

سنن ابو داود میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نجوم کے کسی شعبے کو حاصل کیا اس نے جادو کا ایک شعبہ حاصل کر لیا اور جتنا اس میں اضافہ کیا اتنا ہی جادو میں اضافہ کیا۔''[1]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی عراف (کاہن) کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا، پھر اس کی تصدیق بھی کی تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں کرتے۔''[2] کاہنوں کو نجومیوں سے زیادہ علم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے پاس جانے اور ان سے کچھ پوچھنے سے منع کیا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٢٦) صحيح الجامع (٦٠٧٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣٠)

ہے تو نجومی کے پاس جانے کی اجازت کس طرح ہو گی؟! اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ بیان ہو چکی ہے۔

جس چیز کا علم حساب کے ذریعے حاصل ہو وہ موسموں کے اوقات کے علم جیسا ہی ہے کہ کب موسمِ بہار آتا ہے، کب گرما، کب سرما اور کب خزاں۔

جس فقیہ نے کہا ہے کہ سورج کو ان ایام کے علاوہ بھی گرہن لگ سکتا ہے جن دنوں چاند پوشیدہ ہو جاتا ہے، اس کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ واقدی سے جو یہ مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا فرزند ابراہیم مہینے کی دس تاریخ کو فوت ہوا اور یہ وہ دن تھا جس دن سورج گرہن زدہ ہوا تھا اور آپ ﷺ نے گرہن کی نماز پڑھائی، یہ غلط ہے۔ واقدی کی مسانید بھی قابلِ حجت نہیں۔ اس کی اس مرسل روایت سے کس طرح دلیل لی جا سکتی ہے جس کی اس نے کسی سے سند بھی ذکر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کو غلطی لگی ہے، پھر سورج گرہن کے مذکورہ معمول سے بھی اس کی غلطی آشکارا ہو جاتی ہے۔ جو اس معاملے میں بحث کرتا ہے وہ لاعلمی کے ساتھ بحث کرتا ہے۔

جہاں تک اس کی پیش گوئی کرنے والے اور خبر دینے والے کی خبر کی تصدیق یا تکذیب کی بات ہے تو خبر دینے والے کی تصدیق یا تکذیب اس کا حال جانے بغیر کرنا درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے: ''جب تم اہلِ کتاب سے بیان کرو تو ان کی تصدیق یا تکذیب نہ کرو، ممکن ہے وہ تمھیں سچی بات بتائیں تو تم اس کی تکذیب کر بیٹھو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھیں جھوٹی بات بتائیں اور تم اس کی تصدیق کر دو۔''[1]

سورج یا چاند گرہن کو گرہن لگنے کا علم اگرچہ ممکن ہے، لیکن یہ مخصوص شخص جو خبر دے رہا ہے اس کو جاننے والا بھی ہو سکتا ہے اور نہ جاننے والا بھی، لہٰذا جس مجہول شخص کی خبر کی تصدیق اور اس کے سچا ہونے کی توثیق نہ ہو اور اس کا جھوٹا ہونا بھی معلوم نہ ہو اس کو موقوف رکھا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی مجہول اور نامعلوم شخص نماز کے وقت کے بارے میں بتائے تو اس کی بات قبول نہیں کی جاتی (جب تک تصدیق نہ کر لی جائے) لیکن جب ماہرینِ حساب کی طرف سے تواتر کے ساتھ اس کی خبر آنے لگے تو پھر قریب قریب یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہے۔ اس کے باوجود ان کی خبر پر شرعی علم مرتب نہیں ہوتا، سورج گرہن یا چاند گرہن کی نماز اس وقت تک ادا نہیں کی جاتی، جب تک اس کا عملی طور پر مشاہدہ نہ کر لیا جائے۔

اگر کوئی انسان ایسی خبر دینے والے کو سچا سمجھتا ہو یا اس کو اس کے سچا ہونے کا غالب گمان ہو اور وہ اس وقت نمازِ کسوف یا خوف کی نیت کرے اور جب بتائی گئی تاریخ آئے تو پوری توجہ کے ساتھ اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس کا یہ عمل نیکی اور فرماں برداری کے کاموں میں رغبت اور سبقت کا غماز ہے، کیوں کہ نمازِ کسوف

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٩٢٨)

پڑھنے پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ متواتر احادیث میں مذکور ہے، جن کو اہلِ صحیح، اہلِ سنن اور اہلِ مسانید نے بہت سی سندوں سے نقل کیا ہے اور یہ حدیث تو مشہور ہے کہ جس دن رسول اللہ ﷺ کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا اس دن آپ ﷺ نے مسلمانوں کو نمازِ کسوف پڑھائی۔ اس دن کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ سورج ابراہیم کی وفات کی وجہ سے گرہن زدہ ہوا ہے تو آپ ﷺ نے ان کو خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا: ''سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یہ کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گرہن زدہ نہیں ہوتے، لیکن جب تم ان کو گرہن زدہ دیکھو تو نماز کی پناہ میں آؤ۔''[1] صحیح کی ایک روایت میں ہے: ''لیکن یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔''[2] اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگوں پر اللہ کے عذاب کے اترنے کا سبب ہیں۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو ڈراتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتے وقت ڈر جائیں، کیوں کہ لوگ اسی سے ڈرتے ہیں جس سے ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر گرہن کے وقت لوگوں کو نقصان پہنچنے کا امکان یا اندیشہ نہ ہو تو یہ ان کے لیے باعثِ تخویف نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٩]

''اور ہم نے ثمود کو اونٹنی واضح نشانی کے طور پر دی تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نشانیاں دے کر نہیں بھیجتے مگر ڈرانے کے لیے۔''

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو نماز، دعا، استغفار، صدقہ اور غلام آزاد کرنے کا حکم دیا، تاکہ ان امور کے ذریعے اس خوف کو زائل کر دیا جائے اور لوگوں پر جس بلا کے اترنے کا اندیشہ ہو وہ چلی جائے، آپ ﷺ نے مسلمانوں کو بڑی لمبی نمازِ کسوف پڑھائی۔

نمازِ کسوف وخسوف کا طریقہ:

اس نماز کو پڑھنے کے کئی طریقے منقول ہیں، لیکن جو محدثین کے ہاں مشہور اور بخاری و مسلم میں مروی ہے، اکثر علما جیسے کہ مالک، شافعی اور احمد ہیں، انھوں نے بھی یہی طریقہ پسند کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے دو رکعات پڑھائیں، ہر رکعت میں لمبی قراءت کی اور ہر رکعت میں دو دو طویل رکوع کیے، لیکن ان میں قراءت نہیں کی، پھر دو دو طویل سجدے کیے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ان میں بلند آواز سے قراءت کی۔ مقصود یہ تھا کہ گرہن ختم ہونے تک نماز جاری رکھی جائے۔ گرہن کا وقت کبھی زیادہ ہوتا ہے، کبھی تھوڑا۔ یہ گرہن کے اعتبار سے ہوتا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٢)

ہے۔ کبھی پورا گرہن لگتا ہے، کبھی آدھا اور کبھی تیسرا حصہ۔ جب گرہن زیادہ ہو تو نماز لمبی کر دی جائے، پہلی رکعت میں سورت بقرہ وغیرہ بھی پڑھی جا سکتی ہے اور دوسرے رکوع کے بعد اس کے علاوہ کوئی سورت پڑھ لی جائے۔ یہ طریقہ جو ہم نے بیان کیا ہے احادیث میں مذکور ہے، صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو مسعود انصاری سے مروی ہے: ''جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرزند ابراہیم فوت ہوا اس دن سورج کو گرہن لگا۔ لوگوں نے کہا: ابراہیم کی موت کی وجہ سے سورج گرہن زدہ ہو گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شمس و قمر اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں ....''[1]

صحیح میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ نشانیاں جن کو اللہ بھیجتے ہیں، یہ کسی کی موت کی وجہ سے نہیں ہوتیں نہ کسی کی زندگی کی وجہ ہی سے ہوتی ہیں، لیکن اللہ ان کے ذریعے اپنے بندوں کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں، جب تم ان میں سے کوئی چیز دیکھو تو اللہ کے ذکر دعا اور استغفار کی پناہ میں آؤ۔''[2]

صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سورج چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، یہ کسی شخص کی موت کی وجہ سے گرہن آلود نہیں ہوتے، جب تم اس جیسی کوئی چیز دیکھو تو نماز پڑھو، یہاں تک کہ وہ چھٹ جائے۔''[3] ابی مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''جب تم اس جیسی کوئی چیز دیکھو تو نماز پڑھو اور دعا کرو، یہاں تک کہ جو تم پر صورتِ حال وارد ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔''[4] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے: ''نماز پڑھو حتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دے جو تم پر ہے۔''[5]

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج کو گرہن لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور تکبیر کہی۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف بنا لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی لمبی قراءت کی، پھر تکبیر کہہ کر رکوع کیا اور رکوع بھی بہت لمبا کیا، پھر سر اٹھایا اور سمع اللہ لمن حمدہ کہا، پھر طویل قراءت کی جو پہلی سے کچھ کم تھی، پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع کیا، یہ بھی لمبا رکوع تھا، لیکن پہلے کی نسبت کچھ چھوٹا تھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمع اللہ لمن حمدہ کہا اور کہا: ربنا ولك الحمد، پھر سجدہ کیا، پھر دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھی، جس طرح پہلی رکعت پڑھی، حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکوع اور چار سجدے مکمل کر کے نماز ختم کی اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

سورج آپ کے سلام پھیرنے سے پہلے صاف ہو گیا۔"[1] سجدوں کو لمبا کرنے کا ذکر بھی صحیح حدیث میں موجود ہے۔ اسی طرح بلند آواز سے قراءت کرنا بھی ثابت ہے۔ آہستہ آہستہ آواز سے قراءت بھی مروی ہے، لیکن بلند آواز سے قراءت کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ سجدوں کو لمبا کرنے میں حدیث میں کوئی اختلاف نہیں، لیکن ہر حدیث میں اضافہ ہے جو دوسری میں نہیں اور یہ ساری احادیث صحیح ہیں، متفق ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ واللّٰہ أعلم[2]

سائنس وفلسفہ اور شریعت میں بارش، بجلی اور زلزلوں کی اصلیت

سوال بارش، کڑک اور زلزلوں کی اصلیت کی اہلِ شریعت اور اہلِ فلسفہ کیا توجیہ پیش کرتے ہیں؟

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. بارش کو اللہ تعالیٰ آسمانوں میں بادل سے پیدا کرتے ہیں اور وہ بادلوں سے اترتی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٦٨] "پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟"

نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴾ [النبأ: ١٤]

"اور ہم نے بدلیوں سے کثرت سے برسنے والا پانی اتارا۔"

مزید فرمایا:

﴿ فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [النور: ٤٣]

"پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے درمیان سے نکل رہی ہے۔"

یعنی بادلوں کے درمیان سے۔

اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ پر یہ بھی ذکر کیا ہے کہ بارش آسمان سے اترتی ہے، اس کے لیے لفظ "سماء" استعمال ہوا ہے جو بلندی کے معنی میں ہے، یعنی بارش اوپر سے اترتی ہے۔ لفظ "سماء" عالی یعنی بلند کے لیے اسم جنس استعمال ہوا ہے جو اس لفظی اشتراک کی وجہ سے کبھی فوق عرش کے لیے استعمال ہوتا ہے، کبھی افلاک کے لیے اور کبھی گھر کی چھت کے لیے۔

بارش کبھی ان ہواؤں سے تشکیل پاتی ہے جو فضا میں اڑتی ہیں اور کبھی زمین سے آسمانوں کی طرف چڑھنے والے بخارات کے ذریعے۔ یہ مسلمان علما نے ذکر کیا ہے اور فلاسفہ بھی اس پر متفق ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠١)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٥٤_٢٦٢)

رعد اور برق، یعنی بجلی اور کڑک کیا چیز ہے؟ ترمذی میں ایک مرفوع حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ سے رعد کے متعلق سوال ہوا، آپ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

«مَلَكٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُوَكَّلٌ بِالسَّحَابِ، مَعَهُ مَخارِيقُ مِنْ نَارٍ يَسُوْقُ بِهَا السَّحَابَ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ »[1]

''یہ ایک فرشتہ ہے جو بادلوں کا نگران ہے، اس کے ساتھ آگ کے کوڑے ہوتے ہیں، ان کے ذریعے وہ جہاں جہاں چاہتا ہے بادلوں کو ہانک کر لے جاتا ہے۔''

خرائطی کی مکارم الاخلاق میں مذکور ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رعد کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: یہ فرشتہ ہے، پھر برق (بجلی) کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: یہ فرشتوں کے ہاتھوں میں کوڑے ہیں۔ ایک روایت میں ہے: یہ اس کے ہاتھ میں لوہے کے کوڑے ہیں۔ اس معنی میں اور آثار بھی مروی ہیں۔ کچھ اسلاف سے مزید اقوال بھی منقول ہیں جو اس کے مخالف نہیں۔ ایک قول یہ ہے: جب بادلوں میں ہوا کا دباؤ بڑھتا ہے تو ان کے اجرام میں ٹکراؤ کے نتیجے میں یہ آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تعارض نہیں، کیوں کہ رعد جو مصدر ہے اسم فاعل راعد کے معنی میں بھی مستعمل ہے جس طرح عادل کو عدل بھی کہا جاتا ہے۔ حرکت کے نتیجے میں آواز کا پیدا ہونا لازمی امر ہے اور فرشتے بادلوں کو حرکت دیتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتے ہیں۔ عالم علوی اور سفلی میں ہر حرکت فرشتوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ انسان کی آواز بھی اس کے اجرام (مختلف حصے) کے ٹکراؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے اجرام اس کے ہونٹ، زبان، دانت، تالو اور حلق ہیں۔ وہ اس کے باوجود رب تعالیٰ کی تسبیح کرنے والا، نیکی کا حکم دینے والا اور برائی سے منع کرنے والا ہوتا ہے۔ لہٰذا رعد وہ آواز ہے جو بادلوں کو چلاتی اور ہانکتی اور ڈانٹتی ہے، اسی طرح برق (بجلی) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پانی کی چمک ہوتی ہے یا آگ کی چمک۔ اس کا آگ یا پانی کی چمک ہونا اس کے منافی اور مخالف نہیں کہ وہ چمکنے والی چیز وہ آگ کا کوڑا ہو جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، کیوں کہ وہ آگ جو فرشتے کے ہاتھ میں چمکتی ہے وہ پھاڑنے والے کوڑے کی مانند ہے بارش چلانے والے کی طرح اور فرشتہ بادل کو ہانکتا ہے جس طرح سائق (ہانکنے والا) سواری کو ہانکتا اور چلاتا ہے۔

زلزلے اللہ کی ان نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جن کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، جس طرح وہ ان کو چاند گرہن، سورج گرہن اور دیگر نشانیوں کے ذریعے ڈراتا ہے۔ ان حادثات کے اسباب اور حکمتیں بھی ہوتی ہیں، ان کے ذریعے ڈراتا ہے۔ ان کے ذریعے بندوں کو ڈرانا یہ ان میں حکمت کا پہلو ہے اور ان کا ایک سبب یہ ہے

---

[1] مسند أحمد (٢٧٤/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٧) صحيح الجامع (٣٥٥٣)

کہ جب زمین کے اندر بخار یعنی بھاپ کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو اس کو باہر نکلنے کے راستے کی تلاش ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں وہ راستہ پھٹ کر بن جاتا ہے اور اس کے اردگرد کی زمین میں بھونچال واقع ہو جاتا ہے یا دباؤ اس طرح کا ہوتا ہے جس طرح کا دباؤ کسی تنگ جگہ میں ہوا اور پانی کے بھر جانے کے نتیجے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زمین کے نیچے کوئی بیل ہے جو جب اپنا سر ہلاتا ہے تو زمین بھی ہلنے لگتی ہے، یہ بکواس ہے اور جہالت پر مبنی بات ہے، اگرچہ کچھ لوگوں سے منقول ہے، لیکن اس کا باطل اور لغو ہونا بالکل عیاں ہے۔ اگر اس کی حقیقت یہی ہے تو پھر جب زلزلہ آئے تو ساری زمین ہلنی چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٦٢_٢٦٤)

نوافل

وتر اور تارکِ وتر کا حکم

سوال ایک آدمی نے عشا کے بعد وتر نہیں پڑھے تو کیا اس کے لیے وتر ترک کر دینا جائز ہے؟

جواب الحمد للہ، وتر سنتِ موکدہ ہے۔ اس پر سب فقہا کا اتفاق ہے۔ جو اصرار اور تسلسل کے ساتھ وتر ترک کر دے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے کچھ اصحاب کے نزدیک یہ واجب ہے، لیکن جمہور فقہا کے نزدیک یہ واجب نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر بھی وتر پڑھ لیا کرتے تھے اور واجب کو سواری پر ادا نہیں کیا جاتا، تاہم یہ بالاتفاق سنتِ موکدہ ہے اور ان کو چھوڑ دینا کسی کو زیب نہیں دیتا۔ وتر ظہر، مغرب اور عشا کی سنتوں سے بھی زیادہ تاکیدی ہے، بلکہ وتروں کی نماز تمام نفل نمازوں سے، جیسے نمازِ چاشت وغیرہ ہے، افضل ہے۔ فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز، نمازِ تہجد ہے اور اس سے بھی زیادہ تاکیدی وتر اور فجر کی سنتیں ہیں۔ واللہ أعلم

مسافر کے لیے وتر کا حکم

سوال ایک شخص مسافر ہے اور وہ قصر نماز پڑھتا ہے، کیا وہ وتر بھی پڑھے یا نہ پڑھے؟

جواب ہاں، سفر میں وتر پڑھے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سفر اور حضر دونوں حالتوں میں وتر پڑھا کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ ''آپ ﷺ اپنی سواری پر نماز پڑھتے، وہ جس طرف بھی اپنا رخ کر لیتی۔ آپ ﷺ اس پر وتر بھی پڑھتے، لیکن فرض نہیں پڑھتے تھے۔''[2]

وتر کی قضا کا وقت

سوال جو شخص سو جائے اور وتر نہ پڑھ سکے وہ کب پڑھے؟

جواب وہ طلوعِ فجر اور نمازِ فجر کے درمیان پڑھ لے، جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہما

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۸۸/۲۳)

(2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰۴۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۰)، مجموع الفتاویٰ (۸۹/۲۳)

کیا کرتے تھے۔ ابو داود میں حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو سو جانے کی وجہ سے وتر نہ پڑھ سکے یا بھول جائے وہ صبح پڑھ لے یا جب یاد آئے۔''[1] رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے ''جو سویا رہے اور نماز نہ پڑھ سکے یا بھول جائے اسے جب یاد آئے اسی وقت پڑھ لے۔ وہی اس کا وقت ہے۔''[2] یہ حدیث عام ہے جو فرض، قیام اللیل، وتر اور سنتوں کو شامل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے ''رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت کسی تکلیف یا نیند کی وجہ سے قیام اللیل نہ کر پاتے تو دن کے وقت بارہ رکعات پڑھ لیتے۔'' (رواہ مسلم)[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے رات کے وظیفے یا کسی عمل کو کیے بغیر سو جائے، وہ اس کو صبح اور ظہر کی نماز کے درمیان پڑھ لے، اس کا وہ عمل ایسے ہی لکھا جائے گا، جیسے اس نے وہ رات ہی میں کیا ہے۔'' (رواہ مسلم)[4]

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ ''جب آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ کسی سفر میں تھے اور سوئے رہنے کی وجہ سے صبح کی نماز نہ پڑھ سکے تو آپ نے طلوعِ آفتاب کے بعد پہلے فجر کی دو سنتیں ادا کیں، پھر فرض ادا کیے۔''[5] ایک دفعہ آپ ﷺ سے ظہر کے بعد والی دو سنتیں چھوٹ گئیں، آپ ﷺ نے انھیں عصر کے بعد پڑھا۔[6] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ظہر کی پہلی چار سنتیں نہ پڑھ پاتے تو انھیں ظہر کے بعد پڑھتے۔'' (رواہ الترمذي)[7]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''جو فجر کی سنتیں نہ پڑھ سکے وہ انھیں طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھے۔'' (رواہ الترمذي وصححه ابن خزيمة)[8]

ایک قول یہ ہے کہ وتر کی قضا نہیں۔ یہ امام احمد سے منقول ایک روایت ہے۔ ان سے مروی ہے کہ ''جب فجر طلوع ہو جائے تو رات کی نماز اور وتر کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔''[9] حنابلہ کا کہنا ہے: وتر سے مقصود یہ ہے کہ وہ رات کا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٣١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٧)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٠، ٦٨١)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٣٤)

[7] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٢٦)

[8] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٢٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٦١)

[9] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٩) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٨٤)

آخری عمل ہو جس طرح دن کے عمل کا وتر مغرب کی نماز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے تہجد کی نماز چھوٹ جاتی تو آپ دن کے وقت بارہ رکعات پڑھتے۔ اگر وتر ان میں شامل ہوتا تو یہ تیرہ رکعات ہوتیں۔ صحیح یہ ہے کہ وتر کو صبح کی نماز سے پہلے پہلے پڑھ لیا جائے، کیوں کہ فجر کے بعد اس کی قضا کا وہ فائدہ باقی نہیں رہتا، جس کی وجہ سے وتر کا حکم دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم[1]

وتر کے بعد دو رکعات نفل کا حکم

سوال وتر کے بعد دو رکعات نفل پڑھنا کیسا ہے؟

جواب وتر کے بعد دو رکعات کے جواز میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے جو صحیح مسلم میں مروی ہے کہ ''آنحضرت ﷺ وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔''[2] بعض صحیح سندوں سے حضرت ام سلمہ کی حدیث میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ ''آپ ﷺ یہ کام اس وقت کیا کرتے تھے جب نو رکعات وتر پڑھتے۔'' آپ ﷺ گیارہ رکعات بھی وتر پڑھتے تھے۔ کبھی نو پڑھتے تو وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ اکثر فقہا نے یہ حدیث نہیں سنی، اس لیے وہ اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن امام احمد وغیرہ نے یہ حدیث سنی اور وہ اس کی صحت سے بھی آگاہ تھے۔ امام احمد نے ان رکعات کو بیٹھ کر پڑھنے کی رخصت دی ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے، لیکن یہ دو رکعات بالاتفاق واجب نہیں ہیں۔ اگر کوئی ان کو نہ پڑھے تو اس کی مذمت بھی نہیں کی جا سکتی۔ یہ نماز زحافہ نہیں، نہ تو اسے لوگوں کے لیے لازمی قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ اسے پڑھنے والے کی مذمت ہی کی جا سکتی ہے لیکن کچھ شافعی اور حنبلی علما و زہاد وتر کے بعد خالی دو سجدے کرتے ہیں اور ان کا یہ عمل ہے قابلِ تردید عمل۔ «أَنَّهُ كان يُصلِّي بَعْدَ الوِتْرِ سَجْدَتَيْنِ» ''آپ ﷺ وتر کے بعد دو سجدے (دو رکعات) پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے یہاں ''سجدتان'' سے محض دو سجدے مراد لیے ہیں جو ان کی غلطی ہے، یہاں ''سجدتین'' سے رکعتین (دو رکعات) مراد ہیں، کیونکہ صحیح احادیث میں اس کی صراحت مذکور ہے کہ سجدے سے رکعت مراد لی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ''حفظت من رسول الله ﷺ سجدتين قبل الظهر''[3] میں نے رسول اللہ ﷺ سے ظہر سے پہلے دو سجدوں یعنی دو رکعات کا عمل یاد کیا۔ یہاں دو سجدوں سے دو رکعات مراد ہیں۔ اس حدیث کے دیگر صحیح طرق میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۸۹۔۹۱)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۳۸)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۶۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۲۹)

«مَنْ أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَقَدْ أَدْرَكَ الْفَجْرَ» [1]

''جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کا ایک سجدہ یعنی ایک رکعت پالی اس نے نمازِ فجر (وقت میں) پالی۔''

یہاں بھی ایک سجدے سے ایک رکعت مراد ہے اور مشہور روایت میں اس کی تفسیر اور وضاحت موجود ہے۔

کچھ لوگوں نے یہاں سے خالی ایک سجدہ مراد لیا ہے جو غلط ہے۔ کسی عالم نے بھی نمازِ فجر کو پانے کو محض ایک سجدہ پانے کے ساتھ معلق اور مشروط نہیں کیا، بلکہ جمعہ اور جماعت پانے کے حوالے سے علما کے تین اقوال ہیں اور صحیح ترین قول کے مطابق جمعہ اور جماعت وہی پاتا ہے جو ان میں سے ایک رکعت پا لیتا ہے، محض ایک تکبیر کے ساتھ کوئی جماعت پانے والا نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں یہ بات مشہور ہے کہ جو جمعہ سے ایک رکعت سے کم حصہ پائے وہ چار رکعات پڑھے۔ صحیح میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ» [2]

''جس نے نماز سے ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔''

اس بنیاد پر یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسافر مقیم کے پیچھے ایک رکعت پالے تو کیا وہ پوری نماز پڑھے یا قصر کرے؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ لفظ سجدہ سے خالی سجدہ نہیں بلکہ پوری رکعت مراد ہے، کیونکہ بعض اوقات جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، اس لیے کبھی قیام، قعدہ، رکوع، سجدہ، تسبیح یا قرآن بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے، حالانکہ یہ نماز کے مختلف اجزا اور حصے ہیں۔

اب کچھ لوگ سلام کے بعد ایک علاحدہ سجدہ کرتے ہیں ان کا یہ عمل زیادہ قابلِ نکیر اور بدعت ہے۔ کسی امام سے اس کا مستحب ہونا منقول نہیں۔ عبادات کی اساس شریعت اور اتباعِ رسول پر قائم ہے، خواہش پرستی اور بدعت سازی پر نہیں۔ اسلام کے دو بنیادی قاعدے ہیں:

1. ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کریں۔
2. ہم اس شریعت اور طریقے کے مطابق عبادت کریں جو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جاری ہوا، اپنی خواہشات کے مطابق اور بدعتوں کے ساتھ نہیں۔

فصل: نمازِ ''زحافہ'' کی حقیقت:

وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھی جانے والی دو رکعات کو نمازِ زحافہ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے جو اس نماز کی پابندی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٧)

نہیں کرتا وہ اہلِ سنت سے تعلق نہیں رکھتا ہے، حالانکہ اہلِ اسلام کا اس کے واجب نہ ہونے پر اتفاق ہے چاہے کوئی ساری زندگی اسے چھوڑے رکھے، یا زندگی میں ایک مرتبہ بھی نہ پڑھے تو اسے بدعتی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے نہ پڑھنے کی وجہ سے نہ وہ قابلِ ملامت ہے نہ اس سے تعلقات منقطع کیے جا سکتے ہیں اور نہ اس کو کسی ملامتی علامت سے موسوم ہی کیا جا سکتا ہے۔

اس سے بڑھ کر اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام ترک کر دے جو ثبوت کے اعتبار سے اس سے بھی زیادہ پختہ ہو، مثلاً: رات کی نماز میں لمبا قیام کرنا جو رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی، یا گیارہ رکعت پڑھنا جو آپ ﷺ کا معمول تھا، اس بنا پر بھی وہ نہ تو اہلِ سنت سے خارج ہو گا نہ بدعتی ہو گا اور نہ قابلِ مذمت، حالانکہ قیام اللیل بالاتفاق گیارہ لمبی رکعات ہیں، نبی اکرم ﷺ کا یہی عمل تھا اور یہی خالی وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھ لینے سے افضل ہے۔

اس حوالے سے آپ ﷺ کا معمول صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح ثابت ہے کہ آپ ﷺ رات کے وقت گیارہ رکعات بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے نو رکعات پڑھنا شروع کر دیں۔ آٹھویں اور نویں کے بعد بیٹھتے اور نویں کے بعد سلام پھیرتے۔ اس کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے، پھر آپ ﷺ نے سات وتر اور اس کے بعد پانچ پڑھنا شروع کر دیے۔ جب پانچ وتر پڑھتے تو پانچویں رکعت میں بیٹھتے، اس کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔[1] جب سات پڑھتے تو ایک روایت کے مطابق ساتویں میں بیٹھتے اور ایک روایت کے مطابق چھٹی اور ساتویں میں بیٹھتے، اس کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ یہ صحیح حدیث اس بات کی شاہد ہے کہ آپ ﷺ اس پر مداومت نہیں کرتے تھے تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جو ان دو رکعات پر مداومت اور ہمیشگی نہیں کرتا وہ اہلِ سنت نہیں؟

ان دونوں رکعات کی شرعی حیثیت کے حوالے سے علما میں اختلاف ہے۔ اکثر علما کے نزدیک یہ کسی حالت میں مشروع نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«اِجۡعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمۡ بِاللَّيۡلِ وِتۡراً»[2]

''وتر کو اپنی رات کی آخری نماز بناؤ۔''

ان علما نے آپ ﷺ کی ان دو رکعات کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ فجر کی دو رکعات ہوا کرتی تھیں لیکن صحیح احادیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ فجر کی دو سنتوں کے علاوہ وتر کے بعد بیٹھ کر دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔

بعض الفاظ میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ وتر کے بعد دو سجدے کرتے جس سے کچھ علما نے خالی دو سجدے ہی مراد لے لیے اور وتر کے بعد صرف دو سجدے کرنے کا معمول بنا لیا۔ یہ بدعت ہے۔ کسی عالم نے اسے مستحب کہا ہے نہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٤٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥١)

اسلاف ہی نے اس پر عمل کیا ہے۔ ان لوگوں نے دو سجدوں کے لفظ سے دھوکا کھایا حالانکہ دو سجدوں سے دو رکعات مراد ہیں، جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رات کے وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھی جانے والی دو رکعات دن کے وتر یعنی نمازِ مغرب کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعات کی طرح ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«اَلْمَغْرِبُ وِتْرُ النَّهَارِ، فَأَوْتِرُ صَلَاةَ اللَّيْلِ» (رواه أحمد)[1]

''مغرب دن کا وتر ہے، لہٰذا رات کی نماز کو وتر بناؤ۔''

اگر مغرب دن کا وتر ہے اور نبی اکرم ﷺ نے مغرب کے بعد دو رکعات پڑھی ہیں اور ان دو رکعات کی وجہ سے مغرب وتر ہونے سے خارج نہیں ہوئی، کیوں کہ یہ دو رکعات حقیقت میں فرض کی تکمیل اور اس میں ہونے والے سہو ونقص کو پورا کرنے کے لیے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بندہ نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کے حصے میں آدھی نماز لکھی جاتی ہے، کبھی ایک تہائی، کبھی چوتھائی، کبھی پانچواں حصہ ۔۔۔ اور کبھی دسواں حصہ۔'' چنانچہ فرائض میں ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے نوافل کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ رات کے وتر میں ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے ان کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے اور یہ اس وقت پڑھا کرتے تھے جب نو، سات، یا پانچ وتر پڑھتے، کیونکہ اس وقت ان کی تعداد گیارہ رکعات سے کم ہوتی تھی اور یہاں تعداد میں کمی واضح ہے۔ اگر کبھی آپ گیارہ رکعات پڑھنے کے بعد بھی یہ دو رکعات پڑھتے تو اس لیے کہ اگر نماز کی صفت یعنی کیفیتِ ادا میں کوئی کمی کوتاہی ہوگئی ہو تو وہ دور ہو جائے، اگرچہ آپ ﷺ بیٹھ کر ہی پڑھ لیتے کیونکہ رات کا وتر دن کے وتر سے کم درجے کا ہے تو اس کی صفت اور کیفیت بھی اس سے ناقص ہے جو سہو کے دو سجدوں اور دو کامل رکعات کے درمیان کا مرتبہ ہے، اس طرح جبر یعنی کمی کو پورا کرنے کے تین درجات ہیں، سہو کی کمی پوری کرنے کے لیے دو سجدے ہیں، یہاں چونکہ نماز کی مقدار میں کمی ہوتی ہے اس لیے انھیں نماز کے متصل بعد ادا کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن دو مستقل رکعات نماز کی معنوی کمی پوری کرنے کے لیے ہیں، تاکہ انسان کی نماز کامل ہو جائے۔ سنن میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''انسان کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا، اگر مکمل ہوئی تو درست ورنہ کہا جائے گا: دیکھو اس کے پاس کوئی نفل ہے؟''[2] پھر اس کے ساتھ اعمال کے ساتھ ایسے ہی کیا جائے گا۔'' واللہ أعلم[3]

---

[1] مسند أحمد (٣٠/٢، ٤١) صحيح الجامع (٦٧٢٠)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٢٥) صحيح الجامع (٢٠٢٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٩٢-٩٤)

نمازِ زحافہ کا حکم

جواب جہاں تک نمازِ زحافہ سے متعلق سوال ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جو اس پر ہیشگی نہیں کرتا وہ اہلِ سنت سے نہیں اور اس نماز سے ان کی مراد وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھنا ہے تو سنتے جایئے، یہ واجب نہیں، اس پر سب مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اگر کوئی اسے ساری عمر بھی نہیں پڑھتا، چاہے زندگی میں ایک مرتبہ بھی نہ پڑھی ہو تو وہ اس وجہ سے نہ تو اہلِ بدعت سے شمار ہوگا اور نہ مذمت، سزا، یا ترکِ تعلق یا کسی مذموم علامت کے ساتھ موسوم ہونے کا حق دار ہی ہوگا، بلکہ اگر کوئی شخص ایسا کوئی عمل بھی ترک کر دیتا ہے جو اس نماز سے زیادہ وثوق کے ساتھ ثابت ہو، مثلاً قیام اللیل کو طویل کرنا اور گیارہ رکعات کا اہتمام کرنا، جس طرح آنحضرت ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی یا اس طرح کا کوئی عمل نہیں کرتا تو وہ اس وجہ سے نہ تو اہلِ سنت سے خارج ہوتا ہے اور نہ بدعتی یا سزا کا حق دار ہی ٹھہرتا ہے، حالانکہ سب مسلمانوں کا اتفاق ہے رات کے وقت گیارہ رکعات طویل پڑھنا جس طرح آپ ﷺ کا معمول تھا، انھیں چھوڑنے اور وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھنے سے کہیں افضل ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو ثابت ہے وہ اس طرح ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ رات کو گیارہ رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔'' پھر آپ ﷺ نے نو پڑھنا شروع کر دیں۔ آٹھویں اور نویں کے بعد بیٹھتے اور نویں کے بعد سلام پھیرتے۔ اس کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ پھر آپ ﷺ نے سات اور پانچ وتر پڑھنا شروع کر دیے۔ جب پانچ پڑھتے تو پانچویں کے بعد بیٹھتے۔ پھر اس کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ جب سات وتر پڑھتے تو مروی ہے کہ آپ ساتویں کے بعد بیٹھتے تھے اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ چھٹی اور ساتویں کے بعد بیٹھتے، پھر آپ ﷺ وتر کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے۔ یہ صحیح حدیث بتاتی ہے کہ آپ ﷺ اس پر ہیشگی نہیں کرتے تھے، لہٰذا یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے جو اس پر ہیشگی نہیں کرتا وہ اہلِ سنت سے نہیں؟ ان رکعات کی مشروعیت اور عدمِ مشروعیت میں علما کا اختلاف ہے۔

بہت سے علما کہتے ہیں: یہ کسی حال میں مشروع نہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ وِتْرًا» ''وتر کو اپنی آخری نماز بناؤ۔''

اس رائے کو اختیار کرنے والے وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھی جانے والی رکعات کی تاویل فجر کی سنتوں کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن صحیح احادیث میں یہ صریحاً ذکر ہوا ہے کہ آپ ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر جو دو رکعات پڑھا کرتے تھے وہ فجر کی سنتوں کے علاوہ تھیں، بعض روایات کے الفاظ ہیں:

«إِنَّهُ كَانَ يُصَلِّي سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ الْوِتْرِ» ''آپ ﷺ وتر کے بعد دو سجدے (یعنی دو رکعات) پڑھتے۔''

بعض شیوخ کو اس سے گمان ہوا کہ دو سجدوں سے صرف دو سجدے مراد ہیں چنانچہ وہ وتر کے بعد خالی دو سجدے

کرتے تھے۔ یہ بدعت ہے، جسے کسی عالم نے پسند نہیں کیا، بلکہ سلف میں سے کسی نے یہ عمل نہیں کیا۔ ان کو ''دو سجدوں'' کے لفظ سے دھوکا ہوا، حالانکہ دو سجدوں سے دو رکعات مراد ہیں، جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

''حفظت مِن رسُول اللّٰه ﷺ سَجُدَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَسَجُدَتَيْنِ بَعُدَهَا، وَسَجُدَتَيْنِ بَعُدَ الْمَغُرِبِ، وَسَجُدَتَيْنِ بَعُدَ الْعِشَاءِ، وَسَجُدَتَيْنِ قَبْلَ الْفَجْرِ''

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو سجدے ظہر سے پہلے دو بعد میں، دو مغرب کے بعد، دو عشا کے بعد اور دو فجر سے پہلے یاد کیے۔''

مراد ہے دو رکعات، شاید کوئی کہے: یہ جو دو رکعات رسول اللہ ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھتے تھے، وتر کی طرف ان کی نسبت ایسے ہی ہے، جیسے مغرب کی دو رکعات کی نسبت دن کے وتر کی طرف ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((اَلْمَغُرِب وِتُر النَّهَار، فَأَوُتِرُوا صَلَاة اللَّيُل)) (رواه أحمد في مسنده)

''مغرب دن کا وتر ہیں، تو تم رات کی نماز کو وتر بناؤ۔''

اگر مغرب دن کا وتر ہے اور نبی پاک ﷺ مغرب کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے تو ان دو رکعات کی وجہ سے مغرب وتر ہونے سے خارج نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ دو رکعات فرض کی تکمیل اور اس میں ہونے والے سہو اور کمی کی تلافی کرتی ہیں، جس طرح حضور اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ اپنی نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کو اس کا نصف حصہ، ایک تہائی حصہ، ایک چوتھائی حصہ، پانچواں حصہ، حتی کہ فرمایا: دسواں حصہ نصیب ہوتا ہے۔'' اس لیے چونکہ شریعت میں سنتیں فرائض میں ہونے والی کمی کوتاہی کی تلافی کے لیے مقرر کی گئی ہیں، اس لیے مغرب کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعات کا فرائض کی تلافی کے لیے ہونا اسے وتر سے خارج نہیں کرتا، جس طرح سجدۂ سہو ہوتا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے رات کے وتر کی تلافی دو رکعات کے ساتھ کی، لہٰذا جب آپ ﷺ نو، سات یا پانچ وتر پڑھتے، اس وقت گیارہ رکعات کی تعداد میں کمی واقع ہوتی، جس کی تلافی کے لیے آپ ﷺ دو رکعات پڑھتے، اس لیے یہاں تعداد کی کمی ظاہری کمی ہے۔

اگر آپ کبھی گیارہ رکعات کے بعد بھی پڑھتے تو اس وقت نماز کی کیفیت میں ہونے والی کمی کی تلافی کے لیے یہ دو رکعات پڑھتے، چاہے بیٹھ کر ہی پڑھتے، کیوں کہ رات کا وقت دن کے وتر سے مختلف اور کم ہے۔ یہ کیفیت میں اس سے کم ہے۔ یہ سہو کے دو سجدوں اور دو کامل رکعات کے مابین مرتبہ ہے۔ یہاں تلافی تین درجات پر ہوگی، سہو کی تلافی دو سجدوں سے ہو جاتی ہے، لیکن وہ نماز کی مقدار میں ظاہر نقص ہے، اس لیے نماز کے متصل بعد واجب ہے، مگر جو دو مستقل رکعات ہیں، وہ اس کے باطل معنی کی تلافی ہیں، اس لیے آپ ﷺ کی نماز مکمل ہوتی تھی۔ جس طرح

سنن میں ہے: بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہو گا، اگر وہ مکمل ہوئی تو درست ورنہ کہا جائے گا: دیکھو کیا اس کے پاس کوئی نفل بھی ہے؟ پھر اس کے ساتھ اعمال کے ساتھ ایسے ہی کیا جائے گا۔ واللہ أعلم[1]

قنوتِ نازلہ اور وتر کا مسنون طریقہ اور حکم

سوال کیا رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں قنوت کرتے تھے یا عشا کی نماز میں؟ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے، اس وقت صحابہ کا عمل کیا تھا؟

جواب آنحضرت ﷺ صبح کی نماز میں قنوت کسی افتاد کی وجہ سے کیا کرتے تھے، جس طرح صحیح بخاری میں مروی ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ان کافروں کے خلاف ایک مہینے تک قنوتِ نازلہ کیا، جنھوں نے آپ ﷺ کے کچھ صحابہ کو قتل کیا تھا، پھر آپ ﷺ نے چھوڑ دیا۔ دوسری مرتبہ آپ ﷺ نے اپنے ان صحابہ کے لیے قنوت کیا جو ایسے لوگوں کی قید میں تھے جو ان کو ہجرت نہیں کرنے دے رہے تھے۔ اسی طرح خلفائے راشدین بھی آپ ﷺ کے بعد اس طرح کے حالات میں قنوت کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نہ اس پر ہمیشگی ہی کرتے نہ مکمل طور پر چھوڑتے ہی۔ اس سے متعلق علما کے تین اقوال ہیں:

1. مداومت اور ہمیشگی سنت ہے۔
2. قنوت منسوخ ہے اور یہ سب بدعت ہے۔
3. یہ بوقتِ ضرورت مسنون ہو جاتا ہے اور یہی صحیح قول ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا کا عمل یہی تھا۔ قنوتِ وتر جائز ہے، لازمی نہیں۔ کچھ صحابی قنوتِ وتر نہیں کرتے تھے، کچھ رمضان کے آخری نصف میں کرتے اور کچھ سارا سال۔ امام مالک کے نزدیک پہلا طرزِ عمل مستحب ہے، شافعی کے نزدیک دوسرا اور امام احمد سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور دوسری روایت میں امام احمد کے نزدیک تیسرا طرزِ عمل مستحب ہے، تاہم سب جائز ہے۔ جو ان میں سے کسی ایک پر بھی کاربند ہے، قابلِ ملامت نہیں۔ واللہ أعلم[2]

نمازِ فجر اور عشا میں قنوتِ نازلہ کا حکم

سوال کیا رسول اللہ ﷺ عشا کی نماز میں قنوتِ نازلہ کیا کرتے تھے یا فجر کی نماز میں؟ نیز آپ ﷺ کی وفات کے وقت صحابہ کا عمل کیا تھا؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۹۵۔۹۸)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۹۸۔۹۹)

جواب صبح کی نماز میں قنوتِ نازلہ کرنے کا ذکر احادیث میں مرقوم ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک قوم کے خلاف ایک مہینے تک قنوتِ نازلہ کی، جنھوں نے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قتل کر دیا تھا، پھر آپ ﷺ نے قنوت کرنا چھوڑ دیا۔ دوسری مرتبہ آپ نے اپنے ان صحابہ کے لیے قنوت کی جو کافروں کی قید میں تھے اور وہ انھیں ہجرت نہیں کرنے دے رہے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کو بھی جب ضرورت پڑتی تو قنوت کر لیتے، لیکن اس پر ہیشگی نہیں کیا کرتے تھے اور کلی طور پر چھوڑ بھی نہیں دیتے تھے، قنوتِ نازلہ کے متعلق فقہا کے تین اقوال ہیں:

1. ایک قول یہ ہے کہ اس پر ہیشگی کرنا سنت ہے۔
2. دوسرا قول یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے۔
3. تیسرا قول جو درست ہے، یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت جائز ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا اور آپ ﷺ کے بعد خلفا کا طریق تھا۔ البتہ وتر میں قنوت جائز ہے ضروری نہیں، کوئی صحابی بالکل قنوت نہیں کرتا تھا۔ کوئی رمضان کے دوسرے نصف میں قنوت کرتا اور کوئی سارا سال۔ امام مالک کے نزدیک پہلا طریقہ مستحب ہے۔ امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک دوسرا طریقہ مستحب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک تیسرا طریقہ مستحب ہے اور سب جائز ہے۔

تاہم جو جس پر عمل کرے، قابلِ ملامت نہیں۔ واللہ أعلم

فصل: نماز میں قنوت کا محل اور جگہ:

قنوت کے حوالے سے تین آرا ہیں، دو یک طرفہ اور ایک معتدل۔ کچھ فقہا کے نزدیک قنوت صرف رکوع سے پہلے ہے اور کچھ کے نزدیک رکوع کے بعد، البتہ امام احمد جیسے محدث فقیہ کے نزدیک دونوں طرح جائز ہے، کیونکہ صحیح سنت میں دونوں عمل مذکور ہیں، لیکن رکوع کے بعد قنوت ان کا اختیار کردہ مذہب ہے کیونکہ یہ کثرت سے منقول ہے اور قیاس کے بھی زیادہ قریب ہے۔ جب بندہ ''سمع اللہ لمن حمده'' کہتا ہے پھر اللہ کی تعریف شروع کرتا ہے، اس موقع پر دعا کرنا سماع کے زیادہ مناسب ہے۔ سورت فاتحہ بھی اسی اساس پر قائم ہے۔ اس کا پہلا حصہ ثنائے الٰہی پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ دعا پر۔

نمازِ فجر میں قنوت کی مشروعیت:

اس بات پر تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز میں قنوت کیا ہے، لیکن اس کے بعد اس کے حکم کے بارے میں فقہا کے تین اقوال ہیں:

ایک قول کے مطابق یہ اب منسوخ ہے۔ آپ ﷺ نے پہلے قنوت کا التزام کیا پھر چھوڑ دیا۔ صحیح احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ دوسرے قول کے مطابق اب ان کفار کو بد دعا دینا متروک ہے۔ اس قول کے قائل تک حدیث کے الفاظ نہیں پہنچے یا پہنچے تو ہیں مگر اس نے اس پر تامل نہیں کیا، کیونکہ صحیحین میں عاصم الاحول سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت انس بن مالک سے قنوت کے متعلق سوال کیا کہ کیا یہ رکوع سے پہلے تھا یا بعد میں؟ انھوں نے جواب دیا: رکوع سے پہلے تھا۔ عاصم کہتے ہیں: میں نے کہا: مجھے فلاں شخص نے آپ کے حوالے سے بتایا ہے کہ آپ کہتے ہیں: یہ رکوع کے بعد تھا؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رکوع سے پہلے قنوت کیا۔ مجھے یاد ہے کہ آپ ﷺ نے ستر کے قریب قراء کو مشرکوں کے ایک گروہ کے پاس بھیجا جو ان سے کم تھے، ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صلح کا معاہدہ تھا۔ آپ ﷺ نے ایک مہینہ قنوت کیا اور ان کے خلاف بددعا کرتے رہے۔[1]

اسی طرح مسند احمد اور حاکم میں ربیع بن انس سے مروی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا:

«مَا زَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقْنُتُ حَتّٰى فَارَقَ الدُّنْيَا»[2]

''رسول اللہ ﷺ مسلسل قنوت کرتے رہے حتی کہ آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔''

ایک روایت کے الفاظ میں اس کی تفسیر بھی مذکور ہے کہ «أَنَّه ما زَالَ يَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكوعِ» ''آپ ﷺ رکوع سے پہلے قنوت کرتے رہے۔''

یہاں قنوت سے ''لمبا قیام'' مراد ہے دعا نہیں۔ اس کی تفسیر بھی مذکور ہے۔ صحیحین میں محمد بن سیرین سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں قنوت کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، رکوع کے بعد تھوڑا سا۔[3] اس حدیث میں انھوں نے بتایا کہ آپ ﷺ کا قنوت مختصر ہوتا اور رکوع کے بعد ہوتا۔

لفظ قنوت کا معنی ہے نیکی اور اطاعت گزاری پر ہمیشگی کرنا اس لیے قیام، رکوع اور سجدے میں طوالت کو قنوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا ﴾ [زمر: ٩]

''(کیا یہ بہتر ہے) یا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے عبادت کرنے والا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٧)

[2] مسند أحمد (١٦٢/٣) السلسلة الضعيفة (١٢٣٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٧)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے قنوتِ موکد (دائمی قنوت) کی بابت پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا: ''یہ ہم نے نہ سنا نہ دیکھا ہے۔'' یہ ایک قول ہے۔

تیسرے قول کے مطابق قنوت سنتِ موکدہ ہے، کیونکہ یہ آپ سے ثابت ہے اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ دنیا سے رخصت ہونے تک قنوت کرتے رہے۔ یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ کے نزدیک تمام نمازوں میں اس کا التزام ثابت ہے۔ کئی روایات میں مغرب، عشا اور ظہر میں پڑھنے کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن قنوتِ نازلہ کی معروف دعا کے ساتھ مسلسل قنوت کرنے کا تذکرہ کسی بھی راوی نے نہیں کیا۔ علما قنوت وتر کی دعا پڑھنا ہی مستحب سمجھتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو سکھائی تھی اور اس کے الفاظ ہیں: «اللّٰهُمَّ اهدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ»[1]

امام احمد اور دیگر فقہائے حدیث نے درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دشمن نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو قتل کیا یا قید کیا تو اس پریشانی کے وقت آپ ﷺ نے اللہ سے مدد مانگتے ہوئے قنوت کیا، اسے قنوتِ نازلہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قحط سالی کے موقع پر آپ ﷺ نے بارش کے لیے دعا کی تو ضرورت کے وقت آپ ﷺ کا اللہ سے مدد طلب کرنا ایسے ہی ہے جیسے ضرورت کے وقت آپ ﷺ کا رزق طلب کرنا کیونکہ رزق اور نصرت کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا وجود قائم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ الَّذِيٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [قريش: ٤]

''وہ جس نے انھیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا اور خوف سے (بچا کر) امن دیا۔''

نبی اکرم ﷺ کا فرمان بھی ہے: ''تمھیں تمھارے کمزوروں کی دعا، نماز اور استغفار کے نتیجے میں نصرت اور رزق ملتا ہے۔''[2] اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورت ملک میں بھی یہ دونوں انواع ذکر کر کے فرمایا کہ یہ اسی کے ہاتھ میں ہیں: ارشاد ہے:

﴿ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۚ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ ﴾ [الملك: ٢٠-٢١]

''یا کون ہے وہ جو تمھارا لشکر ہو، تمھاری مدد کرے، رحمان کے مقابلے میں؟ کافر دھوکے کے سوا کسی کھاتے میں نہیں ہیں۔ یا وہ کون ہے جو تمھیں رزق دے، اگر وہ اپنا رزق روک لے؟ بلکہ وہ سرکشی اور بدکنے پر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٦٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٧٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١٦٨/٢) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٩)

اڑے ہوئے ہیں۔‘‘

نو فقہائے حدیث کے نزدیک اس کے بعد آپ ﷺ نے قنوت کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی تفسیر بھی مذکور ہے کہ جب اس کا وہ سبب ختم ہو گیا تو آپ ﷺ نے قنوت کرنا چھوڑ دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی تھا کہ جب مسلمان فوج کی خبر پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو وہ قنوت کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی خوارج سے لڑائی کرتے وقت اس کا التزام کیا تھا۔ یہ فقہا کہتے ہیں کہ یہ چھوڑنا منسوخ ہونے کی بنا پر نہیں، کیونکہ ناسخ کے لیے منسوخ کے منافی ہونا ضروری ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کوئی کام کسی ضرورت کے پیشِ نظر کریں پھر اس ضرورت کے ختم ہو جانے کی وجہ سے اسے چھوڑ دیں تو یہ نسخ نہیں ہوتا بلکہ اگر آپ اسے مطلقاً بھی چھوڑ دیں تو یہ اس فعل کے کرنے اور نہ کرنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے، اس فعل سے منع کرنے پر نہیں۔

ان فقہا کا کہنا ہے کہ ہمیں بالعموم اس بات کا علم ہے کہ آپ ﷺ نے قنوتِ موکد (دائمی) نہیں کیا، کیوں کہ اس طرح کے عمل کو نقل کے اسباب اور حوصلے میسر ہوتے ہیں۔ اگر کسی صحابی نے یہ قطعاً ذکر نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے فجر وغیرہ میں کسی مخصوص قوم کے حق یا کسی ایک کے خلاف کے علاوہ کبھی قنوت کیا ہو یا ہمیشہ رکوع کے بعد قنوت کیا ہو یا ہمیشہ رکوع سے پہلے قنوت کیا ہو اور پھر بہت سے صحابہ نے اس قنوتِ موکد کی تردید بھی کی ہو تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قطعاً اس طرح نہیں اور یہ اسی طرح ہی ہے کہ جیسے مسنون اذان میں ”حي علی خیر العمل“ کے الفاظ نہیں۔ بعض صحابہ نے کسی عارضی سبب کی وجہ سے لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے یہ کام کیا تھا۔

بنابریں یہ معتدل قول ہے کہ قنوت مشروع ہے منسوخ نہیں لیکن یہ کسی پیش افتادہ ضرورت کی وجہ سے ہے بطور سنتِ موکدہ اور دائمی عمل نہیں۔

یہ واجبات اور مستحبات میں ایک دوسرا قاعدہ ہے جو اس عذر کی وجہ سے ساقط ہونے والے واجبات اور مستحبات بیان کرنے والے قاعدے کی طرح ہے۔

لہٰذا موکد (دائمی) واجبات اور مستحبات عارضی عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں اور اس وقت واجب یا مستحب نہیں رہتے، مثلاً: سفر، بیماری اور خوف کی وجہ سے بہت سے واجبات اور مستحبات ساقط ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح جو واجب یا موکد مستحب نہ ہو کبھی عارضی اسباب کی وجہ سے واجب یا مستحب ہو جاتا ہے۔ عبادات ثبوت اور سقوط کے لحاظ سے دائمی اور عارضی میں منقسم ہوتی ہیں۔ ان میں وجوب و استحباب کا ثبوت و ساقط ہونا برابر ہے۔

ذہن اس وقت غلطی کھا جاتا ہے جب عارضی کو دائمی بنا دے، دائمی کو کسی حالت میں متغیر نہ ہونے والا قرار دے۔ جس کو دائمی اور عارضی احکام کے اس فرق کی سمجھ آ جائے اس کے ذہن میں بہت سے عقدے حل ہو جاتے ہیں۔

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۳/۹۸۔۱۰۴)

عصر کی سنتوں کی مشروعیت

سوال کیا کسی صحیح حدیث میں عصر کی سنتوں کا ذکر ملتا ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. سنتوں کے متعلق جو صحیح حدیث ذکر ہوئی ہے وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس رکعات یاد کی ہیں: دو رکعات ظہر سے پہلے اور دو ظہر کے بعد، دو رکعات مغرب کے بعد، دو رکعات عشا کے بعد اور دو رکعات فجر سے پہلے۔''[1]

صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی مروی ہے: ''جس نے دن اور رات میں بارہ رکعات نفل ادا کیں، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔''[2] سنن میں اس کی تفسیر یہ ذکر ہوئی ہے: ''چار رکعات ظہر سے پہلے، دو اس کے بعد، دو رکعات مغرب کے بعد، دو عشا کے بعد اور دو فجر سے پہلے۔''[3] صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی مذکور ہے: ''ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے (ہر دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت کا دورانیہ ہے) پھر تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے لیے ہے جو چاہے۔''[4] یہ بات آپ نے اس خدشے کے پیشِ نظر کہی کہ لوگ کہیں اسے سنت ہی نہ بنا لیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ عصر، مغرب اور عشا سے پہلے نفل نماز پڑھ سکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ مغرب کی اذان اور تکبیر کے درمیانی وقفے میں دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھا اور منع نہیں کیا، لیکن آپ کا اپنا عمل یہ نہیں تھا، لہٰذا اس طرح کی نفل نمازیں اچھی ہیں، لیکن سنت نہیں، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سنت بنا لینا ناپسند فرمایا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عصر، مغرب اور عشا سے پہلے سنتیں نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے اس کو سنت نہیں بنانا چاہیے، لیکن پڑھنا مکروہ بھی نہیں، لیکن ان سنتوں کے عکس جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہیں اور ان کی ترغیب بھی دی ہے، وہ اس سے زیادہ تاکیدی ہیں۔ ایک ضعیف حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصر سے پہلے چار رکعات پڑھا کرتے تھے اور ایک حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ آپ دو کعات پڑھتے تھے، لیکن ان دو رکعات سے ظہر کی دو رکعات مراد ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٨)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٩٤) صحيح الجامع (٦٣٦٢)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨)

فرض نمازوں کی سنتوں کے تین درجات:

رسول اللہ ﷺ فرض نمازوں کے ساتھ جو سنتیں ادا کیا کرتے تھے اس کی تفصیل مذکورہ بالا احادیث میں گزر چکی ہے، جن کے تین درجات ہیں: ایک فجر کی سنتیں اور وتر، آپ ﷺ نے ان دونوں کو ہمیشہ پڑھا ہے اور ان کو پڑھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ یہ بالاتفاق موکد سنتیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو کبھی سفر میں چھوڑا نہ حضر میں۔ امام مالک تو سنتِ موکدہ میں صرف ان دونوں کو شمار کرتے ہیں۔

دوسرے درجے پر وہ دس رکعات ہیں جو آپ فرض کے ساتھ حضر و قیام میں پڑھتے تھے جن کا ذکر حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں گزر چکا ہے اور ان کے علاوہ قیام اللیل کی تیرہ رکعات اور تیسرے درجے پر وہ نوافل ہیں جو ان اوقات میں پڑھے جا سکتے ہیں، لیکن ان کو سنت قرار نہیں دیا جاتا، کیوں کہ آپ ﷺ نے ان پر ہمیشگی نہیں کی، نیز ان کی تعداد بھی متعین نہیں، لہٰذا عصر، مغرب اور عشا سے پہلے کے نوافل اسی زمرے میں آتے ہیں، نمازِ چاشت بھی تقریباً اسی میں داخل ہے۔ واللہ أعلم[1]

سنن موکدہ کی قضا

سوال کیا سننِ رواتب (سنن موکدہ) کی قضا دی جائے؟

جواب اگر سنتِ راتبہ، مثلاً ظہر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو کیا عصر کے بعد ان کی قضا دی جا سکتی ہے؟ اس میں دو قول ہیں اور امام احمد سے وہ دونوں مروی ہے:

1. قضا نہ دی جائے۔ یہ ابو حنیفہ اور مالک کا مذہب ہے۔
2. قضا دی جائے۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔ یہی زیادہ قوی ہے، واللہ أعلم.[2]

قصر نماز کی سنتوں کا حکم

سوال کیا نمازِ قصر کی سنتیں ہیں؟

جواب نبی اکرم ﷺ سفر میں فجر کی سنتیں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح قیام اللیل بھی کرتے اور وتر بھی پڑھتے۔ غزوۂ خیبر سے واپسی کے موقع پر آپ ﷺ کی فجر کی نماز رہ گئی تو آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ فجر کے فرضوں کے ساتھ ساتھ سنتوں کی قضا بھی دی۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ ''آپ ﷺ اپنی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۱۲۳۔۱۲٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۱۲۷)

سواری پر نماز پڑھتے اس کا رخ جس طرف ہوتا اسی طرف منہ پھیر لیتے اور اس پر وتر بھی پڑھتے، لیکن اس پر فرض نماز نہ پڑھتے۔''[1]

لیکن ظہر سے پہلے اور بعد کی سنتوں کے بارے میں آپ ﷺ سے منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے انھیں سفر میں پڑھا ہو۔ آپ ﷺ منیٰ میں ظہر کی اور عصر کی دو رکعات پڑھتے، لیکن یہ منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ سنتیں بھی پڑھی ہوں۔ اگر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ سفر میں فرض کے بعد سنتیں پڑھنے والے کو روکتے تھے تو وہ سنت کو زیادہ جانتے تھے اور اس کی پیروی میں سب سے آگے تھے۔ البتہ ان کے مستحب ہونے میں علما کا اختلاف ہے۔[2]

مغرب کے بعد دو رکعات کا حکم

سوال مغرب کی اذان کے بعد جماعت سے پہلے دو رکعات پڑھنا کیسا ہے؟

جواب حضرت بلال رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق اذان اور اقامت میں اتنا فاصلہ رکھتے تھے کہ اس دوران میں دو رکعات آسانی سے پڑھی جا سکتی ہوں۔ نبی اکرم ﷺ صحابہ کو پڑھتے دیکھتے تھے اور آپ ﷺ نے ان کے اس عمل کو برقرار رکھا تھا۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے: ''دو اذانوں (اذان اور اقامت کے درمیان) کے درمیان نماز ہے۔ دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ تیسری مرتبہ کہا: جو چاہے پڑھ لے۔''[3] اس خوف سے کہ کہیں اسے سنت نہ بنا لیا جائے۔

اگر موذن اذان اور اقامت میں اتنا وقفہ دیتا ہو کہ اس دوران میں یہ دو رکعات پڑھی جا سکتی ہوں تو پھر انھیں پڑھنا اچھا اور بہتر ہے۔ لیکن اگر وہ اذان کے فوراً بعد اقامت کہہ دے تو پھر اقامت کا جواب دینا چاہیے اور نماز میں شریک ہونا چاہیے، کیوں کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم موذن کو سنو تو وہی الفاظ کہو۔''[4] یہ نہیں کرنا چاہیے کہ اقامت کا جواب چھوڑ کر ان رکعات کو پڑھنا شروع کر دیا جائے، واللہ أعلم.[5]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٠٠)

② مجموع الفتاویٰ (٢٣/١٢٨_١٢٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٣)

⑤ مجموع الفتاویٰ (٢٣/١٢٩_١٣٠)

''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ'' کا مفہوم

سوال رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: «لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قُبُوراً»[1] ''اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔'' کا کیا معنی ہے؟

جواب حدیث کے الفاظ یہ ہیں: «اِجْعَلُوا مِنْ صَلَاتِكُمْ فِي بُيُوتِكُمْ»[2] ''اپنے گھروں میں اپنی نماز سے کچھ پڑھا کرو۔'' اگر تم ان میں اللہ کا ذکر نہیں کرو گے تو تم ان میں مردے کی طرح ہو گے اور وہ گھر قبروں کی طرح۔ صحیح میں نبیِ اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے، اس کی مثال اور جو اپنے رب کا ذکر نہیں کرتا اس کی مثال زندہ اور مردہ کی مثال ہے۔[3] ایک روایت کے الفاظ ہیں: اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے اور اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر نہیں ہوتا، زندہ اور مردہ کی مثال ہے۔[4]

عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا ثواب

سوال ایک عورت تہجد کی نماز پڑھتی ہے، لیکن کبھی کبھی بیٹھ کر پڑھ لیتی ہے اور کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اس کو بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملتا ہے۔''[5] اب یہ عورت کیا کرے؟

جواب یہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان صحیح ہے، لیکن اگر اس کا معمول کھڑے ہو کر پڑھنا ہی ہے، تاہم بسا اوقات تھک ماند کر اور کھڑے رہنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے بیٹھ جاتی ہے تو اللہ اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کا اجر ہی دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بندہ اگر بیمار ہو جائے یا سفر پر نکلے تو اس کا عمل اسی طرح لکھا جائے گا جس طرح وہ صحت اور اقامت کی حالت میں اس کو کرتا تھا۔''[6] بیماری کے عالم میں اگر انسان ساری نماز پڑھنے سے بھی عاجز ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس کی نیت اور فعل کی وجہ سے اس کے لیے ساری کا اجر لکھ دیتے ہیں تو اگر وہ نماز کا کوئی ایک رکن ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہو تو اس کو پورا اجر کیوں نہیں ملے گا؟ واللہ أعلم[7]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (٧٨٠)
[2] صحیح البخاري، رقم الحديث (٤٢٢) صحیح مسلم، رقم الحديث (٧٧٧)
[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (٦٠٤٤)
[4] صحیح مسلم، رقم الحديث (٧٧٩)، مجموع الفتاویٰ (١٣١/٢٣)
[5] صحیح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)
[6] صحیح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)
[7] مجموع الفتاویٰ (١٣٠/٢٣)

نمازِ رغائب کی اصلیت

سوال نمازِ رغائب کی کیا حیثیت ہے؟ جو رجب کی پہلی جمعرات میں دن کو روزہ رکھنے کے بعد مغرب اور عشا کی نماز کے درمیان ادا کی جاتی ہے اور یہ بارہ رکعات پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کی ایک مخصوص کیفیت ہوتی ہے۔

جواب اس نماز کی کوئی حقیقت نہیں، یہ بدعت ہے۔ اس کو انفرادی طور پر پڑھنا مستحب ہے نہ جماعت کے ساتھ ہی۔

صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعرات کی رات کو قیام اور جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کرنا منع ہے۔ اس نماز کی دلیل کے طور پر جو اثر یا حدیث پیش کی جاتی ہے وہ بالاتفاق موضوع اور من گھڑت ہے اور ائمہ و اسلاف میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ پندرھویں شعبان کی فضیلت میں کئی احادیث اور آثار منقول ہیں اور کئی اسلاف سے اس رات نفل نماز پڑھنا منقول ہے۔

بنا بریں اگر کوئی شخص اس رات اکیلے نماز پڑھ لے اور اس کے پاس اسلاف کا عمل اور کوئی حجت بھی ہو تو اس کی اس طرح تردید نہیں کی جا سکتی، لیکن اس رات باجماعت نماز کے اہتمام کی حیثیت نیکی اور عبادت کے لیے اجتماع کے متعلق اس عمومی قاعدے پر مبنی ہے، جس کی وضاحت اس طرح ہے۔

نفل نماز باجماعت پڑھنے کا قاعدہ:

اس اجتماع کی دو انواع ہیں، ایک دائمی اور موکد۔ یہ واجب ہوتی ہیں یا مستحب۔ جس طرح پانچ نمازیں اور جمعہ و عیدین کی نمازیں ہیں، سورج گرہن کی نماز ہے، بارش طلب کرنے کی نماز ہے اور تراویح کی نماز ہے۔ یہ سنتِ موکدہ ہے جس پر مداومت اور اس کی محافظت کرنی چاہیے۔ دوسری نوع غیر موکد سنت ہے، مثلاً کسی نفل نماز جیسے تہجد کی نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے اکٹھا ہونا، قرآن پڑھنے کے لیے جمع ہونا، یا ذکر کے لیے، یا دعا کے لیے اکٹھ کرنا، ان اعمال کو کرنے میں کوئی حرج نہیں، اگر انھیں عادت نہ بنایا جائے اور تسلسل کے ساتھ نہ کیا جائے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے نفل نماز جماعت کے ساتھ بھی پڑھائی ہے اور جماعت کے بغیر بھی، لیکن اس پر ہیشگی نہیں کی۔ صحابہ کرام جب کسی موقعے پر اکٹھے ہوتے تو کسی ایک کو تلاوت کا کہتے اور باقی دھیان سے سنتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہتے: ہمیں ہمارے رب کی یاد کرواؤ تو وہ تلاوتِ قرآن شروع کر دیتے اور باقی توجہ سے سنتے۔ یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اہلِ صفہ کی طرف نکلے۔ ان میں سے کوئی ایک تلاوت کر رہا تھا۔ آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ وہیں بیٹھ گئے۔ مجالسِ ذکر میں حاضر ہونے والے فرشتوں کی حدیث بھی معروف ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر کچھ لوگ کسی وقت کوئی نفل نماز پڑھنے کے لیے جمع ہو جائیں، لیکن اس کو اس طرح کا معمول

نہ بنائیں جس طرح موکد اور تسلسل کے ساتھ پڑھی جانے والی نمازوں کا معمول ہوتا ہے تو اس کو مکروہ نہیں کہا جائے گا، لیکن اس کو مخصوص اوقات کے ساتھ متعین کر کے معمول بنا لینا مکروہ ہے، کیوں کہ اس سے ایک تو شریعت میں تبدیلی کی بو محسوس ہوتی ہے اور دوسری طرف غیر مشروع کی مشروع کے ساتھ مشابہت نظر آتی ہے۔ اگر اس طرح کرنا جائز ہوتا تو چاشت کے وقت ایک اور نماز بنا لی جاتی۔ ظہر اور عصر کے درمیان بھی ایک نماز بنا لی جاتی۔ یا تراویح رمضان کے علاوہ شعبان میں بھی شروع کر دی جاتی، یا عید کے لیے بھی اذان شروع کر دی جاتی یا بیت اللہ کے علاوہ بیت المقدس میں بھی حج کرنا شروع کر دیا جاتا تو اس پہلو سے یہ دین میں تبدیلی اور تغیر کا باعث بن سکتا ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جشن بھی اسی زمرے میں داخل ہوتا ہے۔ مکروہ بدعات وہی ہوتی ہیں جو شریعت میں مستحب نہیں ہوتیں۔ یہ وہ بدعات ہوتی ہیں جن کو انسان اپنی طرف سے بنا لیتا ہے اور اللہ نے ان کی اجازت نہیں دی ہوتی۔ جو انسان اللہ کی شریعت اور اجازت کے بغیر کسی چیز کو دین بنا لیتا ہے، وہ بدعتی اور گمراہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حدیث میں اسی کو مراد لیا ہے کہ ''ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1] بدعت شریعت کے مخالف و متضاد چیز ہوتی ہے۔ شریعت وہ ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ وہ حکم واجب ہو یا مستحب، اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں روبہ عمل نہ ہوا ہو، جس طرح ایک امام کے پیچھے باجماعت تراویح کا اہتمام قرآن کریم کی تدوین کا کام، مرتدوں کو قتل کرنے کا عمل، خارجیوں کے خلاف جنگ اور اس طرح کے دیگر کام جو صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فوت ہونے کے بعد کیے، وہ کام جس کا حکم اللہ نے دیا ہے نہ اس کے رسول ہی نے، وہ بدعت اور گمراہی ہیں، مثلاً: کسی جگہ یا وقت کو عبادت کے لیے مخصوص کر لینا جس طرح صاحبِ شریعت نے نمازوں کے اوقات، جمعہ اور عیدوں کے دن مقرر کیے ہیں، مکہ مکرمہ کا مقام متعین کیا ہے، مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصی کے فضائل اور اہمیت مقرر کی ہے اور باقی مساجد کو نمازوں اور دیگر عبادات کے لیے مخصوص کیا ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ عبادات کے لیے کس طرح کا اجتماع جائز ہے اور کس طرح کا اجتماع ناجائز؟

بدعت سے مراد وہ کام ہے جو شریعت کے مخالف ہو اور دین میں اس کا حکم نہ ہو تو جس فعل کے متعلق کسی آیت، حدیث یا اجماعِ امت سے ثابت ہو جائے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہے وہ بدعت کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸٦۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۱۳۲۔۱۳٤)

وضو کے بغیر سجدۂ تلاوت کا حکم

سوال کیا سجدۂ تلاوت وضو کے بغیر ہو جاتا ہے؟

جواب کچھ علما کے نزدیک سجدۂ تلاوت وضو کے بغیر بھی جائز ہے۔ (مختصراً) واللہ أعلم [1]

سجدے کی آیت سن کر بے وضو سجدہ کرنے کا حکم

سوال اگر کسی شخص کے سامنے سجدۂ تلاوت پر مشتمل کسی آیت کی تلاوت کی جائے، وہ وضو کے بغیر سجدہ کر دے تو کیا گناہ گار ہوگا، کافر ہوگا یا اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی؟

جواب نہ وہ کافر ہوگا نہ اور اس کی بیوی کو طلاق ہی ہو گی، لیکن وہ اکثر علما کے نزدیک گناہ گار ہوگا، لیکن کچھ اصحابِ ابو حنیفہ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی ایسی نماز وضو کے بغیر پڑھے جس کے لیے طہارت کے شرط ہونے پر اجماع ہو، مثلاً: نمازِ پنجگانہ، تو وہ شخص اس وجہ سے کافر ہو جاتا ہے۔ جب کافر ہو گیا تو مرتد ہو گیا اور ابو حنیفہ کے نزدیک مرتد کی بیوی اس سے جدا اور بائن ہو جاتی ہے۔ مگر یہ تکفیر خود ابو حنیفہ سے منقول نہیں اور ان کے صاحبین سے بھی منقول نہیں۔ یہ ان کے اتباع اور پیروکاروں سے منقول ہے۔ جمہور علما کہتے ہیں: اس کو تعزیری سزا دی جائے گی اور کافر قرار نہیں دیا جائے گا، مگر یہ کہ وہ اس کو حلال سمجھتا ہو یا نماز کے ساتھ استہزا کرتا ہو۔

جہاں تک سجدۂ تلاوت کا مسئلہ ہے تو کچھ علما کا موقف یہ ہے کہ طہارت کے بغیر بھی جائز ہے۔ جب مسئلے کے جواز و عدمِ جواز میں علما کا اختلاف ہو۔ اس کے کرنے والے کو باتفاقِ علما کافر قرار نہیں دیا جاتا۔ جمہور علما کا موقف ہے کہ مرتد کی بیوی اس سے بائن اور جدا نہیں ہوتی، مگر یہ کہ اس کی عدت پوری ہو جائے اور وہ شخص اسلام کی طرف نہ لوٹے۔ واللہ أعلم [2]

دعائے استخارہ کی جگہ

سوال دعائے استخارہ نماز کے اندر کرنی چاہیے یا سلام پھیرنے کے بعد؟

جواب دعائے استخارہ نماز کے اندر بھی جائز ہے اور سلام کے بعد بھی، تاہم سلام سے پہلے دعا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی اکثر دعائیں سلام پھیرنے سے پہلے ہی ہوتی تھیں، اور یہی احسن ہے۔ واللہ أعلم [3]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۱۷٦/۲۳)
2. مجموع الفتاویٰ (۱۷۸/۲۳)
3. مجموع الفتاویٰ (۱۷۷/۲۳)

ممنوعہ اوقات میں نماز اور اسباب والی نمازوں کا حکم

سوال ممنوعہ اوقات میں نماز اور اسباب والی نمازوں کو ان اوقات میں ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب ممنوعہ اوقات میں نماز پڑھنے اور اسباب والی نمازوں کو ان اوقات میں ادا کرنے کے متعلق فقہا میں بہت زیادہ اختلاف اور اضطراب ہے۔

ہماری رائے کے مطابق نص اور اجماع سے ثابت ہے کہ یہ منع اور نہی تمام نمازوں کے لیے عمومیت کا حکم نہیں رکھتی۔ صحیحین میں یہ حدیث ہے کہ ''جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے ایک رکعت پا لی اس نے نماز پا لی۔ وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملا کر اس کو مکمل کرے۔''[1] اسی طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے ایک رکعت پا لی اس نے نماز پا لی، لہٰذا وہ اس کو مکمل کرے۔''[2]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص نے طلوعِ آفتاب کے وقت فجر کی دوسری رکعت پڑھی یا غروبِ آفتاب کے وقت عصر کی ایک رکعت پڑھی، اس کی وہ رکعت صحیح ہوگی۔ وہ باقی نماز مکمل کرے۔

اس کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے فجر کی نماز میں سورت بقرہ پڑھی، جب سلام پھیرا تو آپ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا: سورج نکلنے کے قریب ہو چکا تھا، انھوں نے فرمایا: اگر سورج نکل آتا تو تو ہمیں غافل نہ پاتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ اگر سورج نکل بھی آتا تو ان کے لیے چنداں ضرر رساں نہ ہوتا، وہ غافل نہ ہوتے، بلکہ ذکر کرنے والے ہوتے اور ان پر یہ آیت صادق آتی:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٢٠٥]

''اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی سے اور خوف سے اور بلند آواز کے بغیر الفاظ سے صبح و شام یاد کر اور غافلوں سے نہ ہو۔''

یہ امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ثور اور ابن منذر کا قول ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص سویا رہا ہو یا نماز پڑھنا بھول گیا ہو وہ ممنوعہ اوقات میں بھی اس نماز کی قضا دے سکتا ہے، لیکن امام ابو حنیفہ اور ان کے ہم مشربوں کا کہنا ہے کہ اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیوں کہ یہ نماز قضا ہو چکی تھی اور قضا ممنوعہ اوقات میں نہیں پڑھی جا سکتی، لیکن اس دن کی عصر کے خلاف کہ وہ موجود ہے اور اپنے وقت میں ادا کی گئی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

[2] أيضاً.

بہرحال حدیث کی دلالت اور ائمہ کے اتفاق سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ اس دن کی عصر ممنوعہ وقت میں پڑھی جائے اور فجر کی دوسری رکعت بھی ممنوعہ وقت میں پڑھی جائے، کیوں کہ نماز بالکل چھوڑ دینا تاخیر میں پڑھنے کی نسبت زیادہ بڑا گناہ ہے جو کسی حالت میں جائز نہیں۔ شارع کے پیشِ نظر ہمیشہ کمتر کو چھوڑ کر بہتر کو اختیار کر کے بڑے شر سے بچنا قابلِ اعتنا رہا ہے، مثلاً کوئی شخص مسافر ہو اور اس کے پاس محض اتنا پانی ہو جو صرف پینے کے کام آ سکتا ہو اور وضو کے لیے نہ بچتا ہو تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لینا نماز کو کھو دینے اور اس کا وقت گزار دینے سے کہیں بہتر ہے۔

بہرکیف نص اور اتفاق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نہی ہر نماز کو شامل نہیں۔ جمہور نے ممنوعہ اوقات میں نماز کی قضا دینے کی دلیل اس حدیث سے بھی لی ہے: ''جو نماز سے سویا رہے یا بھول جائے تو اس کو جب یاد آ جائے اسی وقت اس کو پڑھ لے، اس کا کفارہ وہی ہے۔'' (بخاری و مسلم)[1]

صحیح مسلم میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «لَيسَ في النَّوْمِ تَفْرِيطٌ، إنما التَّفْرِيطُ فِي الْيَقْظَةِ»[2] ''نیند میں تفریط نہیں، بیداری میں تفریط ہے کہ کوئی شخص نماز نہ پڑھے، حتی کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے تو جس نے اس طرح کیا وہ اسی وقت پڑھ لے جب متنبہ ہو، جب اگلا دن ہو تو اس کو وقت پر پڑھے۔'' اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد آ جانے اور بیدار ہو جانے کے وقت نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور یہ ہر وقت کو شامل ہے۔

یہ عموم منع کے عموم سے زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ نہی کے بارے میں ثابت ہے کہ وہ فرض کو نہ ادا کی صورت میں نہ قضا کی صورت ہی میں شامل ہے۔ اسی طرح اس دن کی عصر کی نماز اور فجر کی دوسری رکعت کو بھی شامل نہیں، کیوں کہ آدمی جب بیدار ہو یا اس کو یاد آئے تو وہی اس کا وقت ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ طلوعِ آفتاب کے وقت اور غروبِ آفتاب کے وقت کا عموم نہی نہیں تو دیگر اوقات اولیٰ ہوئے۔

یہاں ایک اور سمجھنے کی بات بھی ہے کہ ان اوقات میں نفل نماز سے ممانعت کا حکم سدِ ذرائع پر مبنی تھا اور جو کام سدِ ذرائع کی بنیاد پر ممنوع ہو وہ راجح مصلحت کے پیشِ نظر کیا بھی جا سکتا ہے، کیوں کہ نماز بذاتِ خود تمام اعمال سے افضل اور تمام عبادات سے عظیم ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: «واعلَمُوا أنَّ خيرَ أعمَالِكُم الصَّلاةُ»[3] ''جان لو! نماز تمھارے بہترین اعمال میں سے ہے۔'' لہٰذا بذاتِ خود نماز میں کوئی مفسدت نہیں جو نہی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨١)

[3] موطأ للإمام مالك (٣٤/١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٧) مسند أحمد (٢٧٦/٥) صحيح الجامع (٩٥٢)

اور ممانعت کا تقاضا کرتی ہو۔ لیکن اصل معاملہ یہ ہے کہ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کے وقت شیطان سورج کے ساتھ سینگ آزمائی کرتا ہے اور اس وقت کفار اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اس وقت اگر کوئی نماز پڑھے تو وہ جنسِ عبادت میں ان کے مشابہ ہوتا ہے، اگرچہ مسلمان نہ ان کے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں، نہ ان کے مقصود کو اپنا مقصود ہی بناتے ہیں، لیکن یہ ایک صوری مشابہت ہو جاتی ہے، اس لیے ان دونوں وقتوں میں سدِ ذریعہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نماز سے منع کر دیا گیا، تاکہ کفار کی مشابہت ختم ہو جائے اور مسلمان ان کے شرک میں ان کے مشابہ نہ ہو جائیں۔

اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، مثلاً: اجنبی اور پرائی عورت سے خلوت منع ہے۔ عورت کو خاوند یا محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں۔ مشرکوں کے معبودوں کو گالی دینا منع ہے تاکہ وہ اللہ کو برا بھلا نہ کہیں، خبائث اور گندی چیزوں کو کھانا حرام ہے، کیوں کہ وہ حرام کاموں کا باعث بن سکتی ہیں۔ یہ سارے امور سدِ ذریعہ کی وجہ ہی سے حرام ہیں، پھر جو کام سدِ ذریعہ کی وجہ سے حرام ہوں وہ راجح مصلحت کے پیشِ نظر مباح بھی ہو جاتے ہیں، جس طرح مخطوبہ (جس کو نکاح کا پیغام بھجوایا جائے) کو دیکھنا جائز ہے، عورت کی حفاظت کے پیشِ نظر اس کے ساتھ سفر بھی جائز ہے، مثلاً: دار الحرب سے سفر کرنا، جس طرح حضرت امِ کلثوم نے سفر کیا تھا یا جس طرح جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک غزوے میں اکیلی رہ گئی تو حضرت صفوان رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ سفر کیا اور انھیں بحفاظت مدینے پہنچایا۔ لہٰذا اس سے منع نہیں، کیوں کہ یہ مفسدت کا باعث نہیں بنتا، کیوں کہ وہ مصلحتِ راجحہ پر مبنی ہو تو مفسدت کا سبب نہیں ہوتا۔ یہی بات مطلق نفل میں بھی موجود ہے۔ بسا اوقات وہ بھی مفسدت کا باعث بن سکتا ہے اور لوگوں کو ممنوعہ اوقات میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ جن اوقات میں نماز مباح ہوتی ہے۔ ان میں بہت وسعت ہوتی ہے، بلکہ بعض اوقات نفل سے منع کرنے میں دیگر مصالح بھی پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ نفس کو عبادت کی ثقالت سے آرام پہنچانا بھی مقصود ہوتا ہے، جس طرح نیند سے آرام اور تازگی مہیا ہوتی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: میں جس طرح اپنی بیداری میں ثواب کی امید رکھتا ہوں، اسی طرح اپنی نیند میں بھی ثواب کی نیت رکھتا ہوں۔ پھر کسی وقت میں نماز سے منع کر کے دل میں اس کی رغبت اور شوق دلانا بھی مقصود ہوتا ہے، کیوں کہ کسی دائمی اور مسلسل عمل سے دل اکتا جاتا ہے تو اس اکتاہٹ کو توڑنے کے لیے کچھ اوقات میں نماز سے منع کر دیا گیا۔ اس طرح ان اوقات میں مطلق نفل سے منع کرنے میں اور بھی کئی حکمتیں پنہاں ہیں، لیکن یہ بات بہرحال ہے کہ منع کا مقصد مفاسد کو دور کرنا اور مصالح کا حصول ہوتا ہے اور مصلحت کو کسی طور ضائع نہیں کیا جاتا۔

لیکن جس نماز کا کوئی سبب ہو ان میں سے کچھ ایسی ہیں کہ اگر ان اوقات میں انھیں منع کر دیا جائے تو مصلحت مفقود ہو جائے گی۔ لوگ عبادت و نیکی اور اجر و ثواب کے حصول سے محروم رہ جائیں گے جس کا تدارک ممکن نہیں

ہوتا، مثلاً: مسجد میں داخل ہوتے وقت دو رکعات ادا کرنا جنھیں تحیۃ المسجد بھی کہا جاتا ہے، سجدۂ تلاوت، سورج گرہن کی نماز وغیرہ وغیرہ اور ان سبھی نمازوں میں سے کچھ ایسی ہیں کہ اگر انھیں ممنوعہ اوقات میں منع کر دیا جائے تو مصلحت میں نقص واقع ہو جائے گا، مثلاً: طواف کی دو رکعات، بالخصوص باہر سے آنے والوں کے لیے جو ان ایام میں طواف سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

ایک یہ نکتہ بھی ہے کہ اسباب والی نمازوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کو وقت کی وجہ سے نہیں، بلکہ سبب کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے، بلاسبب عمومی نفل کے عکس۔ لہٰذا منع اور نہی کی مفسدت بلاسبب نوافل میں پیدا ہوتی ہے، سبب والی نماز میں نہیں، اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ ''اپنی نماز کے لیے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کا وقت تلاش نہ کرو۔''[1]

جہاں تک فجر اور عصر کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے کا مسئلہ ہے تو اس کے متعلق ابن المنذر کا قول ہے: ''فجر اور عصر کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے جائز ہونے پر اجماع ہے۔ ان تینوں انواع میں امام احمد کا متفقہ قول ہے کہ ان کو ممنوعہ اوقات میں کرنا جائز ہے، کیوں کہ ان کے جواز پر خاص احادیث دلالت کرتی ہیں، تاہم اسباب والی جتنی نمازیں ہیں انھیں وہ منع کہتے ہیں۔ ان کے بہت سے اصحاب، امام مالک اور امام ابوحنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے، لیکن ابوحنیفہ فجر اور عصر کے بعد سجدۂ تلاوت کے جواز کے قائل ہیں۔ امام احمد سے دوسری روایت تمام اسباب والی نمازوں کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے پیروکار ابو الخطاب نے اسی کو ترجیح دی ہے اور امام شافعی کا مذہب بھی یہی ہے اور اس باب میں یہ مذہب درج ذیل چند وجوہ کی بنا پر راجح ہے:

1 تحیۃ المسجد کا حکم صحیح بخاری و مسلم میں ثابت ہے۔ حضرت ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إذا دَخَلَ أَحَدُكُمُ المَسجِدَ فَليَركَعْ رَكعَتَينِ، قَبلَ أَنْ يَّجلِسَ»[2] ''تم میں سے کوئی ایک جب مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے، دو رکعات پڑھے۔'' حضرت قتادہ ہی سے مروی ہے کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے درمیان تشریف فرما تھے تو میں بھی بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھنے سے کس نے منع کیا؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تو بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ایک جب مسجد میں داخل ہو تو اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک دو رکعات نہ پڑھ لے۔''[3] اس حدیث میں بیٹھنے سے پہلے دو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٨)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٤)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١٤)

رکعات پڑھنے کا حکم ہے اور دو رکعات پڑھے بغیر بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ ہر وقت میں محفوظ عموم کے ساتھ عام ہے، اس سے کوئی صورت بھی نص یا اجماع سے مخصوص نہیں کی گئی، حالانکہ منع کی حدیث کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عام نہیں۔ محفوظ عام مخصوص عام پر مقدم ہوتا ہے اور منع کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عام نہیں اور جس میں حکم دیا گیا ہے اس کا عموم باقی ہے اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سے کسی صورت کو نکالا اور خاص کیا گیا ہو۔

2 صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ''ایک آدمی آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا: کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھڑا ہو اور نماز پڑھ۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''دو رکعات پڑھ۔''[2] مسلم میں ہے کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب جمعے کے دن تم میں سے کوئی مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعات مختصراً پڑھ لے۔'' امام احمد نے اس حدیث سے دلیل لی ہے اور ان سے کوئی اختلاف منقول نہیں۔ امام شافعی، اسحاق، ابو ثور اور ابن المنذر جیسے دیگر فقہائے حدیث نے بھی اسی کو لیا ہے۔ حسن اور مکحول وغیرہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بہت سے علما اس حدیث سے واقف نہیں تھے، اس لیے انھوں نے خطبہ کے دوران میں نماز سے منع کیا، کیوں کہ یہ وقت منع ہے۔ یہ قول شریح، نخعی اور ابن سیرین سے مروی ہے اور یہی امام ابو حنیفہ، اللیث، مالک اور سفیان ثوری کا مذہب ہے۔ ان فقہا کا منع کے وقت تحیۃ المسجد سے منع کرنا قیاس پر مبنی ہے۔ امام خطبہ دے رہا ہو تو اس وقت نماز زیادہ سختی سے منع ہے، بلکہ ہر وہ کام منع ہے جو خطبہ سننے سے غافل کر سکتا ہو۔ اگر کوئی ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے یہ کہہ دے: خاموش ہو جا! تو اس نے بھی لغو کام کیا، لیکن اگر ان تمام امور کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران میں آنے والے شخص کو تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم دیا ہے تو دیگر ممنوعہ اوقات میں اس کا حکم اولیٰ اور زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

مزید برآں جمعہ کے دوران میں جنازہ پڑھا جاتا ہے نہ طواف کیا جاتا ہے اور نہ طواف کی دو رکعات ہی پڑھی جاتی ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اس دوران میں ممانعت زیادہ تاکیدی اور سختی پر مبنی ہے اور فجر اور عصر کے وقت کی نسبت زیادہ تنگ اور محدود ہے۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دوران میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم دیا ہے تو دیگر ممنوعہ اوقات میں اس کا حکم اولیٰ ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٧٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٥)

3 اس ممانعت سے بعض نمازوں کا استثنا ثابت ہے، مثلاً: موجودہ عصر، فجر کی سنتیں، قضا نماز، طواف کی سنتیں، مسجد میں اگر جماعت ہو رہی ہو اور آدمی گھر سے نماز پڑھ کر آیا ہو تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو کر اس نماز کو دہرائے۔ ممنوعہ اوقات میں نماز کی ممنوع اور جائز و غیر ممنوع میں تقسیم ثابت ہے، لہٰذا ان دونوں کا فرق مدِنظر رکھنا لازمی ہے۔ اگر صاحبِ شریعت دو متماثل نمازوں میں فرق نہ کرے اور ایک کی اجازت دے، دوسرے کی اجازت نہ دے اور ان میں فرق ہو تو جس کی اجازت دی ہے اس کا یا تو سبب ہوگا تو سببی نماز پڑھنے والا سبب کی وجہ سے پڑھے گا، مطلق نفل نہیں۔ اگر وہ سببی نماز نہ پڑھے تو اس نماز کی مصلحت اور اجر سے محروم ہو جائے گا، مثلاً کوئی شخص اس وقت مسجد میں داخل ہو اور تحیۃ المسجد نہ پڑھے تو اس کے اجر سے محروم ہو جائے گا۔ سورج گرہن لگا ہو اور اس کی وجہ سے نمازِ کسوف نہ پڑھے تو اس کے اجر سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح دیگر سبب والی نمازوں کو اگر نہ پڑھے تو ان کے اجر سے محروم ہو جائے گا۔ یا وہ فرق کوئی اور چیز ہوگی۔ اگر تو وہ فرق پہلا ہی ہو تو سبب والی اور سبب کے بغیر والی نماز میں فرق سے مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اگر وہ فرق کوئی اور ہے تو بتایا جائے وہ فرق کیا ہے۔ اگر فرق معلوم نہیں تو اس کو جانے بغیر کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا جائز نہیں۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ منع کی احادیث عام ہیں، ہم ان کو عموم ہی پر محمول کریں گے، جب تک کوئی دلیل نہ مل جائے جو خاص کرتی ہو، اس کے جواب میں کہا جائے گا: یہ بات تب بنتی ہے جب اس مخصوص عام کی معارض دیگر محفوظ عمومات نہ ہوں جو اس سے زیادہ قوی ہوں۔ جب اس عموم کی کچھ صورتوں کو مخصوص کر دیا گیا تو فرق کو لازم کرنے والے مخصص کا ہونا لازم ٹھہرا۔

4 پھر مسلمانوں کو طواف کی رکعات کی نسبت تحیۃ المسجد کی حاجت عام رہتی ہے، کیوں کہ تحیۃ المسجد کے عکس طواف کی رکعات کو موخر کرنا ممکن ہوتا ہے، نیز اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد آئے جو ممنوعہ اوقات میں شمار ہوتا ہو اور وہ تحیۃ المسجد پڑھے بغیر بیٹھ جائے وہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا اور اگر گناہ گار نہیں تو کم از کم اس کی مصلحت اور ثواب سے ضرور محروم ہوگا، لیکن اگر کھڑا ہی رہے یا مسجد میں داخل ہی نہ ہو تو یہ بھی ایک بہت بڑا شر اور برائی ہے۔

کچھ لوگ فجر کی سنتیں گھر میں پڑھ کر مسجد میں آتے ہیں۔ ان میں سے جو ممنوعہ اوقات میں تحیۃ المسجد پڑھنا مکروہ سمجھتے ہیں وہ مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اقامت ہوتی ہے تو جماعت کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس مبارک وقت میں مسجد میں داخل ہونے اور اس میں اللہ کا ذکر کرنے سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔ کچھ دوسرے تحیۃ المسجد پڑھے بغیر ہی مسجد میں بیٹھ جاتے ہیں تو وہ آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کے مرتکب

ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہر وقت مسجد میں داخل ہوتے وقت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم ہے۔ مسلمان آپ ﷺ کے زمانے میں دن کے دونوں حصوں میں مسجد میں داخل ہوتے تھے۔ اگر ان کو تحیۃ المسجد سے منع کیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا ہے، لیکن آپ ﷺ نے تو اثنائے خطبہ میں آنے والے کو بھی دو رکعات پڑھ کر بیٹھنے کا حکم دیا تو کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دیگر ممنوعہ اوقات میں بھی اس کا حکم موجود ہے؟

5 ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ منع شرک کا دروازہ اور ذریعہ روکنے کی خاطر تھا اور جو اسباب والی نمازیں ہوتی ہیں ان میں کوئی راجح مصلحت ہوتی ہے۔ فاعل اس کو کسی سبب کی وجہ ہی سے کرتا ہے، مطلقاً اور بلا سبب نہیں کرتا، لہٰذا اس میں ان کے ساتھ مشابہت کا امکان نہیں رہتا۔

6 صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ظہر کی دو رکعات کی قضا عصر کے بعد دی، یہ ممنوع وقت میں نفل کی قضا تھی، حالانکہ غیر ممنوعہ وقت میں ان کی قضا دینے کا امکان موجود تھا، تو وہ نوافل کہ جن کو ممنوعہ اوقات میں اگر نہ پڑھا جائے تو ان کا فائدہ اور مصلحت جاتا رہے گا، ان کا جائز ہونا ایسے نوافل سے زیادہ قابلِ جواز ہے جن کو ممنوعہ وقت کے علاوہ بھی پڑھا جا سکتا ہو۔ اس پر مستزاد آپ ﷺ نے ان کو پڑھنے کا حکم بھی دیا ہو جیسے تحیۃ المسجد اور نمازِ کسوف ہے۔ امام احمد کے ایک پیروکار ابو محمد مقدسی اور ان کے کئی ہم خیالوں کا خیال ہے کہ موکد سنتوں کی قضا عصر کے بعد دینا جائز ہے، لیکن دیگر ممنوعہ اوقات میں نہیں۔ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ امام احمد کا مذہب تو یہ ہے کہ فجر کے بعد فجر کی سنتوں کی قضا دینا جائز ہے۔ قصہ مختصر! اگر ظہر کی سنتوں کی قضا عصر کے بعد جائز ہے تو فجر کی سنتوں کی قضا فجر کے بعد زیادہ حق رکھتی ہے، کیوں کہ یہ اس کا وقت ہے، اگر ان کو طلوعِ آفتاب تک موخر رکھنا جائز ہے تو پھر انھیں غروبِ آفتاب تک موخر رکھنا بھی جائز ہوگا۔[1]

قصداً ممنوعہ وقت میں نماز کا حکم

سوال کسی شخص نے کسی کو ممنوع وقت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو کہا: اس وقت رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، پھر اس نے اس کی کراہت سے متعلق ذکر ہونے والی حدیث بھی سنائی مگر اس نے کہا: میں نے اسے نہیں سنا، میں جیسے چاہوں نماز پڑھوں، اس شخص پر کیا عائد ہوتا ہے؟

جواب ایسی نفل نماز جس کا کوئی سبب نہ ہو اسے فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے اور عصر کے بعد سورج غروب ہونے تک پڑھنا منع ہے۔ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نماز پڑھنے والے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۱۷۸۔۱۹۷)

کو تعزیری سزا دیتے تھے، جو شخص یہ کام کرتا ہے اس کو خلیفہ راشد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے تعزیری سزا دی جا سکتی ہے، پھر اس کے منع پر دلالت کرنے والی احادیث متواتر ہیں۔

وہ نماز جس کا کوئی سبب ہو، مثلاً تحیۃ المسجد، چاند و سورج گرہن کی نماز، اس میں اختلاف اور تاویل ہے، لہٰذا جو شخص ایسی نماز پڑھے جس میں اجتہاد کی گنجایش اور جواز ہو اس کو سزا نہیں دی جائے گی، مگر جو انسان صحیح احادیث کو بلا دلیل رد کرتا ہے، منع کرنے والے کو برا بھلا کہتا ہے اور اس سے کہتا ہے: میں جیسے چاہوں نماز پڑھوں، تجھے کیا؟ یہ شخص تعزیری سزا کا سزاوار ہے، کیوں کہ انسان کو اس طرح نماز پڑھنی چاہیے جیسے شریعت نے اس کو مقرر و مشروع کیا ہے، ایسے نہیں، جیسے اس کی اپنی مرضی ہو۔ واللہ أعلم [1]

ممنوع وقت میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم

سوال جو شخص ممنوع وقت میں مسجد میں داخل ہو، کیا اس کے لیے تحیۃ المسجد (سلامِ مسجد) کی نماز پڑھنی جائز ہے؟

جواب الحمد للہ. اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں اور وہ دونوں امام احمد سے روایات ہیں:

① نہ پڑھے، یہ ابو حنیفہ اور مالک کا قول ہے۔

② پڑھے، یہ شافعی کا قول ہے اور یہی زیادہ ظاہر و باہر ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتّٰى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ» [2]

''جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو تو دو رکعات پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔''

یہ حکم تمام اوقات کو عام اور شامل ہے اور یہ معلوم نہیں کہ آپ ﷺ نے اس میں سے کسی صورت کو خاص کیا ہو۔ جہاں تک طلوعِ فجر کے بعد نماز کی ممانعت کا ذکر ہے تو اس سے آپ ﷺ نے متعدد صورتوں کو خاص کیا ہے، مثلاً: چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا، طواف کی دو رکعات، محلے کے امام کے ساتھ شامل ہونے کی صورت میں نماز دہرانا وغیرہ۔ عام محفوظ، عام مخصوص پر مقدم ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا بھی انہی دو ممنوعہ اوقات کی طرح منع ہے، بلکہ ان سے زیادہ شدت کے ساتھ منع ہے، مگر صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''جب تم میں سے کوئی ایک مسجد میں داخل ہو اور امام منبر پر ہو تو وہ دو رکعات پڑھے بنا نہ بیٹھے۔'' اگر اس وقت میں تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم ہے جو وقت منع ہے تو دوسرے وقت میں اس نماز کے پڑھنے کا جائز ہونا زیادہ مناسب ہے۔ اس مسئلے میں امام احمد کے قول میں اختلاف نہیں ہوا، کیوں کہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۲۱۸)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۱۱۰) صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۱٤)

صحیح سنت سے یہ ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ اور مالک کے مذہب کے عکس کہ ان دونوں اوقات میں ان کا مذہب منع کا ہے، کیوں کہ یہ صحیح سنت ان تک پہنچی نہیں۔ واللہ أعلم[1]

موجودہ زمانے میں باجماعت نماز کی فرضیت اور نفاق کا وجود

سوال ایک شخص کہتا ہے: باجماعت نماز فرض نہیں۔ یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور آپ ﷺ کے ساتھ واجب تھی۔ اس کو بتایا گیا کہ کچھ علما کہتے ہیں جو جماعت چھوڑتا ہے اور گھر ہی میں نماز پڑھتا ہے وہ منافق ہے۔ اس نے جواب دیا: جو یہ بات کہتا ہے وہی منافق ہے۔ آج کوئی منافق نہیں پایا جاتا۔ نفاق صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا، آج زندیق کہا جاتا ہے، منافق نہیں۔ کیا اس آدمی کی باتیں درست ہیں؟

جواب الحمد للہ. یہ کہنا کہ باجماعت نماز صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور آپ ﷺ کے ساتھ ہی فرض تھی، ایسی بات ہے جو ائمہ اربعہ اور تمام ائمہ دین کے اقوال و آراء کے خلاف ہے۔ ہمارے علم میں کوئی ایسا امام نہیں جس نے یہ بات کہی ہو، البتہ کچھ علما خاص طور پر نمازِ خوف کے بارے میں یہ بات کہتے ہیں کہ یہ صرف نبی ﷺ کے ساتھ پڑھی جاتی تھی، کسی اور کے ساتھ نہیں، لیکن جمہور ائمہ اس کے خلاف ہیں۔

جہاں تک معروف جماعت کی بات ہے تو تمام ائمہ اس قائل کے خلاف ہیں، البتہ کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں پر اور بعد کے زمانوں میں دیگر اماموں کے پیچھے پڑھنے والوں پر فرضِ عین ہے۔ کچھ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں پر اور بعد کے زمانوں میں دیگر اماموں کے پیچھے پڑھنے والوں پر فرضِ کفایہ ہے۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ ﷺ کے زمانے میں بھی اور بعد کے زمانوں میں بھی سنتِ موکدہ ہے، لیکن یہ بات کہ اس کی فرضیت صرف آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھی، ائمہ اسلام کے اقوال کے خلاف ہے اور میں نے کسی عالم کو یہ بات کہتے ہوئے نہیں سنا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کی امامت میں بھی جماعت قائم کی جاتی تھی اور آپ ﷺ کے علاوہ قبائل کے ائمہ کی امامت میں بھی۔ انصار کے ہر قبیلے میں ایک ایک مسجد ہوتی تھی اور ان کا باقاعدہ امام ہوتا تھا جس کے پیچھے وہ نماز پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اہلِ قبا کو نماز پڑھاتے، غسان بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، اسی طرح دیگر ائمہ۔ البتہ جمعہ صرف آپ ﷺ کی مسجد میں ہوتا تھا، جو یہ کہتا ہے کہ تمام صحابہ پر جس طرح آپ کے پیچھے جمعہ پڑھنا فرض تھا، اسی طرح تمام نمازیں بھی باجماعت آپ کے پیچھے پڑھنا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱۹/۲۳)

ضروری ہیں، اس کی یہ رائے واضح طور پر غلط ہے اور تواتر اور اجماع سے اس کا خراب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

جو جماعت یا جمعہ سے پیچھے رہ جاتا ہے اس کو اسی صورت میں علی الاطلاق منافق کہا جا سکتا ہے جب وہ کسی شرعی تاویل اور عذر کے بغیر یہ کام کرتا ہو۔ اگر وہ کسی شرعی عذر کی وجہ سے پیچھے رہے یا یہ سمجھتا ہو کہ جماعت اس پر فرض نہیں تو اس عقیدے کی وجہ سے اگر جماعت میں شریک نہیں ہوتا تو یہ مومن ہو سکتا ہے، منافق نہیں، چاہے وہ اپنے اس عقیدے میں صحیح ہو یا غلط۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''اللہ نے اپنے نبی کے لیے سنن ہدیٰ (ہدایت کے راستے) متعین کیے ہیں۔ اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے جس طرح یہ پیچھے رہنے والا اپنے گھر میں پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے۔ اگر تم نے اپنے نبی کی سنت چھوڑ دی تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا ہے اس سے صرف وہ پیچھے رہتا تھا جس کا منافق ہونا ہر کسی کو معلوم تھا۔''[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نماز سے وہی پیچھے رہتا تھا جس کا منافق ہونا ہر کسی کو معلوم تھا۔ یہ جماعت کو فرض قرار دینے والوں کی دلیل ہے، کیوں کہ اگر اس کو صرف وہ منافق چھوڑتے تھے جن کا نفاق مشہور تھا تو معلوم ہوا یہ فرض تھی۔ اگر یہ قیام اللیل، سوموار اور جمعرات کے روزے اور ظہر و مغرب کی سنتوں کی طرح مستحب ہوتی تو کبھی کبھی مومن بھی اس کو چھوڑ دیتا اور اس کو ترک کرنے پر اس کو منافق نہ کہا جاتا۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز، زکات اور روزے کی فرضیت سے آگاہ کیا تو اس نے کہا: اس کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں اس میں کچھ اضافہ کروں گا نہ کمی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اس نے سچ کہا ہے تو یہ کامیاب ہو گیا ہے۔''[2] اگر کوئی انسان فرائض ادا کر کے کامیاب ہو سکتا ہے، چاہے مستحبات پر عمل نہ کرے اور جب ان کے ہاں جماعت سے صرف نامزد منافق پیچھے رہتا تھا تو معلوم ہوا یہ ان کے نزدیک فرائض میں شامل تھی، کیوں کہ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مفہوم جانتے تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان میں کوئی اختلاف تھا نہ شبہہ۔ علم اور ایمان غالب تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر جماعت کی تاکید فرمائی وہ اس سے آگاہ تھے، اس لیے اس کی فرضیت جانتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا: میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی کو نماز پڑھانے کا حکم دوں اور ان لوگوں کے گھروں کو ان کے سمیت جلا دوں۔''[3] آگ کے ساتھ جلانا یا تو کفر کی وجہ سے ہوتا ہے یا کسی بہت بڑے گناہ کی وجہ سے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

ایک روایت میں ہے:

«لَوْ لَا مَا فِي الْبُيُوْتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالذُّرِّيَّةِ »[1]

''اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے۔''

ابو داود کی ایک روایت میں ہے: ''پھر میں ان مردوں کی طرف جاؤں جو اپنے گھروں میں نماز پڑھتے ہیں تو ان کے گھروں کو آگ کے ساتھ جلا دوں۔''[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس وعید کی خبر تھی، اس لیے مومن اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرتے تھے اور منافق جماعت سے پیچھے رہتے تھے، مگر آج جب علم و ایمان کم ہو گیا ہے اور عام لوگ تو ایک طرف رہے بہت سے علما بھی کئی سنتوں سے واقف نہیں، اس لیے آج ایسے لوگ بھی جماعت چھوڑ دیتے ہیں جو نامزد منافق نہیں، تاہم اگر یہ منافق نہیں تو منافقوں کے مشابہ ضرور ہیں، کیوں کہ یہ سنتِ موکدہ کے تارک ہیں۔ اگر یہ اس پر اصرار کریں تو ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی، بلکہ ایک قول میں ان سے لڑائی کی جائے گی۔ یہ اس کے نزدیک ہے جو اس کے وجوب کا قائل نہیں۔ جو وجوب کا قائل ہے اس کے نزدیک تارکِ جماعت سے لڑائی کی جائے گی اور چھوڑنے پر اصرار کرنے والوں کو فاسق قرار دیا جائے گا۔ جب ان پر وجوب، قتال اور فاسق قرار دینے کی حجت قائم ہو جائے، جس طرح باغیوں سے شبہہ زائل کرنے اور شکوہ دور کرنے کے بعد جنگ کی جاتی ہے، بلکہ علما کسی وقت فرض چھوڑنے والے یا کوئی حرام کام کرنے والے کو سزا بھی دیتے ہیں، چاہے وہ تاویل کی وجہ سے ایسا کرتا ہو، جس طرح امام مالک، شافعی اور احمد نے تاویل کی بنا پر نبیذ پینے والے سے متعلق کہا ہے کہ اس کو کوڑے لگائے جائیں، چاہے وہ تاویل ہی کرتا ہو۔ شافعی اس وجہ سے اس کی گواہی مسترد نہیں کرتے، جب کہ مالک اس وجہ سے اس کی گواہی بھی مسترد کرتے ہیں۔ امام احمد سے دو روایات ہیں۔ اسی طرح تاویل کرنے والے باغی جب لڑنے پر آمادہ ہوں جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ جمل و صفین سے جنگ کی تھی، وہ ائمہ اربعہ کے نزدیک اس بغاوت کی وجہ سے فاسق قرار نہیں دیے جائیں گے، کیوں کہ وہ اس میں تاویل کرنے والے تھے، گو ان سے لڑائی کی گئی۔ اسی طرح ہر وہ کام جس کا حرام ہونا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، وہ کسی عالم سے مخفی رہ سکتا ہے، اس کو اس کی حرمت اور اس سے متعلق وارد ہونے والی وعید اور سخت الفاظ بتائے جائیں گے۔ اگر تاویل کرنے والا معذور کوئی عالم ہو تو اس کے لیے وعید نہیں،، بلکہ اللہ اس کو بخش دیتے ہیں کیوں کہ اس نے اجتہاد کیا مگر غلطی کھائی۔ قرآن کریم میں ہے:

---

[1] مسند أحمد (۲/۳۶۷) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۲/۱۶۸) میں کہا ہے کہ اس کا راوی ابو معشر ضعیف ہے، ضعیف الترغیب والترھیب (۱/۵۸)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۵۴۸، ۵۴۹) صحیح الترغیب والترھیب (۱/۱۰۳)

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں۔''

صحیح مسلم میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا: "قد فعلت" ''میں نے ایسا کر دیا ہے۔''[1]

اسی طرح نماز، زکات اور حج وغیرہ جیسی دیگر عبادات کے وہ واجبات جن میں ائمہ کا اختلاف ہو۔ جب کوئی انسان فرائض کی ادائی اور محرمات سے اجتناب کے ساتھ ان میں سے کوئی واجب تاویل کی بنا پر چھوڑے تو وہ اس وجہ سے فاسق ہوتا ہے نہ گناہ گار، بلکہ اللہ اس کی خطا بخش دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جو اس کے وجوب کا قائل ہو وہ اس کا وجوب بیان کرے اور علم کے بیان اور سنت کے اظہار کے لیے اس مسئلے میں مذکور دلائل پیش کرے، تاکہ سنت کے خلاف قول کا غلط ہونا اور سنت کے موافق قول کا صحیح ہونا واضح ہو جائے، اگرچہ مخالفت کرنے والا مجتہد معذور ہو، بلکہ مجتہد اللہ کے پرہیز گار اولیا، نیک بندوں اور ائمہ دین سے ہوتا ہے۔ اللہ اس کی خطا، بلکہ خطا سے بڑھ کر گناہ بھی بخش دیتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی بھی خطا اور گناہ سے معصوم نہیں، خواہ وہ کوئی صدیق ہو یا شہید یا صالح، وہ اللہ کے اس فرمان کے مصداق ہیں:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ١٦]

''یہی وہ لوگ ہیں کہ ہم ان سے وہ سب سے اچھے عمل قبول کرتے ہیں جو انھوں نے کیے اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں، جنت والوں میں، سچے وعدے کے مطابق جو ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔''

جماعت کا واجب ہونا بھی اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ کتاب و سنت اور اجماعِ صحابہ میں اس کے دلائل واضح اور ظاہر ہیں۔ ان دلائل کو جان لینے اور ان سے متعلق اقوال کا علم ہو جانے کے بعد کوئی بھی انصاف پسند عالم اس کے وجوب میں شک نہیں کر سکتا، لیکن علما کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ وعید جمعہ کے ساتھ خاص ہے، مگر صریح نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا جماعت کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ کچھ کا گمان ہے کہ (جلانے کی) سزا خاص طور پر نفاق کی وجہ سے تھی، ترکِ جماعت کی وجہ سے نہیں۔ یہ بھی غلطی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کسی کو دل میں نفاق چھپا کر رکھنے کی وجہ سے سزا نہیں دیتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کسی کو ظاہری طور پر کوئی واجب چھوڑنے یا کوئی حرام کام کرنے پر سزا دیتے تھے، نیز اگر ترکِ جماعت نفاق کی علامت ہے تو دلیل مدلول کو مستلزم ہے جس سے معلوم ہوا جو بھی جماعت چھوڑتا ہے وہ منافق ہے، یہ وجوبِ جماعت کی دلیل ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٦)

مزید یہ کہ صحیح میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے ترکِ جماعت کی رخصت مانگی، آپ ﷺ نے پوچھا: «هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ؟» ''کیا تو اذان سنتا ہے؟'' انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر حاضر ہو۔''[1] سنن کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا أَجِدُ لَكَ رُخْصَةً»[2] ''میں تیرے لیے رخصت نہیں پاتا۔''

اور ابن امِ مکتوم بالاتفاق مومن تھے، یہ وہ نابینا صحابی تھے، جن کا ذکر سورت عبس میں ہوا ہے، ارشاد ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ ۝ أَن جَآءَهُ ٱلْأَعْمَىٰ ﴾ [العبس: ۱، ۲]

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اس لیے کہ اس کے پاس اندھا آیا۔''

نبی اکرم ﷺ ان کو مدینہ میں اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ یہ موذنِ رسول تھے۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کو جماعت سے پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا ایمان معلوم ہو یہ اس پر واجب ہے۔

جو شخص اس حدیث کے منسوخ یا اجماع کے مخالف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس کا دعویٰ غلط ہے۔ جماعت کے وجوب کے قائلین کے نزدیک جس طرح اندھے پر جمعہ واجب ہے، اسی طرح جماعت بھی واجب ہے۔ اگر اندھے کے لیے جماعت میں شریک ہونے کے لیے نکلنا ممکن ہو اگرچہ کوئی اس کا سہارا نہ بھی ہو تو اس کے لیے جماعت واجب ہے، کیوں کہ اندھا اپنے کاموں کے لیے کسی سہارے یا رہنما کے بغیر بازار وغیرہ میں آجا سکتا ہے تو جماعت میں شرکت کے لیے بھی حاضر ہو۔

فصل: کیا نفاق صرف عہدِ نبوی کے ساتھ خاص تھا؟

رہی قائل کی یہ بات کہ ''آج کوئی منافق موجود نہیں، نفاق صرف عہدِ نبوی میں تھا۔'' بالاجماع مبنی بر خطا ہے، بلکہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کہا تھا کہ ''آج نفاق عہدِ نبوی سے بھی زیادہ ہے۔'' دل میں کفر چھپا کر رکھنا اور ظاہر میں اسلام کا اظہار کرنا نفاق ہے جو ہر زمانے میں موجود ہوتا ہے۔ اگر رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہونے، آپ کی نشانیوں کو دیکھ لینے اور آپ کی باتیں سننے کے باوجود منافق موجود تھے تو آپ ﷺ کے بعد ان کا موجود ہونا کیونکر بعید ہوسکتا ہے۔ قائل کا یہ کہنا کہ ''آج زندیق کہا جائے گا منافق نہیں'' اس کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ لفظ زندیق عربی کا لفظ نہیں، بلکہ مُعرب ہے اور فارسی سے آیا ہے، اس لیے یہ نہ رسول اللہ ﷺ کی زبان پر وارد ہوا ہے نہ صحابہ کی زبان سے نکلا ہے۔ زندیق، جس کی توبہ قبول ہونے میں فقہا کا اختلاف ہے، اس منافق کے معنی میں ہے جو اسلام کا اظہار کرتا ہے اور دل میں کفر چھپاتا ہے، اس لیے علما کا کہنا ہے: زندیق

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٥٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

منافق ہی ہے، اس کی توبہ قبول کرنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی وغیرہ جن کے نزدیک زندیق کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے دور کے منافقوں کا ظاہر قبول کرتے تھے اور ان کے باطن اللہ کے سپرد کر دیتے تھے۔ اسی طرح چاروں فقہی مذاہب کے کئی علما اور دیگر مذاہب کے علما نے زندیق کے احکام پر بحث کی ہے، مثلاً: اس کی وراثت کا مسئلہ اور جو عبادات اس نے کی ان کے اعادے کے وجوب کا مسئلہ اور اس طرح کے دیگر مسائل۔ ان سب نے ان مسائل میں رسول اللہ ﷺ کے ان احکام سے استدلال کیا ہے جو آپ ﷺ نے اپنے زمانے کے منافقوں کے بارے میں دیے، کیوں کہ ائمہ کے علم میں زندیق منافق ہی ہے، کیوں کہ ہر زندیق دل میں کفر چھپاتا اور ظاہر میں اسلام کا اظہار کرتا ہے۔ یہ منافق ہی ہوتا ہے۔ اس کو منافق ہی کہا جاتا ہے اور یہ قرآن میں مذکور منافقوں میں شامل ہے۔ جو اس کا انکار کرے اس سے توبہ کروائی جائے۔ اگر توبہ کرے تو صحیح، ورنہ قتل کر دیا جائے۔

لفظ نفاق اور لفظ کفر وغیرہما کبھی کفر اور نفاق کی کچھ شاخوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ نفاق اصغر ہے جس کا ڈر صحابہ کو بھی محسوس ہوتا تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت حنظلہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملے تو کہا: ''نافق حنظلة، نافق حنظلة'' ''حنظلہ منافق ہو گیا، حنظلہ منافق ہو گیا۔''[1]

امام بخاری نے ابن ابی لیلیٰ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پایا، ان میں سے ہر کوئی اپنے اندر نفاق کا ڈر محسوس کرتا تھا۔[2]

حافظ جعفر بن محمد فریابی نے ''صفة النفاق وذم المنافقين'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں بہت سی احادیث اور آثار نقل کیے ہیں، یہاں انھیں نقل کرنے کی گنجایش نہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے ان آیات:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٤]

''اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔''

﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٧] ''تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

﴿ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٥] ''تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

کی تفسیر میں کہا ہے:

''كفر دون كفر، وفسوق دون فسوق، وظلم دون ظلم''[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٠)

[2] صحيح البخاري (٢٦/١)

[3] تفسير الطبري (١٦٥/٦، ١٦٦)

''کفر، کفر میں، فسوق، فسوق میں اور ظلم، ظلم میں فرق ہوتا ہے۔''

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس امت میں شرک چیونٹی کی آہٹ سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے، اور ریا شرک ہے۔''[1] صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں میں دو گروہ ایسے ہیں جن میں کفر ہے: ① نسبوں میں طعن و تنقید کرنا ② ستاروں کے ذریعے بارش طلب کرنا۔''[2] ایک حدیث میں ہے: ''اپنے باپوں سے بے رغبتی نہ کرو، تمھارا اپنے باپوں سے بے رغبتی کرنا تمھارا کفر ہے۔''[3] اس کے نظائر بے شمار ہیں۔ واللہ أعلم[4]

مسجد سے متصل دکان میں اور گھر میں اکیلے تاخیر سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال ایک آدمی کی دکان مسجد کے اتنا قریب ہے کہ مسجد اور مکان میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ اس میں خرید و فروخت کرتا ہے۔ جب اقامت کہہ دی جائے اور جماعت تیار ہو تو کیا وہ دکان میں اکیلا نماز پڑھ سکتا اور جماعت چھوڑ سکتا ہے؟ نیز کیا باجماعت نماز کو موخر کر کے گھر میں پڑھنا جائز ہے؟ مثلاً کہے: میں عشا کی نماز آدھی رات تک موخر کر کے گھر میں پڑھتا ہوں؟

جواب وہ بالاتفاق اکیلا دکان میں نماز نہ پڑھے، بلکہ اس کو بھی باجماعت نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ جماعت چھوڑ کر اکیلے نماز پڑھنے کی ترغیب یا تو رافضی دیتے ہیں یا گمراہ صوفی وغیرہما۔ جماعت و جمعہ کا التزام تو اہلِ سنت والجماعت کی سب سے بڑی علامت ہے۔

شریعت میں باجماعت نماز کا حکم موکد ہے، بلکہ یہ واجب ہے۔ صحیح میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میں نے ارادہ کیا کہ نماز کا حکم دوں اور اس کو کھڑا کر دیا جائے، پھر اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لوں، ان کے پاس ایندھن کی گٹھڑیاں ہوں، پھر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے تو ان کے گھروں کو آگ کے ساتھ جلا دوں۔''[5] ایک روایت میں ہے: ''اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے۔''[6] اس حدیث میں آپ ﷺ نے بیان کیا ہے کہ آپ صرف بچوں اور عورتوں کی وجہ سے جماعت سے پیچھے رہنے والوں کے گھر جلانے سے رک گئے۔

---

① مسند أحمد (٤٠٣/٤) السلسلة الضعيفة (٣٧٥٥)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٢)

④ جامع المسائل (١٢٧/٤۔١٣٥)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

⑥ مسند أحمد (٣٦٧/٢) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (١٦٨/٢) میں کہا ہے کہ اس کا راوی ابو معشر ضعیف ہے، ضعيف الترغيب والترهيب (٥٨/١)

صحیح میں ہے کہ نابینا رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میرا گھر بڑا دور ہے اور میرا رہبر میرے مطابق نہیں چلتا۔ کیا آپ میرے لیے گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت دیکھتے ہیں؟ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تو اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اذان کے جواب میں حاضر ہو۔''[1] ایک روایت میں ہے: آپ ﷺ نے کہا: کیا تو اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تیرے لیے کوئی رخصت نہیں پاتا۔''

صحیح میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: اللہ نے اپنے نبی کے لیے ہدایت کی سنتیں (راہیں) متعین کر دی ہیں۔ مساجد میں یہ پانچوں نمازیں جن کے لیے اذان دی جاتی ہے، ان ہدایت کی راہوں، یعنی سننِ ہدیٰ میں سے ہیں۔ اگر تم بھی اس پیچھے رہنے والے اور اپنے گھر میں نماز پڑھنے والے کی طرح اپنے گھروں میں نماز پڑھو گے تو تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے؟ اگر تم نے اپنے نبی کی سنت چھوڑ دی تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ میں اپنے ساتھیوں کو دیکھتا ہوں، اس سے صرف وہ منافق پیچھے رہتا تھا جس کا نفاق ہر کسی کو معلوم تھا۔[2]

اگر کسی انسان سے نماز اور اس کے واجبات میں اکیلا پن ظاہر ہوتا ہو تو وہ اس وجہ سے ایسی سخت سزا کا مستحق ہے جو اس کو واجبات ادا کرنے اور شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا خوگر بنا دے۔ وہ جب کوئی ایسا دعویٰ کرے جو دین کے خلاف ظاہر ہوتا ہو تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے: ''یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے، یہ منافق کی نماز ہے۔ ان میں سے ایک سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان آتا ہے تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مارتا ہے اور اس میں بہت تھوڑا اللہ کا ذکر کرتا ہے۔''[3]

جو کہتا ہے کہ میں عشا کی نماز آدھی رات تک موخر کر کے پڑھتا ہوں، اس کو اس عمل پر برقرار نہ رکھا جائے، بلکہ سزا دی جائے، تا آنکہ وہ نماز کو اس کے وقتِ اختیار میں پڑھنا شروع کر دے۔ نمازِ عصر کو سورج زرد ہو جانے کے بعد اور عشا کی نماز کو طاقت رکھنے کے باوجود آدھی رات کے بعد پڑھنا جائز نہیں۔ یہ صرف اس کے لیے جائز ہے جس کے لیے وقتِ اختیار میں نماز پڑھنا ممکن نہ ہو، مثلاً: حائضہ اس وقت پاک ہو یا پاگل ہوش میں آجائے، یا سویا ہوا بیدار ہو یا کافر مسلمان ہو، وغیرہ وغیرہ۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٣)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٢)

[4] جامع المسائل (١٣٦/٤-١٣٨)

مسجد کے چوکیدار کے لیے باجماعت نماز اور جمعے میں عدمِ شرکت کی رخصت

سوال کیا جمعہ اور نمازِ پنج گانہ کے اوقات میں مسجد وغیرہ کی چوکیداری پر مامور شخص کے لیے جمعہ میں اور باجماعت نماز میں شریک نہ ہونے کی رخصت ہے؟

جواب اگر مسجد وغیرہ کی چوکیداری کے لیے ایسا شخص میسر نہ ہو جس پر جمعہ فرض نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں اگر کسی کو چوکیداری کے لیے جمعہ ترک کرنا پڑے، حالانکہ وہ جمعہ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ عذر آڑے آجائے تو اس کا یہ عذر قبول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مدینہ میں کچھ ایسے لوگ بھی رہ جانے والے ہیں جو تمھارے ہر سفر اور مہم میں شریک تھے۔'' صحابہ نے پوچھا: وہ مدینہ میں رہ کر کس طرح شریک ہوئے؟ فرمایا: ''ان کو عذر نے مدینہ میں روکے رکھا۔''[1]

اس جیسی صورت میں چوکیداری کے لیے کچھ افراد کی باری مقرر کر دینا مسنون طریقہ ہے، کیونکہ بیت المال کے اونٹوں کو چروانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باری مقرر تھی اور ظاہر ہے کہ بعض اوقات اس شخص کا جمعہ یا جماعت چھوٹ جاتی ہے۔ لہٰذا جس شخص کی باری مقرر ہو وہ اپنی ذمے داری ادا کرے اور اس کی نیت کے قدر اس کو اجر ملے گا، واللہ أعلم.[2]

باجماعت نماز اور اکیلے کی نماز کا حکم

سوال کیا باجماعت نماز فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ یا سنت؟ اگر فرضِ عین ہے اور کوئی شخص کسی عذر کے بغیر اکیلا نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز صحیح ہوگی یا نہیں، نیز اس میں علما کے اقوال و دلائل کیا ہیں اور راجح قول کیا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. علما کا اتفاق ہے کہ باجماعت نماز کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور یہ عظیم ترین، عبادت، بندگی اور اسلام کے عظیم شعائر میں داخل ہے۔ اس کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باجماعت نماز اکیلے کی نماز سے پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔''[3] حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی پچیس درجات کا ذکر ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ستائیس درجات کا ذکر ہے، یہ تینوں احادیث ہی صحیح بخاری میں مروی ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١١)

[2] جامع المسائل (٤٨٨/٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٤٩)

جو صوفی یا زاہد یہ سمجھتا ہے کہ اس کا خلوت یا جلوت میں اکیلے نماز پڑھنا افضل ہے، وہ راہِ صواب سے ہٹا ہوا اور غلط ہے۔ اس سے بھی زیادہ گمراہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک باجماعت نماز صرف امام معصوم کے پیچھے ہو سکتی ہے۔ اسی خیال اور رائے کی وجہ سے ان لوگوں نے مساجد سے جمعہ اور جماعت کو ختم کر کے ویران کر دیا ہوا ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا تھا اور ستم ظریفی تو یہ ہے کہ انھوں نے مساجد کو خرافات و بدعات سے آباد کر دیا ہے جن سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا تھا۔ یہ لوگ ایسے لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں جو رحمان کی عبادت سے منع اور اصنام کی پوجا کا حکم دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے نماز و ذکر وغیرہ کو مساجد میں پڑھنے کا حکم اتارا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ﴾

[البقرة: ١١٤]

’’اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟‘‘

نیز فرمایا:

﴿ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ [البقرة: ١٨٧]

’’اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔‘‘

مزید فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

’’کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو۔‘‘

ایک جگہ فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝١٧ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾

[التوبة: ١٧، ١٨]

’’مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور

زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

نیز فرمایا:

﴿ فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿٣٦﴾ رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [النور: ٣٦،٣٧]

''ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ وہ بلند کیے جائیں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان میں صبح و شام۔ وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

فرمایا:

﴿ وَمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ﴾ [الحج: ٤٠]

''اور (مسلمانوں کی) مسجدیں، جن میں اللہ کا ذکر بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔''

جہاں تک درگاہوں اور قبروں پر بنے ہوئے درباروں میں نماز اور دعا کرنے کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا حکم نہیں جس کے موجب ان جگہوں کو نماز، دعا یا اس طرح کی عبادات کے لیے خاص کیا جائے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ ان درگاہوں میں نماز پڑھنا مساجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ متواتر احادیث میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ پانچوں نمازوں کو مساجد میں قائم کرنا سب سے عظیم عبادت اور سب سے بڑی نیکی ہے، جو شخص خلوت میں اور اکیلے نماز پڑھنے کو باجماعت نمازِ پنجگانہ ادا کرنے پر ترجیح دیتا ہے یا درباروں میں نماز پڑھنے اور دعا کرنے کو مساجد میں نماز پڑھنے اور دعا کرنے سے افضل جانتا ہے وہ اپنی گردن سے اسلام کا ہار اتار کر وہ راستہ چلتا ہے جو اہلِ ایمان کا نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ﴾ [النساء: ١١٥]

''اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں

کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔"

باجماعت نماز کا حکم:

لیکن اس اہمیت کے بعد علما کا اس کے فرضِ عین، فرضِ کفایہ یا سنتِ موکدہ ہونے میں اختلاف ہے۔

ایک قول کے مطابق باجماعت نماز صرف سنتِ موکدہ ہے۔ یہ اصحابِ ابوحنیفہ کا معروف مذہب، اکثر اصحابِ مالک اور اصحابِ شافعی کا قول اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ فرضِ کفایہ ہے۔ یہ شافعی مذہب میں راجح قول ہے، البتہ کچھ مالکیوں کا قول ہے اور حنبلیوں میں بھی ایک رائے ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ فرضِ عین ہے۔ امام احمد سے صریحاً یہی قول منقول ہے، جب کہ دیگر ائمہ سلف اور فقہائے حدیث بھی اسی طرف مائل ہیں، لیکن اس بات میں ان کا اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص عذر کے بغیر اکیلے نماز پڑھ لے تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی یا نہیں ہو گی؟ اس میں دو اقوال ہیں:

1. پہلا قول یہ ہے کہ ایسے شخص کی نماز صحیح نہیں ہو گی۔ یہ امام احمد سے قدیم اصحاب کے گروہ کا قول اور مسلک ہے۔ قاضی ابو یعلیٰ اور ابن عقیل وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ سلف کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے اور ابن حزم وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

2. دوسرا قول یہ ہے کہ اس کی نماز درست ہو گی، لیکن ترکِ جماعت کا گناہ ہو گا۔ یہ امام احمد سے منقول ہے اور ان کے اکثر اصحاب کا قول ہے جنھوں نے وجوبِ جماعت کی نفی کی ہے۔ انھوں نے اس بات سے دلیل لی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں صرف اکیلے آدمی کی نماز میں باجماعت نماز کی فضیلت بیان کی ہے، کیوں کہ اگر جماعت واجب ہوتی تو اکیلے کی نماز صحیح نہ ہوتی اور باجماعت نماز کی فضیلت بے محل ہوتی، جن احادیث میں یہ ذکر ہوا ہے کہ آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کے گھر جلانے کا ارادہ کیا تھا، یہ علما ان احادیث کو تارکِ جمعہ پر یا ان منافقوں پر محمول کرتے ہیں جو اپنے نفاق کے ہوتے ہوئے باجماعت نماز سے پیچھے رہتے تھے، یعنی آپ ﷺ نے ان کے گھروں کو جلانے کا ارادہ ان کے نفاق کی وجہ سے کیا تھا۔ گھر میں نماز پڑھنے کی وجہ سے اور جماعت چھوڑنے کی وجہ سے نہیں۔

جو علما جماعت کو فرض قرار دیتے ہیں وہ قرآن و حدیث اور آثارِ صحابہ سے استدلال کرتے ہیں:

فرضیتِ جماعت کے قرآن سے دلائل:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

1 ﴿ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ ﴾ [النساء: ۱۰۲]

''اور جب تو ان میں موجود ہو، پس ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ کھڑی ہو۔''

اس آیت میں دو دلیلیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ اسلام کو آپ ﷺ کے ساتھ نمازِ خوف بھی باجماعت پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ حالتِ خوف میں اس کے واجب ہونے کی دلیل ہے جو حالتِ امن میں اس کے واجب ہونے پر بالاولیٰ دلالت کرتی ہے۔

استدلال کی دوسری صورت یہ ہے کہ نمازِ خوف باجماعت پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں ایسے امور بھی جائز قرار دیے ہیں جو عذر کے بغیر جائز نہیں ہوتے، مثلاً: قبلہ سے بے رخ ہو جانا اور بہت زیادہ حرکت جو بالاتفاق عذر کے بغیر ناجائز ہیں۔ اسی طرح سلام سے پہلے ہی امام سے جدا ہو جانا، امام کی پیروی سے پیچھے رہنا، مثلاً جب دشمن سامنے ہو اور امام رکوع میں جائے تو پچھلی صف کھڑی رہتی ہے۔ جمہور فقہا کا کہنا ہے کہ اگر یہ سارے کام بلاعذر کیے جائیں تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اگر جماعت واجب نہ ہوتی، بلکہ مستحب ہوتی تو گویا مقتدی نے ایسے امور کا التزام کیا جو ممنوع اور نماز لغو و باطل کر دینے والے ہیں اور اس نے صرف مستحب کام کو کرنے کی خاطر نماز میں متابعتِ امام کو چھوڑ دیا جو واجب ہے، حالانکہ اس کے لیے اکیلے مکمل نماز پڑھنا ممکن تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت فرض ہے۔

2 ﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴾ [البقرة: ۴۳]

''اور نماز قائم کرو اور زکات دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

یہاں یا تو فعل کے ساتھ مل جانا مراد ہے جو باجماعت نماز ہے یا اس سے وہ بات مراد ہے جو اس آیت میں مذکور ہے: ﴿ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴾ ''اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔'' اگر دوسری بات مراد ہو اور کوئی یہ کہے: ''صلوا مع المصلین'' ''نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو۔'' روزہ رکھنے والوں کے ساتھ روزہ رکھو، رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو تو ان دونوں میں فرق نہیں ہوگا، لیکن آیت کا سیاق کہ جس میں خصوصیت کے ساتھ رکوع کا ذکر کیا گیا ہے، جماعت پر دلالت کرتا ہے۔ اگر کوئی کہے: نماز تو ساری جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے تو پھر خصوصاً رکوع کا کیا ذکر اور اس سے جماعت کیسے ثابت ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ رکوع کا ذکر اس

لیے کیا کہ رکوع پا لینے سے نماز مل جاتی ہے جو رکوع پا لیتا ہے وہ سجدہ بھی پا لیتا ہے، اس لیے اس رکن کا حکم ہوا جس رکوع کے ساتھ رکعت حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام سے کہا:

﴿يَمَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّكِعِينَ﴾ [آل عمران: ٤٣]

''اپنے رب کی فرماں بردار بن اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

اگر مریم علیہا السلام سے یہ کہا جاتا: ''اقنتي مع القانتين'' ''قیام کرنے والوں کے ساتھ قیام کر۔'' تو اس سے قیام کو پانے کا واجب ہونا ثابت ہوتا، لیکن اگر یہ کہا جاتا: ''اسجدي مع الساجدين'' ''سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ کر۔'' تو اس سے رکوع کو پانے کا واجب ہونا ثابت نہ ہوتا، لیکن ''اركعي مع الراكعين'' ''رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔'' کے عکس کہ اس سے رکوع اور رکوع کے بعد کے ارکان پانے کا حکم ہے، اس سے پہلے کے ارکان کو پانے کا نہیں اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔

حدیث سے دلائل:

جماعت کی فرضیت پر دلالت کرنے والی احادیث معروف و مشہور ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے ارادہ کیا کہ کسی کو نماز کے لیے اقامت کا کہوں اور کسی شخص کو امام مقرر کر کے نماز پڑھانے کا حکم دوں اور خود ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے، پھر میں ان کے گھروں کو آگ کے ساتھ جلا دوں۔'' (متفق علیہ)[1] اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں کو جلانے کا ارادہ کیا جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ ایک حدیث میں اس طرح ذکر ہوا ہے: ''منافقوں پر دو نمازیں سب سے زیادہ بھاری ہیں۔ یہ نمازِ فجر اور عشا ہے۔ اگر ان کو معلوم ہوتا کہ ان دونوں میں کیا اجر ملتا ہے تو وہ ضرور ان میں شریک ہوتے، چاہے انھیں گھٹنوں کے بل ہی چل کر آنا پڑتا، میں نے ارادہ کیا کہ نماز کھڑی کی جائے .....''[2]

مسند وغیرہ میں ہے: ''اگر گھروں میں عورتیں اور اولاد نہ ہوتی تو میں نماز کھڑی کرنے کا حکم دیتا .....''[3]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے گھروں کو جلانے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارادے پر عمل کرنے سے گھر میں موجود عورتوں اور بچوں نے روکا جن پر جماعت میں حاضر ہونا فرض نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥١)

[3] مسند أحمد (٣٦٧/٢) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٤٥/٢) میں کہا ہے کہ اسے امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کا راوی ابو معشر ضعیف ہے۔

اگر آپ ﷺ ان کے باوجود ان کے گھروں کو جلا دیتے تو اس کے نتیجے میں وہ لوگ بھی مارے جاتے جن کو مارنا جائز نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے حاملہ عورت پر اس وقت تک حد نہیں لگائی جا سکتی جب تک وہ بچے کو جنم نہ دے لے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [الفتح: ۲۵]

''اور اگر کچھ مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں جنھیں تم نہیں جانتے تھے (اگر یہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے تو تم پر لاعلمی میں ان کی وجہ سے عیب لگ جائے گا (تو ان پر حملہ کر دیا جاتا) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے، اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، سزا دیتے، دردناک سزا۔''

جو علما اس حدیث کو تارکِ جمعہ پر محمول کرتے ہیں، ان کا استدلال سیاقِ حدیث سے کمزور ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ حدیث میں نمازِ عشا اور نمازِ فجر کا ذکر ہے، اس کے بعد ان لوگوں کے گھر جلانے کے ارادے کا بیان ہے جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے، پھر جو علما اس حدیث کو تارکِ جماعت کی سزا پر نہیں نفاق کی سزا پر محمول کرتے ہیں ان کا یہ موقف کئی وجوہ سے کمزور ہے:

1. رسول اللہ ﷺ منافقوں سے سرزد ہونے والے ظاہری اعمال ہی پر سزا دیتے تھے، یعنی ظاہری طور پر کسی فرض کو ترک کرنے یا کسی حرام کام کے ارتکاب پر سزا دیتے تھے، باطنی امور پر نہیں۔ اگر جماعت کو ترک کرنے میں فرض کو ترک کرنا لازم نہ ہوتا تو آپ ان کے گھر جلانے کا ارادہ نہ کرتے۔
2. آپ نے سزا کو نماز میں غیر حاضری کے ساتھ مربوط کیا ہے، اس لیے حکم کو اسی سبب کے ساتھ مربوط و منسلک کیا جانا چاہیے جو مذکور ہو۔
3. آگے چل کر حضرت ابن ام مکتوم کی حدیث ذکر ہو گی جنھوں نے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت طلب کی تھی، لیکن آپ نے ان کو اجازت نہ دی۔ حضرت ابن ام مکتوم صاحبِ ایمان اور بہترین اہلِ ایمان میں شمار ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کی تعریف کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ طیبہ سے باہر جاتے تو انھیں اپنا نائب امام مقرر کر جاتے تھے اور وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اذان بھی دیا کرتے تھے۔
4. اگر ایسا ہی سمجھ لیا جائے جب بھی یہ اس کے وجوب ہی کی دلیل ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن

مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: جو یہ چاہتا ہے کہ کل اللہ کے پاس جب حاضرِ ملاقات ہو تو مسلمان ہو، اس کو چاہیے کہ جب اذان ہو تو نمازِ پنج گانہ ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لیے سننِ ہدایت مقرر کیں۔ یہ پانچ نمازیں جو مسجد میں ادا کی جاتی ہیں اور ان کے لیے اذان دی جاتی ہے۔ یہ سننِ ہدایت سے تعلق رکھتی ہیں، اگر تم ان کو گھر میں پڑھ لو جس طرح یہ پیچھے رہنے والا پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے اور اگر تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ میں اپنے دوستوں (صحابہ کرام) کو دیکھتا ہوں، اس وقت با جماعت نماز سے وہی پیچھے رہتا جس کا نفاق معلوم ہوتا۔ آدمی دو آدمیوں کے درمیان گھسیٹ کر مسجد میں لایا جاتا اور صف میں کھڑا کر دیا جاتا۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ اس وقت با جماعت نماز سے وہی شخص پیچھے رہتا جو سکہ بند منافق ہوتا اور ہر کسی کو معلوم ہوتا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ ایمان کے ہاں جماعت وجوب کا حکم ہی رکھتی تھی اور ان کو یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے معلوم ہوئی تھی، کیوں کہ اگر یہ ان کے نزدیک قیام اللیل، فرائض کے ساتھ نوافل اور چاشت کی نماز وغیرہ کی طرح مستحب ہی ہوتی تو پھر کوئی جماعت کو اختیار کر لیتا اور کوئی ایمان کے باوجود چھوڑ دیتا۔

جس طرح حدیث میں مذکور ہے کہ ایک دیہاتی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بارے میں پوچھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بتایا تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس پر کچھ اضافہ نہ کروں گا نہ اس میں کوئی کمی ہی کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اس نے سچ کہا تو نجات پا گیا۔''[2]

یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ ہر وہ حکم جس سے منافق پیچھے رہتے تھے وہ فرضِ عین ہی ہوتا تھا، مثلاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو غزوۂ تبوک کے لیے جانے کا حکم دیا اور عذر والوں کے سوا کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہ دی، لیکن بہت سے منافق اس میں شریک نہ ہوئے، جب آپ اس غزوے سے واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی حقیقت آپ کے سامنے کھول دی اور آپ کو بتایا کہ ان لوگوں کا کوئی عذر نہیں تھا، یہ جھوٹے عذر تراش کر پیچھے رہے، لیکن وہ لوگ جو ایمان کے باوجود عذر کے بغیر پیچھے رہے ان کو ترکِ تعلقات کی سزا دی گئی، حتی کہ ان کو اپنی بیویوں سے بھی تعلق ختم کر دینے کا حکم دے دیا گیا، تا آنکہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، اگر کوئی اعتراض کرے کہ تم لوگ اس حدیث کی بنا پر جماعت سے پیچھے رہنے والوں کو منافق کہتے ہو اور اگر ان کے گھروں میں بچے اور عورتیں نہ ہوں تو تم ان کے گھروں کو جلانے کو بھی جائز سمجھتے ہو؟ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگرچہ بہت سے افعال

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٥٤)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٩٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١)

فرض ہوتے ہیں، لیکن اگر کوئی ان کی تاویل کرتا ہو تو اس کی وجہ سے اس سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ آج بہت سے اہلِ ایمان ایسے ہیں جو اس کو فرض نہیں سمجھتے اور تاویل کرتے ہوئے ترک کر دیتے ہیں، لیکن نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تاویل کی گنجایش نہیں ہوتی تھی۔ آپ براہِ راست ان پر کوئی حکم فرض کرتے تھے۔ نیز صحیح و سنن میں یہ حدیث ہے کہ ''ایک نابینا صحابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے اس کو اجازت دے دی۔ جب وہ واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے اس کو بلایا اور اس سے پوچھا: کیا تو اذان سنتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر جواب دے۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ اگر وہ اذان سنتا ہے تو پھر اس کے جواب میں مسجد میں حاضر ہو۔ اسی بنا پر امام احمد نے ایسے شخص کے لیے مسجد میں آ کر باجماعت نماز ادا کرنا فرض کہا ہے جو اذان سنتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''عبداللہ بن ام مکتوم نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا گھر دور ہے، مدینہ میں کیڑے مکوڑے بے شمار ہیں، میرا رہنما بھی ہر وقت میسر نہیں ہوتا۔ کیا آپ میرے لیے کوئی رخصت دیکھتے ہیں کہ میں گھر میں نماز پڑھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو اذان سنتا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: میں تیرے لیے رخصت نہیں دیکھتا۔''[2] یہ مومن ہونے کے باوجود جماعت کے فرض ہونے کی صریح دلیل ہے۔

رہی یہ دلیل کہ باجماعت نماز اکیلے کی نماز سے افضل ہی تو ہے، تو اس کے دو جواب ہیں جو اس مفروضے کی بنا پر ہیں کہ بلاعذر جماعت کے بغیر نماز ہو جاتی ہے۔ جو علما بلاعذر اکیلے کی نماز کو صحیح کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جماعت واجب تو ہے لیکن نماز کے صحیح ہونے کے لیے شرط نہیں۔ جس طرح وقت ہے کہ اگر کوئی شخص عصر کی نماز سورج کے زرد ہونے تک موخر کر دے تو وہ گناہ گار تو ہوگا، لیکن اس کی نماز صحیح ہوگی، بلکہ اگر وہ اتنا موخر کر دے کہ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے محض ایک ہی رکعت پڑھ سکتا ہو، جس طرح صحیح بخاری میں ہے کہ ''جس نے عصر کی ایک رکعت پا لی اس نے عصر کی نماز پا لی۔''[3] تو تفصیل کا یہ مطلب نہیں کہ مفضول (جس کا درجہ کم ہو) وہ جائز ہی نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

[الجمعة: ٩]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٥٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧٢) مسند أحمد (٤٢٣/٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

''جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔''

اس آیت میں جمعہ کے لیے تگ و دو واجب ہے اور بیع حرام، ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ﴾ [النور: ۳۰]

''مومن مردوں سے کہہ دے اپنی کچھ نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔''

جن علما کا یہ کہنا ہے کہ اکیلے کی نماز عذر کے بغیر نہیں ہوتی۔ انھوں نے وجوبِ جماعت کے دلائل ہی سے استدلال کیا ہے۔ ان کے نزدیک نماز میں جس عمل کا وجوب ثابت ہو جائے وہ نماز کی درستی کے لیے شرط ہوتا ہے جس طرح دیگر تمام واجبات میں یہی قاعدہ ہے۔

جہاں تک وقت کی بات ہے تو اس کی تلافی ممکن نہیں ہوتی، اگر وقت گزر جائے تو اس میں نماز ممکن نہیں ہوتی، اس کی مثال جمعے کا چھوٹ جانا ہے اور جماعت کا چھوٹ جانا بھی کہ جس کا استدراک ممکن نہیں ہوتا۔ اگر فرض جمعہ چھوٹ جائے تو آدمی گناہ گار ہوتا ہے اور وہ ظہر کی نماز پڑھتا ہے، کیوں کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اس طرح جو اس فرض جماعت سے محروم ہو جاتا ہے جس میں حاضر ہونا فرض تھا اور کوئی اور جماعت بھی نہیں ہوتی تو وہ اکیلے ہی نماز پڑھتا ہے۔ اب اس کی نماز ہو جائے گی، کیوں کہ کسی اور جماعت کا امکان نہیں رہتا، جس طرح جس کا جمعہ چھوٹ جاتا ہے اور وہ ظہر کی نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کی ظہر کی نماز ہو جاتی ہے۔

جماعت کی فرضیت جمعہ کی فرضیت سے بڑھ کر نہیں۔ اس شخص کی بات ہو رہی ہے جو گھر میں کسی عذر کے بغیر نماز پڑھتا ہے، پھر جماعت کھڑی ہوتی ہے تو ان کے نزدیک اس کو جماعت میں حاضر ہونا چاہیے، جس طرح کوئی شخص جمعے سے پہلے ہی ظہر کی نماز پڑھ لے تو اس کو جمعہ میں حاضر ہونا چاہیے۔ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی دلیل لی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اذان سنے، پھر بلا عذر اس کا جواب نہ دے (یعنی مسجد میں آ کر نماز نہ پڑھے) اس کی نماز نہیں۔''[1] اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے سوا نہیں۔''[2] یہ حضرت عائشہ، علی، ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا موقف ہے۔ دار قطنی نے اس کو مرفوع بھی روایت کیا ہے اور کچھ حفاظِ حدیث نے اس کو تقویت بھی پہنچائی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٣٠٠)

[2] سنن الدار قطني، رقم الحديث (١٥٥٢)

ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں جہاں بھی حرف نفی ''لا'' کسی شرعی فعل کے لیے استعمال ہوا ہے اس میں کسی واجب کو ترک کرنا ہی مراد ہوتا ہے، مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا: « لا صَلاةَ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرآنِ »[1] ''فاتحہ کے بغیر نماز نہیں۔'' « لا إِيمانَ لِمَنْ لَا أَمانَةَ لَهُ »[2] ''جس کی امانت نہیں اس کا ایمان نہیں۔'' وغیرہ۔

دوسرے علما نے باجماعت نماز کی فضیلت کی حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ معذور پر محمول ہے، مثلاً: کوئی شخص مریض ہو، یہ اسی طرح کی بات ہے جو آپ ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی ہے: ''بیٹھ کر نماز پڑھنے والوں کی نماز کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز کے نصف ہے اور لیٹ کر نماز پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے نصف ہے۔''[3] جو اکیلے کی نماز پر باجماعت نماز کی فضیلت ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز پر فضیلت ہے اور یہ معلوم ہے کہ قیام فرض نماز میں واجب ہے نفل میں نہیں، اسی طرح جماعت بھی فرض نماز میں واجب ہے نفل میں نہیں۔

قصہ مختصر! اس حدیث میں علما کا اختلاف ہے، کیا اس سے صاحبِ عذر مراد ہے یا غیر معذور؟

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس سے غیر معذور مراد ہے، کیوں کہ معذور کا اجر پورا ہوتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ بیمار ہو جائے یا مسافر ہو تو اس کا وہی عمل لکھا جاتا ہے جو وہ صحت کی حالت میں یا حضر کی حالت میں کیا کرتا تھا۔''[4] ان کا کہنا ہے کہ اگر مسافر اور مریض کو ان کے اعمال کا اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا صحت اور کی حالت میں ملتا ہے تو پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو اس کو آدھا اجر ملے۔ ان علما نے نفل نماز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز کو بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز پر فضیلت پر محمول کیا ہے، کیوں کہ فرض میں قیام واجب ہے۔ یہ موقف اختیار کرنے والوں پر لازم آتا ہے کہ وہ تندرست آدمی کے پہلو کے بل لیٹ کر نفلی نماز پڑھنے کو جائز کہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جو بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نسبت آدھا ثواب ملتا ہے۔''[5] بعض متاخرین شافعی اور حنبلی علما تو اس دلیل پر قیاس کر کے بغیر عذر لیٹ کر نفل پڑھنا جائز سمجھتے تھے، کیوں کہ وہ اس کو مریض پر محمول کرنا ناممکن خیال کرتے تھے، جیسے ابھی ذکر ہوا ہے، لیکن اکثر علما نے اس کی مخالفت کی ہے اور انھوں نے اس کو

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

[2] مسند أحمد (١٣٥/٣) صحيح الجامع (٧١٧٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٣٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٥)

بدعت قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تک ایسا سنا نہیں گیا کہ کسی نے عذر کے بغیر جان بوجھ کر نفل نماز لیٹ کر پڑھی ہو۔ اگر یہ جائز ہوتا تو کسی مسلمان نے یہ عمل آنحضرت ﷺ کے زمانے میں یا بعد کے زمانے میں کیا ہوتا یا خود رسول اللہ ﷺ ہی نے کیا ہوتا، خواہ ایک دو مرتبہ ہی۔ پھر ان لوگوں میں سے جو جماعت کی فرضیت کے قائل نہیں۔ ان کے موقف میں تضاد بھی نظر آتا ہے، کیوں کہ انھوں نے اس حدیث سے کہ ''باجماعت نماز اکیلے کی نماز پر پچیس درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔''[1] غیر معذور مراد لیا ہے۔ ان سے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں غیر معذور کے لیے تفضیل کیوں ہے اور وہاں معذور کے لیے تفضیل؟ کیا یہ تناقض نہیں؟!

وہ علما جو جماعت کو فرض کہتے ہیں اور تفضیل کو معذور پر محمول کرتے ہیں وہ اپنی اس دلیل پر قیاس کرتے ہوئے اس حدیث میں بلاعذر جماعت کے بغیر نماز پڑھنے والے کی نماز کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں پاتے۔ جس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ ''جب بندہ بیمار ہو جائے یا مسافر ہو تو اس کا وہی عمل لکھا جاتا ہے جو وہ صحت اور اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا۔'' وہ اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس میں تو یہ دلیل ہے کہ اس شخص کی نیت اور عذر کی بنا پر اس عمل کو کرنے سے قاصر ہونے کی وجہ سے اس کے برابر اجر لکھا جاتا ہے، جتنا اجر صحت اور اقامت کی حالت میں لکھا جاتا ہے۔ یہ شرعی قاعدہ ہے کہ جو انسان کسی عمل کو کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہو پھر وہ اپنی استطاعت کے مطابق جس طرح اس عمل کو کر سکتا ہو کرتا ہو وہ اس کام کو کرنے والا ہوتا ہے، لہٰذا یہ شخص جو صحت اور اقامت میں جو عمل کرتا تھا اس کا عزم یہی ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو کرے پھر وہ بیماری اور سفر کی وجہ سے جس حد تک اس کو کر سکتا ہے کرتا ہے اس لیے وہ اس کو کرنے والا ہی شمار کیا جاتا ہے، جس طرح سنن میں یہ حدیث مروی ہے: ''ایک شخص اپنے گھر سے وضو کرتا ہے، پھر باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جاتا ہے، لیکن نماز ہو چکی ہوتی ہے، تو اس کو باجماعت نماز کا ہی ثواب ملتا ہے۔'' صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ ہیں کہ تم جس بھی وادی کا سفر کرتے ہو اور جس بھی منزل کی طرف گامزن ہوتے ہو وہ تمھارے ساتھ ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں ہو کر کس طرح ہمارے ساتھ ہوتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ مدینہ ہی میں ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کو عذر نے روکے رکھا ہوتا ہے۔''[2] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ﴾ [النساء: ٩٥]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٥١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩١١)

''ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔''

تو ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ معذور کو صحیح اور تندرست شخص کا ثواب ملتا ہے۔ اگر اس کو کرنا اس کی نیت ہو اور وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کو کرے بھی۔ اس کا یہ تقاضا نہیں کہ اس کا وہی عمل تندرست کے عمل جیسا ہو، حدیث میں کوئی ایسا اشارہ نہیں کہ مریض کی وہی نماز اجر میں تندرست کی نماز کے برابر ہو اور نہ یہ بات ہی ملتی ہے کہ اکیلے معذور کی وہی نماز باجماعت نماز پڑھنے والے کے برابر ہے۔ اس میں تو صرف یہ مذکور ہے کہ اس کا وہ عمل لکھا جاتا جو وہ صحت اور اقامت کی حالت میں کرتا تھا، بالکل اسی طرح جو شخص گھر سے باجماعت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جائے، لیکن اس کو جماعت نہ ملے تو اس کے لیے باجماعت نماز کا اجر لکھ دیا جاتا ہے، نیز ہر معذور کا عمل تندرست کے عمل کے برابر نہیں لکھا جاتا، یہ اس وقت لکھا جاتا ہے جب وہ تندرست شخص کی طرح ہی عمل کرنے کا ارادہ رکھے، لیکن کر نہ سکے۔ حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باجماعت اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنا کسی شخص کا معمول ہو، پھر وہ بیماری کی وجہ سے یا سفر کی وجہ سے اس کو چھوڑ دے تو اس کے لیے وہی لکھا جاتا ہے جو وہ صحت اور اقامت کی حالت میں کیا کرتا تھا، اسی طرح جو شخص حضر میں کھڑے ہو کر نفل پڑھتا ہے، لیکن سفر میں اپنی سواری پر بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے تو اس کے لیے حضر میں کھڑے ہو کر نفل پڑھنے کا ثواب ہی لکھا جاتا ہے، لیکن جس شخص کی عادت باجماعت نماز پڑھنا نہ ہو یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا نہ ہو تو وہ اکیلا نماز پڑھے یا بیٹھ کر نماز پڑھے، اس کو تندرست اور مقیم کے اجر کے برابر اجر نہیں ملتا۔

جو اس حدیث کو غیر معذور پر محمول کرتا ہے اس کو لازم آتا ہے کہ وہ یہی بات کہے، لیکن یہ باطل قول ہے جس پر کوئی نص، قیاس یا قول دلالت نہیں کرتا، نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا باجماعت نماز کو اکیلے کی نماز پر فضیلت دینا اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی نماز کو بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کو لیٹ کر نماز پڑھنے والے کی نماز پر فضیلت دینا اس ایک بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی نماز اس سے افضل ہے اور اس کی اس سے، لیکن دونوں کی نمازیں ہی صحیح ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ مفضول (کم درجے کی نماز) صحیح ہے یا نہیں؟ تو حدیث اس پر نفی یا اثبات کی صورت میں کوئی دلالت نہیں کرتی اور نہ یہ حدیث اصل میں نماز کے صحیح یا فاسد ہونے کے متعلق ہے، بلکہ قیام وقعود کے وجوب وسقوط اور جماعت کے وجوب وسقوط کا بیان دیگر دلائل سے ماخوذ ہے، اس طرح اس معذور کا پورا عمل لکھا جانا یا نہ لکھا جانا بھی اس حدیث میں بیان نہیں ہوا، بلکہ دیگر دلائل سے ماخوذ ہے، تاہم دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل ثواب اس کے لیے ہے جو صحت و اقامت کی حالت میں فاضل عمل کرتا تھا، ہر ایک کے لیے نہیں۔

نماز میں قیام کی فرضیت دیگر دلائل سے ثابت ہے، مثلاً: آپ ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے کہا تھا: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے تو بیٹھ کر اور اگر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے تو پہلو کے بل۔''[1]

بہر کیف احادیث سے بیٹھ کر بھی نوافل پڑھنا ثابت ہے۔ اسی طرح دیگر دلائل سے جماعت کی فرضیت بھی ثابت ہوتی ہے تو ہر حدیث کو اس کا حق دیا جائے۔ ان میں کوئی تضاد اور تعارض نہیں، تعارض و تضاد کا گمان وہی شخص کر سکتا ہے جو ان کو ایسے مفہوم پر محمول کرے جو ان کا مدلول نہیں اور اپنی بدفکری اور دور از کار تاویل کے ذریعے ان کو ان کا حق نہ دے۔ واللہ أعلم[2]

کسی کی پیروی میں ترکِ جماعت کی عادت بنانا

سوال اس شخص کا کیا حکم ہے جس کو باجماعت نماز ترک کرنے میں نمونہ بنایا جاتا ہے؟

جواب جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ مسلمانوں کی مساجد کے بجائے اس کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے، وہ باتفاق اہلِ اسلام گمراہ اور بدعتی ہے، کیوں باجماعت نماز یا فرضِ عین ہے یا فرضِ کفایہ۔

کتاب و سنت کے دلائل اس کے فرضِ عین ہونے کے ہیں۔ جو اس کو سنتِ موکدہ کہتا ہے واجب نہیں کہتا، وہ بھی اس کو ہمیشہ چھوڑنے والے کی مذمت ہی کرتا ہے، بلکہ جو شخص جماعت تو ایک طرف رہی، ہمیشہ سنتیں چھوڑ دیتا ہے، اہلِ علم کے ہاں اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جاتی تو جو جماعت چھوڑنے پر ہیشگی کرے، اس کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟! سب مسلمانوں کا اتفاق ہے ایسے شخص کو باجماعت نماز پڑھنے کا حکم دیا جائے اور جماعت چھوڑنے پر ملامت کی جائے۔ اگر معمول کی سنتیں چھوڑنے پر ہیشگی کرنے والا فیصلہ کرنے، گواہی دینے اور فتویٰ صادر کرنے کے مناصب کی اہلیت نہیں رکھتا تو جو جماعت ہی چھوڑ دے جو اسلام کا سب سے بڑا شعار ہے، اس کا کیا؟ واللہ أعلم[3]

پہلی اختتام پذیر ہوتی جماعت اور دوسری کے امکان کی صورت میں مطلوب عمل

سوال ایک آدمی جماعت کے آخر میں آکر شامل ہوتا ہے اور اس جماعت کے بعد ایک دوسری جماعت کا امکان بھی ہے تو کیا وہ اس پہلی جماعت میں شامل ہو جائے جو اختتام پذیر ہے یا دوسری جماعت کا انتظار کرے اور اس کے ساتھ شامل ہو؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٢٢٢-٢٣٩)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٢٥٣)

جواب اگر وہ اس حالت میں جماعت پاتا ہے کہ وہ ایک رکعت سے کم ہو تو پھر یہ اس قاعدے پر مبنی ہے کہ جب نماز ایک رکعت سے کم رہتی ہو اور وہ اس میں شامل ہو جائے تو کیا وہ جماعت پانے والا سمجھا جائے گا یا جماعت پانے کے لیے ایک پوری رکعت کا ملنا ضروری ہے؟ یہاں حنفی مذہب یہ ہے کہ وہ جماعت کو پانے والا سمجھا جائے گا اور اس قیاس کی بنیاد پر اگر کوئی جمعے کی نماز میں قعدے میں شریک ہو تو وہ جمعہ پانے والا سمجھا جائے گا اور جمعہ کے طور ہی پر اسے مکمل کرے گا، لیکن امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص جب تک پوری ایک رکعت نہ پا لے وہ جمعہ یا جماعت پانے والا متصور نہیں ہوگا۔ یہ چھے جگہیں ہیں جہاں اس طرح کے مسائل سامنے آ سکتے ہیں:

① جمعہ ② جماعت ③ مسافر کا مقیم کی نماز سے کچھ پا لینا۔

④ وقت نکلنے سے پہلے پہلے نماز کا کچھ حصہ پا لینا، مثلاً: طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ فجر کا کچھ حصہ پا لینا۔

⑤ آخری وقت کو پانا، مثلاً: کسی نماز کے آخری وقت میں کوئی عورت ماہواری سے پاک ہو جائے، یا کسی پاگل کا پاگل پن ختم ہو جائے اور اس کو ہوش آ جائے یا کوئی کافر اسلام قبول کرے۔

⑥ اول وقت سے کچھ پا لینا، یہ اس کے نزدیک ہے جو اول وقت میں نماز کے وجوب کا قائل ہے، تاہم اس میں اختلاف ہے۔

جمعہ کے متعلق شافعی اور حنبلی مذہب، مالکی مذہب کے ہم نوا ہے، کیوں کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تھا۔ ان ائمہ کے نزدیک جس شخص کو جمعے کی ایک رکعت مل جائے وہ دوسری رکعت ملا کر جمعہ کی نماز مکمل کرے، لیکن جو تشہد میں شامل ہو سکے وہ چار رکعات پڑھے، دیگر مسائل میں شافعی اور حنبلی فقہا کے ہاں اختلاف ہے، لیکن ان کے اکثر اصحاب ان مسائل میں حنفی مذہب کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن زیادہ ظاہر اور راجح مذہب امام مالک ہی کا ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»[1] ''جس نے نماز سے ایک رکعت پا لی اس نے نماز پا لی۔'' یہ ایک عام حدیث ہے جو نماز کی ایک رکعت پانے کی تمام صورتوں کو شامل ہے، چاہے جماعت کے ساتھ ایک رکعت مل جائے یا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے ایک رکعت مل جائے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے فجر کی ایک رکعت پا لی، اس نے فجر کی نماز پا لی اور جس نے سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے عصر کی ایک رکعت پا لی اس نے عصر کی نماز پا لی۔'' یہ حدیث نماز کے وقت میں ایک رکعت پانے میں نص کا درجہ رکھتی ہے۔ کچھ علما نے اس کی مخالفت میں یہ کہا ہے کہ بعض سندوں میں یہ الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں: «مَنْ أَدْرَكَ سَجْدَةً ...»[2]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

’’جس نے ایک سجدہ پا لیا ....‘‘ انھوں نے یہ سمجھا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ جس نے پہلا سجدہ پا لیا اس نے رکعت پا لی، لیکن یہ لغو مفہوم ہے۔ یہاں سجدے سے مراد رکعت ہے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث میں یہ بیان ہوا ہے: « حَفِظْتُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سَجْدَتَيْنِ قَبلَ الظُّهرِ، وسَجَدَتَيْنِ بَعدَها، وسَجْدَتَيْنِ بَعدَ المَغْرِبِ ... »[1] ’’میں نے رسول اللہ ﷺ سے جو عمل یاد کیا وہ یہ تھا، دو سجدے ظہر سے پہلے، دو ظہر کے بعد اور دو مغرب کے بعد ....‘‘ مشہور روایت میں « سَجدَتَيْن » کی جگہ « رَكْعَتَين »[2] (دو رکعات) مروی ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے: « أَنَّهُ كان يُصَلِّي بَعدَ الوِتْرِ سَجْدَتَيْنِ »[3] آپ ﷺ وتر کے بعد دو سجدے، یعنی دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔‘‘ جس طرح صحیح حدیث میں اس کی تفسیر بیان ہوئی ہے تو یہاں سجدتین سے مراد رکعتین ہے۔ اگر کوئی شخص ان الفاظ کو بنیاد بنا کر وتر پڑھنے کے بعد محض دو سجدے کرے تو وہ سب ائمہ کے نزدیک بالاتفاق غلط ہوگا۔

نیز ان کے نزدیک حکم محض دو سجدوں میں سے ایک کو پا لینے سے متعلق نہیں تو معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ بات حدیث میں کہی بھی نہیں۔ بنا بریں اگر کسی شخص کو جماعت سے ایک رکعت سے کم نماز مل رہی ہو اور اس کے بعد دوسری جماعت بھی ہونی ہو تو وہ دوسری جماعت کے ساتھ مکمل نماز پڑھ لے، یہ اس سے افضل ہے، کیوں کہ اس طرح وہ باجماعت نماز پڑھ لے گا۔ اگر کسی کو پہلی جماعت سے صرف ایک رکعت یا ایک سے بھی کم ملی ہو، لیکن دوسری اول سے لے کر پوری مل سکتی ہو تو اس جماعت میں شریک ہونا افضل ہے، گو پہلی جماعت کمالِ فضیلت یا نمازیوں کی کثرت یا امام کی فضیلت یا ایک ترتیب اور پابندی کے ساتھ ہونے کے لحاظ سے امتیازی خصوصیت رکھتی ہے، لیکن دوسری اس لحاظ سے افضل ہے کہ وہ اس کو پوری کی پوری مل جاتی ہے۔ تاہم کبھی کسی اعتبار سے پہلی افضل ہوتی ہے اور تو کبھی دوسری، لیکن اس طرح کا مسئلہ اسلاف کے ہاں معروف نہیں تھا، سوائے یہ کہ کسی دوسری مسجد میں جماعت مل جائے، کیوں کہ ایک ہی مسجد میں دو پابند (مستقل) امام نماز نہیں پڑھاتے تھے اور جماعت تو پابند (مستقل) امام کے ساتھ ہی میسر ہوسکتی تھی، لیکن اس میں کیا شک کہ مسجد میں پابند (مستقل) امام کے پیچھے باجماعت نماز، چاہے ایک رکعت ہی ملے، گھر میں نماز سے، خواہ باجماعت ہی ہو، بہت بہتر ہے۔ واللّٰه أعلم[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٢٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٩٥) مسند أحمد (٦/٢٩٩)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٢٥٥۔٢٥٨)

پڑھی ہوئی نماز دہرانے کے متعلق دو حدیثوں میں مطابقت

سوال حضرت یزید بن اسود سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھا۔ میں نے آپ کے ساتھ فجر کی نماز مسجد خیف میں ادا کی۔ جب آپ ﷺ نے نماز پڑھا لی اور آپ ﷺ نے نمازیوں کی طرف رخِ انور کیا تو دیکھا سب سے آخر میں دو لوگ تھے جو جماعت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو بلوایا۔ وہ دونوں کانپنے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم نے اپنی اقامت گاہ میں نماز پڑھ لی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اپنی اقامت گاہ میں نماز پڑھو، پھر مسجد میں آؤ اور مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھو، وہ تمھاری نفل ہو جائے گی۔''[1]

اور دوسری حدیث ہے جو سلمان بن سالم سے مروی ہے، ان کا کہنا ہے: ''میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو شاہی دربار میں بیٹھے دیکھا، جب کہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے کہا: اے عبداللہ! آپ کیوں نہیں پڑھ رہے؟ انھوں نے کہا: میں نماز پڑھ چکا ہوں اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوا ہے: « لا تُعادُ صلاةٌ مَرَّتَيْنِ »[2] ''ایک نماز دو مرتبہ نہیں دہرائی جاتی۔'' ان دونوں احادیث میں کس طرح مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے؟

جواب الحمد لله. حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث مطلقاً بلا سبب نماز کے اعادے کے متعلق ہے جو بلاشبہہ منع ہے۔ کسی ایسے سبب کے بغیر جو اعادے کا تقاضا کرتا ہو، نماز دہرانے کا ارادہ کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ اگر شرعی نماز کے لیے کوئی متعین تعداد مشروع ہوتی تو ممکن تھا انسان ظہر کئی مرتبہ پڑھ لے، عصر کئی مرتبہ پڑھ لے، اسی طرح دیگر نمازیں بھی، تو یہ بلاشبہہ مکروہ عمل ہے، لیکن ابن اسود کی حدیث میں اس اعادے کا ذکر ہے جو اعادے کا تقاضا کرنے والے سبب کے ساتھ مقید ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ اگر تم نے اپنی رہایش پر نماز پڑھ لی ہے، پھر تم مسجد میں آتے ہو اور مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو اس میں شریک ہو جاؤ، وہ نفل بن جائے گی۔''

یہاں اعادے کا سبب مسجد میں پابندی کے ساتھ ہونے والی جماعت میں حاضر ہونا ہے۔ تو ایسے شخص کے لیے مسجد میں ہونے والی جماعت میں شرکت کرنا مستحب ہے، لیکن امام شافعی اور احمد مطلقاً اعادے کو مستحب کہتے ہیں۔ کچھ ایسی صورت میں مستحب کہتے ہیں جب دوسری نماز جو ہو رہی ہو، زیادہ کامل ہو۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔ دہرانے کی صورت میں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک پہلی فرض ہو گی، کیوں کہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں: « فإنَّها لَكُمَا نافِلَةٌ »

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٩) مسند أحمد (٤/١٦٠، ١٦١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٧٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٦٠) صحيح الجامع (٧٣٦٥)

''یہ تم دونوں کے لیے نفل ہوگی۔'' نیز ایک صحیح حدیث یہ بھی ہے: ''عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جو نماز کو اس کے وقت سے موخر کر کے پڑھیں گے، تم بروقت نماز پڑھ لینا، پھر ان کے ساتھ جو نماز پڑھو گے اسے نفل بنا لینا۔''[1] اس میں بھی سبب کی صورت میں اعادے کا ذکر ہے اور یہ بھی ذکر ہے کہ دوسری نفل ہوگی۔ ایک قول یہ ہے کہ فرض زیادہ کامل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ کا معاملہ ہے۔

سبب کی وجہ سے نماز کا اعادہ کرنے کے متعلق ایک یہ حدیث بھی مروی ہے جو سنن ابو داود میں مروی ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی آدمی ہے جو اس پر صدقہ کرے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے؟''[2] اس حدیث کے مطابق صدقہ کرنے والا اس آنے والے شخص کو جماعت کا ثواب اور فضیلت پہنچانے کے لیے نماز دہراتا ہے۔ پھر یہ اعادہ جس کا شریعت میں حکم موجود ہے، یہ امام شافعی، احمد اور مالک کے نزدیک ممنوعہ وقت میں بھی جائز ہے، لیکن ابو حنیفہ کے نزدیک اس وقت جائز نہیں۔

مغرب کو دہرانے کے متعلق تین اقوال ہیں: ایک قول ہے کہ اس کو اسی طرح دہرایا جائے۔ دوسرا قول ہے اس کے ساتھ ایک رکعت کا اضافہ کر لیا جائے اور تیسرا قول ہے کہ اسے نہ دہرایا جائے۔

سبب کی وجہ سے دہرانے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی موقع پر نمازِ خوف دو مرتبہ پڑھائی۔ ایک گروہ کو دو رکعات پڑھائیں، پھر سلام پھیرا۔ اس کے بعد دوسرے گروہ کو دو رکعات پڑھائیں اور سلام پھیرا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے کہ وہ خود رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے اور اپنے لوگوں کو جا کر وہی نماز پڑھاتے۔ یہ مسئلہ یعنی نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنا ایک اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ اس کے متعلق تین اقوال ہیں:

1. امام ابو حنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کے نزدیک یہ جائز نہیں۔
2. امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک (ان سے دوسری روایت کے مطابق) یہ جائز ہے۔
3. تیسرا قول یہ ہے کہ یہ خوف کی حالت جیسی ضرورت کے وقت اور نفل پڑھنے والے شخص کو امام بنانے کی ضرورت کے وقت جائز ہے، اس کے سوا نہیں۔ یہ امام احمد سے منقول تیسری روایت ہے۔

اسی سے ملتا جلتا مسئلہ نمازِ جنازہ دہرانے کا بھی ہے۔ یہ بغیر سبب بالاتفاق جائز نہیں، بلکہ اگر دوبارہ جنازہ پڑھایا جائے اور وہ اس میں شریک ہو جو پہلی مرتبہ شریک نہیں ہوا تھا، تو کیا وہ پڑھے گا یا نہیں پڑھے گا، امام شافعی اور

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٧٤) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٢٦٥٢)

احمد کا مذہب ہے کہ وہ پڑھے گا، لیکن قبر پر جا کر پڑھے گا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور بہت سے صحابہ سے یہی ثابت ہے، لیکن ابوحنیفہ اور مالک اس سے منع کرتے ہیں جس طرح وہ مسجد میں دو مرتبہ جماعت کھڑی کرنے سے منع کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فرض پہلی نماز کے اختتام پذیر ہو جانے کے ساتھ ہی ساقط ہو جاتا ہے اور دوسری نفل ہوتی ہے، لیکن نمازِ جنازہ بطورِ نفل نہیں پڑھی جاتی۔ یہ فرض پڑھنے والے کے عکس ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے، کیوں کہ یہ اس پر فرض ہے۔ شافعی اور حنبلی اس کے دو جوابات دیتے ہیں۔ دوسری اس کے لیے فرض ہوگی جس نے اس کو پڑھا۔ اسی طرح وہ تمام فروضِ کفایہ میں کہتے ہیں کہ فرضِ کفایہ اس سے ساقط ہوتا ہے جو اس کو ادا کر لیتا ہے، لیکن اس کے علاوہ جو اس کو ادا کرتا ہے تو اس کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو وہ پہلے کے ادا کرنے کی وجہ سے ساقط ہونے پر اکتفا کرے یا پھر خود اس کو ادا کر کے اس کو اپنے سے ساقط کر لے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ نفل ہی ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ نفل نہیں ہو سکتی تو ایسے نہیں اس کو بطورِ نفل پڑھا جا سکتا ہے جب کوئی اس کا سبب ہو۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر جنازہ ہو جائے اور بعد میں کوئی شخص آئے تو کیا کوئی اس پر صدقہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل کر دوبارہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں جس طرح فرض میں کیا جاتا ہے؟ اس کے جواب میں ایک قول تو یہ ہے کہ یہاں یہ کام جائز نہیں، اس کو بطورِ نفل نہیں پڑھا جاتا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے گا، نبی اکرم ﷺ نے جب قبر پر جنازہ پڑھا تو آپ کے ساتھ وہ لوگ بھی شریک ہو گئے جو پہلے پڑھ چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کو اعادہ ہی کہیں گے، نفل نہیں۔ یہی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ یہ اعادہ سبب کی وجہ سے ہے، مقصود بالذات نہیں اور یہ فرض نماز میں جائز ہے اور جنازے میں بھی۔ واللہ أعلم [1]

جماعت کھڑی ہونے کی صورت میں پہلے سنتیں پڑھنے کا حکم

سوال ایک آدمی مسجد میں آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جماعت کھڑی ہے، تو کیا وہ فرض میں شامل ہو یا پہلے سنتیں پڑھ لے، پھر امام کے ساتھ مل جائے، چاہے تشہد ہی میں شریک ہو، نیز فجر کی دو سنتوں کا کیا حکم ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے: «إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاةُ فَلا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ» [2] ''جب نماز کھڑی ہو جائے تو اس وقت فرض کے سوا کوئی نماز نہیں۔'' ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: « فَلا صلاةَ إِلَّا الَّتِي أُقِيمَتْ » [3] ''اس وقت وہی نماز ہوگی جو پڑھی جا رہی ہے۔'' بنا بریں جب جماعت کھڑی ہو جائے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۲۵۹۔۲۶۴)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۱۰)

[3] مسند أحمد (۲/۳۵۲)

تو آنے والا تحیۃ المسجد، یا فجر کی سنتوں میں مصروف نہ ہو جائے، بلکہ جماعت میں شریک ہو۔ اس بات پر تو علما کا اتفاق ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو تحیۃ المسجد میں مصروف نہیں ہونا چاہیے، لیکن فجر کی سنتوں میں اختلاف ہے۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ جب بندہ اقامت سن لے تو وہ سنت نہ پڑھے، خواہ گھر میں ہو یا مسجد میں، بلکہ اگر چاہے تو فرض کے بعد ان کی قضا دے لے۔ سنت یہ ہے کہ آدمی طلوعِ فجر کے بعد دو سنتیں پڑھے، اس کے بعد فرض کی دو رکعات پڑھے، طلوعِ فجر اور فجر کے فرائض کے درمیان صرف دو سنتیں پڑھی جاتی ہے، فرض نماز کو نمازِ فجر یا نمازِ صبح کہا جاتا ہے، اور سنتوں کو فجر کی سنتیں، صبح کی سنتیں اور فجر کی دو رکعات وغیرہ کہا جاتا ہے، واللہ أعلم۔ [1]

جمعہ اور جماعت پانے کی مقدار

سوال جمعہ اور جماعت میں سے کس قدر نماز پانے کی صورت میں انسان ان دونوں کو پانے والا شمار ہوتا ہے؟

جواب جمعہ اور جماعت کس عمل کے ساتھ پائے جاتے ہیں اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے اور ان کے تین اقوال منقول ہیں:

1. امام مالک، ایک روایت کے مطابق امام احمد اور امام شافعی کے مذہب میں ایک تفریع کے مطابق جمعہ اور جماعت اس وقت پائے جاتے ہیں جب انسان ان میں سے ایک رکعت پا لے۔
2. جمعہ اور جماعت تکبیر کے ساتھ ہی پا لیے جاتے ہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔
3. جمعہ تو ایک رکعت پانے کے ساتھ ہی پایا جاتا ہے، لیکن جماعت ایک تکبیر کے ساتھ بھی پائی جاتی ہے۔ یہ امام شافعی اور احمد کے مذہب کا مشہور قول ہے۔ لیکن درج ذیل وجوہ کی بنا پر پہلا قول ہی صحیح ہے:

١. ایک تکبیر کی مقدار کے ساتھ شارع نے وقت یا جمعہ یا جماعت یا کسی دوسری چیز میں کوئی حکم بھی معلق نہیں کیا۔ شریعت کی نگاہ میں یہ وصف درخور اعتنا ہی نہیں، اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

٢. نبی اکرم ﷺ نے احکام کو رکعت پانے کے ساتھ معلق کیا ہے، لہٰذا ان کو تکبیر کے ساتھ معلق کرنا اس چیز کو کالعدم قرار دینا ہے جس کا اعتبار شارع نے کیا ہے اور اس کا اعتبار کرنا ہے جس کو شارع نے کالعدم قرار دیا ہے اور رکعت کے اعتبار میں یہ دونوں باتیں ہی فاسد ہیں۔ آپ ﷺ نے نماز کا وقت پانے کو بھی ایک رکعت پانے کے ساتھ معلق کیا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣/ ٢٦٤)

جس نے سورج غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت پا لی وہ اپنی نماز پوری کرے، اور جب وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے نمازِ فجر کی ایک رکعت پا لے تو اپنی نماز مکمل کرے۔''[1]

(۳) نبی اکرم ﷺ نے نماز پانے کو امام کے ساتھ ایک رکعت پانے کے ساتھ معلق کیا ہے۔ یہ حدیث اس مسئلے میں نص کی حیثیت رکھتی ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے امام کے ساتھ ایک رکعت نماز پا لی اس نے نماز پا لی۔[2] یہ حدیث اختلاف کو جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔

(۴) جمعہ اس وقت پایا جاتا ہے جب انسان اس کی ایک رکعت پا لے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود اور انس رضی اللہ عنہم وغیرہ کا یہی فتویٰ ہے اور کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ کئی علما نے بیان کیا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع تھا۔ نیز جمعہ اور جماعت کی تفریق بھی درست نہیں، اسی لیے امام ابو حنیفہ نے دونوں کو ایک ہی قیاس میں رکھا ہے، لیکن صحیح احادیث اور صحابہ کے آثار ان کے مذہب کو باطل قرار دیتے ہیں۔

(۵) جو ایک رکعت سے کم ہو اسے نماز میں شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ اس سب کو اکیلا ہی کرتا ہے، لہٰذا وہ امام کے ساتھ کچھ نہیں پاتا جو اس کے حساب اور اجر میں شمار ہو۔ وہ امام کے ساتھ نماز کے ایسے جز میں شریک نہیں ہوتا جو اس کے لیے جماعت سے شمار ہو۔ اس طرح اس کی ساری نماز اکیلے آدمی کی نماز ہی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ انسان اسی صورت میں رکعت پانے والا شمار ہوتا ہے جب وہ امام کو رکوع میں پا لے۔ اگر وہ امام کو رکوع کے بعد پائے تو اس کے بعد وہ جو افعال کرتا ہے وہ اس کے حساب میں شمار نہیں ہوتے، حالانکہ وہ قومہ میں، سجدے میں اور تشہد وغیرہ میں امام کے ساتھ شامل ہوتا ہے، لیکن جب وہ رکعت کے اکثر حصے سے محروم ہو جاتا ہے جو قیام اور رکوع ہے تو رکعت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس نے باجماعت نماز پا لی، حالانکہ وہ جماعت کے ساتھ اتنی مقدار کے ساتھ نماز نہیں پاتا جو اس کے حساب میں شمار ہو اور جس کو رکعت کہا جا سکے۔ معلوم ہوا کہ نماز اسی وقت ملتی ہے جب آدمی اس سے ایک رکعت پا لے اور رکعت اس وقت ملتی ہے جب آدمی رکوع پا لے، کیوں کہ وہ ان دونوں جگہوں میں نماز کا اتنا حصہ پا لیتا ہے جو اس کے لیے کسی حساب میں شمار ہو۔ اس طرح اگر نمازی نماز سے ایک رکعت نہیں پاتا تو وہ اس شخص کی طرح ہوگا جو رکوع نہیں پاتا جس سے رکعت جاتی رہتی ہے، کیوں کہ وہ دونوں جگہوں پر نماز کا اتنا حصہ نہیں پاتا جو اس کے حساب میں شمار ہو۔ یہ صحیح ترین قیاس ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٧)

⑥ اسی پر اس مسئلے کی بنیاد بھی ہے کہ مسافر اگر مقیم کی اقتدا میں نماز پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ایک رکعت یا اس سے زیادہ پا لیتا ہے تو وہ نماز پوری پڑھے گا اور اگر مقیم امام کے ساتھ ایک رکعت سے کم پائے تو وہ نمازِ قصر پڑھے گا۔ یہ امام احمد سے ایک صریح روایت ہے، کیوں کہ یہ مسافر جو مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہے ایک رکعت پا کر نماز کے ایک حصے میں مقیم امام کی اقتدا کر لیتا ہے اس لیے امام کی اقتدا ہی میں اس پر نماز کو پورا پڑھنا لازم ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ اس کے ساتھ ایک رکعت نہ پا سکے تو اس کی نماز اکیلے کی نماز ہوتی ہے، اس لیے وہ قصر پڑھے گا۔

یہ مسئلہ بھی اسی پر مبنی ہے کہ اگر حائضہ غروبِ آفتاب سے اتنی دیر پہلے پاک ہو جائے کہ جس میں وہ ایک رکعت پڑھ سکتی ہو تو اس پر عصر کی نماز لازم ہو گی۔ اگر وہ فجر سے اتنی دیر پہلے پاک ہو جس میں ایک رکعت پڑھی جا سکتی ہو تو اس پر عشا کی نماز لازم ہو گی۔ لیکن اگر وہ اتنی دیر پہلے پاک ہو جس میں ایک رکعت نہ پڑھی جا سکتی ہو تو اس پر اس سے پہلے کی نماز لازم نہیں ہو گی۔ لیکن کیا ظہر اور مغرب کی نماز بھی اس عورت پر لازم ہو گی؟ اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ کا قول ہے، یہ لازم نہیں ہوں گی۔ مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے کہ یہ اس پر لازم ہیں۔ امام احمد نے یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس اور عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ پھر ان فقہا کا اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ پہلی نماز کس چیز کی وجہ سے لازم ہو گی؟

ایک قول تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ دوسری نماز واجب ہوتی ہے اس کے ساتھ پہلی بھی واجب ہو گی، لیکن یہ رکعت پانے کے ساتھ واجب ہو گی یا تکبیر پانے کے ساتھ جس طرح ذکر ہوا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ دوسری نماز اسی صورت میں واجب ہو گی جب وہ اتنا وقت پا لے جو اس نماز کو پڑھنے کے لیے کافی ہو اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اسی طرح کا اختلاف اس مسئلے میں بھی ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے اس وقت تو عورت پاک ہو، پھر کچھ ہی دیر بعد اس کو حیض آ جائے تو کیا اس پر نماز کی قضا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں امام ابو حنیفہ اور مالک کا قول تو یہ ہے کہ اس نماز کی قضا اس پر واجب نہیں، لیکن امام شافعی اور احمد کا قول ہے کہ اس پر اس نماز کی قضا دینا واجب ہے۔ تاہم اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ اور مالک کے موقف کی دلیل زیادہ واضح ہے، کیوں کہ قضا کسی نئے کام کی وجہ سے فرض ہوتی ہے اور یہاں کوئی ایسا کام نہیں ہوا جو قضا کو لازمی کرتا ہو، نیز ایسی عورت اگر تھوڑی سی تاخیر کرتی ہے تو یہ تاخیر جائز ہوتی ہے۔ وہ اس میں بے پروائی کرنے والی شمار نہیں ہو گی، واللہ أعلم.[1]

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۳۳۰-۳۳۶)

نماز کے بعد مصافحہ کرنے کا حکم

سوال نماز کے بعد مصافحہ کرنا سنت ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ، نماز کے بعد مصافحہ مسنون نہیں، بدعت ہے۔ واللہ أعلم[1]

بدعتی اور فاجر کے پیچھے نماز کا حکم

سوال ایک آدمی حافظِ قرآن اور واعظ ہے مگر دف اور بانسری کی محفلوں میں شریک ہوتا ہے، جب کہ دوسرا شخص متقی اور پرہیز گار عالمِ دین ہے۔ ان دونوں میں سے امامت کا زیادہ حق دار کون ہے؟

جواب صحیح مسلم میں حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی امامت وہ کروائے جو کتاب اللہ کو ان سب سے زیادہ اچھا پڑھنے والا ہو۔ اگر وہ سب قراءتِ قرآن میں برابر ہوں تو پھر وہ امامت کروائے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو۔ اگر سنت میں بھی برابر ہوں تو پھر وہ جس کو ہجرت میں سبقت حاصل ہو۔ اگر وہ اس میں بھی برابر ہوں تو پھر وہ جو سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہو۔[2] اگر دونوں آدمی دیندار اور نیک ہوں تو جو کتاب وسنت کو زیادہ جاننے والا ہو اس کو آگے کیا جائے۔ اگر ایک فاجر ہو، مثلاً: کذب بیانی، بددیانتی اور ان اسبابِ فسق میں شہرت رکھتا ہو اور دوسرا ایمان دار اور متقی ہو تو یہ امامت کا زیادہ حقدار ہے، اگر امامت کا اہل ہو، خواہ پہلا زیادہ ماہر قاری اور عالم ہی ہو۔ فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا کچھ علما کے ہاں نہی تحریمی کے زمرے میں آتا ہے اور بعض کے ہاں نہی تنزیہی میں شمار ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے: «لا يَؤُمَّنَّ فاجِرٌ مُؤمِناً إلَّا أنْ يَقْهَرَهُ بِسَوْطٍ أو عَصًا»[3] ''فاجر ایمان دار کا امام نہ بنے مگر یہ کہ وہ کوڑے یا لاٹھی کے زور پر اس پر غالب آ جائے۔''

نیک کو ذمے داری سونپنے کے امکان کی صورت میں فاسق کو ذمے داری سونپنا جائز نہیں۔

باقی رہا بدعتی اور فاجر کے پیچھے نماز تو اس مسئلے میں علما کے ہاں مشہور اختلاف ہے، لیکن سب سے معتدل رائے یہ ہے کہ جب ان سے بہتر کوئی شخص موجود ہو تو اس وقت ان کو امامت کے لیے آگے کرنا جائز نہیں۔ جو شخص علانیہ فسق و فجور اور بدعات کا ارتکاب کرتا ہے، اس کے اس فعل کو منکر خیال کرنا اور اس سے روکنا ضروری ہوتا ہے اور انکار کا کم سے کم مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص سے ترکِ تعلق کر لیا جائے، تا آنکہ وہ اپنی بدعت اور فجور سے باز آ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٣٣٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٣)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٨١) ضعيف الجامع (٦٣٨٦)

جائے۔ اس بنا پر جمہور ائمہ نے دعوت دینے والے بدعتی اور دعوت نہ دینے والے بدعتی میں فرق کیا ہے۔ بدعت کی دعوت دینے والا منکر اور برائی کا اعلان و اظہار کرتا ہے، اس لیے اس کو روکنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن جو خاموش رہتا ہے وہ چھپ کر گناہ کرنے والے کی طرح ہے، جس کو ظاہر میں نہیں روکا جاتا، کیوں کہ غلطی جب تک چھپی رہے تب تک وہ غلطی کرنے والے ہی کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن جب اس کو علی الاعلان کیا جائے اور روکا نہ جائے تو پھر وہ مفادِ عامہ کے لیے نقصان دہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقوں کے ظاہر کو قبول کیا جاتا تھا اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کر دیا جاتا تھا، لیکن اس کے برعکس جو کفر کا اظہار و اعلان کرتا ہے، اگر ایسے شخص کو امامت سے ہٹانا ممکن ہو تو ضرور ہٹانا چاہیے، لیکن اگر اس کو کسی بااختیار شخص نے مقرر کیا ہو اور اس کو معزول کرنا عام لوگوں کے بس میں نہ ہو یا اس کو ہٹانا اس کی بدعت کے فتنے سے بڑے فتنے اور شر کا باعث بن سکتا ہو تو ایسے معمولی فساد کو ختم کرنا جائز نہیں جو بہت بڑے فساد کا پیش خیمہ بن سکتا ہو۔ یہ شریعت کا قاعدہ ہے کہ دو اضرار میں سے خفیف ترین ضرر کو دور کرنا جائز نہیں ہوتا، اگر اس کے نتیجے میں عظیم ترین ضرر وقوع پذیر ہو جائے۔ شریعت مصالح کے حصول اور تکمیل کے لیے اور مفاسد کو ختم کرنے اور حسبِ امکان کم کرنے کے لیے آئی ہے۔ شریعت کا مطلوب دو بھلائیوں میں سے ایک کو ترجیح دینا ہوتا ہے جب وہ دونوں اکٹھی نہ ہو سکتی ہوں، اسی طرح دو برائیوں میں سے ایک کو دور کرنا ہوتا ہے جب وہ دونوں اکٹھی دور نہ ہو سکتی ہوں۔

بنا بریں اگر بدعت اور فسق و فجور کو ظاہر کرنے والے امام کو روکنا صرف اس صورت میں ممکن ہو جس کے نتیجے میں کسی ایسے ضرر کا پہنچنا یقینی ہو جو اس کی بدعت سے بڑھ کر ہو، تب ایسا کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کے پیچھے وہ لوگ نمازیں پڑھیں جن کو اس کے علاوہ کسی اور کے پیچھے پڑھنا ممکن نہ ہو، مثلاً جمعہ عیدین کی نماز اور باجماعت نماز، یعنی جب اس کے علاوہ کوئی اور امام نہ ہو، اسی لیے صحابہ حجاج بن یوسف اور مختار ثقفی وغیرہما کی امامت میں جمعہ اور باجماعت نماز پڑھا کرتے تھے، کیوں کہ جمعہ اور جماعت کو چھوڑ دینا کسی فاجر امام کی اقتدا جیسے فساد سے بڑے فساد پر مشتمل ہے۔ بالخصوص جب ان سے پیچھے رہنا اس کو فجور سے روک نہ سکتا ہو تو ایسی صورت میں اس مفسدت کو دور کیے بغیر شرعی مصلحت کو ترک کرنا لازم آئے گا۔ بنابریں ظالم ائمہ کے پیچھے مطلقاً جمعہ اور جماعت ترک کرنے والے اسلاف اور ائمہ کے نزدیک بدعتی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اگر جمعہ اور جماعت نیک اور صالح امام کے پیچھے پڑھنا ممکن ہو تو فاجر کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ (ملخصاً)[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/ ۳٤۰_ ۳٤٤)

شرابی امام کے پیچھے نماز کا حکم

سوال شراب کے عادی امام کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ نیز مدمنِ خمر یعنی شراب کے عادی کی تعریف کیا ہے؟ کیا جو کبھی ترک نہیں کرتا یا اکثر اوقات مخمور و مدہوش رہتا ہے یا دل میں یہ نیت رکھتا ہے کہ جیسے ہی شراب ملے گی پی لے گا؟

جواب جو ایک دن شراب پیتا ہے، پھر ایک مہینے تک نہیں پیتا مگر دل میں یہ ارادہ رکھتا ہے کہ جب میسر آئے گی پی لے گا، یہ شراب پینے پر اصرار کرنے والا ہے، تائب نہیں۔ ایسے ہی جو عام عادی شرابیوں کی طرح عادی ہوتا ہے مدمن ہے، گو اکثر اوقات نشے میں نہ ہو۔ شراب کا عادی ہونا گوشت خوری کے عادی ہونے کی طرح ہے۔ کچھ لوگ روز کھاتے ہیں، کچھ ایک دن چھوڑ کر، کچھ ہفتے بعد، یہ سب عادی ہوتے ہیں۔ اصرار کرنے والے اور مدمن، یعنی عادی شرابی کو امام بنانا جائز نہیں، لیکن اگر اس کو کسی ایسے طاقتور شخص اور مقتدرہ قوت نے امام مقرر کیا ہو جس کی مخالفت ممکن نہ ہو تو جمعہ اور جماعت جیسی ضروری نماز، جو اس کے علاوہ کوئی اور نہ پڑھاتا ہو، پڑھی جا سکتی ہے۔ تاہم اگر شرعی طریقے سے نیک امام کے پیچھے نماز پڑھنا ممکن ہو تو فاجر کی نسبت اس کے پیچھے نماز پڑھنا زیادہ مناسب ہے، واللہ أعلم.[1]

نماز سے پہلے امام کے عقیدے کی تحقیق کا مسئلہ

سوال کیا مرازقہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟ (مرازقہ ابو عمرو عثمان بن مرزدق کے پیروکار تھے) یہ لوگ اس وقت تک کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جب تک اس کے عقیدے کی تحقیق نہ کر لیتے تھے۔)

جواب ائمہ اربعہ اور تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ آدمی ایسے شخص کے پیچھے پانچوں نمازیں اور جمعہ پڑھ سکتا ہے جس کی کسی بدعت یا بدقماشی سے واقف نہ ہو۔ اقتدا کی یہ شرط نہیں کہ آدمی اپنے امام کے عقیدے کی چھان پھٹک کرتا پھرے اور اس سے پہلے پوچھے: تمھارا عقیدہ کیا ہے، بلکہ وہ اس کے پیچھے نماز پڑھے جس کا حال چھپا ہوا ہو۔ اگر وہ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھے جس کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ فاسق یا بدعتی ہے تو ایسے شخص کی نماز کے صحیح ہونے کے متعلق حنبلی مذہب، شافعی مذہب اور مالکی مذہب میں دو مشہور اقوال ہیں، لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کی نماز صحیح ہوتی ہے۔

قائل کا کہنا کہ میں جس طرح اپنا مال صرف اس کے سپرد کرتا ہوں جس کو جانتا ہوں، اسی طرح نماز بھی اسی

---

[1] جامع المسائل (٤٤٨/٨)

کے پیچھے پڑھوں گا جس کو جانتا ہوں گا۔ یہ جاہلانہ بات ہے جو کسی امام سے منقول نہیں، کیونکہ اگر مال کسی نامعلوم شخص کے سپرد کیا جائے تو وہ ممکن ہے۔ اس میں کوئی بد دیانتی کرے یا اسے ضائع کر دے مگر امام اگر غلطی کرے یا بھول جائے تو اس کا مواخذہ مقتدی سے نہیں ہوتا۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے امام تمھارے لیے اور اپنے لیے نماز پڑھتے ہیں۔ اگر وہ درست نماز پڑھیں تو وہ تمھارے لیے بھی ہوتی ہے اور ان کے لیے بھی، لیکن اگر وہ غلطی کریں تو وہ ان کے ذمے ہوتی ہے تمھارے ذمے نہیں۔''[1] اس حدیث میں آپ ﷺ نے امام کی غلطی کا ذمے دار اسی کو ٹھہرایا ہے، مقتدیوں کو نہیں۔ حضرت وغیرہ نے بھول کر حالتِ جنابت میں نماز پڑھا دی، پھر خود غسل کر کے نماز دہرائی، لیکن مقتدیوں کو دہرانے کا حکم نہ دیا۔ جمہور علما، جیسے مالک، شافعی اور احمد کا یہی مذہب ہے۔ اسی طرح اگر امام ایسا کرتا ہے جو اس کے نزدیک جائز ہو، لیکن مقتدی کے نزدیک نماز کو باطل کرنے والا ہو۔ مثال کے طور پر امام بسم اللہ نہ پڑھتا ہو، یا شرم گاہ کو چھونے پر وضو نہ کرتا ہو اور سمجھتا ہو کہ اس کے باوجود نماز صحیح ہوتی ہے۔ لیکن مقتدی یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ان کاموں کو کرنے کی وجہ سے نماز صحیح نہیں ہوتی تو جمہور علما کا یہی مذہب ہے کہ اس مقتدی کی نماز صحیح ہے۔

فاسق اور بدعتی کی نماز فی نفسہٖ صحیح ہوتی ہے۔ اگر مقتدی اس کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ جو علما اس کو مکروہ سمجھتے ہیں تو اس وجہ سے کہ برائی سے منع کرنا واجب ہوتا ہے لہٰذا جو شخص علانیہ بدعت اور فسق و فجور کا مرتکب ہو اس کو مسلمانوں کا باقاعدہ امام مقرر نہ کیا جائے۔ وہ تعزیر کا مستوجب ہے، جب تک توبہ نہ کرے۔ اگر اس نیت سے اس کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی بدعت یا فسق سے باز آ جائے گا اور اس کا کوئی اثر ہو یا اس وجہ سے اس کو معزول کر دیا جائے پھر تو یہ کام کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ اس میں مصلحت موجود ہے، لیکن اگر اس کام کی وجہ سے مقتدی جمعہ اور جماعت سے محروم ہو جائے تو ایسی صورت میں ان کے پیچھے نماز پڑھنا وہی ترک کرے گا جو صحابہ کی راہ کا مخالف ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص کسی عذر کے بغیر کسی فاجر کے پیچھے نماز پڑھتا ہے تو کیا اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اس میں علما نے اپنے اپنے اجتہاد کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں: وہ نماز دہرائے، کیوں کہ اس نے ناجائز کام کیا ہے، یعنی اس شخص نے اس کے پیچھے نماز پڑھ کر برائی سے منع کرنے کی ذمے داری کو ترک کیا ہے، لہٰذا اس کے پیچھے نماز منع تھی، اس لیے وہ دہرائے۔ کچھ دوسرے کہتے ہیں کہ وہ نماز نہ دہرائے، کیوں کہ نماز فی نفسہٖ صحیح ہے۔ جو اس نے برائی سے منع کرنے کی ذمے داری نہیں نبھائی، یہ نماز سے علاحدہ اور منفصل کام ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جو بدعتِ کفریہ کا مرتکب ہو اس کے پیچھے جمعہ وغیرہ پڑھنے میں بھی علما کا اختلاف ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

مسئلہ تکفیر:

تاہم مسئلہ خواہش پرستوں کی تکفیر سے تعلق رکھتا ہے جس میں لوگ بہت زیادہ اضطراب کا شکار ہیں۔ اس کے پیچھے نماز سے متعلق امام مالک، شافعی، احمد اور ابو الحسن اشعرؒی جیسے علمائے کرام سے بھی دو مختلف اقوال منقول ہیں، تاہم اس کی حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ بسا اوقات وہ قول اور نظریہ کفر ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے صیغہ تعمیم میں کہہ دیا جاتا ہے: اس نظریے اور قول کا حامل کافر ہے، یا اس طرح کہا جاتا ہے جس نے یہ بات کہی وہ کافر ہے۔ کسی شخص کا نام لے کر جو اس کفریہ قول کا اظہار کرتا ہو، تکفیر کرنا اس کو کافر قرار دینا اس وقت تک جائز نہیں ہوتا جب تک اس پر وہ حجت قائم نہ ہو جائے جس کے تارک کو کافر قرار دیا جاتا ہو، یہ جس طرح وعیدی نصوص اور آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوٰلَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾

[النساء: ١٠]

''بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔''

یہ نصوصِ وعید تو حق ہیں، لیکن کسی مخصوص فرد کے خلاف ان نصوصِ وعید سے گواہی قائم نہیں کی جاتی، لہٰذا اہلِ قبلہ میں کسی مخصوص و متعین فرد کے خلاف جہنمی ہونے کی گواہی نہیں دی جا سکتی، کیوں کہ کسی شرطِ تکفیر کے نہ پائے جانے یا کسی مانع کے وجود کا امکان رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی تحریم اس تک پہنچی ہی نہ ہو۔ ممکن ہے وہ حرام کام سے توبہ کرے۔ ممکن ہے اس کی ایسی عظیم نیکیاں ہوں جو اس حرام کی سزا مٹا دیں۔ ممکن ہے وہ ایسی آزمایشوں میں مبتلا ہو جائے جو اس کے اس گناہ کو زائل کر دیں یا پھر ممکن ہے اس کو کسی سفارشی کی سفارش میسر آ جائے۔ اسی طرح وہ اقوال جن کے قائل کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات ایسے شخص تک وہ دلائل اور نصوص نہیں پہنچتی جن سے حق کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کبھی وہ ان نصوص سے آگاہ تو ہوتا ہے لیکن وہ اس کے نزدیک ثابت نہیں ہوتیں۔ یا وہ ان کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں پاتا۔ بسا اوقات اس کے سامنے ایسے شبہات پیش کیے جاتے ہیں یا آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں معذور سمجھا جا سکتا ہے تو جو صاحبِ ایمان طلبِ حق کی جستجو کرتا ہو۔ لیکن غلطی کر بیٹھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وہ غلطی معاف کر دیتا ہے، خواہ وہ نظری مسائل میں ہو یا عملی مسائل میں، صحابہ کرام اور جمہور علمائے امت کا یہی موقف تھا۔ (ملخصاً)[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٣٥١_٣٥٥)

صاحبِ حیثیت امام کے لیے تنخواہ لینے کا حکم

سوال ایک آدمی کے پاس اتنا مال موجود ہے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس کے باوجود وہ نماز پڑھانے کے پیسے لیتا ہے، تو کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

جواب کسی شخص کو امامت کے لیے اجرت پر رکھنا مشہور حنفی، مالکی اور حنبلی مذہب میں جائز نہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ جائز ہے اور یہ شافعی کا مذہب، امام احمد سے ایک روایت اور مالکی مذہب میں ایک قول ہے۔ موذن کو اجرت پر رکھنے میں بھی اختلاف ہے، لیکن امام مالک کا مشہور مذہب اس کے جواز کا ہے، تاہم تعلیم اور اس جیسے امور میں کسی کو اجرت پر رکھنے کے متعلق حنبلی مذہب میں ایک یہ تیسرا قول بھی ہے کہ یہ ضرورت کے وقت جائز ہے اور ضرورت کے بغیر جائز نہیں، واللہ أعلم.[1]

نامرد کے پیچھے نماز کا حکم

سوال کیا خصی (آختہ نامرد) کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب الحمد للہ، جس طرح کامل مرد کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے، اسی طرح خصی کے پیچھے بھی نماز صحیح ہوتی ہے۔ اس پر ائمہ اہلِ اسلام کا اتفاق ہے، بلکہ وہ اپنے سے کم رتبے کے حامل کی نسبت امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ اگر وہ علم اور دین میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو تو امامت میں مقدم ہوگا، چاہے مفضول اور کم درجے کا شخص پورا مرد ہی ہو، واللہ أعلم.[2]

قضا شدہ نماز کو اگلی باجماعت نماز کے ساتھ پڑھنے کا حکم

سوال ایک شخص نے لوگوں کو ظہر کی نماز باجماعت پڑھتے ہوئے پایا تو اس نے ان کے ساتھ مل کر فجر کی قضا شدہ نماز پڑھنی چاہی۔ جب امام تیسری رکعت کے لیے اٹھا تو اس نے بیٹھ کر سلام پھیری اور ان سے جدا ہو گیا۔ کیا یہ نماز صحیح ہے؟ اگر ہے تو کس مذہب میں؟

جواب یہ نماز ابو حنیفہ، مالک اور ایک روایت میں احمد کے مذہب میں صحیح نہیں۔ شافعی کے مذہب اور امام احمد کی دوسری روایت میں صحیح ہے، واللہ أعلم.[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۳۶۶/۲۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۳۶۶/۲۳)

[3] مجموع الفتاویٰ (۳۹۱/۲۳)

غسلِ جنابت اور حالتِ جنابت میں پڑھی گئی نماز دہرانے کا حکم

سوال غسلِ جنابت فرض ہے یا نہیں، نیز اگر کوئی حالتِ جنابت میں نماز پڑھ لے تو کیا اسے دہرائے یا نہیں؟

جواب جنابت کی وجہ سے طہارت فرض ہے، طہارت حاصل کیے بغیر کسی جنابت والے شخص یا بے وضو انسان کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ جو انسان شرعی طہارت کے بغیر نماز پڑھنے کو حلال سمجھتا ہو وہ اس کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے، اگر اسے حلال نہ سمجھتا ہو تو پھر اس کے کافر ہونے میں اختلاف ہے، لیکن وہ عبرت ناک سزا کا مستحق ہے۔

اگر وہ پانی کے ساتھ غسل کرنے پر قادر ہو تو غسل کرے، لیکن اگر پانی موجود نہ ہو یا کسی بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال اس کے لیے باعثِ ضرر ہو، یا ہلاکت خیز ٹھنڈک ہو تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن اگر غسل اور تیمّم دونوں ناممکن ہوں تو پھر علما کے راجح قول کے مطابق وہ غسل اور تیمّم کے بغیر ہی نماز پڑھ لے اور اس کو بعد میں دہرانے کی ضرورت نہیں، واللہ أعلم.[1]

مکبّر کا حکم

سوال کیا امام کے پیچھے بلند آواز میں اللہ اکبر کہنا جائز ہے، تا کہ دوسروں تک تکبیر پہنچائی جائے؟

جواب امام کے پیچھے بلند آواز میں مکبّر کا تکبیر کہنا بلا ضرورت جائز نہیں۔ اس پر ائمہ کرام کا اتفاق ہے۔ حضرت بلال یا کوئی دوسرا اصحابی رسول اللہ ﷺ کے پیچھے بلند آواز سے تکبیر نہیں کہتا تھا۔ اسی طرح خلفائے راشدین کے پیچھے بھی کوئی مکبّر (بلند آواز سے تکبیر کہنے والا) نہیں ہوتا تھا، لیکن جب رسول اللہ ﷺ بیمار ہوئے اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی تو آپ ﷺ کی آواز کمزور تھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پہلو میں نماز پڑھ رہے تھے اور وہ لوگوں کو آپ ﷺ کی تکبیر سناتے۔ دوسری مرتبہ کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک گھوڑے پر سوار ہوئے اور اس سے گر پڑے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کو چوٹ آئی اور آپ ﷺ نے اپنے گھر میں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی تکبیر لوگوں تک پہنچاتے۔ (رواہ مسلم)[2]

حالانکہ اس نماز کے متعلق امام احمد کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگوں کی امامت کروا رہے تھے،[3] اس لیے آپ ﷺ جو بلند آواز سے تکبیر کہہ رہے تھے وہ بطور امام تھی،

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹۵/۲۱)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۱۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۸۱)

اگر چہ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں تھے۔ علمائے کرام نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تبلیغ تکبیر انہی دو مواقع پر ذکر کی ہے۔ تاہم علما میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ تبلیغِ تکبیر (امام کی تکبیر مقتدیوں تک منتقل کرنا) ضرورت کے بغیر مکروہ ہے، بلکہ کچھ تو کہتے ہیں کہ اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عام علما کے نزدیک اگر یہ مکبّر نماز میں اطمینان کا التزام نہ کرے یا امام سے سبقت لے جائے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ واللہ أعلم[1]

امام کے آگے کسی رکاوٹ کی صورت میں نماز کا حکم

سوال کیا اس صورت میں امام کے آگے یا پیچھے نماز ہو جاتی ہے جب درمیان میں کوئی رکاوٹ نہ ہو؟

جواب امام کے آگے مقتدی کی نماز کے متعلق تین اقوال ہیں:

1. ایک قول یہ ہے کہ اس کی نماز مطلقاً صحیح ہوتی ہے، اگر چہ اسے مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ مالکی مذہب میں مشہور قول اور امام شافعی کا قدیم قول ہے۔
2. دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مطلقاً صحیح نہیں۔ یہ ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کا مشہور مذہب ہے۔
3. تیسرا قول یہ ہے کہ یہ عذر کے ساتھ صحیح ہے، عذر کے بغیر نہیں۔ مثال کے طور پر بھیڑ بہت زیادہ ہو، مسجد میں جگہ بالکل نہ ہو اور جمعہ یا جنازہ امام کے آگے پڑھنا ہی ممکن ہو تو ایسی صورت میں امام کے آگے نماز پڑھ لینا اسے چھوڑ دینے سے بہتر ہے۔ یہ علما کے ایک گروہ کا قول ہے اور حنبلی مذہب میں ایک قول ہے۔

تاہم یہ معتدل اور راجح قول ہے، کیوں کہ امام کے آگے نہ ہونا زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ باجماعت نماز کا ایک واجب ہو اور سارے واجبات عذر کے ساتھ ساقط ہو جاتے ہیں۔ اگر جماعت کو اصلِ نماز میں واجب سمجھا جائے تو وہ بھی عذر کی بنا پر ساقط ہو جاتی ہے لہٰذا جو جماعت کا واجب ہو اس کا عذر کے وقت ساقط ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نمازی اگر قیام، یا قراءت یا لباس یا طہارت وغیرہ کے کسی معاملے کو اپنانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔

جماعت میں دیکھیے اگر نمازی ایک دو رکعات کے بعد جماعت میں شریک ہو تو وہ امام کی متابعت میں بسا اوقات ایک رکعت کے بعد ہی بیٹھ جاتا ہے۔ اگر وہ یہ کام اکیلا کرے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ امام کو رکوع، سجدے یا قعدے کی صورت میں پاتا ہے تو اسی حالت میں اس کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے، گو وہ اس کے کسی حساب میں شمار نہیں ہوتی، بلکہ امام کی متابعت میں سجدہ سہو بھی کر لیتا ہے، اگر چہ اس سے کوئی سہو واقع نہ ہوا ہو۔ نمازِ خوف

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۳/۴۰۲۔۴۰۳)

میں نمازی بسا اوقات قبلہ رخ بھی نہیں ہوتا اور بہت زیادہ حرکت کرتا ہے، امام کو سلام سے پہلے چھوڑ دیتا ہے اور امام کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے پہلی رکعت کی قضا دیتا ہے اور اس طرح کے دیگر کام وہ جماعت کی خاطر کرتا ہے۔ اگر کسی عذر کے بغیر کرے تو اس کی نماز باطل ہو جائے۔

اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اکثر بصریوں اور اکثر اہل الحدیث کا مذہب ہے اگر امامِ راتب (باقاعدہ) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی اس کی متابعت میں بیٹھ کر نماز پڑھیں گے۔ وہ محض متابعت کی خاطر واجب قیام کو چھوڑ دیتا ہے، جس طرح احادیث میں آپ ﷺ کا یہ فرمان مذکور ہے: «وإذا صَلَّى جالِسًا فَصَلُّوا جُلُوسًا أَجْمَعُونَ»[1] ''جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔''

اس مسئلے میں بھی علما کے تین اقوال ہیں:

1. بیٹھ کر نماز پڑھنے والا کھڑے ہونے والوں کا امام نہ بنے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی۔ یہ مالک اور محمد بن حسن کا قول ہے۔
2. امامت کروائے، لیکن مقتدی کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھیں۔ بیٹھنے کا حکم منسوخ ہے۔ یہ ابو حنیفہ اور شافعی کا قول ہے۔
3. یہ حکم محکم ہے منسوخ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد کئی صحابہ نے اس پر عمل کیا ہے جن میں اسید بن حضیر وغیرہ کا نام شامل ہے۔ یہ حماد بن زید اور احمد بن حنبل وغیرہ کا مذہب ہے۔

بنا بریں اگر مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو ان کی نماز صحیح ہونے میں دو اقوال ہیں۔ تاہم یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حتی الامکان جماعت پر عمل کیا جائے۔ اگر مقتدی کے لیے امام کی اقتدا کی یہی صورت ہو کہ وہ اس کے آگے کھڑا ہو سکتا ہو تو اس میں زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے حصول کے لیے جگہ چھوڑ رہا ہے تو یہ کسی دوسرے کام کے ارتکاب سے خفیف تر ہے۔ جہاں تک اس صورت میں اقتدا کا مسئلہ ہے کہ مقتدی مسجد کے اندر یا مسجد کے باہر امام کے پیچھے ہو اور درمیان میں کوئی رکاوٹ ہو اور صفیں ملی ہوئی ہوں تو وہ بالاتفاق جائز ہے، لیکن اگر درمیان میں کوئی راستہ، کوئی نہر وغیرہ ہو تو اس میں دو مشہور اقوال ہیں، امام ابو حنیفہ کا قول ہے، یہ منع ہے اور امام شافعی کا قول ہے کہ یہ جائز ہے۔

اگر درمیان میں پردہ یا رکاوٹ ہو جو دیکھنے میں رکاوٹ ہو تو اس کے متعلق کئی اقوال ہیں، تاہم یہ ضرورت کے وقت جائز ہے، مثلاً مسجد کے دروازے بند ہوں، یا امام جس کمرے میں نماز پڑھا رہا ہو وہ بند ہو۔ اگر یہاں دیکھنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٤)

واجب بھی ہو تو وہ ضرورت کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے، جس طرح ابھی ذکر ہوا ہے۔ تاہم باجماعت نماز اکیلے نماز پڑھنے سے ہر حال میں بہتر ہے۔[1]

مسجد سے متصل اپنی اپنی دکانوں میں نمازِ جمعہ پڑھنے کا حکم

سوال اگر کوئی مسجد بازار میں ہو اور اس کے قریب قریب دکانیں ہوں تو کیا دکاندار اپنی دکانوں میں نمازِ جمعہ پڑھ سکتے ہیں؟

جواب جمعہ کی نماز ہو یا کوئی اور نماز، اس کے لیے ترتیب کے ساتھ پہلی صفوں کو مکمل کرنا ضروری ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: فرشتے اپنے رب کے پاس کس طرح صفیں بناتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ پہلے پہلی صفیں مکمل کرتے ہیں، پھر باقی اسی ترتیب کے ساتھ اور صف میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔''[2] لہٰذا پہلی صفوں کو خالی چھوڑ کر آخری صفیں بنانا جائز نہیں۔ اسی طرح مسجد کو خالی چھوڑ کر دکانوں اور راستوں میں صفیں بنانا بھی جائز نہیں۔ جو آدمی یہ کام کرتا ہے اس کی تادیب کرنی چاہیے اور جو بعد میں آئے وہ ان کو پھلانگ کر پہلی صفیں مکمل کرے۔ اس پچھلی صف کی کوئی حرمت نہیں۔ جب مسجد بھر جائے تو مسجد کے باہر صفیں بنائی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر صفیں راستوں اور بازاروں تک ایک دوسرے کے متصل پھیل جائیں تو ان نمازیوں کی نماز درست ہو گی، لیکن اگر اس طرح صفیں بنائی جائیں کہ آخری صف کے درمیان کوئی راستہ آ جائے جہاں سے لوگ گزرتے ہوں تو ان لوگوں کی نماز راجح قول کے مطابق درست نہیں۔ اسی طرح اگر صفوں میں اس طرح کا پردہ آ جائے کہ پچھلی صف والے اگلی صف کو نہ دیکھ سکیں، یہ پردہ غیر ضروری ہو، لیکن وہ تکبیر کی آواز سنتے ہوں تو علما کے ایک قول کے مطابق ان کی نماز بھی درست نہیں ہوتی۔ علی ہذا القیاس جو آدمی اپنی دکان اور خالی راستے میں نماز پڑھتا ہے، صفیں وہاں تک نہیں پہنچتیں تو اس کی نماز بھی درست نہیں۔ اس کو دکان پر بیٹھے رہنا اور صفوں کا وہاں تک پہنچنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اٹھ کر مسجد میں جانا چاہیے اور پہلے اگلی صفیں مکمل کرنی چاہییں، واللہ أعلم۔[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٤٠٤/٢٣)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٤٠٩/٢٣)

اپنی مرضی سے مسجد سے متصل دکانوں میں جمعہ پڑھنے کا حکم

سوال کیا اپنی مرضی اور اختیار سے بازاروں، دکانوں اور گلیوں میں نمازِ جمعہ پڑھنے والے کی نماز صحیح ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب اگر صفیں ایک دوسرے سے متصل ہوں تو آخری صفوں میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر اس کے سوا چارہ ہی نہ ہو، لیکن اگر کوئی شخص جان بوجھ کر دکان پر بیٹھا رہے اور مسجد میں داخل ہی نہ ہو، جس طرح مسجدوں کے قریب دکانداروں کی عادت ہوتی ہے۔ تو ایسا کرنے والے سنت کے مخالف اور غلطی پر ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس صفیں بناتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا: فرشتے اپنے رب کے پاس کیسے صفیں بناتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ پہلے پہلی صفیں مکمل کرتے ہیں اور صف میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کھڑے ہوتے ہیں۔''[1] آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''مردوں کی بہترین صفیں اگلی صفیں ہیں اور بدترین صفیں آخری صفیں ہیں۔''[2] اگر صفیں ملی ہوئی نہ ہوں، بلکہ صفوں کے درمیان راستہ ہو تو اس سے نماز کے صحیح ہونے میں علما کے دو اقوال ہیں اور وہ دونوں ہی امام احمد سے دو روایات کے طور پر منقول ہیں:

1. یہ نماز صحیح نہیں ہوتی۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔
2. یہ نماز صحیح ہوتی ہے، یہ امام شافعی کا قول ہے، واللہ أعلم.[3]

نصف شعبان (شبِ براءت کی نماز کا حکم)

سوال نصف شعبان کی نماز کا حکم کیا ہے؟

جواب اگر کوئی شخص نصف شعبان کی رات اکیلا یا خاص جماعت میں نماز پڑھتا ہے، جس طرح کچھ اسلاف کا عمل تھا تو یہ احسن اور بہتر ہے، لیکن کوئی خاص مقرر نماز کے لیے مساجد میں اجتماع، مثلاً: ایک سو رکعات پڑھنے کے لیے اجتماع یا ہزار مرتبہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھنے کے لیے اکٹھ اور اس پر مداومت بدعت ہے۔ ائمہ میں سے کسی نے بھی اسے مستحب اور پسندیدہ قرار نہیں دیا۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٣٠)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٣/٤١١-٤١٢)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٣/١٣١)

رخصتیں

بوڑھے معذور کی نماز

سوال ایک آدمی اس قدر بوڑھا ہو چکا ہے کہ اس کے اعضا نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ خود نہ کھا سکتا ہے نہ پی سکتا ہے۔ نہ حرکت کر سکتا ہے اور نہ استنجا کر سکتا ہے۔ جب سجدے میں جائے تو خود اٹھ بھی نہیں سکتا۔ یہ کس طرح نماز پڑھے؟

جواب وہ نماز کے جن افعال کو کرنے کی طاقت رکھتا ہے انھی کو ادا کرے۔ اگر کھڑا نہیں ہو سکتا تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ اپنی حالت کے مطابق سر سے اشارہ کرے۔ اشارے سے سجدہ کر لے۔ اس پر جو گندگی لگی ہو اس کو کپڑے سے صاف کر دیا جائے۔ کوئی دوسرا اس کو وضو کروا دے۔ وہ دو نمازیں اکٹھی کر کے بھی پڑھ سکتا ہے۔ ظہر کو موخر کر کے اور عصر کو مقدم کر کے۔ قصر کے بغیر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پوری پوری نماز پڑھ لے۔ اسی طرح مغرب اور عشا کی نمازیں اکٹھی کر کے پڑھ لے اور فجر کے وقت بھی اس کو کوئی وضو کروا دے اور وہ نمازِ فجر پڑھ لے۔ اگر وہ بیٹھ کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو پہلو کے بل لیٹ کر قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھے۔ اگر اس کو کوئی وضو یا تیمّم کروانے والا نہ ہو تو وہ اپنی حالت کے مطابق نماز پڑھے، چاہے وہ گدی کے بل پڑا ہو اور اس کی ٹانگیں قبلے کی طرف ہوں۔ اگر پہلو کے بل ہو تو چہرہ قبلے کی طرف کر لے۔ اگر اس کے پاس کوئی نہ ہو جو اس کو قبلے کی طرف کر دے تو وہ جس سمت ہو نماز پڑھ لے، واللہ أعلم۔[1]

عورت کا طاقت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھنا

سوال کیا عورت طاقت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھ سکتی ہے؟

جواب طاقت کے باوجود فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا نہ عورت کے لیے درست ہے نہ مرد کے لیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کھڑے ہو کر نماز پڑھ۔ اگر طاقت نہیں رکھتا ہو تو بیٹھ کر پڑھ۔ اگر بیٹھنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو پہلو کے بل پڑھ۔''[2] لیکن نفل بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح نفل سواری پر بھی پڑھنا جائز ہے، سواری کا رخ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٥-٦)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٠٦٦)

چاہے جس بھی سمت ہو۔ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر نفل پڑھا کرتے تھے۔ وہ جس بھی سمت گامزن ہوتی۔ آپ ﷺ اس پر وتر بھی پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن اس پر فرض نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح بیمار کے لیے بھی بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، اگر وہ کھڑا ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ایسی سواری پر ہو جس سے زمین پر اترنا ممکن نہ ہو (بحری جہاز، ہوائی جہاز) تو وہ اپنی سواری ہی پر نماز پڑھے۔ دشمن سے خائف بھی اپنی سواری پر نماز پڑھ سکتا ہے، جب اس کو خدشہ ہو کہ اگر وہ اترا (تو پکڑا یا مارا جائے گا)، واللہ أعلم۔ [1]

سفر میں قصر نماز کا حکم

سوال کیا سفر میں قصر سنت ہے یا عزیمت؟ نیز کیا یہ حدیث صحیح ہے جو امام شافعی نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سفر میں نماز پوری بھی پڑھی ہے اور قصر بھی کی ہے؟

جواب سفر میں نماز قصر کرنا رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سفر میں کبھی دو رکعات سے زیادہ نماز نہیں پڑھی۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی خلافت کے پہلے سال اسی پر کاربند رہے، لیکن دوسرے سال انھوں نے چند عذروں کی بنا پر منیٰ میں پوری نماز پڑھی، جن کا ذکر کسی دوسری جگہ گزر چکا ہے۔

سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غلطی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہے۔ اس سند میں ابراہیم بن محمد، ابو یحییٰ مدنی قدری کا بیٹا ہے اور دوسرا طلحہ بن عمرو مکی ہے۔ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں ہی ضعیف ہیں اور دونوں ہی ناقابلِ حجت ہیں۔ اس کے برعکس صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے:

«فُرِضَتِ الصَّلاَةُ رَكْعَتَيْنِ، رَكْعَتَيْنِ، فَأُقِرَّتْ صَلاَةُ السَّفَرِ، وَزِيْدَ فِي صَلاَةِ الْحَضَرِ» [2]

''نماز دو رکعات فرض کی گئی تھی۔ پھر نمازِ سفر کو برقرار رکھا گیا اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔''

حضرت عروہ بن زبیر سے پوچھا گیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوری نماز کیوں پڑھی؟ انھوں نے کہا: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی طرح تاویل کی جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تاویل کی۔'' سیدہ عائشہ بتاتی ہیں کہ سفر کی نماز دو رکعات ہیں۔ ان کا بھانجا عروہ ان کے متعلق سب سے زیادہ جانتا تھا۔ اس نے ذکر کیا کہ انھوں نے تاویل کرتے ہوئے پوری نماز پڑھی۔ یہ ان کے ہاں سنت نہیں تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ ''سفر کی نماز دو

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۶۔۷)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۴۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۶۸۵)

رکعات ہیں۔ نمازِ جمعہ کی دو رکعات ہیں۔ عید الفطر کی دو رکعات ہیں اور عید الاضحیٰ کی بھی دو رکعات ہیں اور یہ پوری نماز ہے، قصر نہیں اور یہ حکم تمھارے نبی کی زبان سے نکلا ہے۔''[1]

مزید برآں مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے سفر میں ہمیشہ دو رکعات ہی پڑھی ہیں۔ آپ ﷺ سے کسی صحابی نے نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے کبھی سفر میں چار رکعات پڑھی ہوں۔ یہ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سفر میں روزہ رکھا بھی اور چھوڑا بھی۔ آپ ﷺ کے صحابہ میں سے کچھ روزے سے ہوتے اور کچھ روزے کے بغیر، لیکن جہاں تک قصر کی بات ہے تو تمام صحابہ مکہ، عرفات وغیرہ میں قصر ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں مکی صحابی بھی تھے اور غیر مکی بھی۔

سفر میں چار رکعات پڑھنے کے متعلق علما کا اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس میں ترک اولیٰ ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ دونوں ہی برابر ہیں۔ اس میں فقہا کے پانچ اقوال ہیں:

① امام شافعی کا قول: پوری نماز پڑھنا افضل ہے۔

② چند مالکیوں کا قول: دونوں برابر ہیں۔

③ شافعی کا صحیح قول اور حنبلی مذہب میں ایک روایت: قصر افضل ہے۔

④ امام مالک سے ایک روایت اور امام احمد سے ایک روایت کے مطابق پوری نماز مکروہ ہے۔

⑤ امام ابوحنیفہ کا قول اور مالک سے ایک روایت: قصر واجب ہے۔

تاہم ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ ظاہر قول اس کا ہے جو کہتا ہے کہ یہ سنت ہے اور پوری نماز مکروہ ہے، اس لیے اکثر علما کے نزدیک قصر کی نیت واجب نہیں، جس طرح امام ابوحنیفہ، امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد کا قول ہے۔[2]

شریعت میں قصر کی مسافت کی تعیین

سوال کیا صاحبِ شریعت حضرت محمد ﷺ نے قصر کی مسافت کی تعیین کی ہے؟

جواب سنت یہ ہے کہ مسافر قصر نماز پڑھے۔ وہ چار رکعات والی نماز کی دو رکعات پڑھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام سفروں میں یہی عمل کیا تھا۔ آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ نے سفر میں کبھی چار رکعات والی نماز کی

---

① سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٣) مسند أحمد (٣٧/١)

② مجموع الفتاویٰ (١٣-٧/٢٤)

چار رکعات نہیں پڑھیں بلکہ دو ہی پڑھی ہیں۔ آپ ﷺ سے جو یہ حدیث منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں سفر میں چار رکعات پڑھیں، وہ تمام محدثین کے نزدیک باطل ہے۔

اگر مسافر چار رکعات یعنی پوری نماز پڑھے تو اس کی نماز کے متعلق علما کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس طرح فجر جمعہ اور عید کی چار رکعات پڑھنی جائز نہیں، اسی طرح مسافر کے لیے چار رکعات پڑھنی جائز نہیں۔ دوسرا قول ہے: پوری نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن قصر افضل ہے۔ یہ عام فقہا کا قول ہے اور اس میں اختلاف شاذ ہے۔ قصر میں قصر کی نیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت یہی ہے۔ آپ ﷺ نے جب حجۃ الوداع کیا تو مسلمانوں کو دو دو رکعات ہی پڑھائیں، تاوقتیکہ آپ واپس مدینے آ گئے۔ آپ ﷺ نے عرفات اور مزدلفہ میں نمازیں اکٹھی پڑھائیں۔ مسلمان آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ ان میں مکی بھی تھے اور غیر مکی بھی۔ وہ جمع بھی کرتے اور قصر بھی۔ آپ ﷺ نے کسی کو قصر یا جمع کی نیت کا حکم نہیں دیا تھا۔ آپ ﷺ نے عید کے دن منیٰ میں قیام کیا اور منی کے ایام میں آپ مسلمانوں کو دو دو رکعات ہی پڑھاتے رہے۔ مکی اور غیر مکی مسلمان آپ کے پیچھے آپ کی نماز کے مطابق ہی پڑھتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی تھا۔ نہ رسول اللہ ﷺ نے اور نہ آپ کے بعد ابوبکر وعمر ہی نے کسی مکی کو منیٰ یا غیر منیٰ میں چار رکعات پڑھنے کا حکم دیا، اس لیے علما کے صحیح قول کے مطابق اہلِ مکہ بھی عرفہ ومزدلفہ میں جمع اور قصر کریں گے۔ یہ امام مالک اور ابن عیینہ جیسے عمومی فقہائے حجاز، اسحاق بن راہویہ، کچھ شوافع اور حنابلہ کی رائے ہے۔ ایک قول کے مطابق اہلِ مکہ جمع کریں گے لیکن قصر نہیں۔ یہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے اور امام احمد سے بھی یہی منصوص ہے۔ دوسرے قول کے مطابق وہ قصر کریں گے مگر جمع نہیں۔ یہ کچھ شوافع اور حنابلہ کی رائے ہے اور وہ کمزور ترین رائے ہے۔

قطعی درست بات یہی ہے کہ اہلِ مکہ وہاں قصر بھی کریں گے اور جمع بھی جس طرح رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ نیز یہ کسی مسلمان سے منقول نہیں کہ اس نے وہاں اہلِ مکہ سے کہا ہو کہ تم اپنی نماز پوری کرو، ہم تو مسافر ہیں۔ البتہ فتح مکہ کے موقع پر یہ منقول ہے جب آپ ﷺ نے مکہ کے اندر نماز پڑھائی تو لوگوں سے کہا تم اپنی نماز مکمل کرلو، ہم مسافر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی جب اہلِ مکہ کو مکہ شہر کے اندر نماز پڑھاتے تو کہتے تم اپنی نماز مکمل کرلو، لیکن جب منیٰ میں انھیں نماز پڑھاتے تب یہ نہیں کہتے تھے۔

اب آپ ﷺ کے پیچھے اہلِ مکہ کے قصر کرنے کی علت میں فقہا کا اختلاف ہے۔ ایک قول ہے کہ یہ حج کا ایک نسک اور شرعی حکم ہے، قصر کی وجہ سے نہیں، کیونکہ یہ سفر بہت تھوڑا ہے۔ ایک دوسرا قول ہے کہ یہ سفر کی وجہ سے حکم ہے۔ یہ دونوں اقوال بعض حنابلہ سے منقول ہیں اور دوسرا قول ہی درست ہے۔ وہ سفر ہی سے قصر کرتے تھے۔ اس

لیے جب وہ مکہ میں ہوتے اس وقت قصر نہیں کرتے تھے، حالانکہ حالتِ احرام میں ہوتے تھے۔

قصر وجوداً اور عدماً سفر ہی کے ساتھ معلق اور منسلک ہے، اس لیے مسافر کے سوا کوئی دو رکعات نہیں پڑھتا اور ہر مسافر دو رکعات پڑھتا ہے، جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''مسافر کی نماز دو رکعات ہیں۔ عیدِ فطر کی نماز دو رکعات ہیں۔ عیدِ قربان کی نماز دو رکعات ہیں۔ نمازِ جمعہ کی دو رکعات ہیں اور یہ مکمل نماز ہے، ادھوری نہیں۔ یہ حکم تمھارے نبی کی زبان سے جاری ہوا ہے۔''[1] صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''نماز دو دو رکعات کر کے فرض کی گئی، پھر حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور سفر کی نماز برقرار رکھی گئی۔''[2]

اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ کیا قصر خاص سفروں کے ساتھ مخصوص ہے یا ہر سفر میں جائز اور عام ہے۔ راجح قول یہی ہے کہ یہ ہر سفر میں جائز ہے، وہ چھوٹا ہو یا لمبا، جیسے اہلِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عرفات اور منیٰ میں قصر کی تھی۔ مکہ اور عرفات کے درمیان ایک برید کی مسافت ہے جو چار فرسخ بنتے ہیں (ایک فرسخ میں تین میل ہوتے ہیں جو کل بارہ میل ہوئے)۔

مزید برآں کتاب و سنت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو نماز قصر کرنے، روزہ چھوڑنے اور تیمّم کرنے کو کسی سفر کو چھوڑ کر کسی سفر کے ساتھ خاص کرتی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قصر کی زمانی اور مکانی کوئی حد متعین نہیں فرمائی۔ اس سلسلے میں جتنے اقوال منقول ہیں سب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قول بھی حجت کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ مضطرب اور متعارض اقوال ہیں، جن سے کوئی صحیح حد متعین کرنا ممکن نہیں۔ نیز عام سفروں میں زمین کو کسی معیاری پیمانے کے ذریعے ماپنا بھی ممکن نہیں۔ ہر مسافر کی حرکتِ سفر بھی مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا جس کو صاحبِ شریعت نے مطلق چھوڑا ہے اس کو مطلق ہی چھوڑا جائے اور جس کو مقید کیا ہے صرف اس کو مقید کیا جائے۔ بنا بریں مسافر ہر سفر میں قصر کر سکتا ہے۔ اسی طرح سفر سے متعلق قصر، سواری پر نماز اور موزوں پر مسح کے جتنے احکام ہیں وہ ان سب سے مستفید ہو سکتا ہے۔ جو علما سفر کی چھوٹے اور لمبے سفر میں تقسیم کر کے بعض احکام کو ایک قسم کے ساتھ اور بعض کو دوسری قسم کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں اور سفر کے جتنے احکام اور رخصتیں ہیں، ان کو صرف لمبے سفر کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں جس سے رجوع کرنا ضروری ہو۔

تاہم یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ سفر عرف میں سفر شمار کیا جاتا ہو، مثلاً مسافر باقاعدہ زادِ راہ لے کر نکلے اور وہ اپنے شہر سے باہر نکلے۔ یہ نہیں کہ وہ شہر کے اندر ایک محلے سے دوسرے محلے میں جائے اور مسافر بن

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٣) مسند أحمد (٣٧/١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٥)

جائے۔ اس کو مسافر نہیں کہا جاتا۔ مدینہ طیبہ بھی کئی آبادیوں اور بستیوں پر مشتمل تھا، جو ایک دوسرے کے قریب تھیں۔ ہر قبیلے کا اپنا نخلستان، قبرستان اور مساجد تھیں، کچھ قبا میں رہتے تھے، کچھ دوسری جگہوں پر، تو قبا کی طرف جانے والے کا جانا سفر میں شمار نہیں ہوتا، اسی لیے نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ اس طرح کے مقامات کی طرف جانے کو سفر شمار کرتے ہوئے قصر نہیں کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ﴾ [التوبة: ١٠١]

''اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے اردگرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہلِ مدینہ میں سے بھی۔''

تو تمام عمارتیں اسمِ مدینہ (شہر) میں داخل ہیں۔ اور جو بستیاں اہلیانِ شہر سے خارج ہوں، ان کو اعراب (دیہاتی) کہا جاتا ہے۔ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف سفر کرنے والا مسافر نہیں کہلاتا۔ تاہم یہ اجتہادی مسائل ہیں جو آدمی جس قول پر عمل کرے، قابلِ مواخذہ نہیں، واللہ أعلم۔ [1]

چار دن سے زائد قیام کے ارادے کی صورت میں قصر کا حکم

سوال ایک شخص کسی شہر کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ وہاں ایک مہینا یا اس سے زائد عرصہ قیام کرنا چاہتا ہے، وہ نماز پوری پڑھے یا قصر کرے؟

جواب اگر وہ اس شہر میں چار دن یا اس سے کم عرصہ قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو قصر کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ جب مکے میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے ایسا کیا۔ آپ ﷺ نے وہاں چار دن قیام کیا اور نماز قصر پڑھی۔ اگر اس سے زیادہ دن قیام کرنا ہو تو پھر اس میں اختلاف ہے، لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ نماز پوری پڑھی جائے۔ اگر وہ ٹھہرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور یہی کہتا ہو کہ میں کل چلا جاؤں گا یا پرسوں چلا جاؤں گا تو وہ جب تک رہے قصر کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکے میں دس دن سے کچھ زیادہ قیام کیا اور آپ ﷺ قصر ہی کرتے رہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے تبوک کے مقام پر بیس راتیں قیام کیا اور آپ ﷺ قصر ہی کرتے رہے۔ [2]

سفر میں دو نمازیں اکٹھی پڑھنے اور قصر کرنے کا حکم

سوال کیا سفر میں دو نمازوں کو اکٹھا کرنا افضل ہے یا قصر کرنا؟ اس میں علما کے اقوال اور دلائل کیا ہیں اور راجح قول کیا ہے؟

جواب الحمد للہ. اگر جمع کرنے کی ضرورت نہ ہو تو ہر نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا افضل ہے۔ نبی اکرم ﷺ سفر

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲٤/۱۰-۱۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲٤/۱۷)

میں اکثر نمازیں وقت ہی پر ادا کرتے تھے۔ بہت کم مرتبہ آپ ﷺ نے انھیں جمع کیا ہے۔ بہت سے علما جمع اور قصر میں فرق کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ قصر تو ثابت شدہ سنت ہے، لیکن جمع عارضی رخصت ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے تمام سفروں میں چار رکعات والی نمازوں کی دو رکعات ہی پڑھی ہیں۔ آپ ﷺ سے کسی صحابی نے نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے سفر میں چاروں رکعات والی نماز کی چار رکعات ہی پڑھی ہوں، بلکہ آپ ﷺ کے صحابہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو یہ روایت نقل کی جاتی ہے کہ ''انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (سفر میں) پوری نماز پڑھی اور روزہ چھوڑا۔'' یہ ضعیف حدیث ہے، بلکہ آپ ﷺ سے صحیح بخاری میں منقول ہے: ''نماز جب پہلے فرض ہوئی تو یہ دو رکعات ہی تھی، پھر حضر کی نماز میں اضافہ ہو گیا، لیکن سفر کی نماز برقرار رکھی گئی۔''[1] صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے: ''سفر کی نماز دو رکعات ہیں، جمعے کی نماز دو رکعات ہیں، عید الاضحیٰ کی نماز دو رکعات ہیں، عید الفطر کی نماز دو رکعات ہیں۔ یہ پوری ہیں، قصر نہیں۔ یہ فرمان تمھارے نبی کی زبان سے صادر ہوا ہے۔''[2]

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت:

﴿ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾ [النساء: ١٠١]

''اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کر لو، اگر ڈرو کہ تمھیں وہ لوگ فتنے میں ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا۔''

میں جو حکم بیان کرنے اور شبہہ زائل کرنے کے لیے گناہ کی نفی کا ذکر ہوا ہے تو یہ قصر کے سنت ہونے میں مانع نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ [البقرة: ١٥٨]

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا خوب طواف کرے۔''

اس شبہے کو زائل کرنے کے لیے گناہ کی نفی کی ہے جو صفا و مروہ کی سعی کرتے وقت ان کے دل میں پیدا ہوا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٥)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٣) مسند أحمد (٣٧/١)

تھا، کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگ صفا و مروہ کی سعی کو کراہت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تو صفا و مروہ کے درمیان چکر لگانا شریعت کا حکم ہے۔ اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، خواہ اسے رکن کہیں یا فرض یا سنتِ موکدہ۔

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوف اور سفر کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ قصر، قصرِ عدد (تعداد میں کمی) اور قصرِ ارکان (ارکانِ نماز میں کمی) دونوں کو شامل ہے۔ خوف کی وجہ سے ارکان میں قصر اور کمی کرنا جائز ہو جاتا ہے اور سفر کی وجہ سے تعداد میں قصر اور کمی جائز ہو جاتی ہے۔ جب یہ دونوں امور (سفر اور خوف) جمع ہو جائیں تو قصر کی دونوں صورتیں جائز ہو جاتی ہیں۔ اگر اکیلا سفر ہو خوف نہ ہو تو قصر کی ایک قسم، یعنی قصرِ عدد جائز ہو جاتی ہے۔

کیا مسافر کے فرض دو رکعات ہیں اور اس کو قصر کی نیت کی ضرورت نہیں ہوتی یا وہ نیت کے بغیر قصر نہیں کر سکتا؟ اس مسئلے میں علما کا اختلاف ہے اور اس میں دو اقوال ہیں: پہلا قول اکثر علما کا ہے جن میں ابوحنیفہ، مالک اور ایک روایت میں احمد بھی شامل ہیں۔ ابوبکر وغیرہ نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔ دوسرا قول شافعی کا ہے اور حنبلی مذہب میں دوسرا قول یہ ہے کہ خرقی وغیرہ نے اسے ہی اختیار کیا ہے، لیکن پہلا قول صحیح ہے، کیوں کہ سنت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ قصر ہی کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ نماز شروع کرنے سے پہلے انھیں یہ نہیں کہتے تھے کہ آپ قصر کریں گے۔ اسی طرح آپ ان کو قصر کی نیت کرنے کا حکم بھی نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بھول کر دو رکعات پڑھا دیں تو ذوالیدین نے آپ ﷺ سے کہا: کیا نماز کم ہوگئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہ میں بھولا ہوں نہ نماز ہی کم ہوئی ہے۔ اس نے کہا: نہیں، آپ بھولے ہیں۔[1] ایک روایت میں ہے: ''اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو میں تمھیں بتا دیتا۔''[2] آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ اگر نماز میں کمی ہوگئی تو میں تم کو قصر کی نیت کرنے کا حکم دیتا۔ اسی طرح جب آپ ﷺ نے دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھا تو آپ ﷺ نے نماز شروع کرنے سے پہلے ان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم نماز جمع کر کے پڑھیں گے، بلکہ انھیں اس وقت تک علم ہی نہیں تھا کہ وہ جمع کر کے پڑھ رہے ہیں، یہاں تک کہ پہلی نماز پڑھ لی گئی۔ معلوم ہوا کہ جمع میں بھی پہلی نماز شروع کرتے وقت جمع کی نیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے اور امام احمد سے منصوص اسی کے مطابق ہے۔ سفر میں چار رکعات والی نماز کی چار رکعات ہی پڑھنے میں علما کا اختلاف ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ حرام ہے۔ کچھ کے نزدیک مکروہ۔ کچھ کے نزدیک ترکِ اولیٰ اور کچھ کے نزدیک راجح۔ حنفی مذہب کے مطابق اور مالکی مذہب میں ایک قول کی رو سے قصر واجب ہے۔ مسافر چار رکعات نہ پڑھے۔ مالکی مذہب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٧٢)

میں دوسری روایت اور امام احمد سے ایک قول کے مطابق پوری نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ دوسری روایت میں ان کا مذہب اور امام شافعی کا ظاہر قول یہ ہے کہ قصر افضل ہے اور چار رکعات پڑھنا ترکِ اولیٰ۔ امام شافعی سے ایک دوسرا قول یہ منقول ہے کہ چار رکعات پڑھنا افضل ہے، لیکن یہ تمام اقوال سے ضعیف تر ہے۔

کچھ خوارج کا یہ مذہب ہے کہ قصر خوف کی حالت کے بغیر جائز نہیں۔ امام شافعی کا ایک قول بھی ذکر کیا جاتا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ ان سے صحیح ثابت نہیں، کیوں کہ متواتر سنت سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو امن کی حالت میں منیٰ میں دو دو رکعات پڑھائی ہیں۔[1] اسی طرح آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

جب معاملہ یہ ہے تو جمع اور قصر کو کیوں کر یکساں کیا جا سکتا ہے اگر کوئی ضرورت نہ ہو تو؟ تمام ائمہ کے نزدیک بالاتفاق ہر نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا ہی افضل ہے۔ جمع کے جواز میں تین اقوال ہیں:

ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ عرفات اور مزدلفہ کے سوا کہیں جمع کرنا جائز نہیں۔ مالک اور ایک روایت میں احمد کا مذہب ہے کہ مسافر جب ٹھہرا ہو تو جمع نہ کرے، صرف اس وقت جمع کرے جب چل رہا ہو، بلکہ امام مالک کے نزدیک تسلسل کے ساتھ چل رہا ہو، شافعی اور دوسری روایت میں احمد کا مذہب ہے مسافر جمع کر سکتا ہے گو ٹھہرا ہوا ہی ہو۔ اس اختلاف کا سبب جمع کی وہ احادیث ہیں جو ان تک پہنچی ہیں کیوں کہ جمع کی احادیث بہت کم ہیں۔ عرفات اور مزدلفہ میں جمع پر تو سب کا اتفاق ہے اور یہ تواتر کے ساتھ منقول ہے، اس لیے اس میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ امام ابوحنیفہ صرف اس کے قائل ہیں کیوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں مروی ہے، وہ کہتے ہیں: ''میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ ﷺ نے نماز کو اس کے وقت پر نہ پڑھا ہو، سوائے مزدلفہ میں فجر کی نماز کے اور عرفات سے واپسی کی رات مغرب کی نماز کے۔''[2] اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ جس وقت میں معمول کے مطابق فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، اس سے پہلے پڑھی، کیوں کہ صحیح میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ''آپ ﷺ نے مزدلفہ میں فجر کی نماز فجر کے روشن ہوتے ہی پڑھ لی۔''[3] اور اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ فجر کو مزدلفہ یا غیر مزدلفہ میں طلوعِ فجر کے بعد ہی پڑھا جاتا ہے، لیکن مزدلفہ میں آپ ﷺ نے شدید اندھیرے میں پڑھی۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٣٣)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٩)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

دیگر ائمہ کو جمع کے متعلق صحیح احادیث پہنچیں، جس طرح حضرت انس، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور معاذ رضی اللہ عنہم کی احادیث ہیں، جو سب صحیح میں مروی ہیں۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب زوالِ آفتاب سے پہلے سفر کے لیے نکلتے تو ظہر کو عصر کے وقت تک موخر کرتے، پھر سواری سے اترتے اور دونوں کو اکٹھا پڑھتے، اور جب زوالِ آفتاب کے بعد سفر کرتے تو ظہر اور عصر کو اکٹھا پڑھ کر سوار ہوتے۔''[1] صحیح کی ایک روایت میں ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر میں دو نمازوں کو اکٹھا کرنا چاہتے تو ظہر کو عصر کے اول وقت کے داخل ہونے تک موخر کر دیتے، پھر دونوں کو اکٹھا پڑھتے۔''[2]

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جلدی جانا ہوتا تو مغرب اور عشا کو اکٹھا کر لیتے۔''[3] صحیح کی ایک روایت میں ہے: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جب تسلسل کے ساتھ سفر کرنا ہوتا تو سرخی چھپ جانے کے بعد مغرب وعشا کو اکٹھا کر کے پڑھتے اور کہتے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تسلسل کے ساتھ سفر کرنا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب وعشا کو اکٹھا کر کے پڑھتے۔''[4] صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے سفر میں دو نمازوں کو اکٹھا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر، عصر اور مغرب وعشا کو اکٹھا کر کے پڑھا۔''[5] سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کس چیز نے آپ کو اس کام پر اکسایا؟ انھوں نے جواب دیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت تنگی میں نہ پڑے۔''[6] اسی طرح صحیح مسلم میں ابوطفیل کے واسطے سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں ظہر وعصر اکٹھا اور مغرب وعشا کو ایک ساتھ پڑھا۔'' راوی کہتا ہے: میں نے حضرت معاذ سے پوچھا: کس چیز نے آپ کو اس پر اکسایا؟ انھوں نے جواب دیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت تنگی میں نہ پڑے۔'' بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بھی نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھا، صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کسی خوف اور بارش کے بغیر ظہر اور عصر اکٹھی پڑھائی۔''[7]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰٦۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰٤)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰٤)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۰٤۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۳)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۳)

[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۵)

[6] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰٦)

[7] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۵)

ایک روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں سات اور آٹھ رکعات پڑھائیں، ظہر وعصر کو جمع کیا اور مغرب وعشا کو۔''[1] ایوب کا قول ہے کہ شاید یہ بارش کی رات تھی۔ اہلِ مدینہ بارش کی رات مغرب اور عشا کو اکٹھا کر کے پڑھتے تھے۔ ان کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی انھیں اکٹھا ہی پڑھاتے۔ یہ رسول اللہ ﷺ سے مرفوع بھی مروی ہے اور یہ کچھ صحابہ کا عمل بھی تھا۔ صحابہ نے جو یہ کہا ہے: ''آپ ﷺ نے چاہا کہ آپ کی امت تنگی میں نہ پڑے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع سے مراد یہ نہیں کہ پہلی نماز کو اس کے آخر وقت تک موخر کیا جائے اور دوسری کو اس کے اول وقت میں مقدم کیا جائے، پھر دونوں کو اکٹھا کیا جائے۔ اس جیسا اہتمام بہت زیادہ تنگی کا باعث بنتا ہے۔ پھر یہ ہر ایک کے لیے ہر وقت میں جائز ہے، کیوں کہ تنگی کو دور کرنا اسی وقت ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے عذر والوں کو اسی کام کی رخصت دی ہو، جس کے ذریعے ان سے تنگی کو دور کیا جا سکتا ہو جو ان کے لیے نہیں ہوتا جن کے پاس کوئی عذر نہیں ہوتا۔

یہ اس قاعدے پر مبنی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ عمل کیا کرتے تھے جو اس طرح ہے کہ اہلِ عذر کے لیے اوقات تین اور باقیوں کے لیے پانچ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں میں نماز قائم کر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں بھی۔''

اس آیت میں تین اوقات مذکور ہیں۔ دن کا دوسرا حصہ ظہر عصر پر مشتمل ہے اور ''زلف'' مغرب وعشا پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''نماز قائم کر سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک۔''

''دلوك'' صحیح ترین قول کے مطابق زوال کو کہتے ہیں، عربی میں کہا جاتا ہے: ''دَلَکَتِ الشَّمْسُ''، ''زَالت الشمس''، ''زاغت الشمس'' اور ''مالت الشمس'' سب کا معنی زوال ہی ہے۔ اس آیت میں دلوک اور غسق (اندھیرا) کا ذکر ہوا۔ دلوک (زوال) کے بعد ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور غسق (اندھیرا) میں مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں تو اس آیت میں پہلا وقت جو دلوک ہے اور آخری وقت جو غسق ہے مذکور ہوئے۔ غسق رات اور اندھیرے کے اکٹھا ہونے کو کہا جاتا ہے۔

اسی لیے صحابہ میں سے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ وغیرہ کا قول ہے کہ اگر حیض والی عورت طلوعِ فجر سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٠٥)

پہلے پاک ہو تو وہ مغرب اور عشا کی نمازیں بھی پڑھے۔ اگر غروبِ آفتاب سے پہلے پاک ہو تو ظہر اور عصر کی نمازیں بھی پڑھے۔ یہ جمہور فقہا یعنی مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا عرفات اور مزدلفہ میں دو نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھنا بھی ان دونوں جگہوں کے علاوہ دیگر جگہوں پر عذر کے ہوتے ہوئے اکٹھا کرنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ کے لیے ظہر کو اس کے وقت پر اور عصر کو اس کے وقت پر پڑھنا ممکن تھا، لیکن آپ ﷺ نے حج کی اس عبادت اور عرفات میں وقوف میں مشغول ہونے کی وجہ سے عصر کو مقدم کیا۔ اسی لیے جمہور علما کا اختیار کردہ قول یہی ہے کہ مزدلفہ اور عرفات میں وہ بھی قصر کریں جو قصر کی مسافت کو پہنچتے ہیں اور وہ بھی جو قصر کی مسافت کو نہیں پہنچتے۔ نبی اکرم ﷺ نے جب عرفات اور مزدلفہ میں نمازیں پڑھائیں تو آپ ﷺ کے ساتھ مکی اور غیر مکی سب مسلمانوں نے نمازیں پڑھیں۔ آپ ﷺ نے کسی کو عصر کو اس کے وقت پر اور مغرب کو اس کے وقت پر پڑھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ جن شافعی اور حنبلی فقہا کا کہنا ہے کہ اہلِ مکہ نمازیں جمع نہ کریں، ان کا قول بہت زیادہ کمزور ہے اور واضح اور یقینی سنت کے خلاف ہے۔ ان علما کا عذر یہ ہے کہ یہ جمع کا سبب طویل سفر کو قرار دیتے ہیں، لیکن درست یہ ہے کہ جمع طویل سفر کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ بارش اور بیماری کی وجہ سے بھی نمازیں جمع کی جا سکتی ہیں، جس طرح سنت میں استحاضہ میں مبتلا خاتون کو جمع کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے دو احادیث میں اس کو جمع کرنے کا حکم دیا ہے۔ واللہ أعلم[1]

نماز جمع کرنے کے عذر

سوال کیا بارش، شدید آندھی اور شدید سردی وغیرہ کی وجہ سے مغرب اور عشا کی نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھا جا سکتا ہے یا یہ رخصت صرف بارش کے لیے ہے؟

جواب الحمد للہ. بارش، شدید ٹھنڈی ہوا اور شدید کیچڑ کی وجہ سے مغرب اور عشا کی نمازوں کو اکٹھا کر کے پڑھنا صحیح تر قول کے مطابق جائز ہے۔ یہ امام مالک اور احمد کا ظاہرِ مذہب ہے۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/١٩۔٢٦)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٩)

نمازِ جمعہ

مسافر کے لیے جمعہ اور عیدین کا حکم

سوال کیا نماز جمعہ اور عیدین کی نماز قائم کرنے کے لیے مقیم ہونا شرط ہے یا مسافر بھی ان نمازوں کو ادا کرے؟ دوسرے لفظوں میں کیا مسافر پر جمعہ فرض ہے؟

جواب اس مسئلے میں فقہا کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: ان سب کے لیے مقیم ہونا شرط ہے۔ یہ سفر میں مشروع نہیں۔ یہ اکثر فقہا کا قول ہے۔ یہی امام ابو حنیفہ، امام مالک اور ظاہر روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔

دوسرا قول: یہ جمعے میں شرط ہے، عید میں نہیں۔ یہ امام شافعی کا قول اور امام احمد سے دوسری روایت ہے۔

تیسرا قول: یہ جمعہ میں شرط ہے، نہ عیدوں میں۔ یہ بعض ظاہریہ کا قول ہے۔ ان کی دلیل مطلق امر ہے۔ نیز یہ آیت بھی ﴿ إِذَا نُودِيَ ﴾ وغیرہ۔ ان کا گمان ہے کہ شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو ان کو مقیم کے ساتھ خاص کرتی ہو۔ جو جمعہ اور عید میں فرق کرتے ہیں ان کا کہنا ہے: عید یا نفل ہے یا فرضِ کفایہ اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا فرض بھی ساقط نہیں ہوتا جس طرح جمعہ کے ساتھ ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ مزید برآں نوافل مقیم اور مسافر دونوں کے لیے مشروع اور جائز ہیں، مثلاً چاشت کی نماز، تہجد، سنتیں مسافر بھی پڑھ سکتا ہے اور فرض کفایہ نمازِ جنازہ کی طرح ہوتا ہے۔

بلاشبہہ پہلا قول ہی درست ہے کہ یہ مسافر کے لیے مشروع نہیں، یعنی اس کو ان کا حکم نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں بے شمار سفر کیے، آپ ﷺ نے عمرہ اور حج کے علاوہ تین عمرے کیے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک تھے اور آپ ﷺ نے بیس سے زیادہ غزوات میں شرکت فرمائی، لیکن آپ ﷺ سے کسی ایک صحابی نے بھی یہ نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے اپنے کسی سفر میں کبھی جمعہ یا عید کی نماز پڑھائی ہو، بلکہ آپ ﷺ اپنے تمام سفروں میں دو دو رکعات ہی پڑھا کرتے تھے اور عام دنوں کی طرح جمعہ کے دن بھی دو رکعات ہی پڑھتے۔ کسی صحابی نے کبھی یہ بھی نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے کسی سفر میں جمعہ کے دن نماز سے

پہلے کھڑے ہو کر یا اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے خطبہ ارشاد فرمایا ہو، جس طرح آپ ﷺ عید کا خطبہ دیا کرتے تھے یا منبر پر کھڑے ہو کر خطاب کیا ہو، جس طرح آپ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ بعض اوقات سفر میں کسی عارضی صورتِ حال کے پیشِ نظر خطبہ دیتے تو صحابہ اس کو بھی نقل کر دیتے تھے جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، لیکن یہ کسی صحابی سے نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے کبھی دورانِ سفر میں جمعہ کے دن خطبہ جمعہ دیا ہو، بلکہ یہ بھی منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے دورانِ سفر میں جمعہ کے دن نماز بلند آواز سے پڑھائی ہو اور یہ تو عام سی بات ہے کہ اگر معمول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بلند آواز سے نماز پڑھاتے اور خطبہ دیتے تو صحابہ اس کو ضرور نقل کرتے۔ عرفات کے دن آپ ﷺ نے خطبہ دیا، پھر اترے اور دو رکعات پڑھائیں۔ کسی صحابی نے نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے ان دو رکعات میں بلند آواز سے قراءت کی ہو اور وہ خطبہ جمعہ کے لیے نہیں تھا، بلکہ حج کے لیے تھا، کیوں کہ اگر وہ جمعہ کا خطبہ ہوتا تو آپ (اپنے سفرِ حج کے دوران میں) دیگر جمعہ کے دنوں میں بھی خطبہ دیتے، اس لیے تمام علمائے کرام کا یہی موقف ہے کہ عرفات میں خطبہ دیا جائے، گو وہ جمعہ کا دن نہ ہو۔ اس متواتر نقل سے ثابت ہوا کہ وہ عرفات کے دن ان کے لیے خطبہ تھا، اگر وہ جمعہ کا دن نہ بھی ہو۔ وہ خطبہ جمعہ کے دن کے لیے نہیں ہو گا۔ اسی طرح نہ آپ ﷺ نے اور نہ آپ ﷺ کے خلفائے راشدین ہی نے منیٰ میں عید کی نماز پڑھی۔ آپ ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان کے مہینے میں مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے وہاں عیدالفطر پائی، لیکن عید کے دن نمازِ عید نہ پڑھائی اور کسی مسلمان نے یہ نقل بھی نہیں کیا (کہ آپ نے اس دن عید پڑھائی ہو) یہ سادہ سی بات ہے کہ اگر آپ ﷺ نے مکہ میں عید کی نماز پڑھائی ہوتی کہ جب آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ مسلمان تھے اس کو نقل کرنے کے اسباب اس قدر زیادہ تھے اور ہمتیں اتنی بلند تھیں کہ کوئی پیچھے نہ رہتا۔ اسی طرح معرکہ بدر بھی رمضان کے مہینے میں برپا ہوا۔ عید کا دن بھی سفر میں آیا، لیکن آپ ﷺ نے سفر میں نمازِ عید نہ پڑھی۔

مزید برآں مدینے میں کوئی بھی نمازِ عید آپ ﷺ کے سوا کسی کے ساتھ نہیں پڑھتا تھا، جس طرح وہ جمعہ بھی آپ ﷺ کے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے، حالانکہ مدینہ میں بہت سی مساجد تھیں۔ انصار کے ہر محلے میں مسجد تھی۔ ان کے امام تھے جو انھیں پانچ نمازیں پڑھاتے تھے، لیکن وہ جمعہ اور عید ان کے پیچھے نہیں پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عید ان کے نزدیک جمعہ کی جنس سے تھی، مطلق نوافل کی جنس سے نہیں تھی اور نہ نمازِ جنازہ کی جنس ہی سے تھی۔ واللہ أعلم (ملخصاً)[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۱۷۷)

جمعہ کے لیے تعداد

سوال ایک بستی کے مکینوں کی تعداد چالیس سے کم ہے، ان پر جمعہ فرض ہے یا ظہر کی نماز؟

جواب اکثر علما کے نزدیک اگر بستی کے مکینوں کی تعداد چالیس سے کم ہو تو وہ ظہر کی نماز پڑھیں۔ امام شافعی اور احمد کا مشہور قول یہی ہے۔ اسی طرح ابو حنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن شافعی، احمد اور اکثر علما کہتے ہیں کہ اگر وہ چالیس ہوں تو جمعہ پڑھیں۔[1]

یہ شیخ الاسلام نے ان ائمہ کے اقوال نقل کیے ہیں جس طرح ان کی عادت ہے کہ وہ بعض جوابوں میں کسی قول کو راجح قرار دیے بغیر محض علما کے اقوال درج کر دیتے ہیں، لیکن ان کا مشہور اختیار کردہ قول یہ ہے کہ جمعہ تین افراد کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے، ایک خطبہ دے اور دو سامعین سنیں۔

جمعہ کے دن اذان کے بعد سنتوں کی حیثیت اور بعد از نماز سنتوں کی تعداد

سوال کیا رسول اللہ ﷺ، کسی صحابی، تابعی یا کسی امام سے جمعہ کے دن پہلی اذان کے بعد نفل نماز یا سنتیں پڑھنا منقول ہے؟ نیز کیا کسی فقہی مذہب میں ان کا ذکر ملتا ہے، پھر کیا یہ حدیث: «بَينَ كُلِّ أَذَانَينِ صَلاةٌ»[2] ''ہر دو اذانوں (یعنی اذان اور تکبیر) کے درمیان نماز ہے۔'' جمعہ کے دن کے ساتھ خاص ہے یا تمام اوقات میں عام ہے؟ نیز جمعہ کے بعد کی سنتوں کی کیا تعداد ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن اذان کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے اور کسی صحابی نے یہ آپ ﷺ سے نقل بھی نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس وقت اذان دی جاتی تھی جب آپ منبر پر بیٹھ جاتے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے اور آپ ﷺ دو خطبے دیتے، پھر حضرت بلال اقامت کہتے اور آپ ﷺ لوگوں کو نمازِ جمعہ پڑھاتے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اذان کے بعد آپ ﷺ یا کوئی مسلمان جو آپ ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھتا تھا اٹھ کر سنتیں پڑھنا شروع کر دے۔ اسی طرح کسی صحابی نے یہ بھی نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ جمعہ کے دن مسجد میں آنے سے پہلے گھر میں کوئی نماز پڑھتے ہوں، بلکہ آپ ﷺ نے جمعہ سے پہلے نماز کی کوئی تعیین اور مقدار مقرر نہیں کی۔

آپ ﷺ سے جتنے الفاظ منقول ہیں، ان سب میں اس بات کی ترغیب تو ہے کہ آدمی جب جمعہ کے دن مسجد میں آئے تو نماز پڑھے، لیکن آپ ﷺ نے اس کا کوئی وقت مقرر کیا ہے نہ تعداد، مثلاً آپ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (١٨٧/٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨)

«مَنْ بَكَّرَ وَابْتَكَرَ، وَمَشَى وَلَمْ يَرْكَبْ وَصَلَّى مَا كُتِبَ لَهُ»[1]

''جو صبح صبح اور جلدی جلدی پیدل مسجد آیا، سوار ہو کر نہیں اور اس نے اتنی نماز پڑھی جتنی اس کے نصیب میں تھی۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے۔ وہ جمعہ کے دن جب مسجد آتے تو مسجد میں داخل ہوتے ہی جتنی نماز آسانی سے پڑھ سکتے تھے پڑھتے۔ کوئی دس رکعات پڑھتا۔ کوئی بارہ، کوئی آٹھ اور کوئی اس سے بھی کم۔ اس لیے جمہور علما کا اتفاق ہے کہ جمعہ کے دن جمعہ سے پہلے سنتوں کا کوئی وقت مقرر ہے نہ تعداد، کیوں کہ وقت اور تعداد دونوں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہو سکتے ہیں یا فعل سے، لیکن اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور فعل سے کوئی سنت مقرر نہیں کی۔ یہی امام مالک، امام شافعی، اور ان کے اکثر اصحاب کا مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے۔

علما کا ایک گروہ اس خیال کا حامل ہے کہ جمعہ سے پہلے سنتیں ہیں۔ کچھ ان کو دو رکعات قرار دیتے ہیں، جیسے اصحابِ شافعی اور احمد کے ایک طائفے کا کہنا ہے اور کچھ ان کو چار مقرر کرتے ہیں۔ یہ اصحابِ ابو حنیفہ اور اصحابِ احمد کے ایک گروہ سے منقول ہے۔ امام احمد سے اس کی دلیل اور استدلال بھی منقول ہے۔ ان میں کچھ علما ضعیف حدیث سے استدلال کرتے ہیں اور کچھ اس کو قصر ظہر قرار دے کر استدلال کرتے ہیں کہ ظہر کی سنتیں اس کی سنتیں ہیں، لیکن یہ استدلال دو وجوہ کی بنا پر غلط ہے:

1. جمعہ کے بالاتفاق مخصوص احکام ہیں جو اس کو ہر روز کی ظہر کی نماز سے ممتاز کرتے ہیں، اگرچہ جمعہ کو ظہر قصر کہہ دیا جاتا ہے، لیکن اس کے لیے وقت شرط ہے، اس لیے اس کی قضا نہیں دی جاتی، لیکن ظہر کو قضا کیا جا سکتا ہے۔ جمعہ کے لیے عدد، بستی اور امام کی اجازت وغیرہ کی شرائط ہیں جو ظہر کے لیے نہیں، اس لیے جمعہ کے احکام کو ظہر کے احکام سے ملانا جائز نہیں۔ پھر جمعہ کے کچھ مخصوص احکام ہیں جن کی بنا پر وہ ظہر سے ممتاز ہو جاتا ہے لہٰذا جمعہ کسی حکم میں ظہر کے ساتھ شریک ہے اور کسی حکم میں اس سے علاحدہ حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اختلافی مقام کو مشترک یا جداگانہ حکم کے ساتھ کسی دلیل کے بغیر ملایا نہیں جا سکتا، لہٰذا یہاں سنت کو مشترک مقام کے ساتھ ملانا بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو جداگانہ مقام کے ساتھ ملانا۔

2. فرض کریں جمعہ ظہرِ قصر ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفر میں نہ ظہرِ قصر کی پہلی سنتیں پڑھا کرتے تھے نہ بعد والی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضر میں ہوتے اور ظہر کی نماز پوری پڑھتے، اس وقت اس سے پہلے چار سنتیں پڑھتے۔ تاہم اگر جمعہ کو قصرِ ظہر کے ساتھ ملایا جائے تب بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چار رکعات مقرر کی جائیں، کیوں کہ سفر میں

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٧) الترغيب والترهيب (٦٨/١)

اگر فرض دو رکعات ہو سکتے ہیں تو سنتیں بھی دو ہی ہونی چاہئیں۔ نیز آپ ﷺ نے اپنے کسی سفر میں کبھی چار رکعات نہیں پڑھیں، چار رکعات والی نماز کی بھی دو رکعات ہی پڑھی ہیں، جس طرح اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

بنا بریں اگر جمعہ کو قصرِ ظہر کے قائم مقام قرار دیا جائے تو یہ سنت نہیں کہ اس کے ساتھ مقیم کی سنتوں کو ملایا جائے، بلکہ مسافر کی قصر نماز کی طرح قرار دیا جائے۔ لہٰذا یہاں یہ کہنا درست ہے کہ جمعہ سے پہلے کوئی مقرر نماز اور سنت راتبہ نہیں۔ اگر آپ ﷺ کے عہد میں دو اذانیں ہوتیں تو بھی آپ ﷺ کا یہ فرمان ثابت ہے: ''ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی اور پھر کہا: جو چاہے۔''[1] اس خدشے کے پیشِ نظر کہ لوگ اس کو سنت نہ بنا لیں۔'' اس صحیح حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفل نماز عصر سے پہلے، مغرب کی نماز سے پہلے اور عشا کی نماز سے پہلے اذان کے بعد جائز ہے، لیکن یہ سنتِ راتبہ یعنی سنتِ موکدہ نہیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہ کرام مغرب کی نماز کے بعد اقامتِ نماز سے پہلے دو رکعات پڑھا کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ ان کو دیکھتے، لیکن آپ ﷺ نے نہ ان کو اس کا حکم دیا نہ اس سے منع کیا اور نہ خود ہی پڑھی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جائز کام ہے۔

کچھ لوگوں نے اس دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمعے کی اذانیں دو نہیں ہوتی تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگ بہت زیادہ ہو گئے اور ان تک اذان نہ پہنچتی جو ان کے منبر پر بیٹھنے کے وقت دی جاتی تو انھوں نے دوسری اذان کا حکم دیا، لیکن اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے جاری کیا، اور اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو گیا تو یہ شرعی اذان بن گئی۔ ایسی صورت میں اس اذان اور دوسری اذان کے درمیان نماز پڑھنا جائز اور اچھا عمل ہے، لیکن یہ سنتِ راتبہ نہیں، یہ اسی طرح ہے جس طرح مغرب کی اذان کے بعد اور جماعت سے پہلے کی دو سنتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی پہلی اذان کے بعد نماز پڑھے تو اس کو منع نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی نہ پڑھے تو اس کو بھی برا نہیں کہا جائے گا۔ یہ سب سے معتدل رائے ہے اور امام احمد کے اقوال بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔

اگر جاہل سمجھیں کہ یہ سنتِ موکدہ یا واجب ہے تو ایسی صورت میں لوگوں کو بتانے کے لیے کہ یہ سنتِ موکدہ یا واجب نہیں، انھیں نہ پڑھنا افضل ہے، بالخصوص جب لوگ ان پر مداومت اور ہمیشگی کریں لہٰذا کبھی کبھار انھیں چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ یہ فرض کے مشابہ نہ ہو جائیں۔ اسی وجہ سے اکثر علمائے کرام نے جمعے کے دن فجر کی نماز میں سورت سجدہ کی تلاوت پر عدمِ ہمیشگی کو پسند کیا ہے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے یہ عمل ثابت ہے۔ اگر ایسے عمل پر مداومت کو پسند نہیں کیا گیا جو سنت سے ثابت ہے تو جو ثابت ہی نہیں اس پر مداومت، چہ معنی دارد؟! (ملخصاً)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٨)

جمعے کے بعد کی سنتیں:

جمعے کے بعد کی سنتوں کا ثبوت بخاری و مسلم میں مروی اس حدیث سے ملتا ہے کہ ''آپ ﷺ جمعے کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔''[1] جس طرح صحیحین میں یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ فجر سے پہلے، ظہر کے بعد، مغرب کے بعد اور عشا کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔[2] ظہر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ذکر ہے کہ آپ اس سے پہلے دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔ صحیح بخاری میں حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے دن اور رات میں فرض کے علاوہ بارہ رکعات نفل پڑھیں، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔''[3] سنن میں اس کی تفصیل اس طرح وارد ہوئی ہے: ''چار ظہر سے پہلے اور دو اس کے بعد، دو مغرب کے بعد، دو عشا کے بعد اور دو فجر سے پہلے۔''[4] یہ وہ راتب اور موکد سنتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے ثابت ہیں اور ان کا مدار ان تین احادیث پر ہے جن میں سے ایک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، دوسری حضرت امِ حبیبہ سے اور تیسری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔ رسول اللہ ﷺ رات کو قیام بھی کیا کرتے تھے جو گیارہ رکعات پر مشتمل ہوتا یا تیرہ رکعات پر۔ آپ ﷺ کی دن رات کی فرض اور نفل نمازوں کی رکعات کی مجموعی تعداد چالیس رکعات کے قریب بنتی ہے۔ ان موکد اور راتب سنتوں کے متعلق لوگوں کے تین اقوال ہیں:

کچھ فقہا ضعیف، بلکہ باطل احادیث کے ساتھ ان کی تعیین کرتے ہیں، جس طرح اہلِ عراق کے مذہب میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ کچھ اصحابِ شافعی اور اصحابِ احمد بھی اس میں ان کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں موکدہ اور غیر موکدہ سنتوں کے نام سے ہر نماز کی سنتیں مقرر ہیں جو ضعیف بلکہ باطل احادیث پر مبنی ہیں۔ تیسرے گروہ نے اپنی طرف سے کئی ہفتہ وار یا سالانہ نفلی نمازیں بنا لی ہیں، مثلاً اتوار کی نماز، سوموار کی نماز، جمعرات کی نماز، رجب کے آغاز میں نماز الفیہ، عیدِ فطر اور عیدِ اضحیٰ کی رات کی نماز، یومِ عاشورا کی نماز وغیرہ۔ یہ نمازیں ابو طالب مکی، ابو حامد غزالی اور عبدالقادر وغیرہ کی کتب میں مذکور ہیں۔ یہ تمام نمازیں حدیث کا علم رکھنے والے ماہرین اور علما کے نزدیک باطل اور جھوٹ ہیں۔ لیکن یہ موضوع روایات کچھ اہلِ علم کو پہنچیں اور انھوں نے ان کو صحیح سمجھتے ہوئے ان پر عمل کیا۔ ان کے نیک ارادے اور اجتہاد کی وجہ سے ان کو اجر ملے گا۔ سنت کی مخالفت کی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٩)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٢٨)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٥١)

بنا پر نہیں، کیوں کہ جس کے سامنے سنت واضح ہو جائے، پھر بھی وہ دوسری بات کو اس سے بہتر خیال کرتا رہے وہ گمراہ یا بدعتی بلکہ کفر کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

معتدل اور بہتر رائے وہی ہے جو صحیح اور ثابت شدہ سنت کے مطابق ہو اور یہ صحیح ثابت ہے کہ آپ ﷺ جمعہ کے بعد دو رکعات ادا کیا کرتے تھے۔ صحیح مسلم میں ایک یہ حدیث بھی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو آدمی جمعہ کے بعد نماز پڑھنے والا ہو تو وہ چار رکعات پڑھے۔''[1] کچھ صحابہ سے ان دونوں روایات کو جمع کرتے ہوئے چھے رکعات پڑھنا بھی مروی ہے۔ جمعہ اور دیگر نمازوں میں فرض اور سنتوں کے درمیان کچھ فرق رکھا جائے، کیوں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ ملانے سے منع کیا ہے۔ ان دونوں میں قیام یا بات کے ساتھ فرق کیا جائے۔'' اس میں فرض کو غیر فرض سے اور عبادت کو غیر عبادت سے ممتاز کرنے کی حکمت پنہاں ہے، مثلاً سحری میں تاخیر کرنا اور افطاری میں جلدی کرنا، عید فطر کے دن نماز سے پہلے کچھ کھانا مستحب ہے اور رمضان کے استقبال میں ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھنا منع ہے تو یہ تمام احکام مامور بہ اور غیر مامور بہ میں فرق رکھنے اور عبادت کو غیر عبادت سے علاحدہ رکھنے کے لیے جاری کیے گئے۔

اسی طرح جمعہ کو جو فرض ہے، غیر جمعہ سے نمایاں کرنا ہے۔ نیز رافضہ جیسے کئی بدعتی جمعہ کی نیت نہیں کرتے، بلکہ ظہر کی نیت کرتے ہیں، وہ ظاہراً سلام پھیرتے ہیں، لیکن حقیقت میں سلام نہیں پھیرتے، بلکہ ظہر پڑھتے ہیں اور دیکھنے والا سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہ سنتیں پڑھ رہے ہیں۔ اگر فرض اور نفل میں فرق کر لیا جائے تو اس بدعت کی روک تھام بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ أعلم[2]

نمازِ جمعہ پانے کے لیے بھاگ کر جانا

سوال ایک آدمی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے نکلا کہ اقامت ہو گئی۔ اب وہ نماز پانے کے لیے بھاگ کر جائے یا آہستہ جائے، چاہے نماز نکل ہی جائے؟

جواب الحمد للہ، اگر اس کو نماز نکل جانے کا ڈر ہو تو وہ تیز چل سکتا ہے، تاکہ ایک رکعت یا زیادہ پا سکے۔ اگر وہ پرسکون انداز میں چل کر نماز پا سکتا ہو تو یہ افضل ہے، بلکہ یہی سنت ہے۔ واللہ أعلم[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۸۱)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۱۸۸۔۲۰۴)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۰۴)

جمعہ کے دن نمازِ فجر میں سورت سجدہ پر مداومت کا حکم

سوال کیا جمعے کے دن فجر کی نماز میں سورت "الٓمٓ السجدة" کی قراءت پر ہمیشگی کرنا واجب ہے یا نہیں؟

جواب الحمد لله. جمعے کے دن فجر کی نماز میں "الٓمٓ السجدة" یا کسی دوسری سجدے والی سورت کی قراءت واجب نہیں۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ جو اس کو واجب سمجھتا ہے یا نہ پڑھنے والے کی مذمت کرتا ہے وہ غلط اور گمراہ ہے، اس کو توبہ کرنی چاہیے۔

علما نے تو صرف اس کے مستحب یا مکروہ ہونے میں اختلاف کیا ہے۔ امام مالک کے نزدیک بلند آواز سے سجدے والی آیت کی قراءت مکروہ ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں، جس طرح ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کی رائے ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں یہ حدیث ثابت ہے کہ "آنحضرت ﷺ نے عشا کی نماز میں سورت انشقاق کی تلاوت کی اور سجدہ کیا۔"[1] صحیحین میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ جمعے کے دن فجر کی نماز میں سورت سجدہ اور سورت دہر کی قراءت کیا کرتے تھے۔[2] تاہم امام مالک کے نزدیک قصداً ایسی سورت پڑھنی مکروہ ہے، جس میں سجدہ ہو، لیکن شافعی اور احمد ایسی سورتوں کو پڑھنا مستحب سمجھتے ہیں جن کا ذکر سنت میں ہوا ہے، مثلاً جمعے کی نماز میں سورت جمعہ اور سورت منافقون کی تلاوت، عید میں سورت قمر کی قراءت اور جمعے کی فجر میں سجدہ اور دہر کی تلاوت موقع کی مناسبت سے ہے۔

یہاں دو اہم مسائل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

1. علما کا اتفاق ہے کہ سورت سجدہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری سجدے والی سورت کی قراءت مستحب نہیں، کیوں کہ اس سورت کی قراءت اس میں سجدے کی وجہ سے نہیں، بلکہ خود ان دونوں سورتوں کی وجہ سے ہے۔ سجدہ تو اس میں محض اتفاقاً آیا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں چونکہ کائنات کی تخلیق اور مرنے کے بعد اٹھنے کے امور کا بیان ہے جو جمعے کے دن کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان دونوں سورتوں کی قراءت کی جاتی ہے۔
2. اس پر اس انداز میں ہمیشگی نہیں کرنی چاہیے جس سے جاہلوں کو ان کے واجب ہونے کا گمان گزرے اور وہ ان کو نہ پڑھنے والے کو غلط سمجھیں، بلکہ کبھی کبھی ان کو چھوڑ دینا چاہیے، کیوں کہ یہ واجب نہیں، اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ انھیں مکمل پڑھنا چاہیے، یہی سنت ہے۔ والله أعلم[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٨٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٠٤_٢٠٥)

جمعہ کے دن عید ہونے کی صورت میں جمعے کا حکم

سوال اگر عید کا دن جمعے کے دن آ جائے تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب اگر جمعہ اور عید ایک ہی دن آ جائیں تو اس کے متعلق علما کی تین آرا ہیں:

1. جو عید میں حاضر ہو اس کے لیے جمعے میں حاضر ہونا بھی ضروری ہے، جس طرح تمام جمعوں میں حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جمعے کی فرضیت کے عمومی دلائل کا یہی تقاضا ہے۔
2. دور دراز اور نشیب و فراز کے علاقوں سے عید کے لیے حاضر ہونے والوں سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے، کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ان کو عید کی نماز پڑھائی تو انھیں جمعہ چھوڑنے کی رخصت دے دی۔
3. جو عید میں حاضر ہو اس سے جمعہ ساقط ہو جاتا ہے، لیکن امام جمعہ منعقد کرے، تاکہ جو پڑھنا چاہے پڑھ لے اور جو عید میں شریک نہ ہو سکا وہ جمعے میں شریک ہو جائے۔ یہی رائے صحیح ہے، کیوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہے، جن میں حضرت عمر، عثمان، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں، نیز اس مسئلے میں صحابہ سے کوئی اختلاف منقول نہیں۔

جن علما نے پہلی دو آرا اختیار کی ہیں ان تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں پہنچ سکی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک مرتبہ جمعہ اور عید ایک ہی دن آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی اور جمعے کی رخصت دے دی۔[1] ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ قَدْ أَصَبْتُمْ خَيْراً، فَمَنْ شَاءَ أَنْ يَشْهَدَ الْجُمعَةَ فَلْيَشْهَدْ فَإِنَّا مُجَمِّعُوْنَ»[2]

''لوگو! تمھیں بھلائی ملی ہے، تم میں سے جو جمعے میں حاضر ہونا چاہے ہو جائے، ہم جمعہ پڑھیں گے۔''

مزید برآں عید میں شرکت کرنے سے اجتماع کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ جو جمعہ نہ پڑھے وہ ظہر کی نماز پڑھے تو اس کو ایک تو ظہر کی نماز بروقت مل جاتی ہے اور دوسرے عید میں شرکت کے باعث جمعہ کا مقصود بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر اس دن جمعے کو بھی ضروری قرار دیا جاتا تو لوگ تنگی محسوس کرتے اور عید سے جو خوشی اور انبساط حاصل ہوا تھا، اس کا مزا بھی کرکرا ہو جاتا، جس سے عید کا مقصود مکدر ہو جاتا، پھر جمعے کا دن بھی عید ہی ہے اور فطر اور اضحیٰ کا دن بھی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٧٠) سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣١٠)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٩٢)

عید۔ جب ایک ہی جنس کی دو عبادتیں اکٹھی ہو جائیں تو ایسی صورت میں صاحبِ شریعت ایک کو دوسری میں داخل کر دیتے ہیں، جس طرح وضو غسل میں داخل ہو جاتا ہے اور ایک غسل دوسرے میں۔ واللہ أعلم [1]

جمعہ کے دن عصر کے بعد سورت کہف کی تلاوت کا حکم

سوال: کیا جمعے کے دن عصر کے بعد سورت کہف کی تلاوت کے متعلق حدیث میں کچھ ذکر ہوا ہے یا نہیں؟

جواب: الحمد لله. محدثین اور فقہا نے جمعے کے دن سورت کہف کی تلاوت کی فضیلت سے متعلق احادیث و آثار نقل کیے ہیں، لیکن وہ مطلق جمعے کے دن کے بارے میں ہیں۔ میں نے نہیں سنا کہ وہ عصر کے بعد کے ساتھ مختص ہوں۔ واللہ أعلم [2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۱۰۔۲۱۱)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۱۵)

نمازِ عید

نمازِ عید میں مخصوص سورتوں کی تلاوت کا حکم اور دو تکبیروں کے درمیان کچھ پڑھنے کا ذکر

سوال کیا عیدین کی نماز میں کچھ مخصوص سورتوں کی تلاوت مقرر ہے، دو تکبیروں کے درمیان کیا پڑھنا چاہیے؟

جواب ہر سورت پڑھنا جائز ہے، جس طرح دیگر نمازوں میں کہیں سے بھی قرآن پڑھا جا سکتا ہے، لیکن اگر سورت قٓ یا سورت قمر وغیرہ کی تلاوت کی جائے جن کا آثار میں ذکر ہوا ہے تو یہ اچھا عمل ہے۔ تکبیروں کے درمیان اللہ کی حمد بیان کی جا سکتی ہے، نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا جا سکتا ہے، کوئی دعا کی جا سکتی ہے، علما نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ سبحان الله کہہ لیا جائے۔ الحمد لله، لا إلٰه إلا الله، الله أكبر کہہ لیا جائے۔ اللهم صل على محمد، وعلى آل محمد کہہ لیا جائے۔ اللهم اغفرلي کہہ لیا جائے۔ الله أكبر كبيرا، والحمد لله كثيرا، سبحان الله بكرة وأصيلا کہہ لیا جائے۔ سب جائز ہے۔ اس سلسلے میں کوئی متعین ذکر رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی سے، والله أعلم۔[1]

تکبیرات کے الفاظ، طریقہ اور وقت

سوال عیدین میں تکبیرات کے الفاظ اور طریقہ کیا ہے اور ان کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

جواب الحمد لله. تکبیر سے متعلق جمہور صحابہ کرام، اسلافِ امت اور ائمہ فقہا کا صحیح ترین قول یہ ہے کہ عرفات کے دن فجر کے وقت سے لے کر ایامِ تشریق کے آخر تک ہر نماز کے بعد تکبیرات کہی جائیں۔ نمازِ عید کے لیے نکلتے وقت بلند آواز میں تکبیرات پڑھنا جائز ہے۔ اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

تکبیر کے الفاظ جو اکثر صحابہ سے منقول ہیں، بلکہ مرفوع بھی مروی ہیں، یہ ہیں: "الله أكبر، الله أكبر، لا إلٰه إلا الله والله أكبر، الله أكبر، ولله الحمد"[2] اگر صرف تین مرتبہ اللہ اکبر کہہ دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔ کچھ فقہا صرف تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہیں اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہنے کے بعد "لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له،

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢١٩/٢٤)

[2] سنن الدارقطني (٥٠/٢) تاريخ بغداد (٢٣٨/١٠) إرواء الغليل (٦٥٢، ٦٥٤)

له الملك وله الحمد وهو علىٰ كل شيئ قدير" پڑھتے ہیں۔ نمازِ عید میں مقتدی امام کے پیچھے اللہ اکبر کہے، اکثر صحابہ اور ائمہ پہلی رکعت میں سات مرتبہ اللہ اکبر کہتے اور دوسری میں پانچ مرتبہ۔ اگر دو تکبیروں کے درمیان "سبحان الله، الحمد لله، لا إله إلا الله، الله أكبر، اللهم اغفرلي وارحمني" پڑھ لیا جائے تو درست اور اچھا ہے، کیوں کہ یہ کچھ صحابہ سے منقول ہے۔ والله أعلم[1]

عید الفطر میں تکبیرات کا اہتمام

سوال کیا عید الفطر کے موقع پر تکبیر کا اہتمام عید الاضحیٰ کی نسبت زیادہ تاکیدی ہے؟

جواب عید الاضحیٰ کے موقع پر تکبیر کا اہتمام تو بالاتفاق مشروع اور جائز ہے۔ اسی طرح یہ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک عید الفطر کے موقع پر بھی مشروع ہے۔ امام طحاوی نے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب بھی یہی نقل کیا ہے، لیکن ان سے جو مشہور ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ تاہم عید الفطر میں تکبیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، بلکہ اس میں تکبیر اس اعتبار سے زیادہ تاکیدی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر جو اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''

عید الفطر میں تکبیر کا آغاز شوال کا چاند دیکھنے سے ہوتا ہے اور اختتام عید کے ختم ہونے کے ساتھ ہوتا ہے جو صحیح رائے کے مطابق امام کے خطبے سے فراغت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

عید الاضحیٰ کے موقعے پر تکبیر اس اعتبار سے زیادہ تاکیدی ہے کہ یہ نمازوں کے پیچھے پڑھی جاتی ہے اور اس پر سب کا اتفاق بھی ہے۔ عید قربان میں زمان اور مکان دونوں کا اکٹھ ہو جاتا ہے اور یہ عید الفطر سے افضل ہے، اس لیے اس میں نماز کے ساتھ جانور قربان کرنے کی عبادت بھی ہے، جب کہ عید الفطر میں نماز کے ساتھ صدقہ فطر کی عبادت ہے اور ذبح صدقے سے افضل ہے، کیوں کہ اس میں دو عبادتیں جمع ہوتی ہیں، ایک بدنی دوسری مالی، لہٰذا ذبح بدنی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی، لیکن صدقہ اور ہدیہ مالی عبادت ہے۔ نیز صدقہ فطر روزے کے تابع ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو روزے دار کی لغو اور بے ہودگی سے طہارت اور مسکینوں کے لیے خوراک کی غرض سے فرض کیا ہے، اس لیے اس کو نمازِ عید سے پہلے نکالنا مسنون ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] مجموع الفتاوىٰ (٢٤/٢٢٠)

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ﴾ [الأعلیٰ: ١٤، ١٥]

''بے شک وہ کامیاب ہو گیا جو پاک ہو گیا۔ اور اس نے اپنے رب کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔''

جب کہ جانور ذبح کرنا اس دن کی مستقل عبادت ہے، اس لیے نماز کے بعد اس کا حکم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ﴾ [الکوثر: ٢، ٣]

''پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔ یقیناً تیرا دشمن ہی لا ولد ہے۔''

بنابریں جو لوگ حج نہیں کرتے اور وہ مکے سے باہر دیگر بلاد و ممالک میں ہوتے ہیں، ان کا اپنے اپنے ممالک میں نمازِ عید پڑھنا حاجیوں کے جمرات کو کنکر مارنے کے قائم مقام اور ان کا جانور ذبح کرنا حاجیوں کے منیٰ میں جانور ذبح کرنے کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اسی طرح سنن میں یہ حدیث ہے:

«أَفْضَلُ الْأَيَّامِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمُ النَّحْرِ ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ»[1]

''اللہ کے ہاں بہترین دن قربانی کا دن، پھر اس کے بعد کا دن ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''یومِ عرفات، یومِ نحر (قربانی کا دن) اور ایامِ منیٰ ہماری (اہلِ اسلام کی) عید ہیں اور یہ کھانے پینے اور ذکر کے دن ہیں۔''[2]

بنا بریں علما کے صحیح ترین قول کے مطابق دیگر شہروں اور ممالک کے باشندے یومِ عرفات کی فجر سے تکبیروں کا آغاز کر دیں اور آخری یومِ تشریق کے آخر تک جاری رکھیں۔ اس کی ایک دلیل یہی مذکور حدیث ہے اور دوسری حدیث دارقطنی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، اس پر اکابر صحابہ کا اجماع ہے۔ واللہ أعلم[3]

عید مبارک کہنے کا حکم

سوال عید کے موقع پر لوگ ایک دوسرے کو عید مبارک کہتے ہیں، کیا شریعت میں اس کی کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر اس کی اصل موجود ہے تو کیا کہنا چاہیے؟

جواب عید کے دن عید کی نماز پڑھنے کے بعد ایک دوسرے کو ملتے وقت جو الفاظِ تبریک کہے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٦٥) مسند أحمد (٣٥٠/٤) صحيح الجامع (١٠٦٤)

[2] مسند أحمد (١٥٢/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٧٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٠٤) صحيح الجامع (٨١٩٢)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٤/ ٢٢١_٢٢٢)

"تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكَ" "اللہ ہم سے اور آپ سے قبول فرمائے۔" یا یہ کہا جاتا ہے: اللہ کرے تیری زندگی میں دوبارہ یہ موقع دوبارہ آئے "أحاله الله عليك" وغیرہ، یہ کچھ صحابہ سے منقول ہیں اور امام احمد وغیرہ نے ان کی رخصت دی ہے، لیکن امام احمد کہتے ہیں: میں آغاز نہیں کرتا اور اگر کوئی آغاز کرے تو میں جواب دے دیتا ہوں، کیوں کہ سلام و آداب کا جواب دینا واجب ہے، لیکن مبارک باد سے آغاز کرنا ایسی سنت نہیں جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ اس سے منع ہی کیا گیا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے اس کے پاس بھی نمونہ موجود ہے اور جو نہیں کرتا اس کے پاس بھی نمونہ موجود ہے، واللہ أعلم۔ [1]

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٥٣)

جنازے کے مسائل

کم سن فوت شدہ بچوں کے اعمال نامے، کنواری فوت ہونے والیوں کی جنت میں شادی اور حمل و ولادت کے مسائل

سوال ① مسلمانوں کے وہ بچے جو تین سال کی عمر سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں، کیا ان کے اعمال نامے ہوتے ہیں جن میں قرآن خوانی اور صدقے وغیرہ کا ایصال کردہ ثواب لکھا جاتا ہو؟ نیز کیا ان سے قبر میں سوال و جواب ہو گا؟ پھر کیا وہ قیامت کے روز بچے ہی رہیں گے یا جنت میں داخل ہونے کے بعد بڑے ہوں گے اور شادی نکاح بھی کریں گے؟

② کیا کنواری فوت ہو جانے والی لڑکیوں کی جنت میں شادی ہو گی؟

③ کیا جنت میں سب لوگوں کے لیے حمل و ولادت کا سلسلہ ہو گا یا کچھ کے لیے ہو گا اور کچھ کے لیے نہیں؟

جواب بچوں کی طرف سے صدقے وغیرہ کی طرح جو مالی عبادات کی جاتی ہیں ان کا ثواب بلا اختلاف ان کو پہنچتا ہے، بدنی عبادات میں اختلاف ہے، لیکن حنبلی و حنفی مذہب اور کچھ مالکی اور شافعی علما کے نزدیک جس طرح مالی عبادات کا ثواب پہنچتا ہے اسی طرح بدنی عبادات کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور یہی صحیح قول ہے۔ اعمال لکھنے کی بابت چھوٹے بڑے ایک سا حکم رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو بڑوں کو ایصال کیا جائے وہ تو لکھا جاتا ہے اور جو چھوٹوں کو ایصال کیا جائے وہ نہیں لکھا جاتا، بلکہ دونوں انواع کا حکم ایک ہی ہے۔

دوسری بات کہ کیا قبر میں ان سے سوال کیا جائے گا؟ تو اس میں اصحابِ احمد وغیرہ جیسے اہلِ سنت کے دو مشہور اقوال ہیں: قاضی اور ابن العقیل وغیرہما کے نزدیک ان سے سوال نہیں ہو گا، کیوں کہ قبر میں سوال اسی سے ہو گا جو دنیا میں مکلّف تھا، جب کہ بچہ اور پاگل مکلّف نہیں، اس لیے ان سے سوال نہیں ہو گا۔ دوسرا قول ابو حکیم نہروانی کا ہے کہ بچوں سے سوال ہو گا۔ ابو الحسن علی بن عبدوس نے اصحابِ احمد سے یہی نقل کیا ہے، کیوں کہ موطا میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک چھوٹے بچے کا جنازہ پڑھایا جس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی اور دعا میں کہا: اے اللہ! اس کو عذابِ قبر

اور تنگیِ قبر سے بچانا۔''[1] یہ قیامت کے عرصات (مختلف مواقع) پر ان کو آزمائے جانے پر مبنی ہے۔ احادیث میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے۔

آخرت میں ان کی کیا حالت ہوگی تو جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو بڑوں کی طرح ہی داخل ہوں گے جو اپنے باپ آدم کی شکل پر ہوں گے۔ طول ساٹھ ذراع ہوگا اور عرض سات ذراع۔ جس طرح بڑے شادی کریں گے، اسی طرح وہ بھی شادی کریں گے۔ جو عورت دنیا میں کنواری فوت ہوگی آخرت میں اس کی شادی ہوگی۔ اسی طرح جو آدمی کنوارا فوت ہوگا آخرت میں اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔[2]

حاملہ فوت ہونے والی عورت کے پیٹ سے بچہ نکالنے کی صورت اور حکم

سوال ایک عورت جو سات ماہ کی حاملہ تھی، فوت ہوگئی۔ کیا اس کا پیٹ چیر کر یا کوئی بھاری چیز رکھ کر بچے کو نکالا جائے یا دائیہ کسی طریقے سے مردہ بچے کو باہر نکالے؟

جواب الحمد لله. پیٹ کے بچے کو شرمگاہ سے نکالنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ دائیہ اس کو نکالے یا اس کے لیے مخصوص آلہ استعمال کیا جائے۔ جب شرمگاہ کھل جائے تو بچے کو باہر نکال لیا جائے۔ اگر نکالنا ناممکن ہو تو اس کی بابت دو مشہور اقوال ہیں:

1. پیٹ نہ چیرا جائے، کیوں کہ یہ مثلہ ہے۔ بالعموم بچہ بھی ماں کے مرنے کے ساتھ مر جاتا ہے اور زندہ نہیں بچتا، اس لیے یہ میت کا مثلہ ہے جس میں کسی زندہ کو بچایا نہیں جاتا، بلکہ اگر بھوکا، بے گناہ مردہ کھانے پر مجبور ہو جائے تو یہ بھی جائز نہیں، کیوں کہ اگرچہ اس میں زندگی نہیں مگر وہ موجود تو ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مردے کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہی ہے۔''[3] یہ امام مالک واحمد وغیرہما کا مذہب ہے۔
2. بچہ نکالنے کے لیے پیٹ کو چیرا جا سکتا ہے، کیوں کہ زندہ بچے کے حق کا خیال رکھنا مردے کے حق کا خیال رکھنے سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ و شافعی وغیرہما کا مذہب ہے۔ امام شافعی کے مذہب میں ایک پہلی توجیہ کی طرح توجیہ ہے اور امام احمد کے مذہب میں دوسری توجیہ کی طرح ایک توجیہ بھی موجود ہے۔ یہ اختلاف اس کے زندہ نکالنے کے امکان کی صورت میں ہے، اگر اس کی موت معلوم ہو جائے تو پھر بلا اختلاف پیٹ چیرنا جائز نہیں۔[4]

---

[1] الموطأ (١/٢٢٨)

[2] جامع المسائل (٤/٢٢١۔٢٢٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦١٦) صحيح الجامع (٤٤٧٨)

[4] جامع المسائل (٤/١٧٢۔١٧٣)

غائبانہ نمازِ جنازہ کی مشروعیت اور حدود

سوال ایک آدمی قاہرہ میں فوت ہوا، کیا مصر یا قلعہ وغیرہ میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ کتنی دوری سے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے کتنی دوری سے نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی؟ کیا رسول اللہ ﷺ یا کسی صحابی یا امام نے اتنی دوری سے کسی کی نمازِ جنازہ پڑھائی ہے جتنی قاہرہ اور مصر کے درمیان ہے؟

جواب بنیادی طور پر یہ غائبانہ نمازِ جنازہ کا مسئلہ ہے۔ اس میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں:

1. یہ امام شافعی کے مذہب، اکثر اصحابِ احمد کے نزدیک اور مشہور ترین روایت کے مطابق امام احمد کے مذہب میں بھی جائز ہے۔
2. امام ابوحنیفہ، مالک اور دوسری روایت میں امام احمد کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام احمد سے یہ دوسری روایت ابن ابی موسیٰ نے نقل کی ہے جو امام احمد کا مذہب نقل کرنے میں ثقہ ہے۔ اس نے ان کے مذہب میں عدمِ جواز ہی راجح ذکر کیا ہے۔

اس اختلاف کا سبب کچھ اس طرح ہے کہ صحیح نصوص سے نبی اکرم ﷺ کا نجاشی کا غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھانا ثابت ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''جس دن نجاشی کا انتقال ہوا، اسی دن آپ ﷺ نے اس کی وفات کی خبر دی، پھر صحابہ کو جنازہ گاہ لے کر گئے، ان کی صفیں بنائیں اور اس پر چار تکبیریں کہیں، اس کے بعد فرمایا: اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو۔''[1] صحیحین ہی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے نجاشی کا جنازہ پڑھایا تو چار تکبیریں کہیں۔''[2] ان سے بخاری میں مروی ہے کہ ''نبی اکرم ﷺ نے نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھائی، میں دوسری یا تیسری صف میں تھا۔''[3] بخاری ہی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''آج حبشہ کا ایک نیک آدمی فوت ہو گیا ہے، آؤ اس کا جنازہ پڑھو۔ تو ہم نے صفیں بنائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے جنازہ پڑھایا اور ہم صفوں میں تھے۔''[4] مسلم میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا ایک بھائی۔'' اور ایک روایت میں ہے: ''تمھارا بھائی (مراد نجاشی) فوت ہو گیا ہے، کھڑے ہو جاؤ، اس کا جنازہ پڑھو۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٥٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٥٧)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥٣)

سنت سے یہ ثابت ہے، اس کے علاوہ ایک ساقط اور بے اعتبار حدیث کے سوا آپ ﷺ سے کسی کا غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا ثابت نہیں۔[1] وہ روایت اس طرح ہے کہ آپ ﷺ نے غزوۂ تبوک میں معاویہ بن معاویہ لیثی کا جنازہ پڑھایا، کیوں کہ وہ کثرت سے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ یہ نا قابلِ استدلال حدیث ہے۔ آپ ﷺ کے عہد میں اور آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں بے شمار صحابہ فوت ہوئے مگر آپ نے کسی کا غائبانہ جنازہ نہیں پڑھایا، اسی طرح مکہ، طائف اور یمن وغیرہ میں جو مسلمان آپ ﷺ سے دور تھے، انھوں نے بھی نہیں پڑھا، بلکہ ابوبکر و عمر اور دیگر دور دراز کے شہروں میں رہنے والے مسلمانوں کا غائبانہ جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا اس لیے علما کا اختلاف ہو گیا ہے۔ ایک گروہ کا مذہب نہ پڑھنے کا ہے، کیوں کہ اگر یہ سنت ہوتی تو آپ ﷺ کثرت کے ساتھ اس پر عمل کرتے اور مسلمان بھی آپ ﷺ کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی اس پر عمل کرتے۔ یہ علما نجاشی کے مسئلے میں دو عذر پیش کرتے ہیں:

1. پہلا عذر: یہ اس کا اختصاص تھا، کیوں کہ آپ ﷺ اس کو دیکھ رہے تھے یا اس کو آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا۔ مگر یہ عذر کمزور ہے، کیوں کہ یہ بات کسی نے نقل نہیں کی۔ جن صحابہ نے آپ کے پیچھے پڑھا تھا، انھوں نے اس کو نہیں دیکھا تھا اور امام و مقتدی میں کوئی فرق نہیں۔ نیز ان کے ہاں مانع دوری یا تکرار تھا اور وہ دونوں موجود ہیں، وہ موجود ہوتا یا نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ اس جیسی صورتِ حال نجاشی کے علاوہ کسی دوسرے کے حق میں بھی ممکن ہے، اس سے اختصاص ختم ہو گیا، کیوں کہ بنیادی طور پر جب تک نبی کے اختصاص کی دلیل نہ ہو اس وقت تک امت احکام میں شریک ہوتی ہے۔
2. دوسرا عذر: نجاشی عیسائیوں کے درمیان رہتا تھا اور اس نے اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا تھا، بلکہ عیسائیوں نے اس سے لڑنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہاں اسلامی شریعت ظاہر اور نافذ نہیں تھی اور کوئی اس کا جنازہ پڑھنے والا بھی نہیں تھا۔ یہ عذر پہلے کی نسبت زیادہ قرینِ صواب ہے اور اس سے خاص طور پر نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے اور دیگر مسلمان فوت شدگان کی نہ پڑھنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

جو اس توجیہ کا قائل ہے مگر کسی بھی حالت میں غائبانہ جنازے کے جواز کا قائل نہیں اس کی بات میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے اور جو اس توجیہ کے ساتھ ایسے شخص کا غائبانہ جنازہ پڑھنے کا قائل ہے جس کا پڑھا ہی نہ گیا ہو تو اس کی یہ رائے اور قول بہترین اور شائد معتدل ہے، کیوں کہ شریعت اس قاعدے پر قائم ہے:

---

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "الإصابة" (۳/۴۳۶، ۴۳۷) میں اس کے تمام طرق جمع کر دیے ہیں اور "فتح الباري" (۳/۱۸۸) میں اس روایت کے تعدد طرق کی بنا پر اسے قوی قرار دیا ہے۔

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[1]

''جب تم کو کوئی حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس سے جو کر سکتے ہو کرو۔''

لہٰذا جن عبادات پر عمل پیرا ہونا دشوار گزار اور ناممکن ہو وہ عجز یعنی عدمِ استطاعت کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ چونکہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم ہے، لہٰذا جب اسے غائبانہ پڑھنے کے سوا کوئی اور صورت نہ ہو تو پھر غائبانہ ہی کا حکم ہے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے: ہر اس میت کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے جو اپنے شہر سے غائب ہو، چاہے اس کا جنازہ پڑھا ہی گیا ہو۔ یہ اصحابِ شافعی اور اکثر متاخرینِ حنابلہ کا مذہب ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے نزدیک مسافت سے کوئی فرق نہیں پڑتا، چاہے وہ اپنے شہر سے قصر کی مسافت کی دوری پر تھا یا اس سے کم۔ نیز میت کے پڑھنے والے کے آگے یا پیچھے ہونے کی بھی کوئی قید نہیں۔

جو انسان ایک ہی شہر میں غائب ہو تو دونوں ائمہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک اس انسان کا غائبانہ جنازہ پڑھانا جائز نہیں، کیوں کہ اس سے متعلق نہ تو کوئی اثر وارد ہوا ہے اور نہ کسی سلف ہی سے یہ منقول ہے، لہٰذا یہ کام کرنے والا دین میں ایسا طریقہ ایجاد کرنے والا ہے جو اللہ کی شریعت میں نہیں، اور اگر یہ جائز بھی ہو تو اس کو منضبط کرنے کا کوئی ضابطہ نہیں، بلکہ اس بنا پر تو ہر گلی، ہر محلے اور گھر میں فوت ہونے والے کا اسی گلی، اسی محلے اور اسی گھر میں غائبانہ جنازہ پڑھنا جائز ہوتا۔ معلوم ہوا یہ مسلمانوں کا طرزِ عمل نہیں۔ اگر جائز ہوتا تو نیکی اور قربتِ الٰہی ہوتا اور سلف صالحین ترجیح کے ساتھ اس کا اہتمام کرتے، حالانکہ ایسے بہت سے مسلمان ہوتے ہیں جو کسی بیماری، کام یا قید وغیرہ کی وجہ سے جنازے میں شریک نہیں ہو سکتے تو جب اسلاف میں سے کسی نے اس کا اہتمام نہیں کیا تو معلوم ہوا یہ غیر مشروع ہے، اگرچہ ہر حالت میں میت کے لیے دعا کرنا مشروع ہے، چاہے آدمی وضو سے ہو یا بے وضو، قبلے کی طرف منہ کرے یا نہ کرے، کھڑا ہو یا بیٹھا، تکبیر کے ساتھ کرے یا تکبیر کے بغیر، لیکن نمازِ جنازہ کے لیے شرعی شرطیں مقرر ہیں اور ان کی پابندی بھی ضروری ہے۔

دونوں اماموں کے اصحاب کے ایک گروہ نے ایک ہی شہر میں غائب ہونے والے کے لیے بھی غائبانہ جنازہ پڑھنے کا جواز پیش کیا ہے۔ ان کے محققین نے یہ قید لگائی ہے کہ فوت ہونے والا بڑے شہر کی ایک جانب فوت ہوا ہو تو دوسری جانب اس کی غائبانہ نماز پڑھائی جا سکتی ہے، مگر ان میں سے کچھ لوگوں نے بڑے چھوٹے کی قید کے بغیر مطلقاً

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

شہر کی ایک جانب کی شرط لگائی ہے، مثلاً کوئی بغداد کی ایک جانب فوت ہو تو بغداد کی دوسری جانب اس کی غائبانہ نماز پڑھنا جائز ہے۔

یہ مسئلہ ابو حامد اور ابو عبداللہ بن حامد کے زمانے میں پیش آیا۔ بغداد کی ایک جانب ایک بندہ فوت ہوا تو ابو عبداللہ بن حامد اور کچھ لوگوں نے دوسری جانب اس کی نمازِ جنازہ پڑھی تو حفص برمکی اور اکثر حنبلی و شافعی فقہا نے اس کی تردید کی۔ البتہ دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ جو شہر کی ایک جانب میں فوت ہوا ہو اور وہاں کا کوئی شخص غیر موجود ہو تو وہ بعد میں اس کا غائبانہ جنازہ نہیں پڑھ سکتا، مثلاً اگر کوئی شخص بارش یا بیماری یا کسی عذر کی بنا پر جنازے میں شریک نہ ہو سکے تو وہ بالاتفاق غائبانہ جنازہ نہیں پڑھے گا۔ تاہم کچھ متاخرین خراسانی شافعی فقہا نے شہر سے غائب کے حق میں دونوں وجوہ جاری کی ہیں، گو اس کے لیے حاضر ہونا ممکن ہو۔ ان کا قیاس یہ ہے کہ جب کوئی ملزم عدالت میں حاضر ہونے سے قاصر ہو تو ایک کمزور ترین رائے اور توجیہ کے مطابق اس کے خلاف فیصلہ جاری کیا جا سکتا ہے، مگر یہ انتہائی بودا اور شاذ استدلال ہے، پھر یہ کہ عدالتی فیصلے اور نماز میں کوئی نسبت نہیں۔ تھوڑا سا علم رکھنے والے کو بھی اس جیسی شریعت سازی کے بدعت ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کی باتیں فریقِ مخالف کا منہ بند کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں مگر اللہ کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی۔ دونوں مذہبوں کے مشہور قول کے مطابق کہ صرف اس کا غائبانہ جنازہ پڑھا جائے جو شہر سے باہر کسی دوسری جگہ فوت ہو۔ اس سلسلے میں میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں آئی کہ انھوں نے اس کی کوئی شرعی حد بندی بھی کی ہے۔ لفظ کے تقاضے کے مطابق تو جو شہر کی دیوار کے باہر فوت ہوا ہو اس کا غائبانہ جنازہ پڑھا جائے گا، لیکن جو دیوار کے اندر ہو اس کا نہیں، لیکن دونوں مذہبوں میں اس کی کوئی شرعی اساس نہیں۔ اس جیسے معاملے میں شرعی حد یا تو نمازِ قصر کی حد ہو سکتی ہے، جس کے لیے شہر سے اتنا دور ہونا ضروری ہے جس کو سفر کہا جا سکے۔ دونوں مذہبوں کے ایک گروہ کے مطابق پچاس قدم کا سفر کافی ہے، قاضی ابو یعلیٰ کی رائے بھی یہی ہے۔

یا پھر اتنی مسافت کی حد جس سے نمازِ جمعہ فرض ہو جاتی ہے، یہ ایک فرسخ کی مسافت بنتی ہے۔ جو اذان سنے اس کے لیے جمعہ میں شرکت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اتنی مسافت پر فوت ہونے والا شخص غائب شمار نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس سے زیادہ مسافت ہو تو وہ غائب کے زیادہ مشابہ ہوگا۔ یا یہ کہ شافعی مذہب اور حنبلی مذہب کی ایک روایت میں عدویٰ کی مسافت حد قرار دی جا سکتی ہے، جس میں مسافر اسی دن گھر واپس نہیں آ سکتا۔ جو شہر سے غائب کو عدالتی فیصلے سے غائب کے مانند قرار دیتا ہے۔ یہ رائے اس کے زیادہ مناسب ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ فقہ کا تقاضا ہے کہ جس کے لیے حاضر ہونا مشقت آمیز ہو اس کے برعکس جس کے لیے آنا ممکن ہو تاہم نماز کو نماز کے ساتھ ملانا اور

قیاس کرنا نماز کو عدالتی فیصلے کے ساتھ ملانے سے زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔

یہ وہ مسالک ہیں جن پر اس مسئلے کے جواب کی اساس ہے۔ اگر یہ واضح ہو گئے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قلعہ اور قاہرہ بغداد کے دو جوانب کے مشابہ ہیں۔ جن شافعی اور حنبلی علما نے بغداد کی ایک جانب فوت ہونے والے کی غائبانہ نمازِ جنازہ دوسرے کونے اور جانب میں جائز قرار دی ہے۔ ان کے نزدیک قاہرہ میں فوت ہونے والے کی غائبانہ نمازِ جنازہ قلعہ میں اور قلعہ میں فوت ہونے والے کی قاہرہ میں جائز ہے۔ اسی طرح مصر میں فوت ہونے والے کی غائبانہ نماز قاہرہ میں پڑھنا بالاولیٰ جائز ہے، کیونکہ قاہرہ اور قلعہ تو ایک ہی دیوار کے اندر ہیں، جب کہ مصر اس سے باہر ہے، کیوں کہ یہ دونوں دو اطراف والے بڑے شہر کے زیادہ مشابہ ہیں۔ تاہم اکثر حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی فقہا شہر کے کونے میں مرنے والے کی نماز دوسرے کونے میں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، خواہ شہر بڑا ہی ہو، بلکہ انھوں نے صراحت کے ساتھ بغداد کا بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ اس میں بے شمار محلے ہیں اور اس کے وہ کونے ہیں جن کے درمیان دجلہ بہتا ہے۔ پھر ابو جعفر منصور کے زمانے سے لے کر جب بغداد تعمیر کیا گیا آج تک اس میں مختلف جگہوں پر حملے بھی ہوتے ہیں مگر فقہا نے صاف لکھا ہے کہ بغداد کے ایک کونے میں مرنے والے کی غائبانہ نمازِ جنازہ دوسرے کونے میں نہ پڑھی جائے۔ مزید برآں بغداد کے علاوہ بھی مسلمانوں کے کئی بڑے بڑے شہر ہیں جو کئی اضلاع پر مشتمل ہیں اور ان میں نامور شافعی اور حنبلی فقہا بھی گزرے ہیں جو اس مسئلے میں رخصت دیتے ہیں مگر مسلمانوں میں ایک ضلع میں فوت ہونے والے کا غائبانہ جنازہ دوسرے ضلع میں پڑھنے کا رواج نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ غائبانہ جنازے کا مسلک کمزور ترین ہے، کیوں کہ مسلمانوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ مکہ میں فوت ہونے والے کا غائبانہ جنازہ عرفات میں پڑھتے ہیں یا اس کے عکس۔ اسی طرح مدینہ میں فوت ہونے والے کا جنازہ قباء یا بالائی مدینہ کے محلوں میں پڑھتے ہوں یا اس کے عکس۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بے شمار لوگ قبا اور بالائی مدینہ میں فوت ہوئے جس کا مدینہ سے اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا مصر سے قاہرہ کا اور دمشق سے صالحیہ کا، مگر آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین ایک کونے میں فوت ہونے والے کا غائبانہ جنازہ دوسرے کونے میں نہیں پڑھتے تھے۔

رہی یہ بات کہ مصر میں فوت ہونے والے کا قاہرہ میں غائبانہ جنازہ پڑھنا یا اس کے عکس، تو یہ مشہور قول کے مطابق منع ہے، جس میں شہر کے ایک کونے میں فوت ہونے والے کی دوسرے کونے میں غائبانہ نمازِ جنازہ جائز نہیں۔ یہ دراصل اس بات پر مبنی ہے کہ ایک شہر سے مراد کیا ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کی حد شہر کی دیوار سے باہر ہونا ہے، یا جمعہ کی مسافت یا عدویٰ کی مسافت؟

پہلے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے، یعنی شہر کی دیوار کے باہر ہو تو اور دوسرے دو مسالک کی بنیاد پر جائز نہیں۔

ہماری ان معروضات سے واضح ہو جاتا ہے کہ جمہور کے مذہب کے مطابق مصر میں فوت ہونے والے کی قاہرہ اور قلعہ میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں، اسی طرح اس کے عکس اور بعض شافعی اور حنبلی علما کے نزدیک جائز ہے۔ رہا یہ سوال کہ نجاشی اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان کتنی دوری تھی؟ تو یہ مشہور ہے کہ نجاشی حبشہ میں تھا، ان دونوں کے درمیان یمن ہے، پھر تہامہ اور یہ بہت زیادہ مسافت ہے۔

یہ سوال کہ کیا اتنی دوری سے نبی اکرم ﷺ یا صحابہ یا تابعین یا ائمہ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھتے تھے؟ تو جواب یہ ہے کہ ان میں سے کسی سے منقول نہیں۔ جو منقول تھا وہ ہم ذکر کر چکے ہیں، مگر یہ اختلاف ائمہ کے بعد کا ہے۔ شافعی اور احمد کے زمانے میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی کہ کسی نے بغداد کے ایک کونے میں فوت ہونے والے کی دوسرے کونے میں غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہو، حالانکہ فوت ہونے والے بے شمار تھے اور اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو اس کو نقل کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعد کا عمل ہے۔ ائمہ نے یہ کام نہیں کیا۔

آج جو لوگ ہر رات تمام فوت شدگان کا غائبانہ جنازہ پڑھتے ہیں، بلاشبہہ یہ بدعت ہے اور اسلاف میں سے کوئی بھی اس پر کاربند نہیں تھا، واللہ أعلم۔[1]

بے نماز اور شرابی کے جنازے کا حکم

سوال کیا بے نماز اور شراب نوش کا جنازہ پڑھنا جائز اور کارِ ثواب ہے؟

جواب جو شخص اسلام کا اظہار کرتا ہو، اس پر اسلام کے احکام، نکاح، وراثت، غسل، جنازہ اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا جیسے ظاہری احکام لاگو ہوتے ہیں، لیکن جس شخص کو جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس میں زندیقیت اور منافقت پائی جاتی ہے، اس کے لیے اس کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں، گو وہ اسلام کا اظہار ہی کرتا ہو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو منافقوں کا جنازہ پڑھنے سے منع کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ ﴾ [التوبة: ٨٤]

''اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

[1] جامع المسائل (٤/١٧٤-١٨٢)

﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴾ [المنافقون: ٦]

''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''

جس شخص میں ایمان موجود ہو، لیکن اس کے باوجود وہ فسق و فجور کا اظہار کرتا ہو، جس طرح کبیرہ گناہ کرنے والے ہیں ان جیسے لوگوں کا جنازہ کچھ مسلمان ضرور پڑھیں، لیکن جو شخص اس طرح کے لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے ان بے عملوں کا جنازہ نہ پڑھے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے خودکشی کرنے والے، مالِ غنیمت میں خیانت کرنے والے اور مقروض کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور اکثر سلف بدعتیوں کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے تو اس سنت کے مطابق اس کا یہ عمل درست اور اچھا ہے۔ جندب بن عبداللہ بجلی سے ان کے بیٹے نے کہا: کل رات میں نے کھانا زیادہ کھا لیا تھا اور بدہضمی کی وجہ سے سو نہ سکا، انھوں نے کہا: اگر تو مر جاتا تو میں تیرا جنازہ نہ پڑھتا، گویا وہ کہہ رہے تھے کہ تو نے زیادہ کھا کر اپنے آپ کو مار ڈالا۔ یہ کبیرہ گناہوں کا اظہار کرنے والوں سے ترکِ تعلق کے باب سے تعلق رکھتا ہے، تا آنکہ وہ توبہ کر لیں، اگر ان کا جنازہ نہ پڑھنے میں مصلحتِ راجح ہو تو یہ اچھا ہوتا ہے، تاہم جو ان کا جنازہ پڑھے اور اللہ سے ان کے لیے رحمت کا امیدگار ہو، پھر اس کے نہ پڑھنے میں کوئی راجح مصلحت بھی نہ ہو تو یہ بھی اچھا ہے۔ اگر وہ دونوں مصلحتوں کے پیشِ نظر ظاہر میں جنازہ نہ پڑھے، لیکن باطن میں اس کے لیے دعا کرے تو دونوں مصلحتوں کو حاصل کر لینا ایک کو حاصل کرنے اور دوسری سے محروم رہنے سے بہت اچھا ہے۔ ہر وہ شخص جو مسلمان ہو اور کسی کو اس میں نفاق کا علم نہ ہو، اس کے لیے بخشش کی دعا کرنا اور اس کا جنازہ پڑھنا جائز ہے، بلکہ اس کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾ [محمد: ١٩]

''اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔''

اور مردہ شخص جو کبیرہ گناہوں کا اظہار کرتا ہو، اس کو ترکِ تعلق یا اس طرح کی کوئی بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ ترکِ تعلق میں مصلحتِ راجحہ ہو تو حسبِ امکان شرعی مصلحتوں کو حاصل کیا جائے۔ واللہ أعلم[1]

میت کے غسل سے بچے ہوئے پانی کا حکم

سوال ① کیا میت کے غسل کا بچا ہوا پانی پاک ہے یا ناپاک؟

② کیا عورت آدمی کو قبر میں اتار سکتی ہے یا آدمی عورت کو قبر میں اتار سکتا ہے؟

---

① مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٨٥-٢٨٧)

③ کیا یہ ضروری ہے کہ عورت کی طرف سے آدمی ہی حج کرے یا آدمی کی طرف سے عورت ہی حج کرے۔ نیز فوت شدہ کی طرف سے حجِ بدل کروانے کے لیے حج کرنے والے کو کیا دیا جائے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. ① جمہور علما کے نزدیک میت کے غسل کا بچا ہوا پانی پاک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی ایک صحابہ کا قول ہے کہ آدمی زندہ ہو یا مردہ، پلید نہیں ہوتا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو راستے میں کوئی صحابی ملا تو وہ آپ ﷺ سے چھپ گیا، پھر غسل کر کے آیا تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''تو کہاں تھا؟'' اس نے کہا: میں حالتِ جنابت میں تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! مومن پلید نہیں ہوتا۔''[1]

بنابریں جمہور علما کے نزدیک غسلِ جنابت، حیض اور وضو میں استعمال شدہ پانی پاک ہی ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور اپنے وضو کا بچا ہوا پانی حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر بہایا۔[2]

② دوسری بات کہ آدمی عورت کو دفن کرے یا عورت۔ اگر عورت کو قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے تو سنت یہی ہے کہ اس کے جنازے میں صرف مرد شریک ہوں گے، عورتیں نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی نیک آدمی اس کو دفن کرے گا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کو قبر میں اتارنے کے لیے حضرت ابوطلحہ کو حکم دیا تھا۔[3] اگرچہ اس کو اتارتے وقت آدمی کفن سے اوپر اس کو ہاتھ لگاتا ہے تو یہ ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، کیوں کہ عورتوں کا جنازے کے ساتھ آنا منع ہے۔

البتہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ عورت کو اس جگہ دفن کیا جاتا ہو جہاں عورتیں ہوں تو ایسی صورت میں عورت کا اس کو قبر میں اتارنا مرد کے اتارنے سے بہتر ہے، اگر اس میں کوئی مفسدت اور خرابی نہ ہو۔ مرد کو بھی مرد ہی قبر میں اتاریں گے۔ ہاں اگر اس کو قبر میں اتارنے کے لیے عورتوں کی ضرورت پیش آجائے تو یہ جائز ہے۔ عورتوں کا آدمی کو قبر میں اتارنا اس کو غسل دینے سے خفیف کام ہے۔ آدمی کا اپنی محرم عورتوں اور عورت کا اپنے محارم کو غسل دینے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ مگر جو بات ہم نے ذکر کی ہے، صحیح سنت سے ثابت ہے۔

③ بالاتفاق آدمی عورت کی طرف سے حجِ بدل کر سکتا ہے۔ ایسے ہی ائمہ اربعہ کے نزدیک عورت بھی آدمی کی طرف سے حجِ بدل کر سکتی ہے۔ البتہ کچھ فقہا نے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ چونکہ عورت کا حج مرد کی نسبت ناقص ہوتا ہے۔ مگر یہ ایسے ہی بات ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے عورت کو اپنے باپ کی طرف سے حج کرنے کا حکم دینا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٧)

ثابت ہے[1] اور رسول اللہ ﷺ کی بات کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کی کوئی وقعت نہیں۔ جس طرح اصلاً آزاد عورت کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے اسی طرح آزاد شدہ کی طرف سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر دونوں کی زندگی میں دونوں پر حج فرض ہو چکا تھا تو احمد اور شافعی اور ان کے مذہب میں دونوں کے ترکے سے اتنا مال نکالنا واجب ہے جو حج کے لیے ضروری ہوتا ہے، البتہ ابو حنیفہ، مالک اور ان کے ہم خیالوں کے مذہب میں دونوں کے مال سے اتنا مال نکالنا مستحب ہے، واجب تب ہوگا جب وہ وصیت کر کے جائے اور وہ ایک تہائی سے نکالا جائے گا۔ اس کی طرف سے مکمل حج کے اخراجات نکالے جائیں گے۔ اگر اس کی زندگی میں اس پر حج فرض نہیں ہوا تھا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی طرف سے حج کرنا مستحب ہے۔ مکمل حج مقامی حج سے افضل ہے۔ حج کرنے والے کو معروف کے مطابق قابلِ کفایت اخراجات دیے جائیں۔ اگر مالک نے لونڈی کی آزادی کو اپنی موت کے ساتھ مشروط رکھا اور یہ لونڈی مالک کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تو اس پر بالاجماع حج فرض نہیں، لیکن اگر اس کے مال سے نفلی حج کروایا جائے تو یہ اچھا عمل ہے۔ واللہ أعلم[2]

مقتول کے کسی زخم سے خون رسنے کی صورت میں اس کو غسل دینے کا حکم

سوال مقتول جب مر جائے اور اس کے جسم پر کوئی زخم ہو جس سے خون نکل پڑے تو کیا اس کو غسل دے کر اس کا جنازہ پڑھا جائے گا یا نہیں؟

جواب اگر وہ کسی معرکے میں کافروں کے خلاف لڑتا لڑتا شہید ہوا ہے تو اس کو غسل نہیں دیا جاتا، بلکہ انھی کپڑوں میں دفن کر دیا جاتا ہے جو وقتِ شہادت اس کے جسم پر ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے شہدا کی بابت فرمایا تھا:

((زَمِّلُوْهُمْ بِكُلُوْمِهِمْ وَدِمَائِهِمْ، فَإِنَّ أَحَدَهُمْ يَجِيْئُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجُرْمُهُ يَشْعُبُ دَماً اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ، وَالرِّيْحُ رِيْحُ الْمِسْكِ))[3]

''ان کو ان کے خون اور زخموں سمیت چادروں میں لپیٹ دو، ان میں سے ہر ایک جب قیامت کے دن آئے گا تو اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا مگر خوش بو کستوری کی ہوگی۔''

شہید کا جنازہ پڑھنے میں فقہا کا اختلاف ہے۔ جس کو مسلمان ظلم کرتے ہوئے قتل کریں اس میں بھی اختلاف ہے۔ اکثر علما کی رائے میں اس کو غسل دیا جائے گا اور اس کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا۔ جس کو قصاص میں قتل کیا جائے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٤)

[2] جامع المسائل (٢١٤/٤-٢١٦)

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٠٢) صحيح الجامع (٣٥٧٣)

اس کو غسل دینے اور اس کا جنازہ پڑھنے پر سب کا اتفاق ہے۔ ایسے ہی اگر کوئی زخمی ہو گیا اور زخمی ہونے کے بعد اس نے کچھ کھا پی بھی لیا پھر مر گیا، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا، تو اس کو غسل دیا جائے گا اور اس کا جنازہ بھی پڑھا جائے گا۔[1]

سمندر میں ڈوب کر مرنے والے کا حکم

سوال ایک آدمی تجارت کی غرض سے سمندری سفر کرتا ہے اور وہ ڈوب جاتا ہے، کیا وہ شہید کی موت مرا؟

جواب ہاں وہ شہید فوت ہوا، اگر اس کا سفر معصیت کے لیے نہیں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے: "ڈوب کر مرنے والا شہید ہے۔ پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔ جل کر مرنے والا شہید ہے۔ طاعون سے مرنے والا شہید ہے۔ حالتِ نفاس میں مرنے والی عورت بھی شہید ہے اور گر کر مرنے والا بھی شہید ہے۔"[2] ان کے علاوہ اور لوگوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ تو تجارت کے لیے سمندری سفر جائز ہے۔ اگر سلامتی کا غالب گمان ہو، اگر سلامتی کا گمان نہ ہو تو پھر جائز نہیں۔ اس کے باوجود وہ سفر کرے تو گویا وہ خودکشی پر اتر آتا ہے۔ اس جیسے شخص کو شہید نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ أعلم[3]

میت کو قبرستان لے جانے کا مسنون طریقہ اور چند بدعات کا تذکرہ

سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں میت کو کس طرح لے جایا جاتا تھا؟ کیا عورتیں بھی ساتھ جاتی تھیں اور کیا لوگ تیسرے دن قبر پر جاتے تھے؟ آج کچھ لوگ میت کو غسل دینے کی جگہ پر تین دن تک دیا جلاتے اور روٹی پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ تین دن تک قبر پر قرآن خوانی کرتے ہیں اور تیسرے دن قبر کو اپنے ہاتھوں سے مرتب کرتے ہیں اور دف اور بانسریاں بجاتے ہیں۔ کیا یہ کام مکروہ ہیں یا نہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مرد میت کو اٹھا کر جلدی جلدی مگر پروقار انداز میں قبرستان لے جایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ عورتیں نہیں جاتی تھیں اور مرد بلند آواز میں تلاوت یا ذکر وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ یہی چاروں مذاہب کے علما اور دیگر علما کے اتفاق کے ساتھ سنت ہے۔ وہ میت کو لے جاتے وقت کسی بھی طرح کی آواز بلند کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے، چاہے کوئی تلاوت ہی کرے۔

---

① جامع المسائل (۷/۷۰-۷۱)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٤، ١٩١٥)

③ مجموع الفتاویٰ (۲۴/۲۹۳)

قیس بن عبادہ ایک بڑے تابعی تھے اور ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا، ان کا قول ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں، ذکر اور جنگ کے مواقع پر آواز پست رکھنا پسند کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو کسی جنازے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ فلاں کے لیے مغفرت کی دعا کرو تو فرمایا: اللہ اس دور دراز کے شخص کی بخشش نہ کرے۔ انھوں نے یہ بات اس بدعت سے منع کرنے کے لیے کہی۔

جب حضرت سعید بن مسیب کا آخری وقت آیا تو انھوں نے کہا:

"إياي وحادثكم هذا الذي ترحّموا على سعيد، استغفروا لسعيد"

سنن میں ہے کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز یا آگ کے ساتھ جنازے کے پیچھے چلنے سے منع کیا۔"[1] صحیحین میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنازہ جلدی لے جاؤ۔ اگر میت نیک ہوئی تو یہ خیر اور اچھی چیز ہے جس کی طرف تم اس کو جلدی لے جا رہے ہو۔ اگر وہ اس کے علاوہ کچھ ہوئی تو بری چیز ہے جس کو تم اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو۔"[2] سنن میں ہے: "جنازہ جلدی لے کر چلو اور یہود کی طرح آہستہ آہستہ نہ لے کر جاؤ۔"[3] اس مسئلے میں متعدد آثار ملتے ہیں۔

جنازے کے ساتھ عورتوں کا نکلنا منع ہے، بالخصوص جب وہ گریہ کریں یا ماتم کریں یا آوازیں بلند کریں۔ یہ بلاشبہہ نزاع ہے چاہے وہ یہ کام جنازے کے ساتھ کریں یا جنازے کی غیر موجودگی میں، لیکن جنازے کی موجودگی میں مردوں کے سامنے ایسا کرنا تو زیادہ سنگین کام ہے۔ صحیحین میں حضرت ام عطیہ سے مروی ہے کہ "ہمیں جنازے کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا۔"[4] سنن میں ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کے ساتھ کچھ عورتیں دیکھیں تو فرمایا: کیا تم اٹھانے والوں کے ساتھ اٹھاتی ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ کہا: کیا تم کھودنے والوں کے ساتھ کھودتی ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ کہا: کیا تم قبر میں ڈالنے والوں کے ساتھ ڈالتی ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بوجھ کے ساتھ واپس لوٹ جاؤ، اجر کے ساتھ نہیں۔ تم زندہ کو فتنے میں ڈالتی ہو اور مردہ کو اذیت پہنچاتی ہو۔"[5]

مردے کو اذیت پہنچانے کا مطلب ہے، نوحہ اور گریہ کر کے اذیت دینا، کیوں کہ صحیح میں آیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس پر نوحہ کیا جائے اس کو وہی عذاب دیا جاتا ہے جو اس پر نوحہ کیا جاتا ہے۔"[6] ہم نے اس موضوع پر

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٧١) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (١٩٣/٣) میں اسے ضعیف کہا ہے۔
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٤)
3. مسند أحمد (١٢١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٨)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٨)
5. سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧٨) السلسلة الضعيفة (٢٧٤٢)
6. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٩، ٩٢٧)

تفصیلی گفتگو کسی دوسری جگہ کی ہے اور ہم نے بتایا ہے کہ زندہ کے نوحہ کرنے سے میت کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ اس کو کسی دوسرے کے گناہ کی سزا کے طور پر نہیں ہوتی، بلکہ نوحہ کرنے والی کو اس کے نوحے کی سزا ملے گی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر اپنے مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اس کو قیامت کے دن خارش زدہ قمیص اور گندھک کی شلوار پہنائی جائے گی۔''[1]

لہٰذا میت نوحہ کرنے والے کے بوجھ اور گناہ کو نہیں اٹھاتی، بلکہ اس کو اس کے نوحہ کرنے کی وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے، جس طرح آپ ﷺ نے بتایا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کو جو تکلیف بھی پہنچے وہ لازماً کسی سزا کی وجہ ہی ہو۔ صحیحین میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رخساروں پر تھپڑ مارے، سینے چاک کیے اور جاہلیت کی آوازیں لگائیں وہ ہم سے نہیں۔''[2] اس حدیث میں آپ ﷺ نے رخساروں پر تھپڑ مارنے اور گریبان چاک کرنے والوں سے براءت کا اظہار کیا ہے۔ کچھ مصیبت زدہ لوگ مصیبت میں اپنے گریبان چاک کر لیتے ہیں، جاہلیت کی آوازیں لگاتے ہیں اور میت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کو پکارتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں: ''یا رکناہ!'' ''تو ہمارا سہارا تھا''، ''یا عضداہ!'' ''تو ہمارا بازو تھا!''، ''یا ناصراہ!'' ''تو ہمارا مددگار تھا۔'' یہ نوحہ کی صورت ہے، اس میں میت کو پکارا جاتا ہے، حالانکہ وہ جواب نہیں دیتی۔ اس پکارنے اور نوحہ کرنے میں زندہ کا کچھ فائدہ ہے نہ مردہ کا، بلکہ یہ دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ پر بے ہوشی طاری ہوگئی تو ان کی بہن نے ان پر نوحہ کرنا شروع کر دیا۔ جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے: تو میرے متعلق جو کہتی رہی، مجھ سے کہا جاتا رہا: کیا تو ایسا ہی ہے؟ کیا تو ایسا ہی ہے؟[3]

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے مصیبت کے وقت اپنا سر مونڈنے والی، مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی اور مصیبت کے وقت اپنے کپڑے پھاڑنے والی سے براءت کا اظہار کیا۔[4] اس موضوع کی احادیث بے شمار ہیں۔ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہم میت کے گھر اکٹھ کے لیے جانا اور کھانا بنانا نوحہ میں شمار کرتے تھے (رواہ أحمد)۔[5] یعنی جب لوگ اکٹھے ہوں اور اہلِ میت ان کے لیے کھانا تیار کریں، یہ جاہلیت کے کام ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۴۳)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۳۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۳)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۰۱۹)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۳۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۴)

[5] مسند أحمد (۲/۲۰۴) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۶۱۲) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

سنت یہ ہے کہ اہلِ میت کے لیے کھانا تیار کیا جائے، کیوں کہ وہ اپنی مصیبت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب حضرت جعفر کی موت کا پیغام آیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ''آلِ جعفر کے لیے کھانا تیار کرو۔ ان پر ایسی مصیبت ٹوٹی ہے جس نے ان کو اس سے مشغول کر دیا ہے۔''[1] میت کا عرس منانا عظیم ترین منکر اور بدعت ہے۔ ایسے ہی جنازوں میں نوحہ گری کے طور پر دف بجانا بھی بالاتفاق برائی ہے۔ کسی صاحبِ علم نے جنازوں اور موت کے مواقع پر دف بجانے کی اجازت نہیں دی تو بانسری کی اجازت کیسے ہو گی؟ دف وغیرہ کی اجازت شادی بیاہ کے موقع پر ہے جس طرح سنت سے ثابت ہے۔ کچھ اسلاف نے اس کو مطلقاً مکروہ کہا ہے، لیکن صحیح قول کے مطابق موت کے موقع پر اور شادی کے موقع پر دف بجانے میں فرق کرنا چاہیے۔ اسلاف کی دف کی چھن چھناہٹ نہیں ہوتی تھی، اس لیے چھنچھناہٹ والی دف کے جواز میں علما کے دو اقوال ہیں، مگر بانسری کی اجازت ائمہ اربعہ وغیرہ میں سے کسی نے بھی نہیں دی، شادی کا موقع ہو، یا موت کا سانحہ۔

ایسے ہی کچھ مصیبت زدہ لوگ مصیبت کے وقت سر کھول دیتے ہیں، بال پھیلا دیتے ہیں، اون کے کپڑے پہن لیتے ہیں، برتن اور چٹائیاں پھینک دیتے ہیں یا توڑ دیتے ہیں، یا گھوڑے کے بال اکھاڑ دیتے ہیں یا اس کی زین الٹ دیتے ہیں، یا اپنے گھر میں انجیر رکھ دیتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دیگر جتنے بھی کام ہیں سب غلط ہیں اور جاہلیت کے کاموں کی قبیل سے ہیں۔ ایسے ہی میت کے پاس پھل یا خوش بو رکھنا یا اس کو اچھے کپڑے اور زیور پہنانا وغیرہ جیسے سارے کام غلط ہیں اور جاہلیت کی قبیل سے ہیں۔ میت کو غسل دینے کی جگہ کھانا پینا رکھنا اور چراغ جلانا بھی بدعت اور بے اصل ہے۔ پھر تیسرے دن قبر کی مٹی پھاڑنا پہلے دن کی صبح یا تیسرے دن، یا ساتویں دن یا مہینے کے آخر میں یا سال بعد قبر پر جانا بھی بدعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفا کے زمانے میں ان کاموں کا کوئی رواج نہیں تھا۔ جب عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ ''میری قبر پر اتنی دیر بیٹھے رہنا جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے، میں تم سے مانوس ہو جاؤں گا، تاکہ دیکھوں اپنے رب کے ایلچیوں کو کس طرح جواب دے کر بھیجوں گا۔''

البتہ میت کی طرف سے صدقہ کرنا اس کو فائدہ دیتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی نص اور ائمہ کے اتفاق سے ثابت ہے۔ صحیح میں ہے کہ حضرت سعد نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری ماں کی جان نکل گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ بولتی تو صدقہ کرنے کا کہتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اس کو فائدہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦١٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠١٥)

ہاں۔[1] لیکن جنازے کے ساتھ صدقہ نکالنا بدعت ہے۔ یہ قبر پر ذبح کرنے کے مشابہ ہے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے۔ سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے قبر کے پاس جانور ذبح کرنے سے منع کیا۔[2] اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی بڑا آدمی فوت ہوتا تو لوگ اس کی قبر کے پاس اونٹ، گائے یا بکری وغیرہ ذبح کرتے تھے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کر دیا، بلکہ بعض ائمہ نے ایسے جانور کا گوشت کھانا صاف الفاظ میں مکروہ لکھا ہے، کیوں کہ یہ غیر اللہ کے لیے ذبح کرنے کے مشابہ ہے۔ کچھ علما کہتے ہیں جو لوگ جنازے کے ساتھ بکری، روٹی یا کسی اور صورت میں صدقہ نکالتے ہیں وہ اسی مفہوم میں ہے، اور اس میں درج ذیل خرابیاں ہیں:

① اس کی وجہ سے جنازے میں شریک ہونے والے لوگوں کے دل اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔
② وہ بھی جنازے میں شریک ہو جاتا ہے جس کا مقصد کچھ لینا ہوتا ہے۔
③ اس کی وجہ سے لوگ لڑ پڑتے ہیں۔
④ ایسے صدقات اکثر اوقات غیر مستحق لوگ لے اڑتے ہیں اور مستحق محروم رہ جاتا ہے۔
⑤ بعض اوقات میت مقروض ہوتی ہے یا اس کے وارث بچے اور چھوٹے ہیں۔
⑥ یہ کام ریاکاری کے لیے کیا جاتا ہے۔

لہٰذا جو انسان میت کی طرف سے صدقہ کر کے اس کو ثواب پہنچانا چاہتا ہے وہ مستحق پر صدقہ کرنے کا اہتمام کرے، تاکہ اس کو کچھ ثواب بھی ہو، کیوں کہ اگر صدقہ مستحق تک پہنچایا جائے اور وہ اس سے مستفید ہو تو اس کا اجر و ثواب بہت بڑا ہے، پھر اس میں سنت کی پیروی اور بدعت سے چھٹکارا بھی ہے۔[3]

جنازے کے ساتھ باآواز بلند کلمہ طیبہ کے ورد کا حکم

سوال جنازے کے ساتھ آواز بلند کرنا اور کلمہ طیبہ وغیرہ کا ورد کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد لله. جنازے کے ساتھ آواز بلند کرنا مستحب اور پسندیدہ عمل نہیں، خواہ بلند آواز میں تلاوت کی جائے یا ذکر کیا جائے یا اس طرح کا کوئی اور عمل کیا جائے۔ ائمہ اربعہ کا مذہب بھی یہی ہے، صحابہ و تابعین سے بھی یہی منقول ہے اور مجھے اس کا کوئی مخالف معلوم نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے آواز یا

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٤)
② مسند أحمد (١٩٧/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٨٥٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٣٦)
③ جامع المسائل (١٤٦/٤ـ١٥٢)

آگ کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے۔ (رواہ أبو داود)[1] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک آدمی کو کسی جنازے میں یہ کہتے ہوئے سنا: ''اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرو۔'' تو کہا: ''آج کے بعد اللہ اس کو معاف نہ کرے۔'' ایک بڑے تابعی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی قیس بن عباد سے منقول ہے: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنازوں، ذکر اور لڑائی کے وقت آواز پست رکھنا پسند کرتے تھے۔''

حدیث اور آثارِ صحابہ کا علم رکھنے والے علما کا اتفاق ہے کہ یہ کام پہلی تین افضل صدیوں میں نہیں ہوتا تھا۔

آج اگر کچھ لوگ یہ کام کرتے ہیں تو ان کا یہ کام حجت نہیں، کیوں کہ مسلمان اب بھی اسے ناپسند ہی کرتے ہیں اور مسلمانوں کے بے شمار علاقوں میں ابھی تک بہت سے جنازے آواز کے بغیر اور خاموشی سے نکلتے ہیں۔ اگر کسی ایک علاقے یا دو علاقوں یا دس علاقوں کے لوگ کسی کام کو معمول بنا لیں تو یہ اجماع نہیں ہوتا۔ اہلِ مدینہ بھی، کہ جس شہر میں قرآن وسنت کا نزول ہوا اور وہ دارِ ہجرت، دارِ نصرت، دارِ ایمان اور دارِ علم ہے، یہ کام نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر وہ امام مالک یا ان کے شیوخ کے زمانے میں کسی ایسے کام پر متفق ہو جائیں اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا سے نقل نہ کریں تو جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک ان کا یہ اجماع بھی معتبر نہیں ہوتا۔

اگر امام مالک اور ان کے اصحاب کے زمانے کے بعد کا اجماع بالاتفاق معتبر نہیں تو دیگر شہروں کے رہنے والوں کا اجماع کیا حیثیت رکھے گا۔ یہ کہنا کہ یہ عمل یہود و نصاریٰ کے جنازوں سے مشابہت رکھتا ہے، ایسا نہیں، بلکہ اہلِ کتاب جنازوں کے ساتھ آوازیں بلند کرتے ہیں۔ جب وہ ذمی تھے اس وقت ان پر یہ کام نہ کرنے کی شرط لگائی، نیز ہمیں ان کاموں میں ان کی مشابہت سے روکا گیا ہے جو ہمارے اوائل سلف کے طریقے سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اگر ہم اپنے اوائل اسلاف کی راہ اختیار کریں گے تو صحیح راہ پر گامزن رہیں گے گو وہ بعض اعمال میں ہمارے ساتھ شریک بھی ہوں جس طرح زمین میں دفن کرنے میں وہ ہمارے ساتھ شریک ہیں، واللہ أعلم۔[2]

دفن کے بعد کلمے کی تلقین کرنے کا حکم

سوال کیا میت کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کو کلمہ شہادت کی تلقین کرنا کسی صحیح حدیث یا کسی صحابی کے فعل سے ثابت ہے؟ اگر اس سلسلے میں کوئی روایت موجود نہیں تو کیا یہ کام کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب یہ مذکور تلقین، صحابیِ رسول حضرت ابوامامہ باہلی اور واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اس سلسلے میں ایک

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٧١) ضعيف الجامع (٦٢٠٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٩٣)

حدیث بھی روایت کی جاتی ہے، لیکن وہ صحیح نہیں۔ اسی طرح یہ اکثر صحابہ کا عمل بھی نہیں۔ اس بنا پر امام احمد وغیرہ اس تلقین میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور وہ اس کی رخصت تو دیتے ہیں، لیکن حکم نہیں۔ کچھ شافعی اور کچھ حنبلی علما کے نزدیک یہ مستحب ہے اور کچھ مالکی علما کے نزدیک مکروہ۔

احادیث میں جس عمل کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے کسی صحابی کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر پر کھڑے ہوتے اور کہتے: ''اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو، اس سے اب پوچھا جا رہا ہے۔''[1]

صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: «لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لا إله إلَّا الله»[2] اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔'' اس سے معلوم ہوا جو مر رہا ہو اس کو تلقین کرنا سنت ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ قبر میں دفنائے گئے شخص سے سوال کیے جاتے ہیں اور اس کو آزمایا جاتا ہے، اس لیے اس کے لیے دعا کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس وقت تلقین اس کو فائدہ دیتی ہے، کیوں کہ میت آواز سنتی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ان کے جوتوں کی کھٹک بھی سنتی ہے۔''[3] پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں جو ان سے کہتا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ نہیں سنتے۔''[4] آپ ﷺ نے مردوں کو سلام کہنے کا حکم بھی دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو آدمی کسی کی قبر سے گزرتا ہے اور وہ اس کو دنیا میں جانتا ہوتا ہے، وہ اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ اس کے سلام کا جواب دینے کے لیے اس کی روح اس میں لوٹا دیتا ہے۔''[5]

بنا بریں اس میں علما کے تین اقوال ہیں:

① یہ مستحب ہے۔ ② یہ مکروہ ہے۔ ③ یہ جائز ہے۔

تیسرا قول سب سے معتدل ہے۔[6]

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢١) صحيح الجامع (٩٤٥)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٦)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٠)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٣)

⑤ تاريخ دمشق (١٠٣٠/٨) الاستذكار (٢٣٤/١) العلل المتناهية (٤٢٠٩/٢) الآيات البينات في عدم سماع الأموات للآلوسي (ص: ٨٠)

⑥ مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٩٦-٢٩٧)

مسلمانوں کے قبرستانوں میں غیر مسلموں کو دفنانے کا مسئلہ

سوال مسلمانوں کے قبرستانوں میں ذمیوں کو بھی دفن کیا جاتا ہے، کیا صاحبانِ اقتدار اس سے روکیں یا نہ روکیں؟

جواب اہلِ ذمہ مسلمانوں کے کسی قبرستان میں اپنے مردے نہ دفنائیں، بلکہ ان کے قبرستان مسلمانوں کے قبرستان سے جدا اور اتنے واضح ہونے چاہئیں کہ ان کا ان کے ساتھ اختلاط نہ ہو سکے اور مسلمانوں کی قبریں کافروں کی قبروں کے ساتھ مشتبہ نہ ہوں۔ اگر زندگی میں ان کو خاص لباس پہننے کا حکم دیا جاتا ہے، تاکہ وہ مسلمانوں سے ممتاز اور نمایاں رہیں تو قبرستان میں اس کی تمیز کرنا زیادہ تاکیدی اور ضروری ہے، کیوں کہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں رحمت اترتی ہے اور کافروں کے قبرستانوں میں عذاب ہوتا ہے، اس لیے ان کے قبرستان مسلمانوں کے قبرستانوں سے دور ہونے چاہئیں اور جتنے دور ہوں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ واللہ أعلم[1]

عیسائی پڑوسی کی عیادت اور جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال کچھ مسلمان عیسائیوں کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی عیسائی بیمار ہو جائے تو کیا مسلمان اس کی عیادت کر سکتا ہے؟ یا اگر وہ مر جائے تو اس کا جنازہ پڑھ سکتا ہے؟ اگر کوئی مسلمان یہ کام کرے تو اس کو گناہ ہوگا؟

جواب الحمد للہ. عیسائی کے جنازے میں شریک نہ ہو، لیکن اس کی عیادت میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ اس میں اس کو اسلام کے قریب کرنے اور اس سے مانوس کرنے کی حکمت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کافر ہی مر جائے تو اس کے لیے جہنم لازم ہو جاتی ہے، اس لیے اس کا جنازہ نہ پڑھا جائے، واللہ أعلم۔[2]

مسلمان کی حاملہ عیسائی بیوی کے دفن کرنے کی جگہ

سوال ایک عیسائی عورت جس کا خاوند مسلمان ہے، فوت ہوگئی ہے اور اس کے پیٹ میں سات ماہ کا بچہ ہے۔ کیا اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا یا عیسائیوں کے ساتھ؟

جواب اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفنایا جائے گا نہ عیسائیوں کے قبرستان میں، کیوں کہ مسلمان اور کافر اکٹھا ہو گیا ہے، اس لیے کافر کو مسلمانوں کے ساتھ دفن کیا جا سکتا ہے نہ مسلمان کو کافر کے ساتھ ہی، اس کو علاحدہ دفن کیا جائے اور اس کی پشت قبلہ کی طرف کی جائے، کیوں کہ بچے کا چہرہ اس کی پشت کی طرف ہے۔ اگر اس کو

---

[1] جامع المسائل (٢٢٣/٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٦٥/٢٤)

اس انداز میں دفن کیا جائے گا تو مسلمان بچے کا چہرہ قبلے کی طرف ہو گا، بچہ اپنے باپ کے مسلمان ہونے کی وجہ سے مسلمان ہے، خواہ اس کی ماں کافر ہی ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔[1]

قبروں پر قرآن رکھنے اور چراغ جلانے کا حکم

سوال قبروں پر قرآن رکھنا اور وہاں چراغ جلانا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب قبروں کے نزدیک قرآن رکھنا اور وہاں قندیلیں روشن کرنا مکروہ اور منع ہے، اگرچہ انھیں وہاں قرآن پڑھنے کے لیے ہی روشن کیا جاتا ہو، لیکن اگر ویسے ہی روشن کیا جاتا ہو تو یہ اور بھی غلط ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ »[2]

''قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، ان کو سجدہ گاہ بنانے والوں اور ان پر چراغ جلانے والوں پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قبر پر قندیل یا چراغ جلانا مطلقاً منع ہے، کیوں کہ یہ ان دو کاموں میں سے ایک ہے جسے کرنے والے پر آنحضرت ﷺ نے لعنت بھیجی ہے۔

قبر پر قرآن خوانی امام ابوحنیفہ، مالک اور اکثر روایات میں احمد کے نزدیک مکروہ ہے۔

قبروں پر قرآن خوانی کی غرض سے قرآن پاک کے نسخے رکھوا دینا بدعت ہے۔ کسی سلف نے یہ کام نہیں کیا، بلکہ یہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کے مفہوم میں داخل ہے، جس سے احادیث میں منع کیا گیا ہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ والنَّصَارَى إِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ »[3]

''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

آپ ﷺ نے یہ بات ان کے اس برے فعل سے خبردار کرنے کے لیے کہی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ فرمان نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی قبر کو ظاہر کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے ناپسند کیا کہ کہیں اسے سجدہ گاہ نہ بنا لیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، خبردار! تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٣٩/٢٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) ضعيف الجامع (٤٦٩١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩، ٥٣٠، ٥٣١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

سلف اور ائمہ میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی نہی اور ممانعت میں کوئی اختلاف نہیں۔

سب جانتے ہیں کہ نماز کے لیے اللہ کے ذکر کے لیے اور تلاوت کے لیے مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، اگر قبر کو ان میں سے کچھ کاموں کے لیے خاص کر دیا جائے تو یہ اس نہی اور ممانعت میں داخل ہوگا۔ یہ اس صورت میں ہے جب لوگ وہاں رکھے ہوئے نسخوں سے دیکھ کر پڑھیں، لیکن اگر ویسے ہی قرآن پاک کو قبروں پر رکھ دیا جائے اور کوئی زندہ اس سے فائدہ اٹھائے نہ مردہ تو اس کے منع ہونے میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ اگر میت کو اس جیسے کاموں سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہوتا تو اسلافِ امت یہ کام ضرور کرتے، کیوں کہ انھیں ان کاموں کا زیادہ علم ہوتا تھا جو اللہ کو پسند ہیں اور وہ ان پر عمل کرنے اور ایسے کاموں کو تلاش کرنے میں بڑی مستعدی سے کام لیتے تھے۔ واللہ أعلم [1]

اپنی زندگی میں اپنی قبر کو کھدوانے کا حکم

سوال ایک آدمی اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر کھدوانے کا ارادہ رکھتا ہے، کیا اس کا کوئی ثواب اور فضیلت ہے؟ تفصیل سے آگاہ فرمایئے۔

جواب مرنے سے پہلے اپنی قبر کھدوانا کوئی مستحب اور نیک عمل نہیں۔ ایسا رسول اللہ ﷺ نے کیا نہ کسی صحابی ہی نے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ﴾ [لقمان: ٣٤]

''اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔''

لہٰذا بندے کو اپنے مرنے کے مقام کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں اپنی قبریں بنوائیں اور ان پر عمارتیں بھی کھڑی کر دیں، مگر وہ کسی دوسرے شہر میں فوت یا قتل ہو گئے! اگر اس سے مقصود موت کی تیاری ہے تو یہ نیک عمل کے ساتھ ہونی چاہیے، کیوں کہ قبر میں نیک عمل ہی مونس و غم خوار بنے گا۔ نماز، تلاوتِ قرآن، ذکر، دعا، صدقہ و خیرات اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے نیک اعمال جتنے زیادہ کرے گا اتنے ہی یہ قبر میں اس کو فائدہ دیں گے۔ قبر کو آراستہ کرنا اور وسیع کرنا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ بلکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قبر کو چونا گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔ [2] تو جو لوگ قبروں کو محلات کی طرح بناتے ہیں، ان سے متعلق کیا گمان کیا جا سکتا ہے بلکہ یہ سب برائیوں سے بڑی برائی ہے۔ یہ کام بالاتفاق میت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٠٠_٣٠٢)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٠)

کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ صرف عملِ صالح اس کو فائدہ دیتا ہے۔ فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے: ”سمجھ دار وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور موت کے بعد کے حالات کے لیے عمل کرتا ہے۔ عاجز وہ ہے جو نفس کو خواہش کا غلام بنا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے آرزوئیں لگا لیتا ہے۔“[1]

لہٰذا جو انسان سمجھتا ہے کہ قبر تیار کروانا اور اس کی تعظیم و آرایش کرنا اس کو فائدہ دے گا وہ جھوٹی آرزوئیں لگا لیتا ہے۔ قبر میں وہ اپنے دل کے حسبِ حال ہی ہوگا۔ جس قدر اس کے دل میں ایمان زیادہ ہوگا، اسی قدر وہ قبر میں خوشی اور عیش میں ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ﴾ [العاديات: ۹۔۱۱]

”تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا۔ اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا۔ بے شک ان کا رب اس دن کے متعلق یقیناً خوب خبر رکھنے والا ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قبروں کے رازوں اور سینوں کے بھیدوں کو یکجا کر دیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ رسولِ رحمت ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر مشرکوں کے لیے کہا تھا: ”اللہ ان کی قبروں اور پیٹوں کو اسی طرح آگ سے بھر دے جس طرح انھوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ، یعنی نمازِ عصر سے غافل کر دیا، حتی کہ سورج غروب ہوگیا۔“[2]

یہ وسیع مضمون ہے جو اس جگہ نہیں سما سکتا۔ واللہ أعلم[3]

مسجد میں کسی شخص کا اپنے لیے قبر کی جگہ مخصوص کرنے کا حکم

سوال ایک درویش ایک مسجد میں رہتا ہے۔ مسجد کی ایک ٹھنڈائی اقامت گاہ ہے۔ اس درویش نے اس میں اپنے لیے ایک قبر کھود رکھی ہے اور اس میں ایک فوارے والا مدّور (گول) حوض بنایا ہے۔ لوگ اس سے اختلاف بھی کر رہے ہیں۔ کیا اس کو اس قبر میں دفن کرنا اور اس جگہ اس عمارت کو برقرار رکھنا جائز ہے؟

جواب الحمد للہ. کسی کو مسجد میں دفن کرنا جائز نہیں۔ ایسی مسجد میں تو قطعاً نہیں جو اس کی موت سے پہلے بنائی گئی ہو۔ اس جیسی مسجد میں مردے کو دفن کرنا بالاجماع حرام ہے۔ اسی طرح کسی کے لیے بھی مسجد کے حوض یا کسی دوسری جگہ اپنی قبر بنانا جائز نہیں۔ اس میں مسجد کی چھت اور اس کی اقامت گاہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس کام میں

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٣١٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٨٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧)

[3] جامع المسائل (٢١٩/٤۔٢٢٠)

تعاون کرنے والا اللہ اور رسول کا نافرمان اور بالاتفاق خطا کار ہے۔ اور اس کام سے روکنے والا اللہ اور رسول کا فرماں بردار۔ اس لیے ہر صاحبِ استطاعت مسلمان کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔

مسجد میں اس طرح کی جو ٹھنڈائی اقامت گاہ اور قبر کا فوارہ وغیرہ تعمیر ہو اس کو توڑ دینا چاہیے۔ اس مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ و تابعین اور تمام ائمہ و مشائخ کا طریقہ یہی تھا کہ ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے اور ان میں سے کسی نے بھی یہ وصیت نہیں کی تھی کہ اس کو مسجد میں دفن کیا جائے اور نہ ان میں سے کسی کو مسجد میں دفن ہی کیا گیا، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا: ''تم میں سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مساجد نہ بنانا۔ میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[1]

صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔''[2] آپ ﷺ نے ان کے فعل سے خبردار کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر کو ظاہر کر دیا جاتا، لیکن آپ کو اس کا مسجد بنا لینا ناپسند تھا۔''[3] آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو لوگ قیامت قائم ہوتے وقت بقیدِ حیات ہوئے وہ بدترین لوگ ہوں گے اور وہ بھی جو قبروں کو مساجد بناتے ہیں۔''[4]

اگر ساری انسانیت کے سردار اپنی قبر کو مسجد بنانا ناپسند کرتے تھے، اس لیے صحابہ نے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے حجرے میں دفن کیا، تاکہ آپ کی قبر کو مسجد نہ بنا لیا جائے اور مسلمانوں کو بھی ہمیشہ ان کے قبرستانوں میں دفن کیا جاتا ہے۔ تو جو انسان ایسی جگہ دفن ہونا پسند کرتا ہے جہاں نماز پڑھی جاتی ہو اس کا مقصود نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقصود کے خلاف ہے اور ایسا ارادہ رکھنے والا اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والا ہے۔

سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور ان پر مساجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت کرے۔''

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[4] مسند أحمد (٤٥٤/١) صحيح ابن خزيمة (٦/٢) اس کی اصل صحیحین میں ہے: صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٤٩)

بنابریں جو چاہتا ہو کہ کسی عالم یا پیر کو ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں لوگ اس کی نذریں مانیں اور وہاں دیے جلائیں تو وہ اللہ اور رسول کی لعنت کا مستحق ہے، بلکہ اس کام کے لیے مسجد میں کوئی کھڑکی کھول کر اس میں تبدیلی کرنا بھی جائز نہیں۔ واللہ أعلم[1]

میت کو منتقل کرنا نیز روحوں کی ملاقات

سوال کیا میت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے؟ کیا مردوں کی روحیں ایک دوسری سے ملاقات کرتی ہیں، نیز کیا میت کی روح قبر میں اترتی ہے اور جو اس کی زیارت کرتا ہے وہ اس کو پہچان لیتی ہے؟

جواب الحمد لله. کسی اہم ضرورت کے بغیر قبر اکھاڑنا جائز نہیں، مثلاً پہلی جائے دفن میں کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے جو میت کے لیے باعثِ اذیت ہو تو اس کو دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے جس طرح کچھ صحابہ نے اس جیسی صورتِ حال میں میت کو منتقل کیا تھا۔

زندوں کی روحیں جب قبض ہو جاتی ہیں تو وہ مردوں کی روحوں سے ملاقات کرتی ہیں اور وہ آنے والوں سے زندہ لوگوں کے حالات معلوم کرتی ہیں، مثلاً: فلاں نے کیا کیا؟ وہ کہتے ہیں: اس نے شادی کر لی، فلاں خوش حال ہے، پھر وہ کسی دوسرے کے بارے میں پوچھتے ہیں تو وہ نیا آنے والا کہتا ہے: وہ ابھی تک تمھارے پاس نہیں آیا؟ وہ کہتے ہیں نہیں، وہ اپنی اصل جگہ (جہنم کے) گڑھے میں چلا گیا ہے۔

مردوں کی روحیں بھی ملاقات کرتی ہیں جو اعلیٰ درجے میں ہو وہ نچلے درجے میں اترتا ہے، لیکن جو نچلے درجے میں ہوتا ہے وہ اعلیٰ درجے کی طرف چڑھ کر نہیں جاتا۔ روح قبر میں جھانکتی ہے اور بسا اوقات قبر میں واپس بھی لائی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”جو آدمی کسی قبر کے پاس سے گزرتا ہے وہ دنیا میں اس کو جانتا ہوتا ہے اور اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سلام کا جواب دینے کے لیے اس کی روح اس میں لوٹا دیتے ہیں۔“[2] میت اپنی ملاقات کے لیے آنے والے کو کبھی پہچان بھی لیتی ہے، اس لیے یہ دعا پڑھنا سنت ہے:

« اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ أَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُؤْمِنِیْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ، وَیَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَمِنْکُمْ وَالْمُسْتَأْخِرِیْنَ »[3]

---

[1] جامع المسائل (٢٠١/٤-٢٠٣)

[2] تاريخ دمشق (١٠٣٠/٨) الاستذكار (٢٣٤/١) العلل المتناهية (٤٢٠٩/٢) الآيات البينات في عدم سماع الأموات للآلوسي (ص: ٨٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٤، ٩٧٥)

''مومن قوم کے گھر کے باشندو! تم پر سلامتی ہو، ہم بھی اگر اللہ نے چاہا تو تم سے آ ملیں گے، اللہ تعالیٰ ہم میں سے اور تم میں سے پہلے چلے جانے والوں اور بعد میں آنے والوں پر رحم فرمائے۔''[1]

ایک حدیث کی تحقیق

سوال کچھ لوگ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں جو کچھ میتوں کو مسلمانوں کے قبرستانوں سے عیسائیوں اور یہودیوں کے قبرستان میں اور ان کے قبرستانوں سے مسلمانوں کے قبرستانوں میں منتقل کر دیتے ہیں'' کیا اس سلسلے میں کوئی حدیث یا اثر منقول ہے، نیز کیا اس بات کی کوئی دلیل ہے؟

جواب الحمد لله. جسموں کو قبروں سے منتقل نہیں کیا جاتا، لیکن جس طرح ہم جانتے ہیں کہ کچھ لوگ بظاہر مسلمان ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں منافق، یہودی، عیسائی یا مرتد ہوتے ہیں، جس کی یہ صورتِ حال ہو وہ قیامت کے دن اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ ہی اٹھایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾ [الصافات: ۲۲]

''اکٹھا کرو ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے جوڑوں کو۔''

یعنی ان سے ملتے جلتے۔ اسی طرح مرنے والوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت بظاہر کفر پر آتی ہے، لیکن ممکن ہے کہ وہ سانس اکھڑنے سے پہلے پہلے مسلمان ہو گیا ہو، اس کے پاس کوئی مومن نہ ہو جو اس بات کی گواہی دے اور اس کے گھر والے کسی بھی غرض سے اس خبر کو چھپا لیں تو وہ مومنوں کے ساتھ ہی اٹھے گا، اگرچہ اس کو کافروں کے ساتھ دفن کیا گیا ہو۔ جہاں تک ان کے جسموں کو فرشتوں کے ذریعے نقل کرنے کی بات ہے تو میں نے اس کے متعلق کوئی اثر نہیں سنا۔[2]

انسان کی کوشش صدقہ جاریہ اور ایصالِ ثواب

سوال اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ۳۹] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

« إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُّنفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَّدْعُوْ لَهُ »[3]

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۴/۳۰۳۔۳۰۴)

(2) مجموع الفتاویٰ (۲۴/۳۰۴)

(3) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۳۱)

”جب بندہ فوت ہو جاتا ہے تو تین عملوں کے سوا اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، وہ تین یہ ہیں: صدقہ جاریہ، نفع بخش علم اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“

کیا اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ میت کو نیکی کے کاموں کا ثواب نہیں پہنچتا؟

جواب الحمد لله رب العالمين. آیت اور حدیث سے کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ میت کے لیے کوئی دعا کرے یا اس کی طرف سے کوئی نیکی کا کام کرے تو اس کو اس کا ثواب اور فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ میت کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ بات دینِ اسلام میں ہر کسی کو بداہتاً معلوم ہے، پھر کتاب وسنت اور اجماعِ امت بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو اس کی مخالفت کرتا ہے وہ بدعتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ۣالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ ﴾ [المؤمن: ٧۔٩]

”وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے تو ان لوگوں کو بخش دے جنھوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انھیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! اور انھیں ہمیشہ رہائش والی ان جنتوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کو بھی جو ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے لائق ہیں۔ بلاشبہ تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ اور انھیں برائیوں سے بچا اور تو جسے اس دن برائیوں سے بچا لے تو یقیناً تو نے اس پر مہربانی فرمائی۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فرشتے مومنوں کے لیے مغفرت، عذاب سے بچاؤ اور جنت میں داخلے کی دعا کرتے ہیں، حالانکہ فرشتوں کا دعا کرنا بندے کا عمل نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ ﴾ [محمد: ١٩]

”اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔“

حضرت ابراہیم نے کہا تھا:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ﴾ [إبراهيم: ٤١]

''اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہو گا۔''

اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ انبیائے کرام مومنوں کے لیے استغفار کرتے تھے اور اس میں ہمیں بھی دوسروں کے لیے استغفار کرنے کا حکم ہے۔

مسلمانوں کا دوسرے مسلمانوں کی نمازِ جنازہ پڑھنا، نماز میں ان کے لیے دعا کرنا اور رسول اللہ ﷺ کا قیامت کے دن شفاعت کرنا متواتر سنتوں سے ثابت ہے۔ جو ان کا انکار کرتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ بدعت پرستوں کے سوا کسی نے کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا انکار نہیں کیا۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے بھی شفاعت کریں گے اور آپ ﷺ کی شفاعت آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا اور سوال کرنا ہی ہے۔

یہ اور اس طرح کے حقائق جو قرآن کریم اور متواتر احادیث میں بیان ہوئے ہیں، جو آدمی ان کے ثابت اور معلوم ہو جانے اور حجت قائم ہو جانے کے باوجود ان کا انکار کرتا ہے اس کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

اس موضوع کی صحیح احادیث بھی کافی تعداد میں ہیں۔ صحاح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میری ماں فوت ہوگئی ہے۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو فائدہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میرا ایک باغ ہے، میں آپ کو گواہ بنا کر اس کو اس کی طرف سے صدقہ کرتا ہوں۔''[1] صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میری ماں کی سانس چھوٹ گئی اور وہ کوئی وصیت نہ کر سکی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ بولتی تو صدقہ کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔[2]

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میرا باپ فوت ہو گیا ہے اور اس نے کوئی وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو کچھ فائدہ ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٥٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٠)

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عاص بن وائل نے زمانۂ جاہلیت میں سو اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی تھی۔ ہشام بن عاص نے اپنے حصے کے اونٹ ذبح کر دیے اور عمرو نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تیرا باپ توحید کا اقرار کر لیتا، پھر تو اس کی طرف سے روزہ رکھتا یا صدقہ کرتا تو وہ اس کو فائدہ دیتا۔''[4]

سنن دارمی میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے والدین کی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتا تھا۔ اب ان کی موت کے بعد میں کس طرح ان کے ساتھ حسنِ سلوک کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کی زندگی میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد اس کی صورت یہ ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھ، اپنے روزے کے ساتھ ان کے لیے بھی روزہ رکھ اور اپنے صدقے کے ساتھ ان کے لیے بھی صدقہ کر۔''[2]

امام مسلم نے اپنی کتاب کے شروع میں ابو اسحاق طالقانی سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے کہا: اے ابو عبدالرحمان! اس حدیث کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ ان کی زندگی میں حسنِ سلوک کے بعد حسنِ سلوک کی یہ صورت ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھ ...؟ عبداللہ بن مبارک نے کہا: اے ابو اسحاق! یہ کس سے مروی ہے؟ میں نے کہا: یہ شہاب بن حراس کی حدیث ہے۔ انھوں نے کہا: وہ ثقہ ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کس سے روایت کرے تو ثقہ ہوتا ہے؟ انھوں نے کہا: حجاج بن دینار سے۔ پھر کہا: وہ بھی ثقہ ہے۔ میں نے کہا: وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا ہے؟ انھوں نے کہا: ابو اسحاق! حجاج اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بہت سا فاصلہ ہے، لیکن صدقہ کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ بات وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن مبارک نے کہی ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے۔ ائمہ کا اتفاق ہے کہ صدقہ میت کو پہنچتا ہے، اسی طرح دیگر مالی عبادات بھی پہنچتی ہیں جس طرح میت کی طرف سے کوئی غلام آزاد کر دینا، البتہ نماز، روزے اور قرآن خوانی جیسی بدنی عبادات میں اختلاف ہے، لیکن اس کے ساتھ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث بھی مروی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ مَاتَ وعَلَيْهِ صِيَامٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ»[3] ''جو فوت ہو جائے اور اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔'' صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] مسند أحمد (۱۸۲/۲) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (۱۹۵/٤) میں کہا ہے کہ اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ راوی مدلس ہے۔

[3] صحیح مسلم (۱۲/۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۵۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱٤۷)

سے مروی ہے کہ ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس کے ذمے نذر کے روزے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو اسے اتارتی تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟ اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ۔''[1]

صحیح میں مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: میری بہن فوت ہو چکی ہے اور اس کے ذمے مسلسل دو ماہ کے روزے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیری بہن کے ذمے قرض ہوتا تو کیا تو اسے اتارتی؟ اس نے کہا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کا حق زیادہ حق رکھتا ہے۔''[2]

صحیح مسلم میں عبداللہ بن بریدہ بن خصیب سے اپنے باپ کی روایت سے مروی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہیں، اگر میں اس کی طرف سے روزے رکھ دوں تو کیا یہ اس کی طرف سے ہو جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔[3]

یہ ساری احادیث صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ میت کی طرف سے وہ روزے رکھے جائیں جن کی اس نے نذر مانی ہوئی تھی، یہ قرض اتارنے سے مشابہت رکھتے ہیں۔

ائمہ کا اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے، جس کو یہ صریح احادیث پہنچی ہیں اس نے تو ان کی مخالف نہیں کی، لیکن جس تک یہ نہیں پہنچی اس نے ان کی مخالفت کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا ہے کہ اگر مسلمان کی طرف سے روزے رکھے جائیں تو یہ اس کو فائدہ دیتے ہیں۔ البتہ حج عام فقہا کے نزدیک دوسرے کی طرف سے کفایت کر جاتا ہے، اس میں شاذ سا اختلاف ہے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: جہینہ قبیلے کی ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی، لیکن وہ حج کرنے سے پہلے ہی فوت ہوگئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی طرف سے حج کر، اگر تیری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تو نہ اتارتی؟ اللہ کا قرض ادا کرو وہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کا قرض اتارا جائے۔''[4]

صحیح بخاری کی روایت میں ہے: ''میری بہن نے حج کی نذر مانی تھی۔''[5] صحیح مسلم میں حضرت بریدہ کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٧١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧١٦) صحيح ابن حبان)٢٩٩/٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٥٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢١)

روایت میں ہے کہ ایک عورت نے کہا: میری ماں فوت ہوگئی ہے اور اس نے حج نہیں کیا، اگر میں اس کی طرف سے حج کروں تو اس کو کفایت کر جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔[1]

ان صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے میت کی طرف سے حج فرض اور حج نذر کرنے کا حکم دیا ہے، جس طرح پہلی احادیث میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے اور جس کو حکم دیا جاتا ہے وہ کبھی بیٹا ہوتا ہے تو کبھی بھائی، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کو قرض سے تشبیہ دی ہے جو میت کے ذمے واجب الادا ہوتا ہے اور قرض کو ہر کوئی اتار سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھائی یا بیٹے ہی کے ساتھ خاص نہیں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں مذکورہ تفصیلی معروضات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے حق میں استغفار کرتا ہے یا اس کی طرف سے کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اس کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے، یہ اس آیت کے خلاف ہے جو سوال میں ذکر کی گئی نہ اس حدیث ہی کے منافی ہے، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صحیح اور برحق ہیں۔

حدیث شریف میں آپ ﷺ نے اولاد اور ماں باپ کے لیے اس کی دعا کا ذکر کیا، اولاد بندے کی کمائی ہی ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴾ [اللهب:٢]

''نہ اس کے کام میں اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا۔''

کسب کی تفسیر میں علما نے کہا ہے کہ اس سے اس کی اولاد مراد ہے۔ حدیث شریف میں بھی ہے:

((إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسَبِهِ وَإِنَّ وَلَدَهُ مِنْ كَسَبِهِ))[2]

''انسان کی پاکیزہ ترین کمائی وہ ہے جو اس نے ہاتھ سے کمائی ہو اور اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔''

کیوں کہ باپ اولاد کے دنیا میں وجود پذیر ہونے کا سبب بنتا ہے تو اس کا یہ عمل اس کی کمائی ہی ہوا، لیکن بھائی، چچا زاد اور باپ وغیرہ کے عکس کہ وہ اس کی دعا سے تو ضرور مستفید ہوتا ہے، بلکہ غیر رشتے داروں کی دعا سے بھی مستفید ہوتا ہے، لیکن یہ اس کا عمل نہیں ہوتا، جب کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: تین کے سوا اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ دوسرے کے عمل سے فائدہ نہیں حاصل کرتا، اگر اس کا بیٹا اس کے لیے دعا کرے تو یہ اس کے اس عمل سے ہے جو منقطع نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی دوسرا اس کے لیے دعا کرے تو

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢٠٨)

وہ اس کا یعنی میت کا عمل نہیں ہوتا، لیکن وہ اس کو فائدہ ضرور دیتا ہے۔

مفسرین نے آیت کے متعدد جوابات دیے ہیں: ایک یہ ہے کہ یہ ہم سے پہلی شریعتوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ مخصوص ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے۔ چوتھا یہ ہے کہ یہ آیت سعی اور جدوجہد کو براہِ راست شامل ہے اور اس کے سبب کو بھی شامل ہے۔ ایمان اس کی وہ سعی ہے جو اس میں سبب بنی۔ تاہم یہ آیت ان تفسیروں کی محتاج نہیں۔ اس کا ظاہر حق ہے جو باقی نصوص کے مخالف نہیں۔ اس میں کہا گیا ہے: ''انسان کے لیے بھی وہی ہے جو اس نے کوشش کی۔'' یہ بالکل برحق بات ہے۔ وہ اپنی کوشش کا مستحق ہے، کیوں کہ وہی اس کا مالک و مستحق ہے جس طرح مکاسب اور کمائے گئے کام۔ وہ انہی کا مالک ہوتا ہے جن کو کماتا ہے اور جو دوسرے کی کوشش ہوتی ہے وہ بھی حق ہے اور وہ اسی کی ملکیت ہوتی ہے، کسی دوسرے کی نہیں۔ لیکن یہ دوسرے کی کوشش سے فائدہ اٹھانے کے منافی نہیں، جس طرح آدمی دوسرے کی کمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طرح دوسرے کی کوشش سے مستفید بھی ہوتا ہے۔

جو کسی کا جنازہ پڑھتا ہے اس کو ایک قیراط کے برابر اجر ملتا ہے۔ یہ نمازِ جنازہ پڑھنے والے کی کوشش ہے اور وہ اس ثواب کو پا لیتا ہے، لیکن اس زندہ کے نمازِ جنازہ پڑھنے کی وجہ سے میت پر بھی رحم کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح حدیث میں ہے: جو مسلمان بھی فوت ہوتا ہے پھر مسلمانوں کی ایک جماعت اس کا جنازہ پڑھتی ہے تو وہ سو ہوں، ایک روایت میں ہے: چالیس ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ تین صفیں ہوں اور وہ اس کی سفارش کریں تو اس کے حق میں اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے، یا آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی بخشش ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کوشش کرنے والے کو اس کی کوشش کا ثواب دیتا ہے جو اس کی اپنی ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس زندہ کی اس میت کے لیے دعا کرنے کی کوشش، یا اس کی طرف سے صدقہ کرنے کی کوشش یا اس کی طرف سے روزہ رکھنے کی کوشش یا اس کی طرف سے حج کرنے کی کوشش کی وجہ سے اس پر رحم کر دیتے ہیں۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''جو آدمی اپنے بھائی کے لیے دعا کرتا ہے اللہ ایک فرشتے کی ذمے داری لگا دیتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے لیے جب کوئی دعا کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے: آمین اور تجھے بھی اس جیسا ملے۔ یہ وہ کوشش ہے جس کے ذریعے مومن اپنے بھائی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اللہ اس کو ثواب دیتا ہے اور دوسرے پر رحم کرتا ہے۔

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ۳۹]

''اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''

پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ کام جس سے میت کو یا زندہ کو فائدہ پہنچے یا اس کے ذریعے اس پر رحم کیا جائے وہ اس کی اپنی کوشش ہی ہو، بلکہ مسلمانوں کے بچے کسی کوشش کے بغیر اپنے باپوں کے ساتھ جنت میں جائیں گے، لیکن

وہ جس کو صرف اس کے عمل کی جزا ملے وہ ہر فائدہ اٹھانے سے زیادہ خاص ہے، تاکہ انسان اس عمل پر ثواب طلب نہ کرے جو اس کا اپنا نہ ہو، وہ اس قرض کی طرح ہے جس کو انسان دوسرے کی طرف سے اتارتا ہے اور وہ بری الذمہ ہو جاتا ہے، لیکن اس نے جو قرض اتارا ہوتا ہے وہ اس کے لیے نہیں ہوتا، کیوں کہ اصل میں اسے ہی وہ ادا کرنا چاہیے تھا جس کے ذمے تھا، واللہ أعلم۔[1]

میت کو قرآن خوانی کا ثواب

سوال کیا میت کو قرآن خوانی کا ثواب پہنچتا ہے؟

جواب میت کو ثواب پہنچانے کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے جس عمل کی ترغیب دی ہے وہ اس کے لیے دعا کرنا ہے۔

قبر پر قرآن خوانی امام ابوحنیفہ، مالک اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک مکروہ ہے۔ دوسری روایت میں انھوں نے اس کی اجازت دی ہے، کیوں کہ ان کو معلوم ہوا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر کے پاس سورت بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیات پڑھی جائیں۔ کچھ صحابہ سے سورت بقرہ پڑھنا بھی منقول ہے۔ بالجملہ دفن کرتے وقت قرآن خوانی منقول ہے، لیکن ایسا کوئی اثر نہیں ملتا جو دفن کے بعد بھی قرآن خوانی پر دلالت کرتا ہو، واللہ أعلم۔[2]

قرآن خوانی کا ایصالِ ثواب

سوال کیا قرآن پڑھ کر والدین یا مسلمان فوت شدگان کو ایصالِ ثواب کرنا افضل عمل ہے، نیز تلاوتِ قرآن کے بعد یہ دعا کرنا چاہیے کہ اے اللہ! میرے والدین اور مسلمان فوت شدگان کو اس کا ثواب دے، یا اس کے ثواب کو اپنے لیے ہی خاص رکھے؟

جواب افضل عبادت وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سابقین و اولین، انصار و مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کے مطابق ہو۔ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے:

«إِنَّ خَيْرَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٠٦۔٣١٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٢٩٨)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

''یقیناً بہترین کلام، کلام اللہ ہے اور بہترین سیرت، سیرتِ محمد (ﷺ)۔ بدترین امور نوایجاد ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ [التوبة: ١٠٠]

''اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سابقین سے مطلقاً راضی ہو چکا ہے اور جو احسان اور نیکی میں ان کی پیروی کریں ان سے بھی۔

صحیح بخاری میں کئی طرق سے یہ حدیث ثابت ہے: ''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میں مبعوث ہوا، پھر وہ جو اس کے بعد کا ہے، اور اس کے بعد وہ جو اس کے بعد کا ہے۔''[1] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''تم میں سے جو کسی کا طریقہ اختیار کرنا چاہے تو اس کا طریقہ اور سنت اختیار کرے جو فوت ہو چکا ہے، کیوں کہ زندہ آدمی فتنے سے مامون نہیں ہوتا۔ وہ اصحابِ محمد (ﷺ) تھے جو ساری امت سے زیادہ نیک دل، علم میں گہرے اور تکلف میں کم تھے۔ اس قوم کو اللہ نے اپنے نبی کی صحبت اور اقامتِ دین کے لیے منتخب کر لیا تھا، اس لیے ان کا حق پہچانو، ان کی سیرت اپناؤ۔ وہ صراطِ مستقیم پر تھے۔''[2]

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''قراء کی جماعت! سیدھے ہو جاؤ اور اپنے سے پہلے لوگوں کی راہ اختیار کرو۔ اللہ کی قسم! تم بہت دور نکل گئے ہو۔ اگر تم نے دائیں بائیں راہ اختیار کی تو بہت دور کی گمراہی میں جا پڑو گے۔''[3]

یہ وسیع موضوع ہے اور اس کے دلائل بھی بے شمار ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [هود: ٧]

''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

فضیل بن عیاض نے اس کی تعبیر میں کہا: "أخلصه وأصوبه" ''جو خالص ترین ہو اور صائب ترین ہو۔'' پوچھنے والوں نے پوچھا: "أخلصه وأصوبه" کیا ہے؟ انھوں نے کہا: ''عمل اگر خالص ہو مگر صائب یعنی درست نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا اور اگر صائب تو ہو لیکن خالص نہ ہو تب بھی قبول نہیں ہوتا۔ قبول تب ہی ہوتا ہے جب صائب بھی ہو اور خالص بھی۔ خالص یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے لیے کیا جائے اور صائب یہ ہے کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٤)

[2] حلية الأولياء (٣٠٥/١، ٣٠٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے مشكاة المصابيح کی تخریج میں اسے ضعیف کہا ہے: (١٩٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٣)

فضیل کا یہ قول متفقہ اصول ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»[1] ''جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی نیا کام کیا جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔''

صحیح حدیث ہے: «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ...»[2] فضیل نے یہ دونوں قاعدے ہی ذکر کر دیے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر اپنے لیے اخلاص کو واجب قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ ﴾ [البينة: ٥]

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں۔''

فرمایا:

﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ [زمر: ٢]

''پس اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والا ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [المؤمن: ١٤]

''پس اللہ کو پکارو، اس حال میں کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والے ہو۔''

و دیگر آیات۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہوں پر اللہ کی شریعت کو چھوڑ کر کسی دوسری شریعت اور طریقے کو دین بنانے کی مذمت بھی کی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشورىٰ: ٢١]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

فرمایا:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴾ [يونس: ٥٩]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

''کہہ کیا تم نے دیکھا جو اللہ نے تمھارے لیے رزق اتارا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال بنالیا۔ کہہ کیا اللہ نے تمھیں اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔''

اگر یہ قاعدہ اچھی طرح واضح ہوگیا ہے تو یاد رکھیے قرونِ فاضلہ میں مسلمان متنوع مسنون فرضی و نفلی عبادتیں کیا کرتے تھے جن میں نماز، روزہ، تلاوت اور ذکر وغیرہ شامل تھا۔ وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق مومن مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ وہ نمازِ جنازہ پڑھتے وقت اور قبرستان جاتے وقت زندہ و مردہ مسلمان کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ سلف کے ایک گروہ سے منقول ہے کہ ہر ختم قرآن کے موقع پر دعا قبول ہوتی ہے، اس لیے اگر کوئی ختمِ قرآن کے موقع پر اپنے لیے اپنے والدین اور اساتذہ کے لیے اور دیگر مومن مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کرے تو یہ مشروع کام کی قبیل سے ہے۔ ایسے ہی قیام اللیل اور قبولیت کے دیگر مواقع پر بھی ان کے لیے دعا کرنا جائز ہے۔ میت کی طرف سے صدقہ کرنا حدیث سے ثابت ہے۔ ایسے ہی روزے کی نذر ماننے والے کی طرف سے روزہ رکھنا بھی ثابت ہے۔ لہٰذا میت کی طرف سے صدقہ کرنا نیک عمل ہے۔ ایسے ہی اس کی طرف سے روزے کا ذکر بھی سنت میں آیا ہے۔ میت کو بدنی عبادات کا ایصالِ ثواب کرنے کے قائلین نے ان جیسے دلائل سے استدلال کیا ہے، لہٰذا اگر میت کو روزے، نماز یا قرآن خوانی کا ثواب ہبہ کر دیا جائے تو یہ حنبلی و حنفی مذہب اور کچھ شافعیوں اور مالکیوں کے نزدیک جائز ہے۔ اکثر شافعی اور مالکی فقہا کا کہنا ہے کہ یہ صدقہ کرنے اور غلام آزاد کروانے جیسی مالی عبادات میں تو مشروع ہے مگر بدنی عبادات میں نہیں۔ کیوں کہ مالی عبادت میں نیابت قبول ہوتی ہے اور وکیل بنانا جائز ہوتا ہے، لیکن بدنی عبادت میں ایسا جائز نہیں۔ پہلے موقف کے قائلین کا کہنا ہے کہ یہ ثواب ہے جس کا نیابت سے کوئی تعلق نہیں جس طرح اجیر خاص (مستقل ملازم) اپنی تنخواہ میں سے کسی کو اپنا نائب نہیں بنا سکتا، مگر وہ اپنی مرضی سے اپنی اجرت جس کو دینا چاہے، دے سکتا ہے۔ حنفی فقہا روزے وغیرہ میں تو نیابت کے قطعاً قائل نہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے ایصالِ ثواب کو جائز کہا ہے۔ نیابت ایصال اور ہبہ کے برعکس مخصوص جگہوں پر جائز ہوتی ہے۔

منکرین ایصال کی دلیل یہ ہے:

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ٣٩]

''اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔''

یہ استدلال متواتر نصوص اور اتفاقِ ائمہ کے خلاف ہے، جس کے مطابق انسان کبھی دوسرے کے عمل سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آیت سعیِ غیر کے استحقاق کی نفی کرتی ہے، سعیِ غیر سے فائدہ اٹھانے کی نفی نہیں کرتی۔ دونوں میں فرق واضح ہے۔ اس سب کے باوجود سلف صالحین کی یہ عادت نہیں تھی کہ جب وہ نفلی نماز پڑھتے یا نفلی روزہ رکھتے یا نفلی حج

کرتے یا قرآن پڑھتے تو اس کا ثواب مسلمان فوت شدگان کو ہبہ کرتے یا بلکہ اپنے لیے بھی خاص نہیں کرتے تھے۔ ان کا طریقہ وہی تھا جس کا ذکر ہو چکا، اس لیے ان کے طریقے کو نہیں چھوڑنا چاہیے، کیوں کہ وہی افضل اور اکمل ہے۔ ہم نے ایک تفصیلی جواب میں رسول اللہ ﷺ کے لیے ثواب کو ہبہ کرنے کے مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کا غیر مشروع ہونا ثابت کیا ہے۔ وہاں ہم نے اس سے متعلق تمام معانی اور حکمتیں بیان کی ہیں۔ واللہ أعلم[1]

تلاوت کے ایصالِ ثواب کا مسئلہ

سوال کوئی آدمی قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے، کیا وہ اس کا ثواب اپنے والدین کو دے دے یا مسلمان فوت شدگان کو یا اپنے ہی لیے رکھے؟

جواب افضل اور بہترین عبادات وہی ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کے مطابق ہوں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں ہمیشہ کہا کرتے تھے:

« خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ، وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ »[2]

''سب کلاموں سے بہترین کلام اللہ کا کلام ہے، بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے، بدترین کام بدعات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ »[3]

''بہترین صدی میری صدی ہے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"من كان منكم مستنا فليستن بمن قد مات فان الحي لا تؤمن عليه الفتنة، أولئك أصحاب محمد"

''تم میں سے جو شخص کوئی سنت اپنانا چاہتا ہے تو ان کی سنت اپنائے جو فوت ہو گئے ہیں۔ زندہ آدمی فتنے سے محفوظ نہیں ہوتا۔ وہ اصحابِ محمد تھے۔''

---

[1] جامع المسائل (٤/١٩٦۔٢٠٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣)

اگر اس قاعدے کو مدِ نظر رکھا جائے تو بہترین صدیوں کے مسلمانوں میں جو امور رائج اور معروف تھے وہ اس طرح تھے کہ وہ نماز، روزے، تلاوت، ذکر اور ان جیسی مختلف فرض و نفل عبادات میں مصروفِ بندگی رہتے۔ وہ مومن مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کرتے اور اللہ کے حکم کے مطابق جنازوں میں اور قبروں کی زیارت کے وقت تمام زندہ اور مردہ اہلِ اسلام کے لیے دعائیں کرتے۔ اسلاف کے ایک گروہ سے مروی ہے کہ ہر ختمِ قرآن کے موقع پر دعا قبول ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کریم ختم کرے اور اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، اپنے اساتذہ کے لیے اور دیگر مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعائے خیر کرے تو یہ جائز کاموں میں داخل و شامل ہے۔ اسی طرح تہجد اور دیگر قبولیتِ دعا کے موقعوں پر سب کے لیے دعا کرنا جائز ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے صحیح ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے میت کی طرف سے صدقہ کرنے اور اس کی طرف سے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ میت کی طرف سے صدقہ کرنا نیک عمل ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں کچھ علما فوت شدگان کو مالی اور بدنی عبادتوں کا ایصالِ ثواب کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ یہ احمد، ابو حنیفہ اور مالک و شافعی کے کچھ اصحاب کا مذہب ہے۔

بنا بریں اگر کوئی میت کو روزے، نماز یا تلاوت کا ایصالِ ثواب کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ اکثر مالکی اور شافعی فقہاء کہتے ہیں: یہ صرف مالی عبادات میں جائز ہے۔ فقہا کے اس موقف کے باوجود سلف صالحین کی یہ عادت نہیں تھی کہ وہ جب نفل نماز پڑھتے یا نفلی روزہ رکھتے یا حج کرتے یا تلاوت کرتے تو اپنے مسلمان فوت شدگان کو ان کا ایصالِ ثواب کر دیتے یا اس ثواب کو اپنے لیے خاص کرتے، بلکہ ان کا معمول وہی تھا جو پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس لیے لوگوں کو سلف صالحین کے راستے سے روگردانی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ وہی افضل اور اکمل راہ ہے۔ واللہ أعلم [1]

رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو تلاوت کا ایصالِ ثواب کرنے کا حکم

سوال ایک آدمی جب قرآن ختم کرتا یا کہیں سے بھی تلاوت کرتا ہے تو آخر میں کہتا ہے: اے اللہ! میری قرآن خوانی کا ثواب رسول اللہ ﷺ یا تمام اہلِ مشرق و مغرب کو ہدیہ کر دے، کیا ایسا کرنا جائز یا مستحب ہے؟ نیز کیا ایسے شخص کو روکنا چاہیے اور کیا کسی عالم نے یہ کام کیا ہے؟

جواب اس مسئلے کی بنیادی بحث یہ ہے کہ اگر فوت شدگان کو عبادات کا ثواب ہبہ کیا جائے تو ان کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ صدقے جیسی مالی عبادات کا ثواب پہنچنے میں تو کوئی اختلاف نہیں، کیوں کہ صحیح میں ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۳۲۱۔۳۲۲)

نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری ماں کی جان نکل چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ بولتی تو صدقے کا کہتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کر دوں تو کیا اس کو فائدہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔''[1]

روزے، نماز اور قرآن خوانی جیسی بدنی عبادات کا ثواب پہنچنے میں علما کے دو اقوال ہیں:

1. ابو حنیفہ، احمد اور کچھ مالکی اور شافعی علما کے نزدیک ان کا ثواب ہبہ کرنا، یعنی ایصالِ ثواب جائز ہے۔
2. مشہور مالکی اور شافعی مذہب میں یہ ثواب میت کو نہیں پہنچتا۔

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ ایک عورت نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میری ماں نے ایک مہینے کے روزے رکھنے کی نذر مانی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ۔''[2]

ان صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح میت کی طرف سے مالی عبادات کی جاتی ہیں، اسی طرح بدنی عبادات بھی کی جا سکتی ہیں۔ ترمذی میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی طرف سے قربانی کرنا ثابت ہے،[3] اور ان کے بقول رسول اللہ ﷺ نے ان کو اس کا حکم دیا تھا۔

اس قاعدے کی رو سے رسول اللہ ﷺ یا تمام فوت شدگان کو قرآن خوانی کا ایصالِ ثواب نفلی روزے یا نفل نماز کے ایصالِ ثواب جیسا اور ایک قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ اور تمام مسلمانوں کو صدقے، غلام آزاد کرنے اور حج کا ایصالِ ثواب کرنے جیسا ہی ہے۔

مگر ہمارے علم میں کسی صحابی، تابعی یا تبع تابعی کا یہ عمل نہیں آیا، البتہ متقدمین میں سے علی بن موفق سے متعلق آتا ہے کہ وہ کوئی اس طرح کا کام کیا کرتے تھے۔ یہ امام احمد کے طبقے کے ایک شیخ اور شیخِ جنید تھے۔

کچھ علما اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس سے ماوریٰ ہیں کہ کوئی ان کو کسی چیز کا ثواب ایصال کرے مگر یہ تردید عمدہ نہیں، کیوں کہ ہمیں آپ ﷺ پر درود بھیجنے اور آپ ﷺ کے مقام و وسیلے کی دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جب تم اذان سنو تو اس کا جواب دو، پھر میرے لیے اللہ تعالیٰ سے مقامِ وسیلہ کی دعا کرو۔ یہ جنت کا ایک درجہ ہے جو صرف ایک بندے کے لائق ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ میں ہی وہ بندہ ہوں، جس نے میرے لیے ''وسیلہ'' کی دعا کی، قیامت کے دن وہ میری شفاعت کا حق دار ہوگا۔''[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٩٥) ابو الحسناء راوی کے مجہول ہونے کی بنا پر یہ روایت ضعیف ہے۔

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

دعا اعلیٰ سے ادنیٰ کے لیے بھی ہوتی ہے اور ادنیٰ سے اعلیٰ کے لیے بھی، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''اپنی دعا میں ہمیں بھول نہ جانا۔''[1] جب آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اویس قرنی کی بابت بتایا تو کہا: ''اگر تیری بساط میں ہو کہ وہ تیرے لیے دعائے بخشش کرے تو وہ ضرور کرے۔''[2] ایسے ہی میت کی طرف سے صدقہ کرنا بھی جائز ہے اور روزہ رکھنا بھی، چاہے اپنی طرف سے روزہ رکھنے والے اور صدقہ کرنے والے اس شخص سے افضل ہی ہو۔ تو معلوم ہوا کہ میت کا زندہ سے افضل ہونا یا کوئی نبی یا صدیق ہونا زندہ کے لیے اس میت کے لیے دعا کرنے میں مانع نہیں، اسی طرح اس کا جنازہ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح میت کو نیک اعمال کا ثواب ایصال کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں۔ اللہ اپنے فضل سے اس پر بھی رحمت کرتا ہے اور اس پر بھی۔ جس طرح آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس رحمتیں نازل کرتا ہے۔''[3] نیز فرمایا: ''جو میرے لیے وسیلے کی دعا کرتا ہے قیامت کے دن میری شفاعت کا حق دار بن جائے گا۔''[4]

لیکن تمام لوگوں کو ایصالِ ثواب کرنا میرے علم میں نہیں آیا کہ کسی نے ایسا کیا ہو اور نہ میں نے یہ سنا ہے کہ کوئی رسول اللہ ﷺ کو ایصالِ ثواب کرتا تھا، البتہ علی بن موفق وغیرہ سے ایسا کچھ منقول ہے۔ مگر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی اقتدا ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔ انسان کو مشروع اور مسنون درود وسلام بھیجنے ہی پر اکتفا کرنا چاہیے، کیوں کہ اللہ ورسول نے اسی کا حکم دیا ہے۔

سنن میں حدیثِ مبارک ہے: ''جمعرات اور جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، کیوں کہ تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' صحابہ نے پوچھا: آپ کا جسم تو بوسیدہ ہو چکا ہوگا، پھر کس طرح ہمارا درود آپ پر پیش کیا جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''اللہ نے زمین پر انبیا کا گوشت کھانا حرام کر دیا ہے۔''[5]

ایک آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: میں ایک تہائی ورد آپ کے درود کے لیے وقف کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تیرے ایک تہائی معاملات اپنے ذمے لے لے گا۔ اس نے کہا: میں اپنا آدھا وقت آپ ﷺ پر درود کے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٩٤) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦٢٧٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٨٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٢٧)

لیے خاص کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تیرے آدھے معاملات اپنے ذمے لے لے گا۔ اس نے کہا: میں دو تہائی وقت آپ پر درود کے لیے خاص کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تیرے دو تہائی معاملات اپنے ذمے لے لے گا۔ اس نے کہا: میں اپنا سارا وقت آپ پر درود کے لیے خاص کر دوں گا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تب اللہ تیرے سارے دینی اور دنیاوی معاملات میں تجھے کافی ہو جائے گا۔''[1]

میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں، آپ پر درود کے اتنے فضائل ہیں کہ یہاں ذکر کیے جائیں تو تنگیِ دامن کا احساس ہو۔ اسی طرح مومنوں اور مومنات کے لیے دعا اور استغفار کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾ [محمد: ١٩]

''اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔''

سنن میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جو دعا کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''اے علی! دعا میں عمومیت رکھ۔ خصوص پر عموم کی فضیلت زمین پر آسمان کی فضیلت کی طرح ہے۔''

سنن میں حدیث ہے: ''غیر موجود کی موجود کے لیے دعا سب سے زیادہ جلدی قبول ہوتی ہے۔''[2] صحیح میں حدیث ہے: ''جو آدمی اپنے بھائی کے لیے اس کی غیر موجودگی میں دعا کرتا ہے اللہ ایک فرشتہ کو اس کا موکل بنا دیتا ہے۔ وہ جب تک اس کے لیے دعا کرتا ہے تو موکل فرشتہ کہتا ہے: تجھے بھی وہی ملے۔''[3] لہٰذا مومن کو شرعی افعال کی جستجو میں رہنا چاہیے۔ واللہ أعلم[4]

میت کو قرآن خوانی کا ثواب، اجرت پر پڑھوانا اور قبروں پر قرآن پڑھنا اور مسجد بنانا

سوال کیا میت کو قرآن خوانی کا ثواب ملتا ہے، نیز کیا قرآن خوانی کے لیے کسی کو اجرت پر بلوانا اور مستحق افراد کو کھانا کھلانا جائز ہے؟ ایک سوال یہ ہے کہ قبروں پر قرآن پڑھنا اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جو قبرستان کے درمیان ہو اور یہ معلوم نہ ہو کہ مسجد پہلے تھی کہ قبرستان پہلے تھا، جائز ہے یا ناجائز اور اس مسجد کے امام کو نیازیں پیش کی جاتی ہیں، وہ مسجد کی ضروریات کے لیے انھیں قبول کر سکتا ہے یا نہیں، ان مسائل میں فتویٰ درکار ہے۔ جزاکم اللہ خیرا.

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥٧) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٣٥) ضعيف الجامع (٨٤١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٢)

[4] جامع المسائل (٢١٣-٢٠٩/٤)

جواب الحمد لله رب العالمين. میت کی طرف سے جو صدقہ کیا جاتا ہے وہ بالاتفاق اس کو فائدہ پہنچاتا ہے اور صحیح احادیث میں اس کا ذکر ہوا ہے۔

قرآن خوانی کے لیے کسی کو اجرت پر بلوانا، پھر اس کا ثواب میت کی نذر کرنا درست نہیں، بلکہ علما نے تو قرآن کریم کی تعلیم دینے، اذان دینے، امامت کروانے اور کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنے کی اجرت لینے میں بھی اختلاف کیا ہے، کیوں کہ جو اجرت پر رکھتا ہے وہ پورا فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ مشہور مالکی اور شافعی مذہب میں یہ جائز ہے۔ اور ایک قول ہے کہ یہ جائز نہیں، کیوں کہ ان اعمال کو کرنے والے کے لیے ایسے شخص کا ہونا ضروری ہے جو نیکی کرنے والوں میں ہو اس لیے یہ اعمال مسلم کی طرف سے صحیح ہوتے ہیں، کافر کی طرف سے نہیں، لہٰذا ان کو اسی طور کروانا چاہیے جس میں اللہ کا قرب حاصل ہو۔ اگر ان کو صرف دنیا کی خاطر کیا جائے تو سب علما کا اتفاق ہے کہ ان کا اجر نہیں ملتا، کیوں کہ اللہ وہ عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کی رضا کے حصول کے لیے کیا جائے وہ نہیں جو دنیاوی مفاد کے لیے کیا جائے۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ حاجت مند کے لیے ان کاموں پر اجرت لینا جائز ہے، لیکن مال دار کے لیے نہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے یتیم کے نگران کے لیے اگر وہ نادار ہو، مالدار نہ ہو اس کے مال سے لینا جائز قرار دیا ہے۔ اس توجیہ کے مطابق یہ مضبوط ترین قول ہے۔ نادار اگر یہ کام اللہ کے لیے کرے اور اپنی ضرورت کی وجہ سے اجرت لے اور اس کے ذریعے اللہ کی عبادت میں معاونت لے تو اللہ اس کو اس کی نیت کا اجر دے گا اور وہ حلال کھانے والا ہو گا۔

اگر قرآن خوانی صرف دنیاوی اغراض کے لیے ہو تو ایسے لوگوں کو اس کا ثواب ہی نہیں ملتا۔ جب اس کام میں ثواب ہی نہیں تو وہ میت کو بھی نہیں پہنچتا، کیوں کہ میت کو عمل کا ثواب پہنچتا ہے، بذاتِ خود وہ عمل نہیں۔ اگر یہ مال مستحق پر صدقہ کیا جائے تو میت کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ اگر وہ ایسے لوگوں پر صدقہ کرے جو قرآن کریم کی تعلیم دیتے ہوں تو یہ افضل اور بہترین عمل ہے، کیوں کہ مسلمانوں کا اپنی جانوں اور مالوں کے ذریعے قرآن کریم کی تعلیم کو فروغ دینا بہترین اعمال میں شمار ہوتا ہے۔

اگر میت کے گھر والے کھانا بنا کر لوگوں کو دعوت دیں تو یہ ناجائز بلکہ بدعت ہے، بلکہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "كُنَّا نَعُدُّ الِاجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنْعَتَهُمُ الطَّعَامَ لِلنَّاسِ مِنَ النِّيَاحَةِ"[1]

"ہم میت کے گھر والوں کے پاس اکٹھ کرنے اور ان کا لوگوں کے لیے کھانا بنانے کو نوحہ گری میں شمار کرتے تھے۔"

مستحب عمل یہ ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کے گھر والوں کے لیے کھانے کا بندوبست کیا جائے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦١٢) مسند أحمد (٢/٢٠٤)

رسول اللہ ﷺ کے پاس جب حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''آلِ جعفر کے لیے کھانا بناؤ۔ ان کے پاس ایسی خبر آئی ہے جس نے ان کو مشغول کر دیا ہے۔''[1]

قبروں پر دائمی قرآن خوانی اسلاف کے ہاں معروف نہیں تھی، بلکہ قبر پر قرآن خوانی میں فقہا کا اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ، مالک اور اکثر روایات میں احمد نے اس کو مکروہ کہا ہے، لیکن احمد نے بعد کی ایک روایت میں رخصت دی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عمر نے اپنے دفن کے وقت سورت بقرہ کے آغاز اور اختتام کی آیات پڑھنے کی وصیت کی تھی۔ کچھ انصار صحابہ سے بھی دفن کے وقت سورت بقرہ کی تلاوت کی وصیت منقول ہے، لیکن یہ دفن کے وقت ہے۔ اس کے بعد قرآن پڑھنے کے حوالے سے ان سے کوئی اثر منقول نہیں، اس لیے امام احمد نے تیسری روایت میں دفن کے وقت کی قراءت اور دفن کے بعد کی قراءت میں فرق کیا ہے اور اس دوسری کو بدعت اور بے اصل قرار دیا ہے۔

جو کہتا ہے کہ میت قرآن کے سماع سے مستفید ہوتی ہے اور اس کو اجر ملتا ہے اس نے غلط کہا ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے سوا اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں: ....''[2] بنا بریں میت کو مرنے کے بعد قرآن کے سماع کا کوئی ثواب نہیں ملتا، گو میت واپس جانے والوں کے جوتوں کی آہٹ سنتی ہے، سلام بھی سنتی ہے اور دیگر امور بھی، لیکن ان مذکورہ تین عملوں کے سوا اس کا کوئی عمل باقی نہیں رہتا۔

قبرستان میں مساجد بنانا جنھیں عرفِ عام میں دربار اور آستانے کہا جاتا ہے ناجائز ہیں، بلکہ ساری امت رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی وجہ سے اس سے منع کرتی ہے: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے۔ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔'' آپ ﷺ نے ان کے اس فعل سے ڈرایا اور متنبہ کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر کو ظاہر اور نمایاں کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے اسے سجدہ گاہ بنانا ناپسند کیا۔''[3] صحیح میں یہ حدیث بھی ہے: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیتے تھے، خبردار! تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[4] سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، ان پر مسجدیں بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت کرتا ہے۔''[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦١٠) صحيح الجامع (١٨٩٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) السلسلة الضعيفة (٢٢٥)

ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ درباروں پر نماز پڑھنے کا کوئی استحبابی یا ایجابی حکم نہیں، اسی طرح باقی تمام جگہوں کو چھوڑ کر قبروں پر بنائے گئے درباروں میں نماز پڑھنے کی کوئی اضافی فضیلت نہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ان جگہوں پر نماز پڑھنا دیگر جگہوں پر نماز پڑھنے کی نسبت افضل ہے، یا اس کی کوئی فضیلت ہے اس کا مسلمانوں کی جماعت سے کوئی تعلق نہیں، وہ دین سے نکل جاتا ہے۔ امت کا یہی موقف ہے کہ ان جگہوں پر نماز پڑھنا منع اور نہی تحریمی ہے، گو قبرستان میں نماز کے حرام، مکروہ یا جائز ہونے یا پرانے اور اکھاڑے گئے قبرستان کے فرق کے ساتھ اختلاف ہے۔ جو اس سے منع کرتے ہیں وہ اس کی یہ علت بیان کرتے ہیں کہ قبرستان مردوں کے جسم سے نکلنے والی گندگی کی وجہ سے نجس ہو جاتا ہے اس لیے وہ ناپاک جگہ ہے جو نماز کے قابل نہیں، لیکن درباروں پر نماز پڑھنے سے منع کرنے کی علت مشرکوں کے ساتھ مشابہت ہے اور بتوں کی پوجا کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ [نوح: ۲۳]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

کئی ایک صحابہ اور تابعین کا کہنا ہے کہ یہ قومِ نوح کے کچھ نیک لوگوں کے نام ہیں۔ جب وہ مر گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے، پھر انھوں نے ان کی تمثیلیں بنا لیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ» [1] اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنا دینا جس کی پوجا شروع ہو جائے۔

بنا بریں تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قبروں پر بنائے گئے ان درباروں اور ان میں بیٹھے ہوئے مجاوروں اور گدی نشینوں کو تیل، شمع، پیسے اور کسی چیز کی نیاز نہ دی جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان پر دیے جلانے والوں اور ان پر مسجدیں بنانے والوں پر لعنت کی ہے۔ جو شخص اس طرح کی نذر دیتا ہے وہ گناہ کی نذر ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی نذر مانی وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔'' [2]

کیا ایسی نذر کا کفارہ ہے یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں: امام احمد وغیرہ کا قول ہے کہ اس پر قسم کا کفارہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔'' [3] (رواہ مسلم) مالک اور شافعی وغیرہ کا مذہب ہے

---

[1] مسند أحمد (۲/۲٤٦) موطأ (۱/۱۷۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٥)

کہ اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

تاہم اگر درباروں پر بیٹھے ہوئے مستحق مسلمان فقرا پر نذر کا پیسہ صدقہ کر دیا جائے جو اس کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر معاونت حاصل کریں تو یہ اچھا کام ہے اور اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کسی مسجد میں لوگ نماز اور جمعہ پڑھتے ہوں تو ان کو کسی دربار وغیرہ میں منتقل کر دینا جائز نہیں، بلکہ یہ سب سے بڑی گمراہی اور برائی ہے، کیوں کہ ایسے لوگ اللہ اور اس کے رسول کے دیے گئے حکم کو چھوڑ کر ان کے منع کردہ کام کا ارتکاب کرتے ہیں اور سنت کے تارک اور بدعت کے خوگر بنتے ہیں۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری چھوڑ کر نافرمانی کے مجرم بنے ہیں۔ جمعہ اور جماعت کو اسی مسجد میں دوبارہ قائم کیا جائے جہاں سے منتقل کیا تھا۔ وہ اللہ کا ایک گھر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ١٨]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

درباروں وغیرہ میں جو قبریں ہوتی ہیں ان کی زیارت کا سنت طریقہ یہی ہے کہ وہاں جا کر میت کو سلام کیا جائے اور اس کے لیے دعا کی جائے جو رسول اللہ ﷺ نے سکھائی ہے: «اَلسَّلَامُ عَلَيكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ ...»[1]

قبر کو چھونا، اس پر لیٹنا، یا اس کے پاس نماز پڑھنا، یا یہ نیت کر کے وہاں دعا کی غرض سے جانا کہ یہاں دعا کرنا دوسری جگہوں کی نسبت افضل ہے، یا اس کے لیے چڑھاوا چڑھانے، یا نیاز دینے کی غرض سے آنا، یا اس طرح کوئی دوسرا غیر شرعی کام تو یہ سب امور مسلمانوں کے دین سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ یہ وہ قبیح ترین بدعتیں ہیں جو شرک کی فروعات میں داخل ہیں، واللہ أعلم وأحکم۔[2]

ہفتہ وار یا ماہانہ ختم قرآن کی وصیت کا حکم

سوال ایک شخص نے فوت ہوتے وقت وصیت کی: مرنے کے بعد اس کا ہفتہ وار اور ماہانہ ختم (قرآن خوانی) دلوایا جائے، کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٥٤٦) ابن ماجہ کے زائد الفاظ والی روایت ضعیف ہے۔
[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣١٤-٣٢١)

جواب میت کے لیے صدقہ کرنا اس کے لیے اس طرح کی قرآن خوانی کرانے سے کہیں بہتر ہے، کیوں کہ ثوابِ صدقہ بالاتفاق میت کو پہنچتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری ماں کی جان نکل گئی ہے۔ میرا خیال ہے اگر وہ بولتی تو صدقے کا کہتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو فائدہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔[1]

اگر قرآن خوانی صرف اللہ کی رضا کے لیے کی جائے تو کیا اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے لیکن اجرت پر قرآن خوانی کرانا پھر میت کو اس کا ایصالِ ثواب کرنا کسی مشہور عالم نے مستحب قرار نہیں دیا؟ کیوں کہ دینے والا اللہ کے لیے صدقہ نہیں کرتا، پڑھنے والوں کو معاوضہ دیتا ہے اور پڑھنے والا بھی معاوضے کے لیے پڑھتا ہے۔ صرف قرآن خوانی کے لیے کسی کو اجرت پر بلانا ناجائز ہے۔ اختلاف تعلیم وتدریس جیسے امور میں ہے جن کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔ میت کو ثواب تب ہی پہنچتا ہے جب عمل خالصاً اللہ کے لیے کیا جائے۔ جو عمل اجرت کے لیے کیا جائے اس کا کوئی ثواب نہیں۔ اگر کوئی اجرت پر قرآن خوانی کروانے کا قائل بھی ہو تو کیوں کہ اس میں کئی قباحتیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے والے غیر مستحق ہوتے ہیں، ایک طرف قرآن خوانی ہو رہی ہوتی ہے اور دوسری طرف لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوتے ہیں اور پڑھنے والے بھی سب کھانا لوٹنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اگر قرآن پڑھنے اور پڑھانے والوں پر صدقہ کر دیا جائے تو جتنا ثواب ان کو ملتا ہے اتنا ہی ان کی معاونت کرنے والے کو بھی ملتا ہے اور ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی، پھر اس سے میت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔

اگر مرنے والا اس ختم کی وصیت کر جائے اور اس کا مقصد اللہ کی رضا اور قرب کا حصول ہو تو اس کا یہ مال ضرورت مندوں کو دے دیا جائے جو جب چاہیں ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے لیے قرآن پڑھ دیں، یہ لوگوں کو ختم کے لیے اکٹھا کرنے سے کہیں بہتر اور افضل ہے، واللہ أعلم۔[2]

مزار سازی کی تاریخ اور بدعات

سوال مزارات کے بارے میں بتائیے، ان کا آغاز کس نے کیا اور ان کی زیارت کا حکم کیا ہے؟ کہا جاتا ہے: جامع بنی امیہ وغیرہ کے پاس انبیا وصحابہ مدفون ہیں، وہاں جانا چاہیے یا نہیں؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید کی تربت حمص میں تھی اور ان کا پاؤں زمین پر چلتا تھا۔ تو کیا مزار سے برکت حاصل کرنا یا مردے کی زیارت

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۲۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۰٤)

[2] جامع المسائل (٤/١٨٦-١٨٧)

کرنا درست ہے؟ جو کہتا ہے: فلاں کی حرمت اور صدقے میں میری حاجت پوری کر دے، یا وہ اس کو پکارتا ہے تو اس کا حکم کیا ہے؟ نیک آدمی کی زیارت یا ایسی قبر کی زیارت کا حکم کیا ہے جہاں کسی نبی کا دفن ہونا ثابت ہو؟

جواب الحمد لله رب العالمين. ان سوالات کا جواب ان دو اصولی باتوں پر مشتمل ہے:

اول:

ان قبروں اور مزارات میں سے کچھ حقیقی ہیں اور کچھ غیر حقیقی اور خود ساختہ، لہٰذا ان کی تین اقسام بنتی ہیں:

1. کچھ ایسی قبریں ہیں جو بلاشبہہ حقیقی ہیں جیسے رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک اور آپ کے دو ساتھیوں: ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی قبریں۔ یہ تواتر سے ثابت ہیں، اگرچہ کئی رافضی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں پر تنقید کرتے ہیں۔ یہ لوگ بہتان باز اور محض بغض و عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی نبی اکرم ﷺ کی قبر کا انکار کرے۔

2. کچھ قبریں ایسی ہیں جو بلاشک وشبہہ جھوٹی اور جعلی ہیں، مثلاً دمشق کے مشرق میں حضرت ابی بن کعب کی طرف منسوب قبر۔ علما کا اتفاق ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں فوت ہوئے تھے۔ اسی طرح تمام امہات المومنین (رضوان الله عليهن أجمعين) بھی مدینہ طیبہ ہی میں فوت ہوئی تھیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ دمشق کے باہر حضرت ام حبیبہ یا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما وغیرہما کی قبر ہے، وہ صریحاً جھوٹ کہتے ہیں، لیکن صحابیات میں سے ام سلمہ، اسماء بنت ابی یزید بن السکن نامی صحابیہ شام میں فوت ہوئی تھی، ان کی قبر احتمال رکھتی ہے۔ اسی طرح حضرت بلال بھی ممکن ہے کہ دمشق کے چھوٹے دروازے کے پاس دفن ہوئے ہوں۔ ہمیں یہ تو علم ہے کہ وہ وہاں دفن ہوئے، لیکن قطعیت کے ساتھ ان کی قبر کی تعیین نہیں کر سکتے۔ یہ محلِ نظر ہے، کیوں کہ وہ قبریں بعد میں بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح دمشق کے مغرب میں اویس قرنی کی طرف منسوب قبر بھی بلاشبہہ جعلی ہے۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی نے ایک حکایت نقل کی ہے کہ وہ دمشق میں فوت ہوئے اور وہ قبر ان کی ہے، مگر یہ حکایت بالکل غلط اور جھوٹی ہے، کیوں کہ اویس کبھی شام آئے ہی نہیں، بلکہ وہ عراق گئے تھے۔ جامع دمشق میں حضرت ہود علیہ السلام کی طرف منسوب قبر بھی اہلِ علم کے اتفاق کے ساتھ جعلی اور جھوٹی ہے، کیوں کہ حضرت ہود علیہ السلام شام نہیں آئے تھے، بلکہ یمن میں مبعوث ہوئے اور انھوں نے مکہ ہجرت کی۔ ایک قول کے مطابق وہ یمن میں فوت ہوئے اور دوسرے قول میں مکہ میں۔ یہ معاویہ بن ابوسفیان کی قبر کے سامنے ہے، کیوں کہ دیوار کے پیچھے ایک تابوت ہے جس پر حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کا نام لکھا ہوا ہے۔ رہی وہ قبر جو چھوٹے دروازے کے باہر ہے اور جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے وہ حقیقت میں معاویہ بن یزید بن معاویہ کی قبر ہے۔ جو بہت تھوڑے وقت کے لیے خلیفہ بنا پھر فوت ہو گیا اور اس

نے کسی کو اپنا ولی عہد مقرر نہیں کیا تھا۔ وہ نیک اور دین دار شخص تھا۔ لیکن چونکہ یہ مشہور ہو گیا کہ وہ معاویہ کی قبر ہے، اس لیے لوگوں نے سمجھ لیا کہ شاید وہ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی قبر ہے۔

حضرت خالد کی قبر کا معاملہ بھی یہی ہے۔ وہ درحقیقت اس یزید کے بھائی خالد بن یزید بن معاویہ کی قبر ہے، لیکن چونکہ وہ خالد کے نام سے مشہور ہے اور عام لوگ خالد سے خالد بن ولید ہی مراد لیتے ہیں، اس لیے انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ خالد بن ولید کی قبر ہے، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے پر ان کو شام کی امارت سے معزول کر دیا تھا۔ حمص میں ان کی قبر سے متعلق بھی یہ اختلاف ہے کہ آیا وہ ان کی قبر ہے یا خالد بن یزید کی۔ اسی طرح داریا میں ابومسلم خولانی کی قبر میں بھی اختلاف ہے۔ ان کے علاوہ دیگر قبروں میں بھی اختلاف ہے۔ یہ تیسری قسم ہے جس میں نقل کرنے والے اور اہلِ تاریخ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی کے پاس خبر کا راجح ثبوت ہو تو جو بات راجح ہو اسے قبول کیا جائے گا۔

جن کا جعلی اور جھوٹ ہونا قطعیت سے ثابت ہے وہ بے شمار ہیں، مثلاً مصر میں علی بن حسین کی قبر جو بالاجماع مدینہ میں فوت ہوئے اور بقیع میں مدفون ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مقبرہ عباس میں ان کی قبر اور ان کے ساتھ ساتھ حسن، علی بن حسین، ابوجعفر باقر اور جعفر بن محمد کی قبریں بھی ہیں۔ حضرت حسین کا سر بھی وہیں ہے، مگر ان کا بدن بالاتفاق کربلا میں ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام بخاری نے ذکر کی ہے کہ ان کا سر عبداللہ بن زیاد کے پاس لایا گیا اور وہ ان کے دندان پر چھڑی مارنے لگا۔ اس کی گواہی حضرت انس بن مالک نے دی ہے۔[1] ایک دوسری روایت میں ابو برزہ اسلمی نے بھی اس کی گواہی دی ہے۔ یہ دونوں صحابی عراق میں تھے۔ جہاں تک یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ ان کا سر یزید کے پاس لے جایا گیا اور وہ ان کے دندان پر چھڑی مارنے لگا، وہاں حضرت ابو برزہ موجود تھے اور انھوں نے اس کو روکا اور اس کی مذمت کی، یہ منقطع یا مجہول سند کے ساتھ منقول ہے۔[2] یہ جھوٹی روایت ہے کیوں کہ حضرت ابوبرزہ یزید کے پاس شام میں نہیں تھے، بلکہ وہ عراق میں تھے۔ یہ اس طرح کی جھوٹی روایت ہے جس طرح کی جھوٹی روایت یہ ہے کہ اہلِ بیت کو قیدی بنا کر اونٹوں پر بٹھا کر لایا گیا تو اس وجہ سے اونٹوں کے دو کہان پیدا ہو گئے۔ ہر صاحبِ عقل اس کے جھوٹ ہونے کا یقین رکھتا ہے، کیوں کہ دو کہانوں والے اونٹ جنھیں بختی اونٹ کہا جاتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی موجود تھے۔ اس طرح کی ایک جھوٹی روایت یہ بھی ہے کہ حجاج بن یوسف نے اشرافِ بنی ہاشم کو قتل کیا، یہ بھی جھوٹ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حجاج بن یوسف کے ظلم وستم کے باوجود بنی ہاشم کو اس سے محفوظ رکھا اور اس نے کسی ہاشمی کو قتل نہیں کیا، بلکہ خلیفہ عبدالملک نے بھی یہی

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٥٣٨)

[2] تاریخ الطبري (٥/٤٦٥) البدایة والنهایة (١١/٥٥٩)

نصیحت کی اور کہا: کسی بھی ہاشمی سے تعرض کرنے سے اجتناب کرنا۔ میں نے آلِ حرب کو دیکھا ہے جب انھوں نے حسین سے تعرض کیا تو ان کو کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا بنو مروان کی حکومت میں بنو ہاشم کے اشراف میں سے کوئی بھی معروف آدمی قتل نہ ہوا۔ جب زید بن علی بن حسین کو کوفہ میں پھانسی دی گئی اس وقت عبداللہ بن جعفر کی بیٹی حجاج کے حبالۂ عقد میں تھی اور اس نے اس کو بہت زیادہ حق مہر دیا تھا، مگر حجاج ان کے نزدیک اس کے برابر کا نہیں تھا، اس لیے انھوں نے اس سے اس کی علاحدگی کرانے کی بھرپور کوشش کی، چونکہ لوگوں میں مشہور تھا کہ حجاج اشراف کو قتل کرتا ہے اور لفظ اشراف عرب قبیلوں کے سرداروں پر بولا جاتا ہے تو کچھ لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ان اشراف سے اشرافِ بنو ہاشم مراد ہیں۔ لفظ اشراف کو بنو ہاشم کے لیے خاص کرنا نیا عرف ہے، شرف ریاست یعنی سرداری اور عزت داری کو کہتے ہیں، جس طرح ترمذی کی اس صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا ذِئْبَانِ جَائِعَانِ أُرْسِلَا فِيْ غَنَمٍ فِأَفْسَدَ لَهَا مِنْ حَرْصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهِ »[1]

''دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے کسی ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ ان میں اتنی تباہی نہیں پھیلاتے جتنی تباہی انسان کی مال اور شرف (سرداری) کی حرص اس کے دین میں پھیلاتی ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے: بنومخزوم کی عورت نے قریش کو پریشان کر دیا۔ وہ کہنے لگے: کون اس سے متعلق رسول اللہ ﷺ سے بات کرے گا؟ اور اسامہ بن زید کے سوا کس میں یہ جرأت ہے؟ جب اسامہ نے اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ غصے میں آ گئے اور کہنے لگے:

« إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ إِنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وإِذَا سَرَقَ فِيْهُمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدِّ »

''تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے تباہ ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف (عزت دار) چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی ان میں کمزور چوری کرتا تو اس پر حد لگا دیتے۔''

اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتے۔''[2]

یہ عورت اشراف سے اور بنومخزوم سے تھی۔

بعینہٖ کوہِ بعلبک پر حضرت نوح علیہ السلام کی قبر بھی جھوٹی اور جعلی ہے اور اس کو ظاہر ہوئے بھی ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا

---

[1] مسند أحمد (٤٥٦/٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٧٦) سنن الدارمي (٣٩٤/٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٦٢٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠٦)

ہے۔ وہاں کے رہنے والوں نے مجھ سے اس کے متعلق پوچھا تھا اور میں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اس کی کوئی حقیقت واصلیت نہیں۔

قاہرہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کے مدفن کی اصلیت بھی یہی ہے۔ قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کے موضوع پر لکھنے والوں کا اتفاق ہے کہ ان کے سر کا کوئی پتا نہیں۔ مورخین جانتے ہیں کہ قاہرہ میں موجود یہ مدفن جعلی ہے۔ اصل میں اس کو عسقلان کے ایک مدفن سے منتقل کیا گیا اور وہ مدفن اس سے تقریباً ساٹھ سال پہلے پانچویں صدی کے اواخر میں تعمیر کیا گیا، جب کہ یہ چھٹی صدی کے درمیان، یعنی حضرت حسین کی شہادت کے تقریباً پانچ صدیاں بعد بنایا گیا۔ قاہرہ شہر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تقریباً تین سو سال بعد بنایا گیا اور یہ مدفن قاہرہ کے بنائے جانے کے تقریباً دو صدیاں بعد بنایا گیا۔

ایسے ہی کوفہ میں نجف کے اندر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر بھی جعلی ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں ان کو کوفہ کے قصرِ امارت میں دفن کیا گیا تھا، جس طرح حضرت امیر معاویہ کو شام کے قصرِ امارت میں دفن کیا گیا اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو مصر کے قصرِ امارت میں دفن کیا گیا، کیوں کہ یہ خدشہ تھا کہ کہیں خوارج ان کی قبریں اکھاڑ نہ دیں۔ دراصل انھوں نے ان اصحاب کو قتل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی مسجد میں نمازِ فجر ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلے تو عبدالرحمن بن ملجم نے ان کو قتل کر دیا۔ ایک شخص نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے وار کیا مگر وہ علاج کے بعد بچ گئے اور زندہ رہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس دن خارجہ نامی آدمی کو اپنا نائب بنا کر مسجد میں بھیج دیا۔ ایک خارجی نے اس کو عمرو بن عاص سمجھتے ہوئے اس پر وار کیا تو کہا: میں نے تو عمرو کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر اللہ نے خارجہ کا ارادہ کیا۔

حران کے باہر جابر رضی اللہ عنہ کی قبر کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں فوت ہوئے اور وہاں فوت ہونے والے آخری صحابی تھے۔ جزیرہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی قبر بھی ان جیسی قبروں میں شمار ہوتی ہے، کیوں کہ سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ وہ اسی سال مکے میں فوت ہوئے جس سال عبداللہ بن زبیر کو قتل کیا گیا اور انھوں نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کو حرم سے باہر دفن کیا جائے، کیوں کہ وہ مہاجر تھے، یہ بات ان پر گراں گزری تو انھوں نے ان کو بالائی مکہ میں دفن کر دیا۔

ان میں سے بہت سارے نام ناموں میں اشتراک کی وجہ سے بھی غلط فہمی کا باعث بنے ہیں، جس طرح لفظی اشتراک کی وجہ سے معاویہ وغیرہ کی قبر میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی اس لیے ممکن ہے وہاں کوئی جابر یا عبداللہ بن عمر نامی شخص دفن ہوا ہو اور جاہلوں نے اس نام کی وجہ سے اس کو صحابی سمجھ لیا ہو، پھر وہ اسی طرح مشہور ہو گیا ہو۔

ایسے ہی شام و مصر وغیرہما میں مدفون رقیہ و امِ کلثوم وغیرہما سے متعلق بھی کچھ لوگ یہ گمان کر سکتے ہیں کہ شاید وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کی قبریں ہوں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں صاحبزادیاں بالاتفاق مدینہ میں اور

آپ ﷺ کی زندگی ہی میں فوت ہوگئی تھیں اور دونوں یکے بعد دیگرے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حبالۂ عقد میں آئیں۔ اسی وجہ سے ان کو ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی زینب بھی آپ کی زندگی ہی میں وفات پا گئی تھی۔ اور آپ ﷺ نے اپنے پس ماندگان میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو چھوڑا۔ آپ ﷺ کی کوئی بیٹی نہ کبھی شام گئی نہ مصر اور نہ دوسرے خطے ہی میں۔

عُرنہ کے پہلو میں مسجد ابراہیم سے متعلق کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ مراد ہیں، حالانکہ وہ عباس کی اولاد میں ایک شخص تھا اور یہ مسجد عباسی دورِ حکومت میں اس جگہ علامت کے طور پر تعمیر کی گئی، جہاں رسول اللہ ﷺ نے عرفات کے دن ظہر و عصر کی نمازیں پڑھی تھیں۔ آپ ﷺ نے زوال تک ''نمرۃ'' پر قیام کیا، پھر سوار ہو کر وادی عرنہ میں آئے اور اس جگہ ٹھہرے جہاں یہ مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی ہی پر خطاب کیا۔ اس کے بعد اتر کر وہیں لوگوں کو ظہر و عصر کی اکٹھی اور قصر نمازیں پڑھائیں۔ بعد ازاں عرفات میں موقف پر تشریف لائے۔

حران میں بھی ایک مسجد، مسجدِ ابراہیم کے نام سے موجود تھی۔ اس کے متعلق بھی جاہلوں کا یہی خیال تھا کہ اس سے ابراہیم خلیل اللہ مراد ہیں، حالانکہ وہ ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس تھا جو عباسی خلافت کا دعوے دار تھا۔ اس کو وہاں قید کر دیا گیا اور وہ وہیں قید کی حالت میں فوت ہوگیا۔ اس نے اپنے بھائی ابوجعفر منصور کو اپنا وصی (وارث) بنایا۔

اختلافی قبریں بے شمار ہیں۔ حضرت خالد بن ولید کی قبر بھی انہی میں سے ایک ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق دو اقوال ہیں۔ ابوعمر ابن عبدالبر نے دونوں اقوال ''الاستیعاب''[1] میں نقل کیے ہیں۔ ایک قول کے مطابق وہ حمص میں فوت ہوئے اور دوسرے قول کے مطابق ۲۱ھ یا ۲۲ھ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدینہ طیبہ میں فوت ہوئے اور انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا وصی بنایا۔ ابوعمر کہتے ہیں: یحییٰ بن سعید قطان نے ''عن سفيان، عن حبيب بن ثابت عن أبي وائل'' کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ بنومغیرہ کی کچھ عورتیں ایک گھر میں اکٹھی ہو کر حضرت خالد بن ولید پر رو رہی تھیں تو انھوں نے فرمایا:

''وما عليهن أن يبكين على أبي سليمان ما لم يكن نقع أو لقلقة''

''جب تک ان کی آواز بلند نہ ہو یا نوحہ گری نہ ہو یہ ابوسلیمان پر رو سکتی ہیں۔''

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی قبر سے متعلق علما کا کہنا ہے کہ وہ اصلی ہے، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے حجرے کی طرح بند تھی نہ اس پر کوئی مسجد تھی اور نہ وہاں کوئی نماز ہی پڑھتا تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے یہ علاقے فتح کیے تو انھوں نے اس بستی میں اپنے لیے ایک مسجد بنائی جو عیسائیوں کے عبادت خانے سے ہٹ کر تھی۔ اس

[1] الاستیعاب (۴۰۹/۱)

کے بعد مقبرے کی دیوار میں رخنہ ڈال دیا گیا جو آج تک موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب عیسائیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے اس کے اندر رخنہ ڈال کر اس کو گرجا بنا لیا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت اس کا متولی کوئی سنت کا عالم نہیں تھا جو اس کو بند کر کے کسی دوسری جگہ مسجد بنا دیتا، چنانچہ اس کو مسجد بنا لیا گیا۔ قرآن و حدیث کا علم رکھنے والے وہاں نماز نہیں پڑھتے۔

دوسری اصولی بات:

انبیائے عظام اور اولیائے کرام کی طرف منسوب ان قبروں اور درگاہوں کے نقل و روایت میں اضطراب ہے اور اس میں بہت سا جھوٹ اور اشتباہ شامل ہو چکا ہے، کیوں کہ ان کی حفاظت دین کا حصہ نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نازل کردہ ذکر کی حفاظت کی ضمانت دیتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ ﴾ [الحجر: ٩]

''بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ حکمت بھی اتاری ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ ﴾ [البقرة: ٢٣١]

''اور اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کو بھی جو اس نے کتاب و حکمت میں سے تم پر نازل کیا ہے۔''

حکمت سے مراد سنت ہے۔ قتادہ، یحییٰ بن ابی کثیر اور شافعی وغیرہم جیسے بہت سے اسلافِ امت نے یہی تفسیر کی ہے۔ دلیل یہ آیت ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾ [الأحزاب: ٣٤]

''اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جن آیات اور دانائی کی باتوں کی تلاوت کی جاتی ہے انھیں یاد کرو۔''

ان کے گھروں میں جو چیز پڑھی جاتی تھی وہ قرآن تھا اور سنت تھی۔ تو جو ذکر اللہ نے اتارا اسی کی حفاظت کی ضمانت دی اس لیے شریعت محفوظ و مضبوط ہے اور یہ شریعت کا مسئلہ ہی ہے کہ ان قبروں اور درگاہوں کو ایسا نہ بنایا جائے، بلکہ قبروں کی زیارت کی دو اقسام ہیں: ایک مسنون زیارت اور دوسری غیر مسنون زیارت۔ مسنون زیارت کی صورت یہ ہے کہ میت کو سلام کہا جائے اور اس کے لیے جس طرح جنازے میں دعا کی جاتی ہے، دعا کی جائے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو قبروں کی زیارت کرتے وقت یہ دعا پڑھنے کی تلقین کی ہے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ دَارِ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُتَقَدِّمِيْنَ مِنَّا وَمِنْكُمْ وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ، اَللّٰهُمَّ لَا

تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ، وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ »[1]

میت کے لیے یہ دعا نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو منافقوں کی بابت یہ حکم دیا:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ﴾ [التوبة: ٨٤]

''اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔''

اگر اللہ نے اپنے نبی کو منافقوں کا جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے روک دیا تو مفہومِ مخالف کے اسلوب سے ثابت ہوا کہ مومنوں کا جنازہ پڑھا جائے اور ان کی قبروں پر کھڑا ہوا جائے۔ قبروں پر کھڑا ہونے کی تفسیر وہاں کھڑا ہو کر ان کے لیے دعا کی گئی ہے، اس لیے مومن کی قبر پر کھڑا ہو کر اس کے لیے دعا کرنا مشروع اور جائز ہے۔

اگر قبروں اور درگاہوں کی زیارت، وہاں جا کر نماز پڑھنے، دعا کرنے، میت کو وسیلہ بنانے، قبر کو چومنے اور چھونے، وہاں میت کے وسیلے سے مدد، رزق، ہدایت وغیرہ جیسی حاجتیں مانگنے کی نیت سے کی جائے تو یہ ائمہ اسلام کے اتفاق کے ساتھ ناجائز ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کام کیا نہ اس کا حکم دیا اور نہ اس کی ترغیب ہی دی۔ اسی طرح کسی صحابی، تابعی اور امام نے اس کو سیکھا نہ کیا، بلکہ وہ کسی قبر پر کوئی درگاہ، مسجد یا کسی طرح کی عمارت تعمیر نہیں کرتے تھے۔ یہ درگاہیں اور دربار پہلی تین فضیلت والی صدیوں کے بعد کی پیداوار ہیں اور بنی بُوَیہ وغیرہ جیسے بدعتیوں اور جاہلوں کی سلطنت و حکومت کے زیرِ سایہ وجود میں آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کام سے منع کیا ہے، بلکہ ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے مرض الموت میں ارشاد فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مسجدیں (سجدہ گاہ) بنا لیا۔'' آپ ﷺ نے ان کے کام سے خبردار کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی۔[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ ﷺ کی قبر کو نمایاں کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو مسجد بنانا ناپسند کیا۔''[3]

صحیح مسلم میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن پہلے ارشاد فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مساجد (سجدہ گاہیں) بنا لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مسجد نہ بناؤ۔ میں تمھیں اس سے روکتا ہوں۔''[4]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٥٤٧) مسلم و ابن ماجہ میں یہ سارے الفاظ نہیں ہیں۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣١)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٢٦٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٩)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٣٢)

موطا امام مالک میں ہے: ''اے اللہ! تو میری قبر کو صنم نہ بنا دینا جس کی پوجا کی جائے۔ ایک قوم پر اللہ کا شدید غضب نازل ہوا۔ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔''[1] مسند وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بدترین لوگ وہ ہیں جن کو قیامت آ لے اور وہ زندہ ہوں اور وہ جو قبروں کو مساجد بناتے ہیں۔'' (رواہ حاتم في صحیحه)[2]

اس لیے اسلاف اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ جو نبی کریم ﷺ کی قبر پر جا کر درود و سلام پڑھے یا کسی نبی یا کسی ولی کی قبر پر جائے تو قبر کو چومے نہ تبرک کے لیے اس پر ہاتھ ہی پھیرے، بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ چھونا یا چومنا صرف حجرِ اسود کے لیے خاص ہے اور رکنِ یمانی کو صحیح قول کے مطابق چھونا جائز ہے، مگر چومنا نہیں۔ جب زائر نبی اکرم ﷺ پر سلام بھیج لے اور دعا کرنا چاہے تو قبلہ رخ ہو جائے اور مسجدِ نبوی میں دعا مانگے، قبر کی طرف منہ کر کے دعا نہ کرے، کیوں کہ صحابہ کا یہی طریقہ تھا اور اس میں اہلِ علم کا کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں۔ اگرچہ اس مسئلے میں اس کے خلاف امام مالک سے خلیفہ منصور کے ساتھ بحث میں ایک بات منقول ہے مگر اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ آپ ﷺ پر سلام بھیجتے وقت بھی قبر کی طرف منہ کیا جائے گا یا قبلے کی طرف ہی کیا جائے گا۔ ابو حنیفہ کے اصحاب کے نزدیک قبلے کی طرف ہی منہ کیا جائے گا اور اکثر کے نزدیک قبر کی طرف منہ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ کا حجرہ مسجد سے باہر تھا۔ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں مسجد کی توسیع کی گئی تو مسجد کے مشرقی اور قبلہ کی جانب حجرہ مالکوں سے خرید کر مسجد میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ جو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا مدفن ہے مسجد میں داخل ہو گیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز نے وہاں دیوار تعمیر کروائی تو اس کو قبلہ کی سمت سے تھوڑا پھیر دیا اور اس کی پشت کو چوکور کی شکل دے دی، تاکہ کوئی اس کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکے، کیوں کہ صحیح میں آپ ﷺ کا فرمان ثابت ہے:

«لَا تَجْلِسُوْا عَلَی الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا إِلَیْهَا»[3]

''نہ قبروں پر بیٹھو اور نہ ان کی طرف منہ کر کے نماز ہی پڑھو۔''

یہ سب توحیدِ الٰہی کو یقینی بنانے کے لیے تھا، یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو

---

[1] الموطأ (۱۷۲/۱) یہ روایت مرسل ہے۔

[2] مسند أحمد (۴۵۴/۱) صحیح ابن خزیمة (۶/۲) اس کی اصل صحیحین میں ہے: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٥٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۴۹)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۲)

شریک نہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قومِ نوح کی بابت فرمایا:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾ [نوح: ۲۳]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

اس کی تفسیر میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی دیگر مفسرین کا فرمان ہے: یہ قومِ نوح کے نیک لوگ تھے۔ جب فوت ہو گئے تو انھوں نے ان کے مجسمے بنا لیے۔ ایک روایت میں ہے: انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے۔ اس وقت وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے مگر ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد آیندہ نسلوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔ اس سے بتوں کی پوجا کا آغاز ہوا۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبیین ہیں، اللہ نے ان کو توحید کے ساتھ مبعوث کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مادۂ شرک کی جڑیں کاٹ دیں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند قبروں کو برابر کرنے اور تصویریں مٹانے کا حکم دیا۔ صحیح مسلم میں ابو ہیاج اسدی سے مروی ہے، کہتے ہیں: مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تمھیں اس کام پر نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا کہ جو بلند قبر دیکھنا اسے برابر کر دینا اور جو تمثال تصویر دیکھنا اسے مٹا دینا۔''[1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو برابر کرنے اور تصویروں کو مٹانے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ یہ دونوں کام بتوں کی پوجا کے اسباب بنتے ہیں۔

اگر صرف دعا یا نماز پڑھنے کے لیے بہت سی قبروں پر بنی ہوئی عمارتوں اور درگاہوں کا قصد کرنا مشروع اور جائز ہوتا تو وہاں نماز پڑھنا مکروہ نہ ہوتا، بلکہ وہاں نماز پڑھنا افضل ہوتا، مگر اس بات پر سب اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ جو مسجد کسی ولی یا غیر ولی کی قبر یا درگاہ پر نہ بنائی گئی ہو اس میں نماز پڑھنا ایسی مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے جو کسی کی قبر یا درگاہ پر بنائی گئی ہو، بلکہ ائمہ اسلام نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ان مساجد کی تعمیر کرنا حرام ہے اور انھوں نے ایسی مساجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔

سنن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''اللہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، ان پر مساجد بنانے والوں اور دیے جلانے والوں پر لعنت کرے۔''[2] امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ ابو حاتم ابن حبان نے بھی اس کو اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر مساجد بنانے اور ان پر دیے جلانے سے منع کیا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧٥) السلسلة الضعيفة (٢٢٥)

ہے اس لیے علما کا کہنا ہے کہ قبروں کے لیے تیل یا شمع یا چندہ وغیرہ دینے کی نذر ماننا وغیرہ ناجائز ہے، بلکہ یہ نافرمانی کی نذر ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اللہ کی فرمانبرداری کرے، یعنی نیکی کرنے کی نذر مانے وہ اس کو پورا کرے اور جو نافرمانی کی نذر مانے وہ اسے پورا نہ کرے۔''[1]

اس جیسی نافرمانی کی نذر پوری کرنا بالاتفاق جائز نہیں، مگر کیا اس کا کفارۂ یمین ہے؟ اس میں علما کے دو اقوال ہیں: ① ابو حنیفہ، مالک اور شافعی کے نزدیک اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ ② احمد کے ظاہر مذہب کے مطابق اس پر کفارہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''نذر کا کفارہ یمین (قسم) کا کفارہ ہی ہے۔''[2] سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: نافرمانی میں نذر نہیں مگر اس کا کفارہ، کفارۂ یمین ہے۔''[3] اگر کوئی اللہ کی فرماں برداری مثلاً شرعی نماز پڑھنے، شرعی روزہ رکھنے یا شرعی صدقہ کرنے کی نذر مانے تو اسے پورا کرے، اگرچہ نذر ماننا اصلاً مکروہ ہے، کیوں کہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا: ''یہ بھلائی لے کر نہیں آتی، بلکہ اس کے ذریعے صرف بخیل سے مال نکلوایا جاتا ہے۔''[4] لہٰذا اصلاً نذر ماننا باتفاق ائمہ منع ہے لیکن اگر کوئی اللہ کی فرماں برداری پر مشتمل نذر مانے تو اسے پورا کرے اور اگر ایسے کام کی نذر مانے جو اللہ کی نافرمانی پر مشتمل ہو جیسے گرجوں، یہود کے عبادت خانوں اور قبروں، درگاہوں کے لیے تیل، شمع، چادر اور چندے وغیرہ کی نذر ماننا تو اسے پورا کرنا جائز نہیں، لیکن کیا نذر ماننے والے پر کفارۂ یمین عائد ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں دو اقوال ہیں۔

اگر کوئی انسان ایسی قبروں کی زیارت کا قصد کرے جن پر مساجد تعمیر کی گئی ہوں تو میرے علم کے مطابق کسی سلف نے اس کی اجازت نہیں دی، البتہ کچھ متاخر فقہا نے اس کی اجازت دی ہے اور باقی منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ بدعت اور ممنوع ہے، بلکہ انھوں نے یہاں تک فرمایا ہے کہ ایسے شخص کو نمازِ قصر کرنے کی اجازت بھی نہیں، کیوں کہ صحیحین میں آپ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے: ''تین مساجد: مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری اس مسجد کے سوا کسی مسجد کے لیے بھی رختِ سفر نہ باندھا جائے۔''[5]

سنن میں مروی ہے کہ جب حضرت بصرۃ بن ابی بصرہ نے ایک آدمی کو کوہِ طور کی زیارت کے لیے جاتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٩٠۔ ٣٢٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٢٤، ١٥٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٢٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٥١٥/١) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

دیکھا تو اس کو منع کر دیا اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ ...»[1] اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے تین مساجد کے علاوہ ہر جگہ کے لیے رختِ سفر باندھنے کی ممانعت ہی سمجھی ہے، چاہے وہاں کسی نبی یا غیر نبی کے آثار ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ اسی بات پر ائمہ علما کا اتفاق ہے۔ اگر کوئی انسان مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ کسی بقعہ ارض کا رختِ سفر باندھنے کی نذر مانے تو علما کے اتفاق کے ساتھ اس پر اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں۔ اگر یہ ان کے نزدیک نیکی اور اطاعتِ الٰہی کا کام ہوتا تو اس کو پورا کرنا ضروری ہوتا۔ پھر اگر کوئی انسان مسجدِ حرام جانے کی نذر مانے تو اس کو پورا کرنا بالاتفاق ضروری ہے۔ ہاں اگر کوئی مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ جانے کی نذر مانے تو اس کو پورا کرنے میں ان کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کو پورا کرنا ضروری نہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک صرف اس کام کی نذر مانی جا سکتی ہے جو شریعت میں کسی واجب کی جنس سے ہو۔ مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک اسے پورا کرنا ضروری ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اللہ کی فرماں برداری کرنے کی نذر مانے اسے پورا کرے۔''[2] اور یہ بالاتفاق نیکی اور اللہ کی اطاعت ہے، اس لیے اس کو پورا کرنا مستحب ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ علما نے تین مساجد کے علاوہ کسی بھی خطہ ارض کے لیے رختِ سفر باندھنے کی نذر پوری کرنا ضروری قرار نہیں دیا تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے نزدیک یہ کام نیکی میں شمار نہیں ہوتا، حتی کہ مسجدِ قبا سے متعلق بھی ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مدینہ جانے کے بعد وہاں قصداً چلا جائے تو صحیح ہے، ورنہ اس کے لیے بھی باقاعدہ رختِ سفر باندھنا درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو اپنے گھر سے اچھی طرح طہارت حاصل کر کے مسجدِ قبا صرف نماز پڑھنے کے لیے جائے تو اس کو ایک عمرے کا اجر ملتا ہے۔''[3] لہٰذا آپ نے اپنے گھر سے مسجدِ قبا آنے کی ترغیب دی ہے۔ اس طرح ہر کوئی اپنے شہر یا اپنی بستی کی مسجد کا قصد کر سکتا ہے مگر مساجدِ ثلاثہ کے علاوہ کسی شہر یا کسی بستی کی مسجد کے لیے رختِ سفر باندھنا بالاتفاق جائز نہیں۔

قبروں کی زیارت کا شرعی اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ جب آدمی کا گزر قبرستان سے ہو یا کسی ایسے شہر سے جہاں اس کا کوئی عزیز وغیرہ مدفون ہو تو وہ میت کو سلام بھیجے اور اس کے لیے دعا کرے، لیکن اس کے لیے خصوصی طور پر سفر کر کے جانا مشروع نہیں۔ ان بدعات کو ایسے خواہش پرستوں نے فروغ دیا ہے جو مساجد کو بے آباد کرتے ہیں اور جمعہ و جماعت میں شریک نہیں ہوتے ہیں، مگر ان درگاہوں پر خود ساختہ شرکیہ اعمال کر کے ان کو یاد رکھتے ہیں، بلکہ ان

---

[1] مسند أحمد (٧/٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[3] مسند أحمد (٤٨٧/٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤١٢) صحيح الجامع (٦١٥٤)

لوگوں نے درگاہوں کے حج کے آداب و احکام پر کتابیں لکھ دی ہیں، حالانکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں مساجد میں عبادت کرنے کا حکم دیا ہے درگاہوں میں نہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ﴾ [البقرة: ١١٤]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟''

اللہ نے ''مشاهد الله'' (اللہ کی درگاہیں) نہیں کہا۔ نیز فرمایا:

﴿ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ [البقرة: ١٨٧] ''جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔''

''مشاهد'' نہیں کہا۔ فرمایا:

﴿ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٢٩]

''کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو۔''

''کل مشهد'' نہیں کہا۔ فرمایا:

﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [التوبة: ١٧، ١٨]

''مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔''

اللہ نے ''یعمر مشاهد الله'' نہیں کہا۔ فرمایا:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ١٨]

''اور یہ کہ بلاشبہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

یہ نہیں کہا: ''وأن المشاهد لله''۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''آدمی کا مسجد میں نماز پڑھنا گھر اور بازار میں نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے۔''[1] آدمی اپنے گھر سے اچھے طریقے سے وضو کرتا ہے، پھر مسجد آتا ہے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦١)

اور اس کو اس میں نماز پڑھنے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اٹھاتی۔ وہ ایک قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ دوسرا قدم رکھتا ہے تو اس کی ایک غلطی مٹتی ہے۔ وہ مسجد میں بیٹھتا ہے اور جب تک نماز کے انتظار میں رہتا ہے، نماز میں ہوتا ہے۔ تم میں سے کوئی بھی جب تک نماز پڑھ کر وہیں بیٹھا رہتا ہے، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! اس کو بخش دے، اس پر رحم فرما۔ جب تک بے وضو نہیں ہو جاتا یا مسجد سے اٹھ نہیں جاتا۔"

کسی کا واسطہ دینا:

سائل کا یہ پوچھنا کہ اگر کوئی کہے: "فلاں میت کے صدقے تو میری ضرورت پوری کر دے یا مجھے بخش دے" یہ کہنا غیر مشروع ہے۔ اسلاف میں سے کسی نے بھی یہ کام نہیں کیا اور کسی امام نے اس کو مستحب نہیں کہا۔ اس مسئلے میں متقدمین سے کوئی اثر منقول نہیں۔ عبادات کی بنیاد سنت اور اتباع پر استوار ہے۔ خواہش پرستی اور بدعت سازی پر نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

"یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت اختیار کرنا، اس کو مضبوطی سے تھام لینا اور اپنی ڈاڑھوں سے پکڑ لینا، بدعات سے بچنا، ہر بدعت گمراہی ہے۔"[1]

اگر یہ کام کسی کے لیے یا کسی کے حق میں جائز ہوتا تو اس کا سب سے زیادہ حق صحابہ کرام کو تھا کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے حق میں یہ کام کریں، کیوں کہ آپ اللہ کے ہاں ساری انسانیت سے افضل و معزز وسیلے کے لحاظ سے بھی تمام زندوں اور مُردوں کی نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب خشک سالی ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر بارش کی دعا کیا کرتے تھے اور کہتے: "اے اللہ! ہم جب خشک سالی کا شکار ہوتے تو تیرے نبی کو وسیلہ بنا کر تجھ سے بارش کی دعا کرتے اور تو ہمیں بارش سے نوازتا، اور اب ہم تیرے نبی کے چچا کو وسیلہ بنا کر تجھ سے بارش کی دعا کرتے ہیں، تو ہمیں بارش دے۔ تو بارش ہو جاتی۔"[2] اس طرح وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بناتے اور سب مل کر دعا کرتے تو بارش ہو جاتی،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣، ٤٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٦٤، ٣٥٠٧)

جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنا کر بارش طلب کیا کرتے تھے، مگر وہ رسول اللہ ﷺ کی قبر پر جا کر وہاں دعا نہیں کرتے تھے اور ایسا کوئی کام نہیں کرتے تھے جس طرح آج کے لوگ قبروں پر جا کر صاحب قبر کو پکارتے ہیں یا اس سے مانگتے ہیں، اس لیے علما نے استقا کے مسئلے میں صحابہ کا طرزِ عمل نقل کیا ہے، مگر جاہل کی بنائی ہوئی بدعتیں ذکر نہیں کیں۔

زیارت سے مقصود میت کے لیے دعا کرنا ہے جس طرح اس کا جنازہ پڑھا جاتا ہے، اللہ جس طرح جنازہ پڑھنے کا ثواب دیتا ہے اسی طرح اس کے لیے دعا کرنے کا ثواب بھی دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات دعا کرنے والا اس سے افضل ہوتا ہے جس کے لیے دعا کی جاتی ہے اور کبھی جس کے لیے دعا کی جاتی ہے وہ دعا کرنے والے سے افضل ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اذان سنو تو اس کا جواب دو پھر مجھ پر درود بھیجو۔ بے شک جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس رحمتیں کرتا ہے، پھر میرے لیے اللہ سے مقامِ وسیلہ کی دعا کرو۔ یہ جنت کا ایک درجہ ہے جو صرف اللہ کے ایک بندے کے لیے ہے اور میں امید رکھتا ہوں کہ میں ہی وہ بندہ ہوں۔ تو جو میرے لیے اللہ سے وسیلہ کی دعا کرتا ہے وہ قیامت کے دن میری شفاعت کا اہل بن جائے گا (رواہ مسلم)۔''[1] واللّٰہ أعلم[2]

قبروں کی زیارت کی شرعی اور غیر شرعی صورت

سوال قبروں کی زیارت کی شرعی صورت و کیفیت کیا ہے؟

جواب قبروں کی زیارت کی دو صورتیں ہیں: ایک شرعی اور دوسری بدعی۔

شرعی زیارت جنازہ پڑھنے کی طرح ہے جس سے میت کے لیے دعا کرنا مقصود ہوتا ہے، کیوں کہ نمازِ جنازہ میں بھی میت کے لیے دعا کرنا ہی مقصود ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بقیع کے قبرستان میں جایا کرتے، شہدائے اُحد کی قبروں کی زیارت بھی کرتے تو ان کے لیے دعا ہی کرتے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو قبرستان جاتے وقت یہ دعا پڑھنے کی تعلیم دی:

« السَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَمِنْكُمْ وَالْمُسْتَأْخِرِينَ، نَسْأَلُ اللَّهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ، اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ، وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُمْ »[3]

اسی طرح وہ تمام الفاظ جن میں انبیا اور تمام مومنوں کے لیے دعا ہے، رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام بھیجنا بھی مشروع ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم موذن کو سنو تو اس کے الفاظ دہراؤ، پھر مجھ پر درود

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٨٤)

[2] جامع المسائل (٤/١٥٤-١٧١)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٧٤، ٩٧٥) سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٠٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٥٤٧)

بھیجو، جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا، اللہ اس کے بدلے اس پر دس رحمتیں کرتا ہے، پھر میرے لیے اللہ سے وسیلے کی دعا کرو۔ یہ جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ کے صرف ایک بندے کے لائق ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میں ہی وہ بندہ ہوں، لہٰذا جس نے میرے لیے اللہ سے وسیلے کی دعا کی، قیامت کے دن وہ میری شفاعت کا اہل ہو جائے گا۔ جو مسلمان بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ مجھ میں میری روح لوٹا دیتا ہے، تاکہ میں اس کے سلام کا جواب دوں۔''[1]

بدعی یعنی بدعت زیارت، یہ وہ ہے جو اہلِ شرک کرتے ہیں۔ یہ عیسائیوں کی زیارت کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے جو وہاں میت کو پکارنے، اس سے مدد چاہنے اور وہاں حاجت برآری کی نیت سے جاتے ہیں۔ وہ اس کی قبر کے پاس نماز پڑھتے ہیں اور اس کو پکارتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے کام کسی صحابی نے کیے ہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا حکم دیا ہے اور نہ کسی امام نے انھیں مستحب سمجھا ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو شرک کا دروازہ بند کیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے مرض الموت کے وقت ارشاد فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد (سجدہ گاہ) بنا لیا۔''[2] آپ نے ان کے فعل سے خبردار کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر یہ خدشہ اور آپ ﷺ کا فرمان نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی قبر کو نمایاں کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو مسجد بنانا ناپسند کیا تھا اور اپنی وفات سے پانچ دن قبل فرمایا: ''تم میں سے پہلے جو لوگ تھے وہ قبروں کو مساجد بنایا کرتے تھے، خبردار! قبروں کو مساجد نہ بناؤ، میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔''[3]

پہلی زیارت اللہ کی عبادت، مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس زکات (تزکیے) کی نوعیت سے تعلق رکھتی ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور دوسری زیارت اللہ کے ساتھ شرک کرنے، اللہ کے حق اور اس کے بندوں کے حق میں ظلم کی نوعیت سے تعلق رکھتی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۸۲]

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔''

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر گراں گزری۔ انھوں نے کہا: ہم میں سے کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا؟ رسول اللہ ﷺ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٣، ٥٢٩، ٢٠٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩، ٥٣٠، ٥٣١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

نے فرمایا: یہ شرک ہے، کیا تم نے نیک بندے (لقمان علیہ السلام) کی بات نہیں سنی: ﴿ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾[1]۔

آپ ﷺ نے دعا کرتے ہوئے کہا: ''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا، جس کی پوجا کی جائے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾ [نوح: ۲۳]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔''

اسلاف کی ایک جماعت کا قول ہے: یہ قومِ صالح کے نیک لوگ تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے تو انھوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے اور ان کی تمثیلیں (مورتیاں) بنا لیں۔ یہ بتوں کی پوجا کا آغاز تھا۔ یہ عمل عیسائیوں کے دین کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ صحابہ اور تابعین رسول اللہ ﷺ کی قبر یا کسی اور کی قبر کے پاس دعا کرنے کی نیت سے نہیں جاتے تھے، بلکہ ائمہ نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس دعا کے لیے کھڑا ہونا مکروہ قرار دیا ہے اور اسے بدعت کہا ہے۔ صحابہ اور تابعین یہ کام نہیں کرتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کی قبر پر آتے اور آپ اور آپ کے دونوں ساتھیوں پر سلام بھیجتے اور چلے جاتے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مسجدِ نبوی میں داخل ہوتے تو کہتے: ''السلام علیك یا رسول اللہ، السلام علیك یا أبا بكر، السلام علیك یا أبتاہ'' پھر چلے جاتے۔ امام مالک اور دیگر ائمہ، اسی طرح ابو یوسف اور دیگر علما نے صریح الفاظ میں کہا ہے کہ کسی کے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی بھی مخلوق کے واسطے سے، خواہ وہ نبی ہو یا فرشتہ یا کوئی اور، مانگنا جائز نہیں۔

مسلمانوں کو قحط اور تنگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ اللہ سے دعا کرتے۔ اسی سے بارش طلب کرتے۔ دشمنوں کے خلاف بددعا کرتے۔ اللہ سے مدد طلب کرتے اور نیک لوگوں کی دعا کو وسیلہ بناتے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تم اپنے کمزوروں، ان کی دعا، نماز اور اخلاص کے ساتھ مدد کیے جاتے اور رزق دیے جاتے ہو۔''[3] وہ دعا کے لیے نہ رسول اللہ ﷺ کی قبر کا قصد کرتے نہ کسی دوسرے نیک کی قبر کا رخ کرتے، نہ وہاں نماز پڑھتے، نہ اس کے سامنے اپنی حاجتیں رکھتے اور نہ اللہ کو اس کی قسم اور واسطہ ہی دیتے۔ جس طرح لوگ کہتے ہیں: میں تجھ سے فلاں فلاں کے وسیلے سے مانگتا ہوں، یہ سب بدعتیں ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میں مبعوث ہوا، پھر

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۴۹۸)

[2] مسند أحمد (۲/۲۴۶) موطأ (۱/۱۷۲)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۷۳۹)

وہ جو اس کے بعد۔''[1] مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم امت کے تمام طبقات میں سے بہترین طبقہ تھے۔[2]

عورتوں کے قبرستان جانے کا مسئلہ

سوال کیا عورتوں کے لیے قبرستان جانا جائز ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ» (رواه أحمد وابن ماجه والترمذي وصححه)[3]

''اللہ تعالیٰ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کرے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں، ان کو سجدہ گاہ بنانے والوں اور وہاں چراغ جلانے والوں پر لعنت کی۔'' (رواه أبو داود والترمذي والنسائي وابن ماجه وقال الترمذي حديث حسن)[4] ابو حاتم نے بھی اپنی صحیح میں اس کو روایت کیا ہے۔

علما کے دو اقوال میں سے زیادہ ظاہر اور راجح قول کے مطابق اسی پر عمل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قبرستان جانے سے منع کیا ہے۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب تم ان کی زیارت کر سکتے ہو، یہ تم کو آخرت کی یاد دلائیں گی۔''[5]

اگر کوئی اس حدیث کو سامنے رکھتے ہوئے کہے کہ منع کا حکم منسوخ ہو چکا ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: یہ کوئی عمدہ بات نہیں، کیوں کہ اس حدیث کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں مردوں کو مخاطب کیا ہے عورتوں کو نہیں، جو صیغہ استعمال ہوا ہے وہ مذکر کے لیے خاص ہے یا دوسروں کو تبعاً شامل ہے، اگر مردوں کے لیے خاص ہے تو عورتوں کا ذکر ہی نہیں اور اگر مردوں کے علاوہ کسی کو شامل ہے تو یہ عام ہوگا، لیکن دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں: «لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ» ''قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر اللہ لعنت کرتا ہے۔'' یہ لفظ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٣٠ـ٣٢٦)

[3] مسند أحمد (٢/٣٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧٦) صحيح الجامع (٥١٠٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٤٣) السلسلة الضعيفة (٢٢٥)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٨٤)

عورتوں کے لیے خاص ہیں، مردوں کو شامل نہیں، اس حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: «لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ» جو ان پر مسجدیں یا سجدہ گاہیں بناتے ہیں اور ان پر دیے جلاتے ہیں، ان پر لعنت ہو، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، لیکن زیارت کرنے والی عورتوں پر آپ ﷺ نے لعنت کی ہے، مردوں پر نہیں۔ اگر اس حکم کو خاص سمجھا جائے اور یہ معلوم نہ ہو کہ یہ رخصت سے پہلے کا ہے تو عام اہلِ علم کے نزدیک یہ عام پر مقدم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ رخصت کے بعد کا ہے تب بھی مقدم ہی ہوگا۔

اسی سے ملتا جلتا یہ مسئلہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نمازِ جنازہ پڑھی، اس کو ایک قیراط اجر ملے گا اور جو تدفین تک رہا اس کو دو قیراط ملیں گے۔''[1] یہ عام حکم ہے، لیکن اس میں عورتیں داخل نہیں، کیوں کہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو جنازوں کے پیچھے آنے سے منع کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک میت کے جنازے کے لیے چلے۔ جب ہم فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ واپس آ گئے اور ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہی واپس آ گئے۔ جب ہم راستے کے درمیان پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ ایک عورت آ رہی ہے۔ جب وہ قریب ہوئی تو وہ سیدہ فاطمہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: فاطمہ! تجھے کس چیز نے گھر سے نکالا ہے؟ وہ کہنے لگیں: اللہ کے رسول! میں اس میت کے گھر گئی تھی اور اس کے گھر والوں سے تعزیت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تو ان کے ساتھ قبرستان گئی ہو۔ یاد رکھ! اگر تو ان کے ساتھ قبرستان گئی ہوتی تو تُو جنت دیکھ نہ پاتی، حتی کہ تیرے باپ کا دادا اس کو دیکھ لیتا۔ (أبو حاتم)[2]

عورتوں کو قبرستان جانے سے روکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی فطری کمزوری، بے صبری اور کثرت سے رونے دھونے کی عادت کی وجہ سے ماتم، گریہ اور نوحہ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

نیز ان کے رونے کی وجہ سے میت اذیت محسوس کرتی ہے، پھر مرد بھی عورت کی آواز اور شکل کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس طرح ایک دوسری حدیث میں ذکر ہوا ہے:

«فَإِنَّكُنَّ تَفْتِنَّ الْحَيَّ وَتُؤْذِيْنَ الْمَيِّتَ»

''تم زندہ کو مبتلائے فتنہ کر دیتی ہو اور میت کو اذیت پہنچاتی ہو۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا قبرستان جانا خود ان کے حق میں اور مردوں کے حق میں بھی کئی حرام امور کا سبب بن سکتا ہے۔ یہاں حکمت غیر مضبوط اور غیر متعین ہے، اس لیے اس مقدار کی تعیین ممکن نہیں جو ان کاموں کا

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۶۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۴۵، ۹۴۶)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۱۲۳) سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۸۸۰)

باعث نہ بن سکتی ہو اور ایک نوع سے دوسری نوع میں امتیاز کرنا بھی ممکن نہیں۔ اگر حکمت پوشیدہ ہو یا غیر منتشر ہو تو شریعت کا قاعدہ ہے کہ حکم کو عام اندیشے کے ساتھ معلق و مربوط کر دیا جائے اور سدِ ذرائع کے اصول کے پیشِ نظر وہ دروازہ ہی بند اور حرام کر دیا جائے۔ جس طرح شریعت میں عورت کی باطنی زیب و زیبایش کو دیکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ فتنے کا باعث بن سکتا ہے۔ اجنبی یعنی غیر محرم عورت کو دیکھنا حرام کیا گیا ہے۔ مزید برآں عورتوں کے قبرستان جانے میں کوئی ایسی مصلحت نہیں جو ان مذکورہ مفاسد کے معارض و مخالف ہو، کیوں کہ قبرستان جا کر بھی وہ میت کے لیے دعا سے زیادہ کچھ کرنے کی مجاز نہیں تو دعا گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فقہا نے کہا ہے: اگر عورت کو اپنی طبیعت کا پتا ہو کہ اگر وہ قبرستان چلی گئی تو ممکن ہے کہ اس سے کوئی ناجائز قول و فعل سرزد ہو جائے تو اس کے لیے بلا اختلاف قبرستان جانا جائز نہیں۔ واللہ أعلم[1]

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا حکم

سوال رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کا کیا حکم ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کے متعلق کوئی صحیح یا حسن حدیث موجود نہیں، اس موضوع سے متعلق کوئی بھی حدیث نہ تو ابو داود، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ جیسی مشہور کتبِ سنن میں ہے نہ مسند احمد وغیرہ جیسی معروف کتبِ مسانید میں اور نہ موطا امام مالک جیسی عظیم کتبِ مصنفات ہی میں، بلکہ اس سلسلے میں جو عام روایات ذکر کی جاتی ہیں وہ موضوع اور من گھڑت ہیں، مثلاً ایک یہ حدیث روایت کی جاتی ہے: "من زارني وزار أبي إبراهيم في عام واحد ضمنت له على الله الجنة" "جس نے ایک ہی سال میں میری اور میرے باپ ابراہیم کی زیارت کی میں اس کو اللہ کی طرف سے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔" یہ موضوع حدیث ہے اور اہلِ علم کے نزدیک بالاتفاق جھوٹ ہے۔

اسی طرح ایک یہ حدیث روایت کی جاتی ہے: "من زارني بعد مماتي فكأنما زارني في حياتي، ومن زارني بعد مماتي ضمنت له على الله الجنة" "جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔ جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی، میں اس کو اللہ کی طرف سے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔" یہ بھی بے اصل روایت ہے، اگرچہ اس جیسی کچھ روایات دارقطنی اور مسند بزار میں ہیں، لیکن ان سب کا مدار عبداللہ بن عمرو عمری یا اس سے بھی زیادہ ضعیف راویوں پر ہے جن کی روایت سے کوئی شرعی حکم ثابت کرنا جائز نہیں۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٦٠_٣٦٢)

ائمہ کرام نے اس سلسلے میں جن روایات پر اعتماد کیا ہے ان میں ایک تو یہ ہے جو ابو داود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو آدمی بھی مجھے سلام کہتا ہے، اللہ اس کا جواب دینے کے لیے میری روح مجھ میں لوٹا دیتا ہے۔''[1] سنن نسائی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ نے میری قبر پر کچھ فرشتوں کو مقرر کیا ہوا ہے جو میری امت سے سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔''[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کا تو اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے۔

بنا بریں علما اس کو مستحب کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ امام مالک نے کسی آدمی کا یہ کہنا ناپسند کیا ہے: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی۔''

امام مالک نے تابعین کو پایا ہے اور وہ اس مسئلے کو سب سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں زیارتِ قبرِ نبی کے الفاظ مانوس نہیں تھے۔ اس بنا پر کچھ علما نے قبر کی طرف منہ کر کے دعا کرنے کو مکروہ کہا ہے، بلکہ امام مالک وغیرہ نے تو وہاں اپنے لیے دعا کرنے کے لیے کھڑے ہونے کو مکروہ سمجھا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ یہ صحابہ اور تابعین کا عمل نہیں تھا اور اس امت کے بعد میں آنے والوں کی اصلاح بھی اسی کام میں ہے جس نے اس امت کے اولین افراد کی اصلاح کی تھی۔

اس کی کراہت کے اسباب جاننے سے قبل زیارت کی اقسام جاننا ضروری ہے۔ ایک شرعی زیارت ہوتی ہے اور ایک غیر شرعی، جس کو بدعی زیارت کہا جاتا ہے۔ شرعی زیارت کا مقصد میت کو سلام کہنا اور اس کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے جس طرح جنازے میں دعا کی جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قبرستان جانے کی دعا سکھائی ہے جو ان کو سلام کہنے اور ان کے لیے دعا کرنے پر مشتمل ہے۔ بدعت یا غیر شرعی زیارت درحقیقت یہود و نصاریٰ اور ایسے ہی انبیا و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والے بدعت پرست لوگوں کی زیارتِ قبور کی قبیل سے ہے۔ غیر شرعی زیارت کرنے والا کسی نبی، ولی یا بزرگ کی قبر کے پاس نماز پڑھنے یا وہاں دعا کرنے یا اس کے وسیلے سے دعا کرنے یا اس سے کوئی حاجت طلب کرنے یا اس کی قبر کے پاس جا کر اللہ سے مانگنے یا اس سے فریاد طلبی کے لیے یا اللہ تعالیٰ کو اس کا واسطہ دینے کے لیے یا اس طرح کے کسی بھی بدعت پر مبنی ارادے کے لیے اس کی قبر کا قصد کرتا ہے اور وہاں پہنچتا ہے۔ ائمہ کرام نے جو زیارت قبرِ نبوی کہنے کو مکروہ کہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ یہ لفظ استعمال کرتے ہیں جو بدعت اور غیر شرعی زیارت کا قصد و ارادہ کرتے ہیں۔ لفظ زیارت سے عموماً یہی مراد لیا جاتا ہے، لیکن یہ بدعی زیارت بالاتفاق جائز نہیں۔ اس وجہ سے امام مالک نے ایسا مجمل لفظ بولنے کو ناپسند سمجھا ہے جو فاسد اور خراب معنی پر

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٨٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٦٦)

دلالت کرتا ہے، لیکن درود وسلام کے لفظ کے عکس اللہ نے خود اس کا حکم دیا ہے۔

اگر عام قبروں کی طرف زیارت کا لفظ منسوب کیا جائے تو اس سے عموماً وہ مفہوم نہیں نکالا جاتا جو زیارتِ قبرِ نبی سے نکل سکتا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا: «زُوْرُوا الْقُبُوْرَ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ»[1] ''قبروں کی زیارت کرو، یہ تم کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔'' آپ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت بھی کی تھی۔ تو یہ لفظ کافروں کی قبروں پر جانے اور ان کی زیارت کرنے کو بھی شامل ہے۔ تاہم اس سے اس میت کو پکارنے، اس سے مانگنے یا اس سے فریاد طلب کرنے جیسا کوئی مشرکانہ اور بدعتی فعل مراد نہیں لیا جاتا، لیکن اگر جس کی زیارت کے لیے آدمی جائے وہ نبیوں اور ولیوں جیسی کوئی دین میں عظیم ہستی ہو تو پھر اکثر لوگ ان کی قبروں کی زیارت سے یہی بدعتی اور شرکیہ زیارت ہی مراد لیتے ہیں۔

بنا بریں امام مالک نے اس جیسی صورتِ حال میں اس لفظ کا استعمال ناپسند کیا ہے اور ایسی جگہ پر اس کے استعمال کو مکروہ نہیں کہا جہاں اس جیسی مفسدت نہ نکلتی ہو۔ کسی شخص کے لیے رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کی فضیلت میں رسول اللہ ﷺ سے یا آپ ﷺ کے کسی صحابی ہی سے کسی صحیح اور ثابت سند سے کوئی بات نقل کرنا ممکن نہیں، بلکہ صحیحین میں جو حدیث ثابت ہے وہ اس فاسد معنی کے معارض ومخالف ہے جو یہ جاہل بیان کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''میری قبر کو عید یعنی میلہ نہ بنانا، مجھ پر درود بھیجو، تم جہاں بھی ہو تمھارا درود مجھ تک پہنچتا ہے۔''[2] آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ پر لعنت کرے۔ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ آپ ﷺ نے یہ بات ان کے فعل سے خبردار کرتے ہوئے کہی۔''[3] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اگر یہ نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی قبر کو نمایاں کر دیا جاتا، لیکن آپ ﷺ نے اس کو سجدہ گاہ بنانا ناپسند کیا۔''[4] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجدیں (سجدہ گاہ) بنا لیا کرتے تھے۔ تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا۔ میں تم کو اس سے روکتا ہوں۔''[5] آپ ﷺ کہا کرتے تھے: ''اے اللہ! میری قبر کو صنم نہ بنا دینا، جس کی پوجا کی جائے۔''[6]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث ١٥٦٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٢٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٠، ٥٣٠، ٥٣١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

[6] مسند أحمد (٢/٢٤٦) موطأ (١/١٧٢) مرسل.

اس طرح کی احادیث صحاح، سنن اور معتبر کتابوں میں کثیر تعداد میں ہیں، لہٰذا جو شخص علم و ایمان سے بہرہ ور ہو، کس طرح ان صحیح ثابت شدہ احادیث کو چھوڑ کر ان بے اصل روایات کو دین و ایمان بنا سکتا ہے جو ان کے معارض ومخالف ہوں۔ واللہ أعلم[1]

نبی کا قبر میں زندہ ہونا، عبادت کرنا اور ان پر امت کے اعمال پیش کیے جانا

سوال کیا یہ صحیح ہے کہ انبیا اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ پر امت کے اعمال پیش کیے جانے کی کیفیت کیا ہے؟ کیا وہ آپ کی روح پر پیش کیے جاتے ہیں یا آپ ﷺ کی روح آپ کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے؟ نیز کیا آپ درود وسلام پڑھنے والے کو جواب دیتے ہیں؟

جواب الحمد للہ. انبیا اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور کبھی نماز بھی پڑھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''میں معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا، وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔''[2] آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو مسلمان بھی مجھ کو سلام کہتا ہے اللہ اس کا جواب دینے کے لیے میری روح مجھ میں لوٹا دیتا ہے۔''[3] یہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم جہاں کہیں بھی ہو وہیں سے مجھ پر درود بھیجو، تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔''[4] آپ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' صحابہ نے کہا: ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا، کیا آپ کا جسم بوسیدہ نہیں ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ نے زمین پر انبیا کا گوشت کھانا حرام کر دیا ہے۔''[5]

جہاں تک آپ ﷺ پر اعمال پیش کیے جانے کی بات ہے تو یہ بات سچ ہے۔ آپ ﷺ پر اعمال پیش کیے جاتے ہیں، لیکن ان کی جگہ اور کیفیت کیا ہے، یہ لایعنی سوال ہے۔ واللہ أعلم[6]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٥٦_٣٥٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٧٥)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٤١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٢٦٦)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٤٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣١٦٤)

[5] سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٠٤٧، ١٥٣١) سنن النسائي، رقم الحدیث (١٣٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٠٧٥، ١٦٣٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٥٢٧)

[6] جامع المسائل (٤/١٩١_١٩٢)

مردے کا زائر کی بات سننا، اس کی روح کا لوٹایا جانا

سوال کیا مردہ اپنی زیارت کرنے والے کی بات سنتا اور اس کو دیکھتا ہے؟ کیا اس کی روح اس وقت اس میں لوٹائی جاتی ہے یا اس کی قبر پر پھڑ پھڑاتی رہتی ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. ہاں مردہ بالجملہ سنتا ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب لوگ واپس جاتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی کھٹ کھٹ سنتا ہے۔''[1] حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ بدر کے دن مقتول کافروں کو تین دن تک وہیں پڑے رہنے دیا۔ پھر آپ ﷺ وہاں آئے اور آپ ﷺ نے ابوجہل، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا نام لے کر انھیں مخاطب کیا اور ان سے پوچھا: ''کیا تم نے اپنے رب کا وعدہ سچا پایا ہے؟ میں نے تو اپنے رب کا وعدہ سچا پایا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کس طرح سن سکتے ہیں اور کیسے جواب دے سکتے ہیں، یہ تو مردار ہو چکے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں جو ان سے کہہ رہا ہوں تو اس کو ان سے زیادہ نہیں سن رہا، لیکن یہ جواب دینے پر قادر نہیں۔'' پھر انھیں بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ قلیبِ بدر پر کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ نے کہا: کیا تم نے اپنے رب کے وعدے کو سچا پایا؟ آپ ﷺ نے کہا: ''یہ اب سن رہے ہیں جو میں ان سے کہہ رہا ہوں۔''[2]

صحیحین میں کئی سندوں سے یہ روایت موجود ہے جس میں آپ ﷺ اہلِ قبور کو سلام کہنے کا حکم دیتے تھے،[3] آپ ﷺ کی وہ دعا ان کو مخاطب کرنے پر مشتمل ہے اور مخاطب اسی کو کیا جاتا ہے جو سنتا ہے۔

ابن عبدالبر نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے: جو آدمی بھی کسی ایسی قبر کے پاس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں جانتا تھا اور وہ اس کو سلام کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی سلام کا جواب دینے کے لیے اس کی روح اس میں لوٹا دیتا ہے۔[4] کتبِ سنن میں یہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جمعرات اور جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود بھیجا کرو، تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔'' صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ پر کس طرح ہمارا درود بھیجا جائے گا،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤، ٢٧٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٣، ٢٨٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٤، ٩٧٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٤٧)

[4] تاريخ دمشق لابن عساكر (١٠٣٠/٨) الاستذكار لابن عبد البر (٢٣٤/١) العلل المتناهية لابن الجوزي (٤٢٩/٢)

آپ تو بوسیدہ ہو چکے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیا کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔''[1]

کتبِ سنن میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر فرشتوں کو مقرر کیا ہے کہ وہ میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔[2]

یہ اور اس طرح کی احادیث بیان کرتی ہیں کہ میت بالعموم زندہ کی بات سنتی ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کو وہ سننا دائمی ہو، بلکہ ممکن ہے کسی حالت میں سنتی ہو، کسی حالت میں نہ سنتی ہو، جس طرح زندہ آدمی بھی کبھی مخاطب کرنے والے کی بات سنتا ہے اور کبھی کسی عارضے یا سبب کی وجہ سے نہیں بھی سنتا۔ لیکن میت کا یہ سننا سماعتِ ادراک ہے، جس پر کوئی حکم اور جزا مرتب نہیں ہوتی۔ اس طرح اس سے مراد یہ سماعت بھی نہیں جس کی اس آیت میں نفی کی گئی ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ [النمل: ٨٠] ''بے شک تو نہ مُردوں کو سناتا ہے۔''

یہاں سماعت سے مراد وہ سماعت ہے جس کو سن کر کوئی قبول کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو اس مردے کے مانند قرار دیا ہے جو پکارنے والے کی پکار کا جواب نہیں دیتا اور ان جانوروں کی طرح کہا ہے جو سنتے تو ہیں لیکن معنی سمجھتے نہیں۔ مردہ اگر بات سن لے اور سمجھ بھی لے تو بھی مخاطب کرنے والے کی بات کا جواب دے سکتا ہے نہ اس کے حکم کے مطابق عمل کر سکتا ہے اور نہ اس کے منع کردہ کام سے منع ہی ہو سکتا ہے، یعنی وہ امر اور نہی سے مستفید نہیں ہوتا، اسی طرح کافر بھی گو بات سنتا اور معنی سمجھتا ہے لیکن امر اور نہی سے مستفید نہیں ہوتا، جیسے اللہ نے بیان کیا ہے:

﴿ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ﴾ [الأنفال: ٢٣]

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا۔''

جہاں تک مردے کے دیکھنے کی بات ہے تو اس کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہا سے آثار نقل کیے جاتے ہیں۔

روح کا لوٹایا جانا:

رہا یہ سوال کہ اس وقت اس کے جسم میں روح لوٹائی جاتی ہے یا اس کی قبر پر پھڑ پھڑاتی رہتی ہے تو حدیث شریف کے مطابق اس وقت اس کی روح اس میں لوٹائی جاتی ہے، نیز دیگر اوقات میں بھی لوٹائی جاتی ہے۔ مومنوں کی روحیں جنت میں ہوتی ہیں، حدیث شریف میں آیا ہے: ''مومن کی روح پرندہ بن کر جنت کے درخت پر لٹک جاتی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٣٦، ١٦٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٧٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٢١٢)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٨٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢١٧٤)

ہے، اللہ جس دن اس کو اٹھائے گا اس کو اس کے بدن میں لوٹا دے گا۔'' (نسائي، مالك، شافعي)[1] اس کے ساتھ ساتھ جب اللہ چاہتا ہے تو وہ بدن کے ساتھ بھی مل جاتی ہے۔ جس طرح فرشتہ ایک لمحے میں اترتا ہے۔ زمین میں شعاع ظاہر ہوتی ہے۔ سویا ہوا بیدار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روح بھی لمحے بھر میں بدن میں آ جاتی ہے۔

کئی آثار میں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ روحیں قبروں کے صحنوں میں ہوتی ہیں۔ مجاہد کا قول ہے: میت کو دفن کرنے کے سات دن تک روحیں قبروں کے صحنوں میں ہوتی ہیں۔ اس سے جدا نہیں ہوتیں۔ یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ امام مالک کا قول ہے: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ روحیں چھوڑی ہوئی ہیں، جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں۔

علمائے اہلِ سنت کے ہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ صدقہ کرنے اور غلام آزاد کرنے جیسی مالی عبادتوں کا ثواب میت کو پہنچتا ہے، اسی طرح دعا، استغفار، نمازِ جنازہ اور قبر کے پاس دعا کرنا بھی اس تک پہنچتا ہے۔ البتہ روزے، نماز اور تلاوت جیسے بدنی اعمال کا ثواب پہنچنے میں اختلاف ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ سب کا ثواب پہنچتا ہے۔
صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مات وَعَلَيْهِ صِيَام صَام عَنْهُ وليه»

''جو فوت ہو جائے اور اس پر روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''ایک عورت کی ماں فوت ہوگئی، جس پر کچھ روزے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کو وہ روزے رکھنے کے لیے کہا۔'' مسند میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے کہا: ''اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا اور تو اس کی طرف سے صدقہ کرتا، یا روزہ رکھتا یا غلام آزاد کرتا تو اس کو اس کا فائدہ ہوتا۔'' یہ احمد، ابو حنیفہ اور کچھ مالکیوں اور شافعیوں کا مذہب ہے۔

جو اس آیت: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ٣٩] سے استدلال کرتے ہیں، ان کو جواب دیا جائے گا کہ متواتر سنت اور اجماع سے ثابت ہے، اس کا جنازہ پڑھا جاتا ہے، اس کے لیے دعا اور استغفار کیا جاتا ہے اور یہ دوسرے کی سعی اور کوشش ہے۔ گذشتہ معروضات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر اس کی طرف سے صدقہ کیا جائے اور غلام آزاد کیا جائے تو اس کو فائدہ پہنچتا ہے، جو دوسرے کی سعی ہے۔ موارد اجماع میں جو ان کا جواب ہوگا، مواقع نزاع میں وہی دوسروں کا جواب ہوگا۔ لوگوں نے اس کے اور بھی کئی جواب دیے ہیں، لیکن اس میں محققانہ جواب یہ ہے کہ اللہ نے یہ نہیں کہا کہ وہ دوسرے کی سعی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور صرف اپنی سعی سے فائدہ اٹھا سکتا

[1] الموطأ للإمام مالك (٢٤٠/١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٧١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٧٣)

ہے، بلکہ کہا ہے: ﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسٰنِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴾ [النجم: ۳۹] انسان صرف اپنی سعی کا مالک ہے، اس کے علاوہ کا مستحق نہیں۔ دوسرے کی سعی اس کی اپنی ہے۔ جس طرح انسان صرف اپنے مال اور نفع کا مالک ہوتا ہے، دوسرے کا مال اور نفع دوسرے کا ہوتا ہے، لیکن اگر دوسرا اپنی سعی بطور عطیہ دے دے تو اللہ اس کو اس کے ساتھ فائدہ دے گا۔ جس طرح دوسرے کی دعا اور اس کی طرف سے صدقہ پر اس کو فائدہ دیتا ہے۔ میت کو ہر اس چیز کا فائدہ ہوتا ہے جو ہر مسلمان کی طرف سے اس کو پہنچے، چاہے وہ اس کا رشتے دار ہو یا کوئی اور، جس طرح دوسروں کے جنازہ پڑھنے اور اس کی قبر کے پاس اس کے لیے دعا کرنے سے اس کو فائدہ ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس کی روح اس کے گھر والوں اور رشتے داروں کی روح سے ملتی ہے تو ابو ایوب انصاری و دیگر صحابہ کی حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ ابو حاتم نے اپنی صحیح میں رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب میت کی روح اوپر لے جائی جاتی ہے تو روحیں اس سے ملتی ہیں اور اس سے زندوں سے متعلق پوچھتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے کہتی ہیں: اس کو آرام کرنے دو۔ وہ پوچھتی ہیں: فلاں کیا کرتا تھا؟ وہ کہتی ہے: اس نے اچھے عمل کیے ہیں۔ وہ پوچھتی ہیں: فلاں نے کیا کیا؟ وہ کہتی ہے: کیا وہ تمھارے پاس آیا نہیں؟ وہ کہتی ہیں: نہیں، پھر وہ کہتی ہیں: وہ جہنم میں چلا گیا ہے۔''

زندوں کے اعمال مردوں پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے ابو داود کہا کرتے تھے: اے اللہ! میں ایسا عمل کرنے سے پناہ مانگتا ہوں جس کے ساتھ میں عبداللہ بن رواحہ کے ہاں رسوا ہو جاؤں۔'' جب وہ روح آتی ہے، اس وقت ان کا اکٹھ ہوتا ہے اور یہ سوال جواب ہوتے ہیں۔ البتہ ان کا ٹھہرنا اللہ کے ہاں اپنے اپنے مرتبے کے مطابق ہوتا ہے۔ جو مقرب ہوں، وہ اصحاب یمین سے بلند مرتبہ ہیں۔ اوپر والا نیچے آئے گا، مگر نچلے درجے والا اوپر نہیں چڑھ سکے گا۔ جب اللہ چاہے گا وہ مل بیٹھ سکیں گے۔ جس طرح وہ دنیا میں مختلف مراتب کے باوجود مل بیٹھتے اور ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے۔ دنیا میں ان کے مدفن قریب ہوں یا دور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مدفن کے دور ہونے کے باوجود روحیں اکٹھی ہو سکتی ہیں۔ کبھی مومن کو کافر کے نزدیک دفن کر دیا جاتا ہے، مگر یہ روح جنت کی مکین اور وہ جہنم میں جلتی ہے، بلکہ دو آدمی ایک ہی جگہ بیٹھے یا سوئے ہوتے ہیں، مگر ایک کا دل ناز و نعمت میں اور دوسرے کا تکلیف و عذاب ہوتا ہے۔ دونوں روحوں کے درمیان اتصال نہیں ہوتا۔ روحیں ایسے ہی ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ ، وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ »

''روحیں اکٹھے کیے گئے لشکر ہیں۔ جن کا آپس میں تعارف ہو وہ ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتی ہیں۔
جن کا تعارف نہیں ہوتا، وہ ایک دوسرے سے علاحدہ ہو جاتی ہیں۔''

بدن کو جائے ولادت کی طرف منتقل نہیں کیا جاتا، بلکہ آیا ہے: ''میت پر اس کے گڑھے کی مٹی ہی ڈالی جائے۔'' تاہم یہ اثر نہ قطعی ہے نہ قابلِ استدلال، بلکہ اس سے عمدہ یہ حدیث ہے: ''جو اپنے شہر کے علاوہ کسی دوسری جگہ فوت ہوتا ہے، اس کی جائے پیدایش سے لے کر جائے وفات تک جگہ جنت میں ماپ لی جاتی ہے۔'' انسان وہی سے اٹھایا جائے گا جہاں فوت ہوا، اس کا بدن اس کی قبر میں مشاہد اور موجود ہے لہٰذا غیر حقیقی گمان کے ساتھ مشاہد اور موجود کو رد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ عقل و نقل کے مخالف ہے۔[1]

میت پر رونے سے میت کو تکلیف ہونا

سوال کیا میت پر رونا اس کو اذیت پہنچاتا ہے؟

جواب اس مسئلے میں سلف، خلف اور علما میں اختلاف ہے۔ درست رائے یہ ہے کہ میت پر رونے سے اس کو اذیت پہنچتی ہے، جس طرح صحیح احادیث کا منطوق اور مفہوم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ »[2] وفي لفظ «من يُنَحْ عليه يُعَذَّبُ بما نِيحَ عَلَيْهِ »[3]

''میت کو اس کے گھر والوں کے اس پر رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔'' ایک روایت میں ہے:

''جس پر نوحہ کیا جاتا ہے اس کو اسی طرح کا عذاب دیا جاتا ہے جس طرح کا نوحہ اس پر کیا جاتا ہے۔''

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ پر بے ہوشی طاری ہوئی تو ان کی بہن نے نوحہ کرنا شروع کیا اور کہنے لگی: ہائے کتنا مددگار تھا! جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے: تو نے میرے بارے میں جو بھی کہا، مجھ سے کہا گیا: کیا تو ایسا ہی ہے؟[4]

کچھ علمائے سلف و خلف اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کو دوسرے کے گناہ کی سزا دینے کے قبیل سے ہے جو اس آیت کے معارض ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ﴾ [الأنعام: ١٦٤]

''اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی۔''

اس کے بعد انھوں نے ان احادیث کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٤/٣٦٢-٣٦٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٧، ٩٢٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٩، ١٢٣٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠١٩)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو غلطی لگی ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور امام شافعی وغیرہ کا موقف تھا۔ کچھ اس معنی پر محمول کرتے ہیں کہ اگر میت رونے کی وصیت کر کے جائے تب اس کو عذاب ہوتا ہے۔ یہ مزنی وغیرہ کا قول ہے۔ کچھ علما اس معنی پر محمول کرتے ہیں کہ اگر مرنے والے کی زندگی میں اس کے اہلِ خانہ کی مردوں پر بین کرنے کی عادت تھی اور وہ ان کو اس غلط کام سے منع نہیں کرتا تھا تو اس نہی عن المنکر کے فریضے پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو ان کے رونے پر عذاب ہوتا ہے۔ یہ میرے دادا ابو البرکات کا موقف ہے، تاہم یہ سارے اقوال نہایت کمزور ہیں۔

وہ صحیح اور صریح احادیث جنھیں حضرت عمر، ان کے بیٹے عبداللہ اور ابو موسیٰ اشعری وغیرہ نے روایت کیا ہے، ان جیسی کمزور تاویلات سے ان کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے ساتھ ملتے جلتے کئی واقعات ملتے ہیں۔ وہ بعض دفعہ اپنے اجتہاد اور تاویل کی وجہ سے کسی حدیث کو رد کر دیتی تھیں، کیوں کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اس کا معنی باطل ہے اور اصولِ شریعت کے ساتھ لگاؤ نہیں کھاتا، لیکن حقیقت میں وہ ایسا نہیں ہوتا جیسا وہ سمجھتی تھی۔ جو انسان اس موضوع پر غور و فکر کرتا ہے وہ اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ اس صحیح اور صریح حدیث کو، جسے ثقہ روایت کرتا ہے، اس جیسی تاویل کے ساتھ رد کرنے والا غلطی پر ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں نقل کی ہیں۔ وہ اس نقل کرنے میں سچی ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک یہ بات روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ لَيَزِيْدُ الْكَافِرَ عَذَاباً بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ » [1]

''اللہ تعالیٰ کافر کے گھر والوں کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے۔''

یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے متفق ہے، کیوں کہ اگر اس کے گھر والوں کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کے عذاب میں اضافہ ہو جانا روا ہے تو پھر یہ بھی روا ہے کہ وہ کسی دوسرے کو اس کے گھر والوں کے اس پر ابتداءً رونے پر عذاب دے دے۔ اس معنی کو دیکھتے ہوئے امام شافعی نے ''مختلف الحدیث'' میں اس کو رد کیا اور کہا ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت زیادہ مشابہت رکھتی ہے جو اس طرح ہے:

« إِنَّهُمْ يَبْكُوْنَ عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ لَيُعَذَّبُ فِيْ قَبْرِهِ » [2]

''یہ اس پر رو رہے ہیں، حالانکہ اس کو اس کی قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے۔''

جن علما نے اس مفہوم کے ساتھ اس حدیث کا اقرار کیا ہے، ان میں سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ انسان کو

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۲۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۲۹)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۳۱)

دوسرے کے گناہ کی سزا کے قبیل سے ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہے۔ ان لوگوں کا موقف ہے کہ اللہ انسان کو دوسرے کے گناہ کی سزا دیتا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک کافروں کی اولاد اپنے باپوں کے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائے گی، یہ گو سنت کی طرف نسبت رکھنے والے کچھ گروہوں کا قول ہے، لیکن کتاب وسنت سے یہی ثابت ہے کہ اللہ صرف اس کو جہنم میں داخل کرے گا جو اس کا نافرمان ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَاَمْلَاَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۸]

''بے شک ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا میں ضرور ہی جہنم کو تم سب سے بھروں گا۔''

جب وہ ان سے بھر جائے گی تو کسی دوسرے کے لیے گنجایش ہی نہیں رہے گی، چنانچہ جس نے شیطان کی پیروی نہ کی وہ جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔

کافروں کے بچے کے حوالے سے صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان کے متعلق یہ کہا جائے: انھوں نے جو کچھ کرنا تھا اللہ کو سب معلوم ہے۔ یہی جواب رسول اللہ ﷺ نے بھی صحیح حدیث میں دیا ہے اور ان کے کسی متعین بچے کے بارے میں جنت یا جہنم کا فیصلہ صادر نہ کیا جائے۔ کئی احادیث میں یہ بھی ذکر ہوا ہے کہ قیامت کے دن قیامت کے عرصات ومقامات میں انھیں حکم دیا جائے گا اور منع کیا جائے گا۔ جس نے فرماں برداری کر لی وہ جنت میں چلا جائے گا اور جس نے نافرمانی کی وہ جہنم میں داخل ہو جائے گا۔ ابو الحسن اشعری نے اہلِ سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ذکر کیا ہے۔

تکلیف (پابندی شریعت) دارِ جزا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی اور دارِ جزا جنت ہے یا جہنم۔ لیکن جو قیامت کے مختلف مقامات اور مراحل ہیں ان میں ان کو آزمایا جائے گا جس طرح عالمِ برزخ میں آزمایا جاتا ہے اور پوچھا جاتا ہے: تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴾ [القلم: ۴۲، ۴۳]

''جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ سجدے کی طرف بلائے جائیں گے تو وہ طاقت نہیں رکھیں گے۔ ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہو گی، حالانکہ انھیں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا، جب کہ وہ صحیح سالم تھے۔''

صحیح میں کئی طرق سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ حشر میں اپنے بندوں کے سامنے تجلی فرمائیں گے۔ کہا جائے گا: ہر قوم اس کی پیروی کرے جس کی وہ دنیا میں عبادت کیا کرتی تھی۔ مشرک اپنے معبودوں کی پیروی کریں گے۔ مومن باقی رہ جائیں گے۔ رب تعالیٰ ان کے سامنے ایسی شکل میں تجلی فرمائیں گے جو

اس شکل کے مخالف ہو گی جس کو وہ پہچانتے تھے، لہٰذا وہ اس کو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اس شکل میں ظاہر ہوں گے جسے وہ پہچانتے ہوں گے تو مومن اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں گے۔ منافقوں کی پشتیں گائے کے سینگوں کی طرح ہو جائیں گی۔ وہ سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن نہیں کر سکیں گے۔ یہ اس آیت کی تفسیر ہے: ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ...﴾ [1]

اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں کسی کو اس کے گناہ کے بغیر عذاب نہیں دے گا اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «إِنَّ المَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ» [2] ''میت کے گھر والوں کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کو عذاب ہوتا ہے۔'' اس میں یہ بیان نہیں ہوا کہ نوحہ کرنے والی کو سزا نہیں ملے گی، بلکہ نوحہ کرنے والی کو نوحہ کی سزا تو ملے گی۔ صحیح حدیث میں ذکر ہوا ہے: «إِنَّ النَّائِحَةَ إذا لَم تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِها تُلْبَسُ يَومَ القِيامَةِ دِرْعاً مِنْ جَرَبٍ وَسِرْبالًا مِنْ قَطِرانٍ» [3] ''نوحہ کرنے والی اگر توبہ کے بغیر مر گئی تو اس کو قیامت کے دن خارش کی قمیص اور گندھک کا چوغا پہنایا جائے گا، لہٰذا کوئی اس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، جس کی طرف سے وہ نوحہ کرتا ہے۔

مذکورہ حدیث میں میت کو عذاب دینے کا ذکر ہوا ہے، سزا دینے کا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ» یہ نہیں فرمایا: "إن الميت يعاقب" عذاب عقاب کی نسبت زیادہ عام اور وسیع ہے، عذابِ الم، یعنی تکلیف کو کہتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ انسان جو کسی سبب کی وجہ سے تکلیف سے دوچار ہو وہ اس سبب کی بنیاد پر اس کے لیے سزا ہی ہوتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلسَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ الْعَذَابِ يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ» [4]

''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے، تم میں سے کسی ایک کو اس کے کھانے اور پینے سے روک دیتا ہے۔''

یہاں آپ ﷺ نے سفر کو عذاب کا نام دیا ہے، لیکن یہ گناہ پر سزا نہیں۔ انسان کو کئی ایسے ناپسندیدہ امور پر عذاب یعنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مثلاً: کان پھاڑنے والی آوازیں، خبیث روحیں، بھیانک شکلیں۔ وہ ان سب کو سننے یا محسوس کرنے یا دیکھنے کی وجہ سے تکلیف اٹھاتا ہے، لیکن یہ اس کے کسی عمل کی سزا نہیں ہوتی جو اس کو دی جا رہی ہو۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٢٧، ٩٢٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٧)

بنا بریں نوحہ کی وجہ سے میت کو پہنچنے والے عذاب یعنی تکلیف کا انکار کیوں کیا جاتا ہے، گو وہ اس کا قابلِ سزا عمل نہیں؟ انسان کو قبر میں بھی کچھ لوگوں کی بات اور گفتگو کے نتیجے میں تکلیف پہنچتی ہے۔ اس بنا پر قاضی ابو یعلیٰ نے فتویٰ دیا تھا: ''مردوں کے پاس اگر گناہ کیا جائے تو انھیں اس کی وجہ سے تکلیف محسوس ہوتی ہے۔'' کئی آثار میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، تو ان کی قبروں کے پاس گناہ کرنے کی جو تکلیف انھیں ہوتی ہے وہ اس عذاب یعنی تکلیف کی طرح ہے جو ان پر نوحہ کرنے والوں کے نوحے کی وجہ سے انھیں پہنچتی ہے۔ نوحہ بھی عذاب کا ایک سبب ہے اور بسا اوقات سبب کا حکم معارض اور مخالف کے ہوتے ہوئے زائل ہو جاتا ہے۔ کبھی میت میں اتنی قوتِ کرامت ہوتی ہے جو اس سے عذاب کو زائل کر دیتی ہے، جس طرح کچھ لوگوں میں اتنی قوتِ مدافعت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ شور و غل، خبیث روحوں اور بھیانک شکلوں کے ضرر اور نقصان کو دور کر دیتا ہے۔

وعیدِ عذاب کی احادیث میں سبب ذکر کیا جاتا ہے اور بسا اوقات کسی مانع اور رکاوٹ کی وجہ سے اس سبب کا نتیجہ بے اثر ہو جاتا ہے، وہ موانع اور رکاوٹیں حسبِ ذیل ہو سکتی ہیں:

١ قبول شدہ توبہ۔
٢ گناہ مٹانے والی نیکیاں۔
٣ گناہوں کا کفارہ بننے والی مصیبتیں۔
٤ صاحبِ اجازت شفیع کی سفارش۔
٥ اللہ کا فضل۔
٦ اللہ کی رحمت و مغفرت۔

کیوں کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا، اس کے سوا جس کے لیے چاہے اس کو بخش دے۔

ایک مومن کو دنیا، برزخ اور قیامت کے دن جو تکلیف پہنچتی ہے جو عذاب ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اس کی خطائیں بخش دیتا ہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ وَصَبٍ وَّلَا نَصَبٍ وَّلَا هَمٍّ وَّلَا حَزَنٍ وَّلَا أَذًى حَتَّى الشَّوْكَة يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّ اللّٰهُ مِنْ خَطَايَاهُ» [1]

''کسی مومن کو جو تکلیف، مشقت، حزن، ملال اور اذیت پہنچتی ہے، حتی کہ اس کو چبھنے والا کانٹا بھی، مگر اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کی خطائیں مٹا دیتا ہے۔''

مسند احمد میں ہے کہ جب یہ آیت: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ...﴾ [النساء: ١٢٣] نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ تو کمر توڑ کر رکھ دینے والی آیت آ گئی ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو برا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٣)

عمل نہیں کرتا؟! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر! تجھے غم نہیں پہنچتا، تجھے تکلیف نہیں پہنچتی؟''[1] جنت پاکیزہ ہے۔ اس میں پاک ہی داخل ہوگا۔'' جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ [الزمر: ٧٣]

''پس اس میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ رہنے والے۔''

صحیح حدیث میں ہے: ''لوگ جب صراط عبور کریں گے وہ جنت اور جہنم کے درمیان ایک پل پر کھڑے ہو جائیں گے۔ وہاں ان سے ایک دوسرے کا قصاص اور بدلہ لیا جائے گا۔ جب وہ پاک صاف ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔''[2]

یہ جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ مردے سنتے ہیں، ان کو ثواب پہنچتا ہے، نوحہ کرنے کی وجہ سے انھیں اذیت اور عذاب ہوتا ہے، بلکہ قبر کے عذاب سے متعلقہ وہ امور جن سے متعلق سائل نے دریافت نہیں کیا۔ آج کے زمانے کے بہت سے لوگوں کو نیند اور بیداری کے عالم میں ان کا کشف ہو جاتا ہے۔ وہ ان امور کو جانتے ہیں اور ان کا عملی مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہمیں ایسے بہت سے امور کا علم ہے، لیکن علمی مسائل کے جواب میں کتاب و سنت ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس لیے لوگوں کے لیے ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان کو خود ان امور کا کشف ہو یا کسی سچے شخص نے اپنے کشف کی بابت اس کو بتایا ہو تو اس کے علم سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سے قرآن و سنت کی نصوص کی تصدیق اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن تمام لوگوں پر ان باتوں پر ایمان لانا ضروری نہیں جو انبیا کے علاوہ دوسرے لوگوں کی پیش کردہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کی باتوں کی تصدیق فرض کی ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ١٣٦] نیز فرمایا: ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ [البقرۃ: ١٧٧] صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ كَانَ فِيْ الْأُمَمِ قَبْلَكُمْ مُحَدَّثُوْنَ فَإِنْ يَكُنْ فِيْ أُمَّتِيْ فَعُمَر»[1]

''تم سے پہلی امتوں میں محدث (جس کو الہام ہوتا ہو) تھے، اگر میری امت میں کوئی ہو تو عمر ہے۔''

اس امت میں سے جس کو کشف یا الہام ہوتا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کو کتاب و سنت کی میزان پر رکھے۔ اگر وہ اس کے مطابق ہو تو اس کی واردات کی تصدیق کی جائے گی۔ اگر اس کے مخالف ہو تو اس کی طرف

---

[1] مسند أحمد (١١/١) المستدرك للحاكم (٨٧/٣) صحيح الترغيب والترهيب (١٨٦/٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٨٦) صحيح مسلم، رقم الالحديث (٢٣٩٨)

توجہ نہیں کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو سید الملہمین ہیں، اگر ان کے دل میں کوئی ایسی بات ڈالی جائے جو سنت کے مخالف ہو تو قبول نہیں کی جائے گی، کیوں کہ وہ معصوم نہیں، عصمت صرف نبوت کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیق رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ سے افضل تھے، کیوں کہ وہ اپنے دل سے اخذ نہیں کرتے تھے، بلکہ مشکاتِ نبوت سے اخذ کرتے تھے جو معصوم ہے۔ ملہم (محدث) کبھی اپنے دل سے اخذ کرتا ہے، کبھی نبوت سے۔ جو وہ نبوت سے اخذ کرے وہ معصوم ہے اور اس کی اتباع ضروری ہے۔ جو اس کے دل میں الہام ہو، اگر وہ نبوت کے مطابق ہو تو حق ہے۔ اگر مخالف ہو تو باطل۔ لہٰذا اہلِ علم و ایمان، علم و دین کے مسائل میں صرف کتاب و سنت کی نصوص اور اجماع پر بھروسا کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس اپنے وجدان، مشاہدے اور عقل و عمل کے شواہد ہوں تو اس سے وہ ذاتی طور پر مستفید ہوتے ہیں، لیکن لوگوں پر اللہ کی حجت اس کے رسول ہی ہیں۔ تاہم ان مسائل میں ایسے دلائل، عقلی اعتبارات، حسی اور کشفی شواہد ہوتے ہیں جن سے وہ شخص ذاتی طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے جو انھیں محسوس کرتا ہے۔ بنو آدم کا قیاس اور کشف خدا کی طرف سے رسولوں کی پیش کردہ تعلیمات کے تابع ہے۔ ان میں جو حق ہو وہ رسولوں کی تعلیمات کے مطابق ہوتا ہے، ان کے مخالف نہیں ہوسکتا۔ لیکن حق ہونے کے باوجود وہ لوگوں کے اختلافات مٹانے میں فیصلہ کن حیثیت نہیں رکھتا، اسی طرح جس کو ان کیفیات کا تجربہ نہ ہو، اس کے لیے اس طرح ان کی تصدیق بھی ضروری نہیں، جس طرح معصوم یعنی انبیا کی تعلیمات کی تصدیق ضروری ہے۔ تاہم جس کو ان جیسے امور میں بصیرت یا قیاس یا کوئی دلیل حاصل ہو تو یہ سونے پر سہاگا ہے۔ کسی سلف کا قول ہے: ''مومن کی بصیرت حکمت کے ساتھ بولتی ہے، چاہے اس میں کوئی اثر منقول نہ ہو، اگر کوئی اثر بھی منقول ہو تو یہ نور علیٰ نور ہے۔''

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ۴۰]

''اور وہ شخص جس کے لیے اللہ کوئی نور نہ بنائے تو اس کے لیے کوئی بھی نور نہیں۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۳]

''لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تا کہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے، جن میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اس

میں اختلاف انہی لوگوں نے کیا، جنھیں وہ دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پھر جو لوگ ایمان لائے، اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔'' واللہ أعلم۔[1]

تعزیت کا حکم اور طریقہ

سوال تعزیت کا کیا حکم ہے؟

جواب تعزیت مستحب ہے۔ سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ عَزَّى مُصابًا فَلَهُ أَجْرُهُ»[2] ''جس نے مصیبت زدہ سے تعزیت کی اس کو بھی اس کے اجر جتنا اجر ملے گا۔'' تعزیت کے موقع پر غیر شرعی الفاظ سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس کو مفید دعا دینی چاہیے، مثلاً کہنا چاہیے: اللہ اس مرنے والے کو بخش دے، اللہ تمھیں اجرِ عظیم سے نوازے، اللہ تجھے صبر و تسلی دے وغیرہ۔

اس موقع پر میت کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کروانا مستحب عمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: «اِصْنَعُوا لِآلِ جَعْفَرٍ طَعامًا فَقَدْ أَتاهُمْ مَا يُشْغِلُهُمْ»[3] ''آلِ جعفر کے لیے کھانا بناؤ۔ ان کے پاس ایسی خبر آئی ہے جس نے ان کو مشغول کر دیا ہے۔'' لیکن یہ کھانا دلی رضا مندی اور نیک نیتی سے پکانا چاہیے اور اس کے کسی عوض کے طور ہونا چاہیے، مثلاً کسی اس طرح کے اچھے کام کا بدلہ ہو، اگر آدمی کو علم ہو کہ وہ جائز نہیں تو نہ کھائے، لیکن اگر وہ مشتبہ اور غیر واضح ہو تو کسی کا دل رکھنے جیسی کسی مصلحتِ راجحہ کے پیشِ نظر تھوڑا سا کھا لے، واللہ أعلم۔[4]

نوحہ گری کا حکم

سوال قبر پر قرآن پڑھنے، نوحہ کرنے، نازیبا الفاظ کہنے اور غیر مردوں کی موجودگی میں عورتوں کے بے پردہ ہونے کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للہ. نوحہ گری معروف ائمہ کے نزدیک مردوں اور عورتوں سب کے لیے حرام ہے۔

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اس کو قیامت

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۳۶۹۔۳۷۶)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۷۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۶۰۲) ضعيف الجامع، رقم الحديث (۵۶۹۶)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۱۳۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۶۱۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۰۱۵)

[4] مجموع الفتاویٰ (۲۴/۳۸۰۔۳۸۱)

کے دن خارش اور گندھک کی قمیص پہنائی جائے گی۔"[1] کتبِ سنن میں ہے: "آنحضرت ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور سننے والی دونوں پر لعنت کی۔"[2] صحیح میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُودَ، وَشَقَّ الْجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»[3]

"جس نے اپنے رخساروں پر تھپڑ مارے، گریبان پھاڑا اور زمانۂ جاہلیت جیسی آوازیں نکالیں، وہ ہم سے نہیں۔"

عورتوں کا نامحرموں کے سامنے اپنا چہرہ ننگا کرنا ناجائز ہے۔ ولی امر نیکی کا حکم دے اور اس برائی سے منع کرے۔ جو باز نہ آئے اس کو سخت سزا دی جائے، تاآنکہ وہ اس سے توبہ کرے۔ بالخصوص قبرستان میں عورتوں کو نوحہ گری سے روکا جائے، رونا دھونا، جزع فزع کرنا، نوحہ اور ماتم کرنا ایسے گناہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو سخت ناپسند ہیں اور یہ میت کے لیے ایذا رسانی، زندہ کے لیے فتنہ گری، ناجائز ذرائع سے لوگوں کا مال کھانے، صبر اور ثواب کو ترک کرنے اور فحاشی کے اسباب پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ ان سے روکنا مسلمانوں کا فرض ہے۔

والله أعلم، وصلى الله وسلم على محمد وصحبه وسلم.[4]

حشر کے روز سب برہنہ اٹھیں گے؟

سوال (1) جب حشر کے دن لوگ اٹھائے جائیں گے تو کیا سب ہی برہنہ ہوں گے یا کچھ برہنہ اور کچھ کفنوں میں؟ نیز ابوسفیان کی اس روایت کا کیا مطلب ہے: "بالغوا في أكفان موتاكم، فإن أمتي تحشر بأكفانها وسائر الأمم عراة" "اپنے مردوں کو کفن پہنانے میں پورا اہتمام کرو، میری امت اپنے کفنوں میں اکٹھی کی جائے گی اور ساری امتیں برہنہ ہوں گی۔" اس کا ذکر غزالی نے کیا ہے۔

(2) کیا حضرت ادریس علیہ السلام صور پھونکنے کی وجہ سے مر کر گر جائیں گے؟

جواب (1) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَيِّتُ يُبْعَثُ فِيْ ثِيَابِهِ الَّتِيْ قُبِضَ فِيهَا»[5] "میت اسی کپڑے میں اٹھائی جائے گی جس میں اس کی روح قبض ہوئی۔" صحیح ابن حبان میں یہ بھی مروی ہے کہ جب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت ہوا تو انھوں نے نئے

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

(2) مسند أحمد (٦٥/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٢٨) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

(4) مجموع الفتاویٰ (٣٨٢/٢٤)

(5) صحيح ابن حبان (٣٠٧/١٦)

کپڑے منگوا کر پہنے اور کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمَيِّتُ يُبْعَثُ فِي ثِيَابِهِ الَّتِي يَمُوْتُ فِيهَا»[1]

حضرت ابوسعید نے حدیث سے یہ سمجھا کہ بندہ جن کپڑوں میں فوت ہوتا ہے انہی میں اٹھایا جاتا ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اپنے کفن میں اٹھایا جاتا ہے۔ کفن وہ کپڑا نہیں ہوتا جس میں آدمی فوت ہوتا ہے، پھر عام مردوں کو ان کپڑوں میں کفن نہیں دیا جاتا جن میں ان کی وفات ہوتی ہے۔ بالخصوص وہ کفن جو آپ ﷺ کو پہنایا گیا اس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو بطور پہناوا استعمال ہوتی ہو، کیوں کہ اس میں قمیص تھی نہ عمامہ۔ جب یہ معلوم ہوا کہ حدیث میں یہ منقول ہے کہ وہ ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں اس کی روح قبض ہوئی تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی پاک کپڑے میں اٹھایا جائے گا۔ ابو حاتم وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اس عمل پر اٹھایا جائے گا جس پر اس کی موت ہوئی، خواہ وہ نیک تھا یا بد، جس طرح اکثر مفسرین نے ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر: ٤] کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے عمل کی اصلاح اور نفس کو رذائل اور گھٹیا چیزوں سے پاک کرنا مراد ہے۔[2] عربی زبان میں اس لفظ کا یہ مجازی استعمال عام ہے، مثلاً شاعر کہتا ہے:

ثِيَابُ بَنِي عَوْفٍ طَهَارَىٰ نَقِيَّةٌ

''بنی عوف کے کپڑے پاک صاف ہیں۔'' یعنی وہ نیک نام ہیں۔

اسی طور بطور کنایہ کہا جاتا ہے کہ ''فلان طاهر الثياب'' ''فلاں پاک لباس ہے۔'' یعنی نیک نام ہے، اس مفہوم کی تائید ان دو باتوں سے بھی ہوتی ہے:

1 حدیث میں یہ آیا ہے کہ جس عمل پر اس کی وفات ہوئی وہ اچھا تھا کہ برا، اسی پر اٹھایا جائے گا۔ اسی طرح حدیث میں یہ بھی آیا ہے: جس پر اس کا خاتمہ ہوا اسی پر اٹھایا جائے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلَى مَا مَاتَ عَلَيْهِ» (أبو حاتم في صحيحه)[3]

''ہر بندے کو اسی پر اٹھایا جائے گا جس پر اس کی موت ہوئی۔''

2 صحیح احادیث بیان کرتی ہیں کہ لوگوں کا برہنہ حشر ہوگا۔ صحیح بخاری میں ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١١٤) السلسلة الصحيحة (١٦٧١)

[2] تفسير الطبري (٢٩/٩١، ٩٢)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٨)

((يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا))[1]

''لوگ قیامت کے دن برہنہ پا، برہنہ بدن اور بے ختنہ اکٹھے کیے جائیں گے۔''

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ ﴾ [الأنبياء: ١٠٤]

''جس طرح ہم نے پہلی پیدایش کی ابتدا کی (اسی طرح) ہم اسے لوٹائیں گے۔''

صحیح کی ایک روایت میں ہے: ((أَوَّلُ مَنْ يُّكْسٰى إِبْرَاهِيْمُ))[2] ''سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہنایا جائے گا۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ قیامت کے دن برہنہ پا، برہنہ بدن اور بے ختنہ اکٹھے کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مرد اور عورتیں سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے؟! آپ ﷺ نے فرمایا: عائشہ! معاملہ اس سے کہیں سنگین ہوگا کہ کوئی ایک دوسرے کو دیکھے۔''[3]

لہٰذا ان مجمل الفاظ کے ساتھ اس طرح کی صحیح احادیث کا تعارض جائز اور مناسب نہیں۔

مزید یہ کہ انسان کا اسی خیر اور شر پر اٹھایا جانا جس پر اس کی موت ہوئی، بالکل واضح اور ظاہر ہے، کیوں کہ اعمال کا دار و مدار خاتمے پر ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ اہلِ جنت کے عمل کرتا رہتا ہے، حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بازو کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس کی کتاب (تقدیر) غالب آ جاتی ہے اور وہ اہلِ جہنم کے عمل کرنا شروع کر دیتا ہے تو جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور بندہ اہلِ جہنم کے عمل کرتا رہتا ہے، حتی کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک بازو کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہلِ جنت کے عمل شروع کر دیتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کا حشر انھی اعمال پر ہوگا جن پر اس کی وفات ہوئی تھی۔

رہا وہ کپڑا جو وقتِ موت اس کے جسم پر تھا، اسی میں اٹھائے جانے کی کوئی مناسبت نہیں بنتی، کیوں کہ ممکن ہے بہت سے انبیا اور اولیاء بوسیدہ کپڑوں میں فوت ہوئے ہوں اور بہت سے کافر و منافق عمدہ پوشاکوں میں تو کیا یہ کافر اور منافق قیامت کے دن انبیا اور اولیا سے زیادہ خوب صورت اور اعلیٰ پوشاکوں میں اٹھائے جائیں گے؟ اگر یہ بات صحیح ہے تو میت کو انھی کپڑوں میں کفن دیا جانا بہتر ہے جن میں اس کی وفات ہو، تاکہ وہ انھی میں اٹھایا جائے، مگر ایسا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٩)

نہیں ہوتا، بلکہ کبھی حکم اس کے الٹ بھی ہو سکتا ہے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا كَفَّنَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُحْسِنْ كَفَنَهُ» [1]

''جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو کفن دے تو اس کے کفن کو عمدہ کرے۔''

اگر میت اسی کپڑے میں اٹھائی جاتی جس میں اس کی موت ہوئی ہو تو سنت میں اس کو خوب صورت بنانے کا ذکر آتا۔ رہی یہ بات کہ کفنوں ہی میں مردوں کو اٹھایا جائے گا تو اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

2 حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ آسمان میں فوت ہوئے۔ [2] لہٰذا وہ دوسری موت کے محتاج نہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو ہوں گے مر کر گر جائیں گے، سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ قیامت کے دن گر کر مر جائیں گے۔ سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کے عرش کی پنڈلی پکڑے ہوئے پاؤں گا۔ معلوم نہیں ان کو مجھ سے پہلے ہوش آئے گا یا اللہ نے ان کو استثنا دیا ہوا ہوگا۔'' [3] اگر اس طرح کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ نے توقف کیا ہے تو آج ہم جیسے بے علم کس طرح یقین سے کچھ کہہ سکتے ہیں؟ واللہ أعلم۔ [4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤٣)

[2] تفسير الطبري (٧٢/١٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٣)

[4] جامع المسائل (٢٢٤/٤_٢٢٨)

زکات

زکات کے عمومی ضوابط

سوال زکات کے عمومی قواعد و احکام کیا ہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

قرآن کریم میں زکات اور نماز کا اجمالی ذکر ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ آپ ﷺ کی تفصیل بھی وحیِ الٰہی ہی سے ماخوذ ہے، کیوں کہ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ پر کتاب کے ساتھ حکمت بھی اتاری۔ حضرت حسان بن عطیہ کا قول ہے: ''جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ پر سنت بھی نازل کرتے اور آپ ﷺ کو اس طرح اس کی تعلیم دیتے جس طرح قرآن کی تعلیم دیتے۔''

اللہ تعالیٰ نے زکات کو صدقہ اور زکات کے ناموں سے ذکر کیا ہے، لفظ زکات کا لغوی معنی ہے: پھلنا، پھولنا، نمو پانا۔ کوئی چیز اسی وقت نمو پاتی ہے جب اس سے فاسد عناصر الگ کر دیے جائیں اور کھیتی اسی وقت پھلتی پھولتی ہے جب اس سے جھاڑ جھنکار صاف کر دیا جائے، اس لیے یہ لفظ شریعت میں طہارت اور پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴾ [الشمس: ٩] ''یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسے پاک کر لیا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴾ [الأعلىٰ: ١٤] ''بے شک وہ کامیاب ہو گیا جو پاک ہو گیا۔''

صدقہ کرنے والے کا نفس بھی پاک ہو جاتا ہے، مال بھی صاف ہو جاتا ہے اور اس میں معنوی طور پر اضافہ بھی ہوتا ہے۔

فرضیتِ زکات کی جو حکمت سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسے ہمدردی اور مالی معاونت کے لیے فرض کیا گیا ہے۔ کسی کے ساتھ ہمدردی اور اس کی معاونت کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے پاس کسی طرح کا مال ہو، لہٰذا شریعت نے اس کے لیے نصابات طے کر دیے ہیں اور زکات کو بڑھنے اور نمو پانے والے اموال میں مقرر کیا ہے۔ یہ

نمو پانے والے اموال ایک تو وہ ہوتے ہیں جو ازخود بڑھتے ہیں، جس طرح مویشی اور کھیتی ہے اور کچھ وہ ہیں جن میں جب کچھ تغیر اور تصرف کیا جائے تب ان میں اضافہ ہوتا ہے، جس طرح حاضر مال (نقدی، غیر نقدی) ہے۔ انسان کو مال کے حصول میں جس قدر مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی کے مطابق اس سے زکات وصول کی جاتی ہے۔ جو زمانۂ جاہلیت کا خزانہ یا دفینہ ہاتھ لگے اس میں چونکہ مشقت کم ہوتی ہے اس لیے اس میں پانچواں حصہ مقرر ہے، پھر جس میں یک طرفہ مشقت ہو اس میں پانچویں حصے کا نصف ہے، یعنی عشر جو فصل اور کھیت بارش کے پانی سے سیراب ہو اس میں عشر (دسواں حصہ) ہے، جس میں دوطرفہ مشقت ہو اس میں پانچویں حصے کا چوتھائی ہے، یعنی نصف عشر بنا بریں جس کھیت کو خود بندوبست کر کے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے اور جس میں سارا سال مشقت ہو، جس طرح حاضر مال (نقدی، غیر نقدی) ہے اس میں پانچ کا آٹھواں حصہ ہے جو ربع عشر (چالیسواں حصہ) ہے۔

زکات کن چیزوں پر فرض ہے؟ اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے: ''زکات مالِ حاضر، کھیتی اور مویشی سے نکالی جاتی ہے۔'' حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں: ''اس پر اجماع ہے۔'' ابن منذر کا قول ہے: ''اہلِ علم کا اجماع ہے کہ زکات نو اشیا میں فرض ہے: اونٹ، گائے، بکری، سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور اور منقا، ان میں سے ہر صنف جب نصاب کو پہنچ جائے تو اس میں زکات فرض ہو جاتی ہے۔

زکات کا نصاب:

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ فِيمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أَوْسُقٍ صَدَقَةٌ، وَلَا فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ صَدَقَةٌ، وَلَا فِيمَا دُوْنَ خَمْسِ أَوَاقٍ صَدَقَةٌ، وَأَشَارَ بِخَمْسِ أَصَابِعِهِ»[1]

''(کھجور، پھل، کھیتی) میں پانچ وسق (۱۶من ۳۵ سیر) سے کم میں زکات نہیں۔ پانچ اونٹنیوں سے کم میں زکات نہیں اور پانچ اوقیہ چاندی (۲۰۰ درہم/ ۵۲½ تولے) سے کم میں زکات نہیں۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فِيمَا سَقَتِ الْأَنْهَارُ وَالْغَيْمُ: اَلْعُشُرُ وَفِيمَا سُقِيَ بِالسَّانِيَةِ نِصْفُ الْعُشْرِ»[2]

''جس کھیتی کو نہروں اور بادلوں سے سیراب کیا جائے اس میں عشر (دسواں حصہ) ہے اور جس کو آب بردار اونٹنی کے ذریعے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨١)

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

« فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ أَوْ كَانَ عَثَرِياً الْعُشْرُ، وَمَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ »[1]

''جس کھیتی کو آسمانی پانی، مراد بارش یا چشموں سے سیراب کیا جائے اس میں عشر ہے اور جس کو آب بردار اونٹ کے ذریعے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔''

ابوعمر بن عبدالبر کہتے ہیں کہ پہلی حدیث میں کئی علمی فوائد مذکور ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیا میں زکات فرض ہونے کی یہی مقدار ہے اور اس مقدار سے کم میں زکات نہیں۔ لفظِ ''زود'' تین سے لے کر دس اونٹنیوں تک بولا جاتا ہے۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔ اس حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ اوقیہ سے کم میں زکات نہیں، لیکن پانچ اوقیہ اور اس سے زیادہ میں زکات فرض ہو جاتی ہے۔ اکثر صحابہ اور تابعین کا یہی مسلک ہے۔

چاندی کا نصاب:

اس حدیث اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کہ « وَفِي الرِّقَةِ رُبُعُ الْعُشْرِ »[2] ''چاندی میں چالیسواں حصہ ہے۔'' سے معلوم ہوا کہ چاندی کا نصاب دو سو درہم ہیں، جن کا وزن ساڑھے باون تولے یا 612.360 گرام بنتا ہے۔

سونے کا نصاب:

سونے کے نصاب کے متعلق امام مالک کا قول ہے: ''ہمارے ہاں وہ سنت جس میں کوئی اختلاف نہیں، یہ ہے کہ زکات بیس دینار میں فرض ہوتی ہے، جس طرح دو سو درہم میں فرض ہوتی ہے۔'' (دینار سونے کا ہوتا ہے اور درہم چاندی کا)۔

اس مسئلے پر امام مالک نے اہلِ مدینہ کا اجماع ذکر کیا ہے۔ اس میں حضرت حسن بصری کے سوا کسی سے اختلاف منقول نہیں۔ ان کا قول ہے: سونے میں اس وقت تک کوئی زکات فرض نہیں ہوتی جب تک وہ چالیس مثقال (شرعی دینار کے برابر جو تقریباً ۵ گرام بنتا ہے) کو نہ پہنچ جائے۔ اس قول کو ابن منذر نے نقل کیا ہے۔ اس کے بارے میں جو حدیث نقل کی جاتی ہے وہ ضعیف ہے۔

اگر کسی انسان کے پاس ۲۰ دینار (ساڑھے سات تولے) سے کم مقدار میں سونا ہو اور اس کی قیمت ۲۰۰ درہم چاندی یعنی ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کے برابر نہ ہو تو سب کا اتفاق و اجماع ہے کہ اس پر زکات فرض

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤١٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٨٦)

نہیں، ہاں اگر وہ ساڑے سات تولے سے تو کم ہو، لیکن ساڑے باون تولے چاندی کی قیمت سے زیادہ ہو تو کچھ علمائے سلف کے نزدیک اس پر زکات فرض ہو جاتی ہے۔

زکات جس طرح چاندی میں فرض ہوتی ہے، اسی طرح قرآن و سنت کی روشنی میں سونے پر بھی فرض ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: ٣٤]

''اور جو لوگ سونا چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔''

وہ سونا چاندی درہم و دینار اور سکوں کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سونے کو چاندی کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کرنا:

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی انسان کے پاس سونا ہو اور چاندی بھی، لیکن وہ دونوں علاحدہ علاحدہ نصاب کو نہ پہنچتے ہوں تو کیا ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے چھے اقوال ہیں:

1. ان کو ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا۔ یہ شافعی کا قول ہے اور شریک اور حسن بن صالح سے بھی مروی ہے۔
2. سونے کو ملایا جا سکتا ہے، کیوں کہ وہ تابع ہے، لیکن چاندی کو سونے کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا، کیوں کہ وہ اصل ہے۔
3. اس شرط کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے کہ کم تر زیادہ تر کے تابع ہو۔ یہ شعبی اور اوزاعی کا قول ہے۔
4. ملایا جائے گا لیکن قیمت کے ساتھ۔ یہ ابو حنیفہ اور ثوری کا قول ہے۔
5. اجزا کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ حسن، قتادہ اور نخعی کا قول ہے۔ امام مالک اور قاضی ابو یوسف کا مذہب بھی یہی ہے کہ ان کے نزدیک جس کے پاس دس دینار اور سو درہم ہو، اس پر زکات فرض ہو جاتی ہے۔ اگر دس کی قیمت ایک سو پچاس ہو اور اس کے ساتھ پچاس درہم ہوں تو زکات فرض نہیں ہوتی، کیوں کہ زکات میں دینار دس درہم کے برابر ہے اور اجزا کے ساتھ ملایا جاتا ہے، قیمت کے ساتھ نہیں۔

سال گزرنے کی شرط:

مالِ حاضر اور مویشی پر زکات فرض ہونے کے لیے اس پر ایک سال کا گزرنا شرط ہے۔ رسول اللہ ﷺ زکات اکٹھی کرنے والے عامل کو ہر سال بھیجتے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفا کا طرزِ عمل بھی یہی تھا، کیوں کہ وہ اس سنت کو بخوبی جانتے تھے۔ امام مالک نے موطا میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم

سے نقل کیا ہے، وہ کہا کرتے تھے:

"هذا شهر زكاتكم، وقالوا لا تجب زكاة مال حتى يحول عليه الحول"

''یہ تمھارا زکات کا مہینا ہے۔ وہ کہتے تھے: مال میں زکات اس وقت تک فرض نہیں ہوتی جب تک اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔''

ابو عمر بن عبدالبر کا قول ہے: ''حضرت علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے اور قدیم و جدید فقہا کا مذہب بھی یہی ہے، البتہ اس میں حضرت معاویہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اختلاف منقول ہے۔''

بنا بریں جو شخص سونے یا چاندی میں سے نصابِ زکات کا مالک بن جاتا ہے اور وہ نصاب اس کی ملکیت میں پورا سال رہتا ہے تو اس پر زکات فرض ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے پاس نصاب سے کم ہو، پھر بعد میں وہ اتنے مال کا مالک بن جائے جس سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو جس دن نصاب پورا ہوا اس دن کا اعتبار کیا جائے گا اور پہلے کی بنیاد دوسرے کے سال پر رکھی جائے گی۔ اگر کوئی انسان نصاب کا مالک بن جائے، پھر کچھ مدت کے بعد نصاب کا مالک بن جائے تو ہر ایک کی بنا اس کے اپنے سال پر رکھے، مال کا نفع اصل کے ساتھ ملایا جائے اور نفع کی زکات اصل کے مال کے ساتھ ادا کی جائے۔ یہ اس صورت میں ہے جب اصل جمہور کے نزدیک نصاب ہو۔ اگر اصل نصاب سے کم ہو لیکن سال مکمل ہونے تک وہ نفع کے ساتھ نصاب کو پہنچ جائے تو امام مالک کے نزدیک اس سے زکات نکالی جائے گی۔ اگر اس اصل سرمائے کے ساتھ جو نصاب سے کم ہو، تجارتی سامان کو بھی ملا لیا جائے، پھر نصاب مکمل ہو جائے تو اس پر زکات فرض ہو جائے گی۔

سامانِ تجارت میں زکات:

سامانِ تجارت میں بھی زکات فرض ہے۔ ابن منذر کا قول ہے:

''اہلِ علم کا اجماع ہے، وہ سامان جو تجارت کی غرض سے رکھا ہو، جب اس پر پورا سال گزر جائے تو اس سے زکات نکالنا فرض ہے۔'' یہی حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس ساتوں فقہا حسن، جابر بن زید، میمون بن مہران، طاؤس، نخعی، ثوری، اوزاعی، ابو حنیفہ، احمد، اسحاق اور ابو عبید کا قول ہے۔ مالک اور داود سے مروی ہے: ''اس میں زکات نہیں۔'' سنن ابی داود میں حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الزَّكَاةَ مِمَّا نُعِدُّهُ لِلْبَيْعِ»[1] ''رسول اللہ ﷺ ہمیں اس مال سے زکات نکالنے کا حکم دیتے جسے ہم تجارت کے لیے تیار کرتے۔''

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٦٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ إرواء الغليل (١/١٥٩)

حماس کہتے ہیں: ''میرے پاس سے حضرت عمر کا گزر ہوا۔ انھوں نے کہا: اپنے مال کی زکات ادا کرو۔ میں نے کہا: میرے پاس تو صرف ترکش اور چمڑا ہے۔ انھوں نے کہا: ان کی قیمت نکال، پھر ان کی زکات ادا کر۔'' یہ واقعہ مشہور ہے۔ کوئی اس کا انکار نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ اجماع ہے۔ امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ تاجروں کی دو اقسام ہیں: ایک کو متربص کہا جاتا ہے، دوسرے کو مدیر۔

متربص وہ ہوتا ہے جو سامان خریدتا ہے، پھر اس کے لیے بازار اور منڈی میں خریدار کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ وہ سودا اس کے پاس بسا اوقات سالہا سال تک پڑا رہتا ہے۔ اس شخص پر امام مالک کے نزدیک زکات نہیں، اِلا یہ کہ وہ سامان بیچے تو ایک سال کی زکات نکال دے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ زکات نمو پانے اور بڑھنے والے اموال میں فرض کی گئی ہے۔ اگر ایسا شخص ہر سال سامان کی زکات نکالے تو کسی سال اس سامان کی کوئی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور وہ نمو کے بغیر ہی پڑا رہتا ہے، اس لیے اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا جب وہ اس کو بیچے اور اس کو نفع حاصل ہو تو نفع اس میں پنہاں تھا، اس لیے وہ اس سے زکات نکالے اور اس وقت تک زکات نہ نکالے جب تک وہ اس سامان کو نصابِ زکات کے برابر نہ بیچ لے۔ اس کے بعد جو تھوڑا بیچے یا زیادہ، اس سے زکات نکالے۔

مدیر وہ ہوتا ہے جو سارا سال سامان بیچتا رہتا ہے اور وہ سامان اس کے پاس پڑا نہیں رہتا۔ یہ شخص اپنے پاس سامان، حاضر مال، متوقع قرضوں کی واپسی اور سرمائے کا اندازہ لگا کر کوئی مہینا مقرر کرے اور پھر سال گزرنے پر سارے مال کی زکات نکالے۔ یہ اس صورت میں ہے جب سارا سال اس کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ رہے، خواہ ایک درہم ہی ہو، اگر وہ اصلاً کوئی مال فروخت نہ کرے تو اس پر امام مالک کے نزدیک زکات نہیں۔

زیورات کی زکات:

زیورات اگر عورتوں کے لیے ہوں تو امام مالک، لیث، شافعی، احمد، ابو عبید اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، اسماء، عبداللہ بن عمر، انس اور جابر رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت کے نزدیک ان میں زکات نہیں۔ دوسرا قول ہے: زیورات اگرچہ عورتوں کے استعمال ہی کے لیے ہوں، پھر بھی ان میں زکات ہے۔ یہ قول حضرت عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور تابعین کی ایک جماعت سے منقول ہے اور فقہا میں سے ابو حنیفہ، ثوری اور اوزاعی کا مذہب ہے۔

مردوں کے جو مباح اور حلال زیورات ہوتے ہیں، جیسے تلوار کو مرصع کرنا، چاندی کی انگوٹھی، ان میں زکات نہیں۔ وہ چیزیں جو مردوں کے لیے حرام ہیں، جیسے سونے کے برتن، ان میں زکات ہے۔ وہ چیزیں جن کو آراستہ کرنے میں اختلاف ہے، جیسے پٹکا، خود اور سینہ بند وغیرہ، ان کی زکات میں بھی اختلاف ہے۔ مالک اور شافعی کے

نزدیک ان میں زکات ہے اور ان کو رکھنا جائز نہیں۔ ابو حنیفہ اور احمد نے اس صورت میں جائز کہا ہے۔ جب یہ چیزیں چاندی کی ہوں۔ گھوڑے کی زین، کاٹھی اور لگام وغیرہ کو اگر سونے چاندی سے آراستہ کیا جائے تو جمہور کے نزدیک اس میں زکات ہے، لیکن امام مالک، شافعی اور احمد نے ایسی چیزوں کو رکھنے سے منع کیا ہے۔ اسی طرح دوات، سرمے دانی وغیرہ میں بھی جمہور کے ہاں زکات ہے، خواہ یہ سونے کی ہو یا چاندی کی۔

یتیموں کے مالوں کی زکات:

امام مالک، لیث، شافعی، احمد اور ابو ثور کے نزدیک یتیم کے مال میں زکات فرض ہے۔ حضرت عمر، عائشہ، علی، عبداللہ بن عمر اور جابر رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: یتیموں کے مال میں تجارت کرو، کہیں اسے زکات ہی نہ کھا جائے۔ یہی قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور حسن بن علی، عطا بن ابی رباح، جابر بن یزید، مجاہد اور ابن سیرین کا قول بھی یہی ہے۔

ضائع شدہ، غصب شدہ اور قرضے میں دیے ہوئے مال کی زکات:

ضائع شدہ اور چھینے گئے مال کے بارے میں امام مالک کا فرمانا ہے کہ یہ مال جب تک نہیں ملتا، تب تک اس میں زکات نہیں اور جب مل جائے تو ایک سال کی زکات ادا کر دی جائے۔ اسی طرح قرض کے متعلق بھی ان کا قول یہی ہے کہ جب قرض مل جائے تو ایک سال کی زکات ادا کر دی جائے۔ امام مالک کا یہ قول حسن، عطا اور عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے۔ اس مسئلے میں امام شافعی کے دو اقوال ہیں۔ تاہم امام مالک، ابو حنیفہ، احمد اور شافعی کے ایک قول کے مطابق قرض مالِ حاضر کی زکات ساقط کر دیتا ہے۔

عطا، حسن، سلیمان بن یسار، میمون بن مہران، نخعی، ثوری، اوزاعی، لیث، اسحاق اور ابو ثور کا قول بھی یہی ہے۔ ان ائمہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو موطا امام مالک میں سائب بن یزید سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ کہہ رہے تھے: ''یہ تمھاری زکات کا مہینا ہے، جس پر قرض ہو وہ اس کو ادا کرے، تاکہ تمھارے جو اموال بچ جائیں، تم ان کی زکات ادا کر سکو۔''

غلے اور پھلوں کی زکات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُوْنُ الْعُشْرُ»[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤١٢)

''جس کھیت کو بارش، پانی یا چشموں سے سیراب کیا جائے، اس میں عشر ہے۔''

اس حدیث میں عشر والی اشیا سے ماخوذ مقدار کا ذکر ہے جس پر علما کا اتفاق ہے، لیکن اس حدیث میں ان کا اختلاف ہے کہ کس چیز میں عشر فرض ہوتا ہے اور کسی میں نصف عشر۔

ایک گروہ کا کہنا ہے: ہر اس چیز میں عشر واجب ہے جو آدمی کاشت کرے، خواہ وہ دانے (اناج) ہوں، سبزیاں ہوں یا پھل، تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ یہ حماد بن ابوسلیمان، ابوحنیفہ اور زفر سے منقول ہے۔

ابو یوسف اور محمد کا قول ہے: عشر صرف اس میں فرض ہے جس کا پھل باقی ہو اور وہ پانچ وسق (۱۶ من ۳۵ سیر) کے برابر ہو۔

امام احمد کا قول ہے: عشر اس میں فرض ہے جو خشک ہو، باقی رہے اور اس کا وزن پانچ وسق سے اوپر ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ گندم، جو، چاول اور مکئی جیسی غذا ہو یا دالیں ہوں یا مصالحہ جات ہوں یا مختلف بیج، تل اور تمام دانے۔

اسی طرح امام احمد کے نزدیک ان اشیا میں بھی عشر واجب ہے جو ان مذکورہ اوصاف کی جامع ہوں، جیسے: کھجور، منقہ، بادام اور پستہ وغیرہ ہے۔ ابو یوسف اور محمد کا قول ہے: پھل اور سبزی میں عشر واجب نہیں۔

مالکیوں کا قول ہے: گندم، جو، مکئی، چاول، چنے، دال، تل، ماش، سلت (حجاز میں پیدا ہونے والے بے چھلکا جو)، باجرا اور اس طرح کھائے اور ذخیرہ کیے جانے والے دانوں میں عشر واجب ہے۔ اسی طرح تین قسم کے پھلوں میں بھی فرض ہے، جن میں کھجور، منقا اور زیتون شامل ہے۔

امام شافعی کا قول ہے: ''جو خشک ہو، ذخیرہ کیا جا سکتا ہو، اس سے غذا حاصل ہوتی ہو، خواہ اس کو کچا کھایا جائے یا پکا کر یا ستو بنا کر۔'' ان کے نزدیک کھجور اور منقے میں بھی زکات فرض ہے۔

ابن منذر کے نزدیک صرف نو اشیا میں زکات فرض ہے جو یہ ہیں: کھجور، منقا، گندم، جو، چاندی، سونا، اونٹ، گائے اور بکری۔

غلے اور پھلوں کا نصاب پانچ وسق ہے، تاہم مجاہد اور ابوحنیفہ کے نزدیک یہ شرط نہیں، اس سے کم مقدار میں بھی عشر واجب ہے۔

جانوروں کی زکات:

یہ نقد مال اور زرعی پیداوار کی زکات کا ذکر ہوا، حیوانات کی زکات کا نصاب بھی صحیح احادیث میں مذکور ہے۔

اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ پر تب زکات فرض ہو گی جب درج ذیل شرائط پائی جائیں:

1. ایک سال گزر چکا ہو۔

2 حیوانات پورا سال یا سال کا اکثر حصہ باہر جنگل میں چرتے ہوں، یعنی انھیں چارہ ڈالنے کا خرچ نہ آتا ہو۔
3 وہ بار برداری کے لیے نہ ہوں۔
4 وہ مقررہ نصاب کو پہنچ چکے ہوں۔

صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے جب انھیں یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ان کو یہ خط لکھ کر دیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. یہ فریضۂ زکات ہے جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں پر فرض کیا اور جس کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا۔ جس مسلمان سے صحیح طریقے کے مطابق طلب کیا جائے وہ پیش کرے اور جس سے اس سے زیادہ یا اس سے ہٹ کر طلب کیا جائے وہ نہ دے۔ اونٹوں میں اس کی تفصیل اس طرح ہے: ایک تا چار اونٹوں میں کوئی زکات نہیں۔ پانچ تا نو میں ایک سال کی بکری دی جائے گی۔ دس تا چودہ میں ایسی دو بکریاں دی جائیں گی۔ پندرہ تا انیس میں ایسی تین بکریاں دی جائیں گی۔ بیس تا چوبیس میں ایسی چار بکریاں دی جائیں گی۔ پچیس تا پینتیس میں بنت مخاض (ایسی اونٹنی جو اپنی عمر کے دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو) دی جائے گی۔ چھتیس تا پینتالیس میں ایک بنت لبون (ایسی اونٹنی جو اپنی عمر کے دو سال مکمل کر کے تیسرے میں داخل ہو چکی ہو) دی جائے گی۔ چھیالیس تا ساٹھ میں ایک حقہ (ایسی اونٹنی جو اپنی عمر کا تیسرا سال مکمل کر کے چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہو) دی جائے گی۔ اکسٹھ تا پچھتر میں ایک جذعہ (ایسا اونٹ جو پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہو) دیا جائے گا۔ چھہتر تا ننانوے میں دو بنت لبون اونٹنیاں دی جائیں گی اور اکانوے تا ایک سو بیس میں دو حِقہ دی جائیں گی۔ ایک سو بیس کے بعد ہر چالیس اونٹوں میں سے ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ دیا جائے گا۔

بکریوں کی زکات اس طرح ہے: ایک تا انتالیس میں کوئی زکات نہیں۔ چالیس تا ایک سو بیس میں ایک بکری دی جائے گی۔ ایک سو اکیس تا دو سو میں دو بکریاں دی جائیں گی۔ دو سو ایک تا تین سو میں تین بکریاں دی جائیں گی۔ اگر تین سو سے زیادہ ہو جائیں تو ہر سیکڑے پر ایک بکری دی جائے گی۔

گائیوں کی زکات اس طرح ہے: ایک تا انتیس پر کوئی زکات نہیں ہے۔ تیس سے انتالیس تک میں ایک تبیعہ (ایک سال کا بچھڑا جو دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو) دیا جائے گا۔ چالیس تا انسٹھ پر ایک مسنہ (وہ بچھڑا جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو) دیا جائے گا۔ ساٹھ سے اوپر میں ہر تیس پر ایک تبیعہ اور ہر چالیس پر ایک مسنہ دیا جائے گا۔"[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٨٦)

مصارفِ زکات:

زکات کی تقسیم قرآن کریم میں بیان ہوئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾

[التوبة: ٦٠]

''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں کے لیے اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافر میں (خرچ کرنے کے لیے ہیں)۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔''

امام ابوجعفر طبری فرماتے ہیں: عام اہلِ علم کہتے ہیں اس کو ذمے دار تقسیم کرے اور وہ ان آٹھوں اصناف میں سے جس صنف میں چاہے، صرف کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بتانے کے لیے ان آٹھ اصناف کا ذکر کیا ہے کہ یہ مصارفِ زکات ہیں، جن سے زکات باہر نہیں جانی چاہیے، یہ نہیں کہ ان آٹھ مصارف میں زکات صرف کرنا فرض ہے۔ حضرت حذیفہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: ''چاہو تو اس کو ایک ہی صنف میں صرف کر دو یا دو اصناف میں یا تین میں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''جس صنف میں بھی صرف کرے وہ کفایت کر جائے گی۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے: ''وہ فرض زکات اکٹھی کرتے اور اس کو کسی ایک صنف میں تقسیم کر دیتے۔''

ابو العالیہ، میمون بن مہران اور ابراہیم نخعی کا قول بھی یہی ہے۔ کچھ متاخرین کا کہنا ہے: ''اس کو چھے اصناف میں تقسیم کیا جائے۔ وہ تقسیم کرنے والے عامل اور تالیفِ قلب کو ساقط کر دیتے ہیں۔ تاہم درست یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو معانی میں زکات رکھی ہے، ایک مسلمانوں کی محتاجی دور کرنے کے لیے اور دوسرے اسلام کی تقویت و معاونت کے لیے۔ جو حصہ اسلام کی معاونت کے لیے خاص کیا جائے اس سے غنی اور فقیر دونوں کو دیا جائے، مثلاً: مجاہد وغیرہ۔

جن کے دلوں کی تالیف مقصود ہو، ان کو بھی اسی باب سے دیا جائے۔

زکات کی قیمت نکالنا:

زکات کی قیمت نکالنے کے متعلق تین اقوال ہیں:

① یہ ہر حالت میں کارآمد ہے اور کفایت کر جاتی ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

② یہ کسی حالت میں کارآمد نہیں۔ یہ امام شافعی کا قول ہے۔
③ یہ صرف ضرورت کے وقت کارآمد ہے۔ مثلاً کسی شخص کے پاس پانچ اونٹ ہوں اور ان میں ایک بکری زکات بنتی ہو، لیکن اس کے پاس بکری نہ ہو تو وہ بکری کی قیمت نکال دے۔ یہ امام احمد سے منقول ہے۔ وہ قیمت نکالنے سے منع کرتے ہیں، مگر ضرورت کے وقت جائز بھی کہتے ہیں۔ تاہم حنبلی علما نے امام احمد سے دونوں طرح کی روایات نقل کی ہیں، لیکن انھوں نے منع اور نہ نکالنے ہی کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ یہی ان سے مشہور ہے۔ یہ قول سب سے معتدل قول ہے، کیوں کہ وجوب کے دلائل اسی پر دلالت کرتے ہیں، نیز مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے، ملخصاً، واللہ أعلم۔[1]

سال کے دوران میں بکریوں کا نصاب پورا ہونے پر زکات

سوال ایک آدمی کے پاس کچھ بکریاں ہیں مگر وہ نصاب سے کم ہیں۔ اگر وہ سال کے دوران میں نصاب کو پہنچ جائیں تو کیا ان پر زکات فرض ہوگی؟

جواب اس مسئلے میں علما کے دو اقوال ہیں اور وہ دونوں امام احمد سے دو روایات ہیں:

ایک یہ ہے کہ سال کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب وہ چالیس ہو جائیں۔ یہ امام شافعی کے قول کے مطابق ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سال کی ابتدا اس وقت ہو جاتی ہے جب وہ امہات (اصل) کا مالک بنے۔ یہ امام مالک کے قول کے مطابق ہے۔ واللہ أعلم[2]

عشر کی مقدار نکالنے کا پابند

سوال عشر کا نصاب و مقدار کیا ہے، نیز کیا یہ مالک پر فرض ہے یا کسان پر یا دونوں پر؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. عشر کا نصاب پانچ وسق ہے۔ ایک وسق ساٹھ نبوی صاع کا ہوتا ہے۔ جب بغداد کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے علما نے نبوی صاع کو ۵.۳۳ عراقی رطلوں کے برابر قرار دیا۔ اس طرح سولہ سو عراقی رطل اس کا نصاب بنتا ہے۔ اس وقت ایک عراقی رطل میں ۹۰ مثقال ہوتے تھے، یعنی تقریباً ۱۲۸.۵۷ درہم۔ بعد میں اس میں اضافہ کر کے اسے ۱۳۰ درہم تک بڑھا دیا گیا۔ عشر وہی ادا کرے گا جو کھیتی کا مالک ہوگا۔ اگر

---

① مجموع الفتاویٰ (۲۵/۷۔۴۰)
② مجموع الفتاویٰ (۲۵/۴۹)

کسان مزارعت، یعنی بٹائی پر کسی سے کاشت کا معاملہ کرے تو بٹائی پر زمین دینے کے جواز و عدمِ جواز میں دو آرا ہیں۔ جو جواز کے قائل ہیں ان کے نزدیک مالک اپنا حصہ لے گا اور کسان اپنا حصہ اور وہ دونوں اپنے اپنے حصے سے عشر نکالیں گے۔ جن کے نزدیک بٹائی پر دینا جائز نہیں، ان کے نزدیک دانہ مہیا کرنے والا ساری کھیتی کا مالک ہوگا۔ اگر دانہ مہیا کرنے والا کسان ہو تو وہ ساری کھیتی کا مالک ہوگا۔ مالک کو صرف زمین کا کرایہ ملے گا اور عشر کسان نکالے گا۔

دیارِ شام میں مسلمان مزارعت کے جواز پر عمل پیرا ہیں۔ یہی رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفا کی سنت بھی تھی، خواہ مالک دانہ مہیا کرے یا کام کرنے والا (کسان)۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ خیبر سے یہی معاملہ کیا تھا کہ وہ خیبر کی زمینوں کو اپنے مال سے آباد کریں اور آدھی پیداوار مسلمانوں کو دیں۔ بیج بھی انہی کی طرف سے تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اسی پر اتفاق تھا اور رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلمانوں کا عمل عموماً اسی پر ہے۔

امام مالک، شافعی اور احمد وغیرہ کے نزدیک عشر اسی پر فرض ہوتا ہے جس کی ملکیت میں کھیت پروان چڑھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ ﴾ [البقرة: ٢٦٧]

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔“

آیت کا پہلا حصہ تجارت اور کاروبار کی زکات پر مشتمل ہے اور دوسرا حصہ زمین کی پیداوار پر۔ اللہ تعالیٰ جس کے لیے دانے کو زمین سے نکالتا ہے، عشر بھی اسی پر فرض ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کاشت کے لیے زمین کرائے پر لے تو ان سب علما کے نزدیک عشر اس کرائے پر لینے والے ہی پر فرض ہے۔ ابو یوسف اور محمد کا قول بھی یہی ہے، لیکن ابو حنیفہ کا قول ہے کہ عشر کرائے پر دینے والے پر ہے۔ اگر کوئی آدھی پیداوار پر مزارعت کرے تو جو مالک کو ملے گا وہ اس سے عشر نکالے گا اور جو کسان کو ملے گا وہ اس سے عشر نکالے گا۔ واللہ أعلم[1]

حکومت کو زکات دینا

سوال وہ زکات جو حکومت وصول کرتی ہے اور جہاں چاہتی ہے صرف کرتی ہے، فقیروں اور مسکینوں کو نہیں دیتی، اس سے فرض ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٥/٥١۔٥٣)

جواب مسلمان حکمران، جو عشر، مویشیوں اور مالِ تجارت پر زکات وصول کرتے ہیں، وہ جس سے وصول کی جاتی ہے اس کی طرف سے ادا ہو جاتی ہے۔ اگر حکمران عادل ہو تو وہ اس کو شرعی مصارف میں استعمال کرے گا اور اگر ظالم ہو اور شرعی مصارف میں استعمال نہ کرتا ہو تو زکات ادا کرنے والے کو چاہیے کہ وہ ایسے حکمران کو نہ دے، بلکہ خود مستحق افراد میں تقسیم کرے۔ اگر وہ ظالم کو ادا کرنے پر اس طرح مجبور ہو کہ اگر نہ دے تو اس کو نقصان پہنچ سکتا ہو تو اس صورت میں وہ (زکات) اکثر علما کے نزدیک اس کی طرف سے ادا ہو جائے گی۔

اگر ذمے دار افراد اس کو غلط مصارف میں استعمال کریں تو وہ مستحق افراد پر ظلم کرنے والے متصور ہوں گے۔

واللہ أعلم[1]

زکات میں قیمت نکالنے کا حکم

سوال زکات میں قیمت نکالنا جائز ہے یا ناجائز، جب کہ یہ اکثر حالات میں فقیر کے لیے زیادہ مفید ہوتی ہے؟

جواب زکات اور کفارات وغیرہ میں قیمت نکالنے کے متعلق امام مالک اور شافعی کا معروف مذہب عدمِ جواز کا ہے۔ امام ابو حنیفہ جائز کہتے ہیں۔ اس میں زیادہ واضح رائے یہ ہے کہ ضرورت اور مصلحتِ راجحہ کے بغیر قیمت نکالنا ناجائز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کی زکات میں مقرر کردہ تعداد میں مقرر کردہ عمر کے جانور کی عدمِ دستیابی کی صورت میں اس کے عوض دوسرا جانور دینے اور اس کی کمی پوری کرنے کے لیے ساتھ دو بکریاں دینے اور بکریاں نہ ہونے کی صورت میں بیس درہم دینے کا حکم دیا ہے، لیکن اسے چھوڑ کر قیمت نکالنے کو اختیار نہیں کیا، کیوں کہ اگر مطلقاً قیمت نکالنے کی اجازت دے دی جائے تو یہ امکان رہتا ہے کہ مالک نکمی اشیا کی طرف رخ کرے، نیز قیمت نکالنے میں ضرر کا اندیشہ بھی رہتا ہے، کیوں کہ زکات کی بنیاد مالی ہمدردی پر ہے اور یہ مال کی مقدار اور جنس ہی میں معتبر ہے، لیکن کسی ضرورت، مصلحت یا برابری کی غرض سے قیمت نکالنے میں کوئی حرج نہیں، مثلاً: کوئی شخص اپنے باغ کا پھل یا کھیت کی پیداوار فروخت کر دے۔ اس صورت میں وہ پیسوں سے عشر نکالے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔ اس کو پھل یا گندم خریدنے کا پابند نہیں کیا جائے گا۔ بالخصوص جب وہ خود فقرا میں برابر تقسیم کر چکا ہو، امام احمد سے اس کا جواز منصوص ہے۔

مثال کے طور پر کسی شخص کے پاس پانچ اونٹ ہوں اور ان میں ایک بکری زکات بنتی ہو، لیکن اس کے ارد گرد

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۸۱/۲۵)

کوئی شخص نہ ہو جو اس کو بکری فروخت کر دے تو یہاں قیمت نکالنا کافی ہوگا۔ اس کو کسی دوسرے شہر جا کر بکری خریدنے کا پابند نہیں کیا جائے گا یا زکات کے مستحق اس سے پیسوں کا مطالبہ کریں تو وہ ان کو دے دے، واللہ أعلم۔[1]

والدین اور اولاد کو زکات دینے کا حکم

سوال کیا آدمی اپنے والدین اور اپنی اس اولاد کو زکات دے سکتا ہے جو اس کے زیرِ کفالت نہ ہوں؟

جواب دو طرح کے لوگ زکات لیتے ہیں:

1. ایک صنف ضرورت کی وجہ سے زکات لیتی ہے۔ اس میں فقیر اپنی ضرورت کے تحت لیتا ہے اور قرض دار اپنی ذاتی مصلحت کے لیے لیتا ہے۔
2. مسلمانوں کی ضرورت کے لیے زکات لیتی ہے۔ جس طرح مجاہد اور لوگوں کے درمیان صلح کی وجہ سے ضمانت دینے والا شخص چٹی بھرنے کے لیے زکات کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ان کو دینا جائز ہے، چاہے یہ انسان کے قریبی عزیز ہوں۔

اس بنیاد پر اگر والدین قرض دار یا چٹی بھرنے والے ہوں یا جہاد میں شریک ہوں تو ان کو دینے کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں، لیکن دینا ہی راجح ہے۔ اگر وہ غریب وفقیر ہوں اور وہ انسان ان کا خرچہ اٹھانے سے عاجز ہو تو ایسی صورت میں ان کو دینا جائز ہے، کیوں کہ سبب اور مقتضا موجود ہے، مانع مفقود ہے، لہٰذا معارض سے محفوظ مقتضا پر عمل کرنا واجب ہے، واللہ أعلم۔[2]

مقروض بیٹے کا باپ سے زکات لینا

سوال کیا قرض دار اپنا قرضہ اتارنے کے لیے اپنے باپ سے زکات لے سکتا ہے؟

جواب اگر بیٹا مقروض ہو اور وہ اس کو ادا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو تو امام احمد کے مذہب میں راجح قول کے مطابق وہ اپنے باپ سے زکات لے سکتا ہے۔ اگر وہ لڑکا نان ونفقہ کا ضرورت مند ہو لیکن اس کے باپ کے پاس اس پر خرچ کرنے کے لیے کچھ ہو تو اس مسئلے میں اختلاف ہے اور زیادہ واضح رائے کے مطابق وہ اپنے باپ سے زکات لے سکتا ہے۔ اگر اس کا باپ ہی اس کا خرچہ اٹھاتا ہو تو پھر اس کو اس کی زکات سے لینے کی کوئی ضرورت نہیں، واللہ أعلم۔[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۸۲-۸۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۹۰)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۹۲)

حقیقی مستحق بھائی کو زکات دینا اور وقت سے پہلے زکات نکالنا

سوال ایک غریب شخص مقروض ہے۔ اس کا ایک حقیقی بھائی مالدار ہے۔ کیا یہ غیروں کو چھوڑ کر اپنے غریب بھائی کو زکات دے سکتا ہے؟ نیز کیا وہ سال دو سال پہلے بھی زکات نکال سکتا ہے؟

جواب اگر وہ زکات کا مستحق ہے تو غیر کی نسبت زیادہ حق دار ہے، نیز زکات پہلے نکالنا بھی جائز ہے، کیوں کہ زکات دینے میں کتاب وسنت کی نصوص قریب اور بعید کے دونوں مستحق افراد کو شامل ہیں۔

قریبی عزیز کو دینے میں صلہ رحمی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«صَدَقَتُكَ عَلَى الْمِسْكِيْنَ صَدَقَةٌ، وَصَدَقَتُكَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ صَدَقَةٌ وَّصِلَةٌ»[1]

"تمھارا مسکین پر صدقہ کرنا تو صدقہ ہی ہے مگر رشتے دار پر صدقہ کرنا صلہ رحمی بھی ہے۔"

صلہ رحمی میں صدقہ کرنا خالی صدقہ کرنے سے افضل ہے۔

جن علما نے اس کو زکات دینا منع کہا ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ اس پر بھائی کا خرچہ واجب وضروری ہے، اس لیے وہ زکات سے مستغنی ہے، لہٰذا وہ اس کو وہ نہ دے جو واجب خرچے کے قائم مقام ہو۔ یہ رائے متعدد وجوہ کی بنا پر کمزور ہے:

1. ممکن ہے کہ اس پر اس کا خرچہ واجب نہ ہو، یعنی زکات نکالنے والے کے پاس اتنا زائد مال نہ ہو جس کو وہ بھائی پر خرچ کر سکے۔ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ اگر خرچے کے ساتھ اس کو صدقے سے بھی محروم کر دیا جائے تو یہ بات شارع کے مقصود کے خلاف ہے۔

2. چلیے مان لیتے ہیں کہ اس پر اس کا خرچہ واجب ہے تو یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ کمانے پر قادر نہ ہو اور اس کا مطالبہ بھی کرے۔ اگر وہ زکات لینے پر قادر ہو اور اسی کو اختیار کرے تو اس حالت میں اس پر خرچہ واجب نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ زکات کا مستحق ہے اور کسی غیر سے زکات لیتا ہے تو اس حالت میں بالاجماع خرچہ واجب نہیں۔ لہٰذا خرچہ واجب ہونے کی وجہ سے زکات سے منع کرنا وجوبِ زکات کی وجہ سے خرچے سے منع کرنے سے اولیٰ نہیں بلکہ یہ اولیٰ ہے، کیوں کہ صدقہ اللہ نے اسی طرح کے لوگوں کے لیے حلال کیا ہے۔ اگر وہ اس کا مستحق ہے اور اس کو لینے پر قادر ہے تو اس کو خرچے کی ضرورت نہیں رہے گی کیوں کہ خرچہ اس صورت میں واجب ہوتا ہے جب وہ بندہ کمانے سے قاصر ہو اور زکات لینا کمانے کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ جس طرح کسی مالدار اور طاقتور انسان کے لیے صدقہ حلال نہیں تو وہ بھی خرچے کا مستحق نہیں۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٥٨)

3 اگر دوسرے پر اس کا خرچہ واجب ہے اور وہ دوسرا اس کو دینے سے انکار کرتا ہے تو وہ بالاتفاق زکات لے سکتا ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ یہ قریبی رشتے دار اس کو خرچہ نہیں دیتا تو اس سے زکات لینے سے تو اس کو محروم نہیں کیا جائے گا، اس لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ زکات اس سے ساقط نہیں ہوئی، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نفقہ نہ دینے کی وجہ سے گناہ گار ہے۔

4 بلاشبہ اس غریب کی مالی معاونت کرنا اور اس کو مالدار کرنا ضروری ہے، چاہے وہ قریبی رشتے دار اپنے مال سے اس کو مالدار کرے یا زکات سے۔ تو یا اس پر خرچ کرنا واجب ہے یا زکات دینا یا دونوں میں سے ایک۔ اگر محتاج زکات لینے پر قادر ہو اور وہ اسی کو اختیار بھی کرے تو ایسی حالت میں کوئی بھی اس پر خرچہ کرنے کو واجب نہیں کہتا۔ دوسری طرف اگر مال والا اپنے مال سے اس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا پسند کرتا ہے تو ایسی صورت میں کوئی بھی زکات سے دینا واجب نہیں کہتا۔ لہٰذا جب غریب زکات لینا پسند کرے تو اس کو اختیار ہے۔ اور جب مالدار اپنے مال سے صلہ رحمی کرنا چاہے تو اس کو بھی اختیار ہے، جب غریب بھی اس کو اختیار کرے۔ اگر غریب صلہ رحمی قبول نہ کرے، بلکہ کہے: مجھے زکات ہی دے تو اس کو یہ حق بھی حاصل ہے۔ اگر خرچے کا مطالبہ کرنا چاہے اور کہے: میں زکات نہیں صرف خرچہ مانگتا ہوں تو اس میں اختلاف ہے۔ اگر وہ دونوں صلہ رحمی کی مد سے دینے اور لینے پر اتفاق کر لیں تو جائز ہے اور اگر زکات دینا اور لینا پسند کریں تو یہ بھی جائز ہے۔ اسی طرح مالدار اس کو وقف صدقے سے بھی دے سکتا ہے یا جس صدقے پر وکیل یا ولی ہو اس سے بھی دے سکتا ہے۔

اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مالدار اگر زکات سے اس کو دے گا تو اپنا مال بچا لے گا۔ امام احمد نے سفیان بن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''علما کہا کرتے تھے: وہ اس کے ساتھ اپنا مال نہ بچائے۔ اس کے ساتھ کسی عزیز کی جانب داری نہ کرے اور کسی مذمت کو بھی دور نہ کرے۔'' اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ اس صورت میں ہے جب عزیز اس کے عیال میں سے ہو اور وہ اس کو صدقہ و زکات وغیرہ دے کر معمول کے خرچے سے پیچھے ہو جائے۔ اس صورت میں صحیح قول کے مطابق یہ صدقہ وغیرہ اس کو واجب خرچے سے کفایت نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی فتویٰ منقول ہے کہ اگر وہ اس کے عیال سے ہو تو اس کو صدقہ وغیرہ دے کر خرچے سے اپنے دامن کو بری الذمہ نہ کرے، بلکہ اگر کوئی شخص کسی کو کوئی عطیہ وغیرہ دیتا ہے تو اس کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ اس کے پیچھے اس کا مقصد اپنے مال کو بچانا ہو، کیوں کہ ایسا انسان زکات کے ذریعے اپنا مال بچاتا ہے۔ یہ زکات وہ اللہ کے لیے نہیں نکالتا، بلکہ اپنے مقصد کی خاطر نکالتا ہے، حالانکہ زکات صرف اللہ کے لیے نکالنی چاہیے، اگرچہ یہ شرعاً واجب نہیں، لیکن عادات اور رواج لوگوں کا حصہ ہوتا ہے۔ طرف داری کا مطلب ہے کہ کسی عزیز کو دے، حالانکہ اس سے

زیادہ مستحق کوئی دوسرا عزیز موجود ہو، ہاں اگر دونوں برابر کے ضرورت مند ہوں تو پھر طرف داری نہیں، یہ اس کے عکس ہے کہ اگر بھائی پر خرچ کرنا اس کی عادت نہ ہو۔

لہٰذا عزیز پر خرچ کرنے کا وجوب زکات سے لینے کی عدمِ قدرت اور عدمِ اختیار کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ زکات لینے پر قادر ہو اور اس کو اختیار بھی کرتا ہو تو اس وقت اس پر خرچ کرنا واجب نہیں۔ یہ بھائی کے ساتھ ہی خاص نہیں، بلکہ اگر کوئی غیر بھی اس کو زکات دے اور وہ لینا پسند کرے تو ایسی صورت میں اس کے بھائی پر اس کا خرچہ واجب نہیں۔

5 اگر وہ زکات دینے والا حاکمِ وقت کو زکات دیتا ہے اور وہ حاکم اس کے بھائی کو زکات دیتا ہے تو یہ جائز ہے۔ ایسے ہی اگر وہ زکات تقسیم کرنے والوں کو زکات دے اور وہ اس کے بھائی کو دیں تو یہ بھی جائز ہے۔ بالکل اس طرح اگر وہ خود تقسیم کرے تو اپنے بھائی کو بھی دے سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زکات کو اللہ کی طرف پھیرنا ضروری ہے، جو زکات دینے والے کو ثواب دیتا ہے۔ فقراء اللہ سے لیتے ہیں۔ اربابِ اموال کسی معاوضے کے عوض مستحق نہیں ہوتے، یہ ایسے ہی ہے جیسے حاکم اور امام بیت المال سے دیتا ہے۔ وقف کا نگران وقف سے دیتا ہے، لہٰذا اس کا اپنے قریب یا غیر کے مال سے زکات لینا برابر ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی وقف کا نگران اس کا عزیز ہو اور وہ اس سے لے، چاہے وہ وقف سلطانی ہو یا نذر وغیرہ۔

یہ حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''میرا سب سے پسندیدہ مال بیرحاء ہے۔ یہ اللہ کے لیے صدقہ ہے۔ میں اس کی نیکی اور ذخیرے کی امید اللہ سے کرتا ہوں۔ اے اللہ کے رسول! جہاں چاہیں خاص کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میری رائے میں تو اس کو قریبی رشتے داروں کے لیے خاص کر دے۔[1] جب انھوں نے اس صدقے کو اللہ کے لیے وقف کر دیا اور خود اس سے نکل گئے تو آپ ﷺ نے اس کو قریبیوں کے لیے خاص کرنے کا حکم دے دیا۔'' واللّٰه أعلم[2]

صدقہ فطر کی جنس اور مصارف

سوال صدقۂ فطر کس جنس سے نکالا جائے اور کیا ایسے اقارب کو دیا جا سکتا ہے جن کا خرچہ انسان کے ذمے نہیں ہوتا؟

جواب جو کسی علاقے کے رہنے والوں کی خوراک ہو، بلاشبہہ وہ اسی سے صدقہ فطر ادا کر سکتے ہیں، لیکن کیا وہ ایسی چیز سے بھی صدقہ فطر ادا کر سکتے ہیں جو ان کی خوراک میں شامل نہیں؟ مثلاً کسی علاقے کے لوگ صرف چاول

---

1. صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٩٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٩٨)
2. جامع المسائل (٦/٣٧١۔٣٧٤)

کھاتے ہوں تو کیا وہ گندم یا جو سے بھی صدقہ فطر نکال سکتے ہیں یا وہ صرف چاول سے نکالیں گے؟ اس مسئلے میں علما کا مشہور اختلاف ہے:

امام احمد سے دو روایات ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ صرف ان اجناس سے صدقہ فطر نکالا جائے جن کا ذکر احادیث میں ہوا ہے۔ دوسری روایت ہے ہر اس جنس سے نکالا جا سکتا ہے جو بطور خوراک استعمال ہوتی ہو، اگرچہ وہ ان اصناف سے نہ ہو جن کا ذکر احادیث میں ہوا ہے۔

اکثر علما، جیسے شافعی وغیرہ کا یہی مسلک ہے اور یہی صحیح ترین قول بھی ہے، کیوں کہ صدقات میں یہ قاعدہ ہے کہ یہ فقرا کے لیے بحیثیتِ مساوات فرض ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ [المائدۃ: ۸۹]

''درمیانے درجے کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔''

رسول اللہ ﷺ نے کھجور یا جو سے جو ایک صاع صدقہ فطر مقرر کیا ہے تو اس لیے کہ یہی اہلِ مدینہ کی خوراک تھی۔ اگر یہ ان کی خوراک نہ ہوتی، بلکہ کوئی اور جنس ہوتی تو آپ ان کو ایسی جنس سے صدقہ فطر ادا کرنے کا پابند نہ کرتے جو ان کی خوراک ہی نہیں تھی، جس طرح اللہ تعالیٰ نے کفارات میں اس کا حکم نہیں دیا۔ صدقہ فطر بھی کفارات کی جنس سے ہے، کیوں کہ یہ دونوں بدن کا صدقہ ہیں، لیکن مال کا صدقہ اس کے برخلاف ہے، کیوں کہ وہ مال کی وجہ سے فرض ہوتا ہے وہ جس جنس کا بھی ہو۔

ابو حنیفہ اور احمد کے مذہب میں صدقہ فطر آٹے سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے، لیکن شافعی کے نزدیک نہیں۔ آٹا وزن کے ساتھ نکالا جائے گا، کیوں کہ وہ پیسنے کی صورت میں بڑھ جاتا ہے۔

وہ رشتے دار جو غیر رشتے دار کی طرح ضرورت مند ہو وہ زیادہ حق دار ہوتا ہے، کیوں کہ مسکین پر صدقہ کرنا تو صرف صدقہ ہوتا ہے، لیکن رشتے دار پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہوتا ہے اور صلہ رحمی بھی۔ واللہ أعلم [1]

صدقہ فطر نکالتے وقت تمام مصارف کا احاطہ

''وہ زکات جو حکومت وصول کرتی ہے'' سے پہلے (ص: ۱۲)

سوال کیا صدقہ فطر دیتے وقت آٹھوں مصارف کا احاطہ کرنا ضروری ہے یا ایک شخص کو دے دینے سے ادا ہو جاتا ہے؟ اس مسئلے میں علما کے اقوال کیا ہیں؟

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۶۸۔۶۹)

جواب الحمد للہ رب العالمین. اس موضوع پر گفتگو کا دائرہ ان دو صورتوں کے گرد گھومتا ہے:

پہلی صورت: مال کی زکات، یعنی مویشی، نقدی، سامانِ تجارت اور عُشروں کی زکات، اس سے متعلق علما کے دو اقوال ہیں:

1. ہر زکات ادا کرنے والا مقدور بھر ان آٹھوں مصارف کا احاطہ کرے اور ہر صنف میں سے تین کو دے۔ یہ امام شافعی کا معروف مذہب ہے اور امام احمد سے ایک روایت ہے۔

2. آٹھوں مصارف سے باہر نہ نکلے، کسی ایک کو اس کی کفایت سے زیادہ نہ دے اور دیتے وقت غیر جانبدار رہے۔ یہ نہیں کہ زیادہ حق دار کو چھوڑ دے اور کم حق والے کو دے دے، جب عدل کرنے کا امکان بھی ہو۔ ان سب فقہا کے نزدیک اگر کوئی شخص اپنی ساری زکات کسی ایک صنف سے تعلق رکھنے والے کسی ایک مستحق فرد کو دے دے تو اس کی زکات ادا ہو جائے گی، مثلاً کوئی شخص ہزار درہم کا مقروض ہو اور ادا کرنے پر قادر نہ ہو اور کسی شخص کی ساری زکات ہزار درہم بنتی ہو اور وہ ساری اس کو دے دے تو اس کی زکات ادا ہو جائے گی۔ یہ جمہور فقہا کا قول ہے، جن میں ابو حنیفہ اور ایک روایت میں احمد بھی شامل ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حذیفہ بن یمان، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی یہی منقول ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیصہ بن مخارق ہلالی سے کہا: ''اٹھ اے قبیصہ! تا آنکہ ہمارے پاس زکات کا مال آ جائے، پھر ہم تمھیں دینے کا حکم دیں گے۔''[1] سنن ابو داود وغیرہ میں ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمہ بن صخر بیاضی سے کہا: ''بنی زریق کے عاملِ زکات کے پاس جا، وہ ان کی زکات تجھے دے۔''[2] ان دونوں احادیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کی زکات ایک شخص کو دینے کا حکم دیا، مگر یہاں حکم دینے والا امامِ وقت ہے۔ اس جیسے مسئلے میں اختلاف ہے اور دونوں فریقوں کی بحث اس فتوے میں سمٹ نہیں سکتی۔

دوسری صورت: صدقہ فطر، یہ اس بحث کا مقصودِ اصل ہے۔ کیا یہ زکات اموال کی زکات کی طرح ہے یا ابدان کی زکات کی طرح، جیسے کفارات ہوتے ہیں۔ یہ دو اقوال ہیں۔ پہلے قول کے قائلین کے نزدیک تمام مصارف کا بالاستیعاب احاطہ ضروری ہے، لہٰذا یہ ان کے نزدیک واجب ہے۔ سائل نے جو سوال پوچھا ہے، وہ انھی دو بنیادی باتوں پر مبنی ہے۔ امام شافعی کے نزدیک استیعاب واجب ہے اور جمہور کے نزدیک نہیں۔ وہ ایک ہی شخص

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٤٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٢١٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٢٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٠٦٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغلیل (١٧٦/٧) میں اسے صحیح کہا ہے۔

کو صدقہ فطر دینے کے قائل ہیں اور قدیم و جدید دور کے مسلمانوں کا عمل بھی یہی ہے۔

دوسری صورت اور قول کے قائلین کے نزدیک صدقہ فطر قسم، ظہار، قتل، رمضان میں جماع اور حج کے کفارات کے قائم مقام ہے۔ ان کا سبب بدن ہے، مال نہیں۔ سنن میں یہ حدیث مروی ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر روزے دار کو لغو اور بے ہودگی سے پاک کرنے اور مسکینوں کے لیے خوراک کے طور پر فرض کیا۔ جس نے اس کو نمازِ عید سے پہلے ادا کیا تو یہ قبول شدہ زکات ہے، اور جس نے نماز کے بعد ادا کیا تو یہ عام صدقے کی طرح ایک صدقہ ہے۔''[1] ایک دوسری حدیث میں ہے: «أَغْنُوهُمْ فِي هَذَا الْيَوْمِ عَنِ الْمَسْأَلَةِ»[2] ''آج ان کو مانگنے سے بے نیاز کر دو۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خوراک کی صورت میں فرض کیا ہے جس طرح کفارہ خوراک کی صورت میں فرض کیا ہے۔ اس قول کی بنیاد پر اسی شخص کو کھلانا کفایت کرے گا جو کفارے کا مستحق ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی ضرورت کی وجہ سے اس کو لیتے ہیں، اس لیے کفارے میں سے کچھ بھی نہ تو گردن آزاد کروانے کے لیے دیا جاتا ہے نہ تالیفِ قلب کے لیے اور نہ اس کے علاوہ کسی دوسرے مصرف ہی میں۔ یہ قول دلیل کے لحاظ سے قوی تر ہے۔ اس مسئلے میں کمزور ترین قول یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے صدقہ فطر بارہ آدمیوں یا اٹھارہ آدمیوں یا چوبیس آدمیوں یا اٹھائیس آدمیوں یا بتیس آدمیوں کو دینا ضروری ہے۔ یہ قول عہدِ رسول کے مسلمانوں، خلفائے راشدین اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مذہب کے خلاف ہے۔ ان کے زمانے میں کسی مسلمان نے اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ مسلمان اپنا اور اپنے عیال کا صدقہ فطر ایک ہی مسلمان کو دے دیتا تھا۔

اگر وہ کسی کو ایک صاع کو کئی حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اور پھر ہر ایک حق دار کو ایک ایک مٹھی دیتے ہوئے دیکھتے تو ضرور اس کی مذمت و انکار کرتے اور اسے ناپسندیدہ بدعت اور قبیح افعال میں شمار کرتے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور اور جو میں سے مامور بہ صدقہ فطر کی مقدار ایک صاع اور گندم سے نصف صاع یا پورا صاع، جو ایک مسکین کے لیے کفایت کر سکتا ہے، مقرر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ان کے لیے عید کے دن کی خوراک قرار دیا، تاکہ وہ خوراک کے معاملے میں بے نیاز ہو جائیں۔ اگر ایک مسکین کو ایک مٹھی ملے تو وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسی طرح مقروض و مسافر بھی اگر ایک مٹھی گندم لے تو اس کے مقصود سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور یہ عقلا کے نزدیک بھی مقصود نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی وقت مقصود ہو تو مثلاً فرض کیجیے کچھ لوگ حالتِ اضطرار میں ہوں۔ اگر ایک صاع ان سب

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٢٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٥٧٠)

[2] سنن الدارقطني (٢/١٥٣) (٢/١٥٣) سنن الكبرىٰ للبيهقي (٤/١٧٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٣/٣٣٤) میں اسے ضعیف کہا ہے۔

میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ بچ سکتے ہوں۔ اگر چند ایک کو دے دیا جائے تو باقیوں کے مرنے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اس کو اس گروہ میں برابر تقسیم کرنا چاہیے، لیکن یہاں یہ تقسیم مصلحت کا تقاضا ہے۔ مگر شریعت ایسے تمام منکر افعال سے منزہ ہے جو اہلِ عقل قبول نہ کریں اور اسلافِ امت اور ائمۂ امت میں سے کسی نے نہ کیے ہوں۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ: «طُعْمَةٌ لِلْمَسَاكِينِ» یہ مسکینوں کا حق ہونے میں نص اور صریح ہیں۔ ظہار کی آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا ﴾ [المجادلة: ٤] ''تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

اگر یہ (کفارات) آٹھوں مصارف میں صرف کرنا جائز نہیں تو صدقہ فطر بھی اسی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مال کی زکات دیتے وقت جنسِ نصاب سے مال نکالنا معتبر ہوتا ہے اور جو مال میں نمو اور افزایش کا سبب ہو اس کو باقی رکھا جاتا ہے، اسی لیے جانوروں کی زکات نکالتے وقت مادہ جانور دینے کا حکم ہے، سوائے تبیع (دوسرے سال میں داخل ہونے والا بیل) اور ابن لبون (تیسرے سال میں داخل ہونے والا اونٹ) کے، کیوں کہ مقصود دودھ کا حصول اور افرایشِ نسل ہے جو مادہ کا کام ہے۔ عید کی قربانی اور حج کی قربانی کا مقصد کھانا ہوتا ہے، اس لیے ان میں نر مادہ سے افضل ہے، اگر قربانی وغیرہ صدقہ کی جائے تو وہ مسکینوں اور حاجت مندوں کو دی جاتی ہے، اس میں آٹھوں مصارف کا احاطہ نہیں کیا جاتا۔ صدقہ فطر بھی خوراک کے لیے فرض ہوا ہے، افزایش اور نمو کے لیے نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ کفارات کی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ آیت: ﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ ﴾ [التوبة: ٦٠] صدقہ کے استیعاب و احاطہ میں نص ہے، تو جواب ہوگا یہ کئی پہلوؤں سے غلط ہے:

1 اس آیت میں لام عہدِ تعریف کے لیے ہے اور اس میں اسی صدقے کا ذکر ہے جس کا ذکر پہلے اس آیت میں ہو چکا ہے:

﴿ وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِى الصَّدَقَٰتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا ﴾ [التوبة: ٥٨]

''اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تجھ پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں، پھر اگر انھیں ان میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔''

یہ بالاتفاق اموال کے صدقات اور زکاتیں ہیں، ابدان کے صدقات نہیں، اسی لیے اللہ نے آیتِ فدیہ میں فرمایا:

﴿ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ﴾ [البقرة: ١٩٦]

''تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔''

یہ صدقہ سورت براءت (توبہ) کی آیتِ صدقات میں داخل نہیں اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ حج کے فدیے (دم) کو ان آٹھوں مصارف میں صرف کرنا واجب نہیں، اسی طرح نفلی صدقہ بھی اس آیت میں اہلِ اسلام کے اجماع کے ساتھ داخل نہیں۔ اسی طرح تمام معروفات (نیکیاں) بھی صدقہ ہیں، جیسا کہ کئی ایک سندوں سے صحیح میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

« كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ »[1] ''ہر معروف صدقہ ہے۔''

یہ بھی بالاتفاق آٹھوں مصارف کے ساتھ خاص نہیں۔ یہ اس صدقے کے اس آیت میں داخل نہ ہونے کے قائلین کا جواب ہے اور یہ آیت زمین کے مشرق و مغرب میں پھیلے ہوئے تمام فقرا و مساکین اور مقروضوں کو عام اور شامل ہے، مگر کسی مسلمان نے یہ نہیں کہا کہ ان سب کو بالاستیعاب دینا ضروری ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر صنف میں سے کم از کم تین کو دینا ضروری ہے۔ یہ ہر صنف سے عام لفظ کی تخصیص ہے، پھر اس میں بھی کسی فقیر کی تعیین ہو جاتی ہے، کسی کی نہیں ہوتی، نیز کسی نے بھی ہر صنف کے تمام افراد میں برابری کے ساتھ تقسیم کرنا لازمی نہیں کہا۔ تو اصناف (آٹھوں مصارف) میں عمومیت اور برابری کی بابت جمہور کا قول ہر صنف کے تمام افراد میں عمومیت اور برابری کی طرح ہی ہے۔

2 دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس آیت: ﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ ﴾ میں حصر اور تحدید ہے، یعنی مذکور ثابت ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہو گا کہ صدقہ ان کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے نہیں، بلکہ ان کے لیے ہے تو مثبت منفی کی جنس سے ہے، یہاں ملکیت بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ حلال ہونا بیان کرنا مقصود ہے، یعنی ان کے علاوہ کے لیے صدقہ حلال نہیں تو معنی ہو گا، بلکہ ان کے لیے حلال ہے، کیوں کہ اللہ نے یہ اس کی مذمت کے سیاق میں ذکر کیا ہے، جس نے زکات سے مانگا مگر وہ مستحق نہیں، لہٰذا ایسی چیز طلب کرنے پر مذموم کی مذمت کی جاتی ہے جو اس کے لیے حلال نہ ہو، اس کی نہیں جو اس کے لیے حلال ہو گو وہ اس کا مالک نہ ہو، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو ان کی مذمت بھی کی جاتی اور ان سب کی بھی جو امام کی تقسیم سے پہلے مانگتے۔ اگر مذمت عام ہوتی تو حصر میں خاص ان کے لیے مذمت نہ ہوتی، بلکہ دوسرے بھی شریک ہوتے، جب کہ آیت کا سباق صرف ان کی مذمت کا تقاضا کرتا ہے۔ ان کے ساتھ جو مذمت خاص ہوئی وہ ان کے اس کا سوال کرنے کی وجہ سے تھی جو ان کے لیے حلال نہیں تھا، تو یہ نفی ہوئی اور وہ جو مثبت تھا وہ حلال ہوا۔ لہٰذا اصناف اور ان کے افراد کے لیے حلال کرنے میں استیعاب اور برابری کا وجود نہیں، اس لام کی طرح جو ان آیات میں ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٥)

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾ [البقرة: ۲۹]

''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية: ۱۳]

''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔''

حدیث میں ہے:

((أَنْتَ وَمَا لُكَ لِأَبِيْكَ))[1]

یہاں لام اباحت کے معنی میں ہے، اس لیے اگر کوئی کہے کہ اس نے واؤ تشریک اور لام تملیک کے ذریعے ان میں تقسیم کی ہے تو اس کی یہ بات ہماری ان تصریحات کی بنا پر ممنوع ہے۔

3 تیسرا پہلو: اللہ تعالیٰ نے وراثت کی آیت میں فرمایا:

﴿ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ﴾ [النساء: ۱۱]

''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں تاکیدی حکم دیتا ہے، مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصِیْنَ بِهَاۤ اَوْ دَیْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ﴾ [النساء: ۱۲]

''اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے، جو انھوں نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں، یا قرض (کے بعد)۔ اور ان کے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے جو تم چھوڑ جاؤ، اگر تمھاری کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر تمھاری کوئی اولاد ہو تو ان کے لیے اس میں سے آٹھواں حصہ ہے جو تم نے چھوڑا۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ﴾ [النساء: ۱۷٦]

''اور اگر وہ کئی بھائی بہن مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔''

[1] مسند أحمد (۲/ ۲۰٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۲۹۱، ۲۲۹۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱٤۸٦)

یہاں لام تملیک کے لیے ہے، اس لیے یہاں تمام مذکورہ اصناف میں استیعاب ضروری ہے اور ہر صنف کے افراد میں بھی استیعاب اور برابری ضروری ہے، اگر کسی شخص کی چار بیویاں، چار بیٹے یا چار بیٹیاں یا بہنیں یا بھائی ہوں، تمام افراد میں عمومیت اور برابری ضروری ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نسب کی وجہ سے مستحق ہے اور اس میں وہ سب برابر ہیں، لیکن وہاں صورتِ حال اس طرح نہیں، اس لیے وہاں استیعاب اور برابری ضروری نہیں۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ کسی صنف کے افراد کا استیعاب ممکن نہیں، بلکہ جو اصناف میں کہا جائے گا، افراد میں بھی وہی کہنا ضروری ہے۔ اگر کہا جائے کہ حسبِ امکان استیعاب ضروری ہے اور معجوز عنہ ساقط ہو جاتا ہے تو افراد کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا، لیکن معاملہ ایسے نہیں، لیکن حسبِ امکان عدل کو بروئے کار لانا ضروری ہے، جیسے ہم ذکر کر آئے ہیں۔ واللہ أعلم

مانگے بغیر کچھ مل جانے کو قبول کرنا

سوال اگر کسی شخص کو کوئی آدمی مانگنے کے بغیر کچھ دے تو کیا وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''تیرے پاس جو مال مانگنے اور جھانکنے (نظر رکھنے) کے بغیر آئے، اسے لے لے اور جو اس طرح نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ۔'' صحیح میں یہ حدیث بھی ہے کہ حکیم بن حزام نے آپ ﷺ سے کچھ مانگا۔ آپ ﷺ نے ان کو دے دیا۔ انھوں نے پھر مانگا۔ آپ ﷺ نے پھر عطا کر دیا۔ اس کے بعد کہا: ''اے حکیم! تو کتنا مانگے گا؟ یہ مال بڑا میٹھا اور نظروں کو بھاتا ہے۔ جو اس کو اپنے نفس کی سخاوت سے لیتا ہے اس کے لیے برکت ڈالی جاتی ہے اور جو اس پر نفس کے نگاہ رکھنے کی وجہ سے لیتا ہے اس کے لیے برکت نہیں ڈالی جاتی۔ وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔''

یہ سن کر حضرت حکیم نے کہا: قسم اُس کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، میں آپ کے بعد کسی سے کچھ مانگ کر اس کے مال میں کمی نہیں کروں گا۔[2] حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان کو دیتے لیکن وہ نہ لیتے۔

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اگر اپنی زبان سے مانگنے والا ہو یا اس پر لالچ کی نگاہ رکھتا ہو جو اس کو دیا جا رہا ہو تو اس کو ایسے مال کو قبول نہیں کرنا چاہیے، لیکن اسی صورت میں جس صورت میں اس کے لیے سوال کرنا اور نگاہ رکھنا جائز ہو، لیکن اگر کوئی مال مانگنے اور تمنا رکھنے کے بغیر مل جائے تو اسے قبول کر لینا چاہیے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بیت المال سے دیا۔ درحقیقت انھوں نے ایک کام کیا تھا جس کی مزدوری

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۷۱-۷۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۹۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۳۵)

کے طور پر آنحضرت ﷺ نے ان کو دیا۔ گویا وہ ان کا حق تھا۔ انسان کے سامنے حضرت حکیم کا اسوہ بھی موجود ہے۔ وہ ایسے مال کو نہ لے جو اس کا حق نہ ہو، لیکن اگر کچھ ملنے کی توقع رکھنے کے بغیر کسی سے کچھ مل جائے تو اس کو قبول کر لینا مستحسن ہے۔

اگر کسی مال دار کو کوئی کچھ دے تو اس کو بھی چاہیے کہ وہ اس کا بدلہ دے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: جو تمھارے ساتھ اچھا کرے اس کو بدلہ دو۔ اگر تمھارے پاس اس کو دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو اس کے لیے اتنی دعا کرو کہ تمھیں یقین ہو جائے کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے۔ نیز یہ فرمانِ مصطفیٰ بھی ہے:

« اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى »[1] اوپر والا ہاتھ یعنی دینے والا، نیچے والے ہاتھ یعنی لینے والے سے بہتر ہے۔ واللہ أعلم[2]

متفرق سوالات

سوال کوہِ نابلس کی ایک بستی کی ایک جامع مسجد میں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نبی کی قبر ہے؟ وہاں کچھ سامری رہتے ہیں جو ہر رات قبر کو روشن کرتے ہیں۔ مسجد میں بھی داخل ہوتے ہیں اور عموماً نشے میں ہوتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ اگر ولیِ امر ان کو روکتا ہے تو اجر کا مستحق ہوگا؟

جواب الحمد للہ. ذمیوں کو مسلمانوں کی مساجد میں وہاں کسی قبر کی خدمت کے لیے داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ بالخصوص ذکر کردہ صورت میں، بلکہ ان کو روکنا ضروری ہے۔ اسی طرح قبروں کو مساجد بنانا اور ان پر چراغ جلانا ناجائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایسا کام کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔[3]

سائل کا کہنا کہ یہ اولادِ یعقوب میں سے کسی نبی کی قبر ہے، غیر مستند بات ہے، اس لیے اس کو بھی تمام مساجد کی طرح قرار دیا جائے اور اس جگہ کو اس طرح برابر کر دیا جائے کہ اس میں قبر کا نشان بھی باقی نہ رہے، واللہ أعلم۔[4]

سوال ایک شخص نے زکات نکالی، مگر اس کو کوئی مستحق نہ مل سکا اور وہ مال اس کے پاس پڑا رہا، تلف ہوگیا۔ کیا وہ اس کی ضمانت بھرے گا؟ نیز جب فقراء زکات وصول کر لیں تو کیا اس کو ان سے خریدنا جائز ہے؟

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳٦۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۳۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۹٤)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۲۳٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۲۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۰٤۳) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۲۲۵)

[4] جامع المسائل (۹/۳۳۳)

جواب اگر وہ زکات مستحق یا اس کے وکیل تک پہنچنے سے پہلے پہلے تلف ہوگئی تو وہ شخص اس کا ضامن ہوگا اور صاحبِ زکات کے لیے زکات نکال کر خریدنا جائز نہیں۔[1]

سوال کیا کوئی شخص اپنی ایسی محتاج اولاد کو زکات دے سکتا ہے جو اس کی سرپرستی میں نہ ہو؟

جواب اگر وہ زکات کے علاوہ اصلی مال سے ان پر خرچ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اصل مال سے خرچ کرے۔ اگر اصل مال خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ایسے شخص کے اپنی محتاج اولاد کو زکات دینے میں اختلاف ہے۔[2]

سوال کیا حجامہ اور فصد کھلوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اس مسئلے میں علما کا مشہور اختلاف ہے، تاہم بلاضرورت ایسا کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر کوئی انسان ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ اگر روزہ فرض ہے تو اس کی جگہ بعد میں روزہ رکھ لے۔[3]

سوال کیا جانور فروخت کرتے وقت اس کی کھال کا استثنا جائز ہے؟

جواب راجح قول کے مطابق جائز ہے۔ مالک اور احمد کا مذہب بھی یہی ہے اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ سے بھی یہ مروی ہے۔[4]

سوال ایک شخص نے روپوں میں ایک جانور خریدا، اس کے بعد اس کی قیمت بڑھ گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی اصل حرام تھی؟

جواب اگر اس کی اصل حرام تھی تو وہ اپنا اصل سرمایہ لے لے اور زائد قیمت کا صدقہ کر دے۔[5]

سوال کیا گائے کو گائے کے بدلے میں یا اون کو اون کے بدلے میں اضافے کے ساتھ بیچا جا سکتا ہے؟

جواب گائے کو گائے کے بدلے اضافے کے ساتھ بیچنا بالاتفاق جائز ہے، اگر نقد بنقد ہو۔ اگر ادھار ہو تو اختلاف ہے۔ اون کو اون کے بدلے میں اضافے کے ساتھ بیچنے سے متعلق دو اقوال ہیں اور ایسا نہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔[1]

سوال ایک کسان سے کسی آدمی نے کوئی معاملہ کیا، جب وہ اس سے مطالبہ کرتا تو کسان چونکہ تنگدست تھا، اس لیے وہ اس کو گائے بیچ دیتا اور وہ کم قیمت میں اس سے خرید لیتا، کیا یہ درست ہے؟

---

① جامع المسائل (٣٣٣/٩)
② جامع المسائل (٣٣٣/٩)
③ جامع المسائل (٣٣٤/٩)
④ جامع المسائل (٣٣٥/٩)
⑤ جامع المسائل (٣٣٥/٩)
⑥ جامع المسائل (٣٣٥/٩)

جواب یہ حرام ہے، بالخصوص کسان کے تنگدست ہونے کی صورت میں۔ اس کو خوش حال ہونے تک مہلت دینا ضروری ہے اور اس کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچانا جائز نہیں۔ واللہ أعلم[1]

سوال ایک عورت پر اس کے گھر والوں نے الزام لگایا اور اس کو مارا پیٹا، پھر محبوس کر دیا اور قتل کرنے کا ارادہ بنا لیا، کیا ان کو یہ اختیار حاصل ہے؟

جواب الحمد للہ. اگر انھیں یقین بھی ہو کہ اس نے بدکاری کی ہے، تب بھی وہ اس کو قتل کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، کیوں کہ امام یعنی حکمران اور اس کے نائب کے سوا کوئی دوسرا حدود قائم کرنے کا اختیار نہیں رکھتا، مگر وہ اس کو حفاظت اور نگرانی میں رکھیں۔ واللہ أعلم[2]

---

[1] جامع المسائل (۳۳٦/۹)

[2] جامع المسائل (۳٦۱/۹)

روزہ

شک کا روزہ اور ابر آلود دن میں روزہ رکھنے کا حکم

سوال کیا ابر آلود دن میں روزہ رکھنا فرض ہے یا نہیں؟ نیز کیا یہ اس شک کے روزے میں شمار ہوگا جو منع ہے؟

جواب جب چاند دیکھنے میں بادل یا غبار آلود دھواں حائل ہو تو اس دن احتیاطاً روزہ رکھ لینا چاہیے یا نہیں؟ اس مسئلے میں علما کے کئی اقوال ہیں:

ایک قول ہے کہ اس دن کا روزہ منع ہے۔ دوسرا قول ہے کہ اس دن روزہ رکھنا واجب ہے۔ تاہم امام احمد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کی پیروی میں ابر آلود دن میں روزہ رکھنا مستحب سمجھتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اسے لازمی قرار نہیں دیتے تھے، لیکن احتیاطاً ایسا کرتے تھے۔ یہی احتیاط حضرت عمر، علی، معاویہ، ابوہریرہ، عائشہ اور اسما رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

بہت سے صحابہ نہیں بھی رکھتے تھے اور حضرت عمار بن یاسر وغیرہ منع کرتے تھے۔ تیسرا قول ہے کہ اس دن روزہ رکھنا بھی جائز ہے اور نہ رکھنا بھی۔ یہ ابو حنیفہ کا مذہب ہے اور امام احمد سے جو صریح مذہب منقول ہے وہ یہی ہے، نیز اکثر صحابہ اور تابعین کا مذہب بھی یہی ہے۔

جس طرح کسی رکاوٹ کی وجہ سے آدمی کے سامنے طلوعِ فجر واضح نہ ہو رہا ہو تو اس وقت روزہ دار چاہے تو کھانا چھوڑ دے اور چاہے تو اس وقت تک کھاتا رہے جب تک اس کو طلوعِ فجر کا یقین نہ ہو جائے۔ اس طرح اگر آدمی کو شک ہو کہ معلوم نہیں اس کا وضو باقی ہے یا ٹوٹ چکا ہے تو وہ چاہے تو وضو کرے، چاہے تو نہ کرے۔

زکات کے مسئلے میں بھی یہی ہے کہ اگر زکات نکالنے والے کو یقین نہ ہو کہ سال پورا ہوا ہے یا نہیں یا شک ہو کہ اس پر سو روپیہ زکات فرض ہے یا ایک سو بیس تو وہ چاہے تو سو روپیہ دے دے اور چاہے تو زیادہ دے دے۔

اصولِ شریعت میں یہی ضابطہ ہے کہ احتیاط واجب بھی نہیں اور حرام بھی نہیں۔ لہٰذا اگر ابر آلود دن کا روزہ مطلق نیت سے رکھا جائے یا معلق نیت سے کہ اگر رمضان شروع ہو گیا تو وہ رمضان کا روزہ ہوگا، وگرنہ نہیں۔ حنفی مذہب میں کفایت کر جاتا ہے اور امام احمد سے منقول صحیح روایت کے مطابق بھی ہو جاتا ہے۔

تیسرا قول ہے کہ یہ اس وقت کفایت کرے گا جب یہ نیت ہو کہ وہ رمضان کا روزہ ہے، امام احمد سے ایک یہ روایت بھی ہے۔

اس مسئلے کی بنیاد اس ضابطے کے لیے ہے کہ آیا رمضان کے مہینے کے لیے نیت کی تعیین واجب ہے؟ اس مسئلے میں حنبلی مذہب میں تین اقوال ہیں:

① یہ کفایت نہیں کرتی، بجز اس کے کہ رمضان کی نیت ہو۔ اگر مطلق یا معلق نیت سے یا نفل یا نذر کی نیت سے روزہ رکھے تو شافعی مذہب کے مشہور قول اور حنبلی مذہب میں ایک روایت کے مطابق یہ نیت کفایت نہیں کرے گی۔

② حنفی مذہب کے مطابق یہ مطلق کفایت کر جائے گی۔

③ مطلق نیت سے کفایت کرے گی۔ رمضان کے سوا تعیین کی نیت کے ساتھ نہیں۔ یہ امام احمد سے تیسری روایت ہے۔ خرقی اور ابو البرکات نے اسے اختیار کیا ہے۔

لیکن مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ نیت علم کے تابع ہے۔ اگر معلوم ہو کہ کل رمضان کا دن ہو گا تو اس صورت میں تعیین ضروری ہے۔ اگر اس صورت میں کوئی شخص مطلق روزے یا نفل روزے کی نیت کرے تو یہ کفایت نہیں کرے گا، کیوں کہ اللہ نے اس کو اس کام کو ادا کرنے کی نیت اور قصد کرنے کا حکم دیا ہے جو اس پر فرض ہے اور وہ رمضان کا مہینا ہے جس کے روزے کی فرضیت معلوم ہے۔ اگر وہ شخص اس فرض کو ادا نہیں کرتا تو وہ اس سے بری الذمہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس کو علم ہی نہ ہو کہ کل رمضان کا دن ہے تو اس صورت میں تعیین کرنا ضروری نہیں۔ جو انسان عدمِ علم کے باوجود تعیین کرنے کو ضروری قرار دیتا ہے وہ دو متضادوں کو اکٹھا کرنا لازمی قرار دیتا ہے۔

امام احمد سے ایک روایت ہے کہ لوگ اس میں امام کی نیت کے تابع ہیں، یعنی روزہ رکھنا اور عید کرنا لوگوں کے علم کے حسبِ حال ہے، جس طرح سنن میں یہ حدیث بھی مروی ہے:

«صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُوْمُوْنَ، فِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُوْنَ، وَأَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّوْنَ» [1]

"تمھارا روزہ (رمضان کا روزہ) اس دن ہے جس دن تم روزہ رکھو۔ تمھاری عید الفطر اس دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور تمھاری عید الاضحیٰ اسی دن ہے جس دن تم عید اضحیٰ کرو۔"

"ہلال" کے متعلق بھی لوگوں کا اختلاف ہے کہ آیا آسمان میں طلوع ہونے والے کو ہلال کہتے ہیں، خواہ لوگ اس کو نہ بھی دیکھیں، یا ہلال صرف اس صورت میں کہا جاتا ہے جب وہ لوگوں کے سامنے آ جائے اور ان کو علم ہو جائے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٤)

اسی طرح یہ بھی اختلافی مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اکیلا شخص رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھنا اور عید الفطر کا چاند دیکھ کر عید الفطر منا سکتا ہے یا وہ لوگوں کے ساتھ ہی روزہ رکھے اور ان کے ساتھ ہی عید منائے، یا اپنی رؤیت کی بنیاد پر روزے کو شروع کر دے، لیکن عید لوگوں ہی کے ساتھ منائے۔

اگر کچھ شہروں میں چاند دیکھ لیا جائے تو کیا یہ سب کے لیے کافی ہو گا یا نہیں؟

کیا کچھ شہروں کی رؤیت سب شہروں کی رؤیت ہے؟ اس مسئلے میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ ابن عبدالبر نے اس میں اجماع نقل کیا ہے کہ جن شہروں کے مطالع میں اتفاق ممکن ہو، ان میں اختلاف ہے، اندلس اور خراسان جیسے علاحدہ علاحدہ مطالع کے حامل علاقوں میں یہ اختلاف معتبر نہیں۔

میری رائے کے مطابق امام احمد نے اس باب میں اس اعرابی کی حدیث پر اعتماد کیا ہے جس نے گواہی دی تھی کہ اس نے گزشتہ رات ہلال دیکھا تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اسی رؤیت پر اعتبار کرنے کا حکم دیا، حالانکہ وہ کسی دوسرے علاقے میں تھی اور یہ ممکن نہیں کہ اس دیہاتی کی رؤیت قصر کی مسافت سے زیادہ دوری سے تھی۔ آپ ﷺ نے اس سے تفصیل بھی طلب نہیں کی تھی۔ یہ استدلال ابن عبدالبر کی ذکر کردہ بات کے منافی نہیں، لیکن اس کی حد کیا ہے؟

جن علما کا کہنا ہے کہ ایک کی رؤیت سب کی رؤیت نہیں، یہ اکثر شافعیوں کا قول ہے۔ ان میں کچھ قصر کی مسافت کے ساتھ اس کی تعیین کرتے ہیں اور کچھ اختلافِ مطالع کے ساتھ، مثلاً: حجاز کا شام کے ساتھ اور عراق کا خراسان کے ساتھ اختلافِ مطالع، لیکن یہ دونوں باتیں ہی بودی ہیں، کیوں کہ مسافتِ قصر کا ہلال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک علاقائی اختلاف کی بات ہے تو اس کی تحدید کس طرح ہو گی؟ مزید برآں یہ دونوں باتیں دو وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں:

(1) رؤیت تشریق (مشرقی جانب) وتغریب (مغربی جانب) کے مختلف ہونے سے مختلف ہوتی ہے۔ جب چاند مشرق میں دیکھا جائے تو مغرب میں اس کا دیکھا جانا لازمی ہوتا ہے، لیکن اس کے عکس نہیں، کیوں کہ مشرق کی نسبت مغرب میں سورج تاخیر سے غروب ہوتا ہے۔ اگر (مشرق میں) اسے دیکھ لیا جائے تو مغرب میں اس کی روشنی زیادہ ہو جاتی ہے اور سورج کے غروب کے وقت وہ سورج اور اس کی شعاؤں سے دور ہو جاتا ہے، اس لیے اسے دیکھے جانے کا قوی امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر چاند مغرب میں دیکھا جائے تو اس طرح نہیں ہوتا، کیوں کہ اہلِ مغرب کے نزدیک سورج تاخیر سے غروب ہوتا ہے، اس لیے چاند روشنی اور دوری میں بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اگر مشرق میں غروب ہو تو ایسی صورت میں سورج کے قریب رہتا ہے۔

مزید برآں جب مغرب میں چاند دیکھ لیا جائے تو وہ اہلِ مشرق کے ہاں تو غروب ہو چکا ہوتا ہے۔ غروبِ آفتاب، ہلال اور تمام کواکب میں یہ بات مشاہدے پر مبنی ہے اس لیے جب مغرب میں مغرب کا وقت داخل ہو جاتا ہے تو مشرق میں بھی داخل ہو جاتا ہے، لیکن اس کے عکس نہیں ہوتا، اسی طرح طلوع کا معاملہ بھی ہے کہ جب مغرب میں سورج طلوع ہو تو مشرق میں بھی ہو جاتا ہے، لیکن اس کے عکس نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ کواکب کا طلوع و غروب مشرق میں پہلے ہوتا ہے، لیکن ہلال کا طلوع اور اس کی رؤیت مغرب سے پہلے ہوتی ہے، کیوں کہ وہ مغرب سے طلوع ہوتا ہے۔ آسمان میں اس کے سوا کوئی ایسا سیارہ نہیں جو مغرب سے طلوع ہوتا ہو، اس کے ظہور کا سبب سورج سے دور ہونا ہے، لہٰذا سورج جتنی تاخیر سے غروب ہوگا، چاند اتنا ہی اس سے دور ہو جائے گا۔

جن علما نے علاقوں کی دوری کا لحاظ رکھا ہے، ان کے پاس نہ کوئی شرعی دلیل ہے نہ حسی مشاہدتی۔

2 اگر مسافتِ قصر یا علاقوں کی حد متعین کی جائے تو پھر ایک وہ شخص جو آخری سرحدی علاقے یا مسافتِ سفر کے آخرے حصے میں ہو وہ تو روزہ رکھنے یا عید کرنے یا قربانی کرنے کا پابند ہو، لیکن وہ دوسرا شخص جو اس سے صرف ایک تیر پھینکنے کی دوری پر دوسرے علاقے کے پہلے سرحدی علاقے یا مسافتِ سفر کی حد سے باہر ہو وہ نہ روزہ رکھے نہ عید کرے!

مسلمانوں کے دین میں یہ بات نہیں۔

اس مسئلے میں جو درست رائے ہے، حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، وہ یہ ہے جو اس حدیث سے ماخوذ ہے: ''تمھارا روزہ اسی دن ہے جس دن تم روزہ رکھو، تمھاری عید الفطر اسی دن ہے جس دن تم عید الفطر مناؤ اور تمھاری عید الاضحیٰ بھی اسی دن ہے جس دن تم عید الاضحیٰ مناؤ۔'' اگر کوئی شخص تیسویں شعبان کی رات (انتیس شعبان) گواہی دے کہ اس نے کسی دور یا نزدیک کی جگہ میں چاند دیکھا ہے تو روزہ رکھنا فرض ہو جاتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے، عید الفطر اور عید قربان جیسے کئی شرعی احکام کو لفظِ ہلال (نیا چاند) اور لفظِ شہر (مہینا) کے ساتھ معلق کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۹]

''وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔''

اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ ﴿ اَهِلَّةِ ﴾ چاند لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت بتاتے ہیں۔

ایک جگہ فرمایا:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [البقرة: ۱۸۳۔۱۸۵]

''تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔ گنے ہوئے چند دنوں میں، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزے رکھو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

اس آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہرِ رمضان (ماہِ رمضان) کے روزے فرض کیے ہیں۔ اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ لیکن ہلال کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ کیا ہلال اس کا نام ہے جو آسمان میں ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ لوگوں کو اس کا علم نہ بھی ہو؟ اور کیا اسی کے ساتھ نیا مہینا شروع ہو جاتا ہے یا ہلال اس کا نام ہے جس کو لوگ دیکھ کر اعلان کر دیں اور شہر یعنی مہینا اس کا نام ہے جو لوگوں میں مشہور ہو جائے؟

اس بنیاد پر کچھ علما کہتے ہیں: جو اکیلا شخص چاند کو دیکھ لیتا ہے اس کے لیے رمضان کا مہینا اور روزے کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور وہ رات حقیقت میں رمضان کی رات ہوتی ہے، خواہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔

دوسری رائے کے مطابق ہلال کے ہلال اور ماہِ رمضان کے ماہ ہونے کے لیے شرط ہے کہ وہ لوگوں میں مشہور ہو جائے اور لوگ چاند دیکھنے کا اعلان کریں، خواہ اس کو دس لوگ دیکھ لیں، لیکن وہ عام اہلِ شہر کے ہاں مشہور نہ ہوا ہو، وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہ سارے کام کریں۔

یہاں ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے: جو یہ کہتا ہے کہ کیا رؤیت کی تعیین میں علمِ نجوم یا فلکیات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ صحیح سنت اور صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے کہ نجوم کے حساب پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہم اُمی لوگ ہیں، لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔''[1] ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی عید الفطر مناؤ۔''[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۱٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۸۰)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۱۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۸۰)

ہلال کے سلسلے میں حساب پر اعتماد کرنے والا شخص شریعت میں گمراہ، دین میں بدعتی اور عقل اور علمِ حساب میں غلط ہے۔ ماہرینِ فلکیات جانتے ہیں کہ رؤیت کسی حسابی کلیے کے ساتھ طے نہیں کی جا سکتی۔ حساب سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ غروبِ آفتاب کے وقت ہلال اور سورج میں کتنے درجے کا فاصلہ ہے، لیکن رؤیت کچھ محدود اور متعین درجات کے ساتھ منضبط نہیں، یہ نظر کی تیزی اور کمزوری کے فرق سے، جس جگہ سے مشاہدہ کیا جاتا ہے اس کی بلندی اور پستی کے لحاظ سے اور مطلع صاف یا ابر آلود ہونے کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس کو آٹھ درجات سے دیکھ لیتے ہیں، لیکن کچھ بارہ درجات سے بھی نہیں دیکھ پاتے، اس لیے اہلِ حساب کا رؤیت کے پیمانے میں سخت اختلاف اور اضطراب ہے۔ بطلیموس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا، کیوں کہ اس پر حسابی دلیل قائم نہیں۔ کوشیار دیلمی جیسے متاخرینِ ریاضیات نے جب دیکھا کہ شریعت نے کئی احکام ہلال کے تابع کیے ہیں تو انھوں نے حساب کے ذریعے رؤیت کا مسئلہ منضبط کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کارگر ثابت نہیں ہو سکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایسی چیز کو حسابی کلیوں کا پابند کرنے کی کوشش کی ہے جو حساب سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ ملخصاً، واللہ أعلم[1]

اکیلے کی رؤیت کا حکم

سوال ایک شخص نے اکیلے ہی چاند دیکھا اور رؤیت ثابت ہوگئی، کیا وہ اکیلا ہی روزہ رکھے یا اکیلا ہی عید الفطر کرے یا جمہور، یعنی تمام لوگوں کے ساتھ رہے؟

جواب الحمد للہ. اگر کوئی شخص اکیلا ہی رمضان کا چاند یا شوال کا چاند دیکھے تو کیا وہ اپنی ذاتی رؤیت کی بنیاد پر روزہ رکھ سکتا یا فطر کر سکتا ہے یا لوگوں کے ساتھ ہی روزہ رکھے اور ان کے ساتھ ہی عید کرے؟ یہ تین اقوال ہیں اور امام احمد سے یہ تینوں ہی روایات مروی ہیں:

1. وہ روزہ رکھے مگر سراً فطر کرے، یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔
2. روزہ تو رکھے مگر فطر لوگوں کے ساتھ ہی کرے۔ یہ احمد، مالک اور ابو حنیفہ کا مشہور مذہب ہے۔
3. لوگوں کے ساتھ ہی روزہ رکھے اور ان کے ساتھ ہی فطر کرے۔ یہ تمام اقوال سے زیادہ واضح اور ظاہر قول ہے۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۹۸/۲۵)

«صَومُكُمْ يَوْمَ تَصُومُونَ وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُونَ وَأَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّونَ » (رواه الترمذي، وقال حسن غريب، رواه أبو داود و ابن ماجه)[1]

"جس دن تم روزہ رکھو، اس دن تمھارا روزہ ہے، جس دن تم فطر کرو اس دن تمھاری عید فطر ہے اور جس دن تم عید الاضحیٰ کرو اس دن تمھاری عید اضحیٰ ہے۔"

ترمذی کی حدیث میں صوم، فطر اور اضحیٰ کا ذکر ہے۔ ابن ماجہ و ابو داود میں صرف فطر اور اضحیٰ کا ذکر ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اہلِ علم نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ اس سے مراد لوگوں کے ساتھ روزہ رکھنا اور ان کے ساتھ ہی فطر کرنا ہے۔ ابو داود نے ایک اور سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "تمھاری فطر اس دن ہے جس دن تم فطر کرو، تمھاری اضحیٰ اس دن ہے جس دن تم اضحیٰ کرو، پورا عرفات موقف ہے۔ پورا منیٰ جائے قربانی ہے۔ مکے کے ہر راستے پر قربانی ہو جاتی ہے اور سارا مزدلفہ موقف ہے۔"[2]

مزید یہ کہ گو اس نے ہلال (چاند) دیکھا مگر وہ مشہور نہیں ہوا۔ ہلال کہتے ہی اس کو ہیں جس سے مہینے کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہلال کو لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات بنایا ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب لوگ اس کے ذریعے مہینے کا آغاز کریں اور مہینا واضح ہو، چاہے وہ ہلال اور شہر (مہینا) نہ ہی ہو۔

اس مسئلے کی اصلیت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے، فطر اور قربانی جیسے بہت سے شرعی احکام لفظِ ہلال اور شہر (مہینا) کے ساتھ معلق کیے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ ﴾ [البقرة: ١٨٩]

"وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ "أهلة" (چاند) لوگوں اور حج کے لیے مواقیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٤)

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝١٨٣
أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ
يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝١٨٤ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ ﴾ [البقرة: ۱۸۳۔۱۸۵]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔ گنے ہوئے چند دنوں میں، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم رکھو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔ رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شہر رمضان، یعنی ماہِ رمضان کے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے، لیکن جس بات میں اختلاف ہوا ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہلال اس کا نام ہے جو آسمان میں ظاہر ہو، چاہے لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکے، اس کے طلوع ہوتے ہی مہینا شروع ہو جائے گا یا ہلال اس کا نام ہے جسے لوگ دیکھ کر مہینے کا آغاز کریں اور شہر (مہینا) وہ ہے جو ان میں مشہور ہو جائے؟ یہ دو اقوال ہیں، پہلے قول کے قائل کے نزدیک جو اکیلا ہی چاند دیکھ لے اس کے لیے روزے کا وقت اور رمضان کا مہینا شروع ہو جاتا ہے اور وہ رات اس کے لیے حقیقت میں رمضان کی رات ہے، چاہے دوسروں کو اس کا علم نہ ہو سکے۔

جس نے اسے نہیں دیکھا، جب اس کے لیے واضح ہو جائے کہ واقعی چاند طلوع ہو چکا تھا تو وہ روزے کی قضا دے۔ شہرِ فطر اور شہرِ نحر (عید قربان) میں یہی قیاس ہے، لیکن شہرِ نحر سے متعلق میرے علم میں کوئی ایسی بات نہیں کہ کسی نے کہا ہو کہ جو اسے دیکھ لے وہ باقی سب حاجیوں کو چھوڑ کر اکیلا ہی عرفات میں وقوف کرے، دوسرے دن قربانی کرے، جمرہ عقبہ کو مارے اور احرام کھول دے۔

فطر میں البتہ اختلاف ہے۔ اکثر نے اسے نحر کے ساتھ ملحق کیا ہے اور کہا ہے کہ اکیلا فطر نہ کرے، بلکہ لوگوں کے ساتھ ہی کرے۔ کچھ کا موقف ہے کہ فطر بھی روزے کی طرح ہے، کیوں کہ اللہ نے کسی بندے کو بھی اکتیس دنوں تک روزہ رکھنے کا حکم نہیں دیا۔ ان اقوال میں تناقض اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس میں بھی صحیح رائے وہی ہے جس میں اسے ذی الحجہ کی طرح قرار دیا گیا ہے۔

اس بنا پر اس کے ہلال یا شہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ لوگوں میں معروف ہو جائے اور لوگ اس کے ساتھ

نئے چاند اور نئے مہینے کا آغاز کریں، خواہ دس لوگ ہی دیکھ لیں، مگر وہ کسی وجہ سے عمومی شہریوں میں مشہور نہ ہو سکے، مثلاً ان کی شہادت مردود ہو، یا وہ اس کی گواہی ہی نہ دیں تو ان کا حکم تمام مسلمانوں کا حکم ہوگا، جس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی وقوفِ عرفہ کریں گے، ان کے ساتھ ہی قربانی کریں گے اور ان کے ساتھ ہی نمازِ عید پڑھیں گے، اسی طرح روزہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ہی رکھیں گے۔ یہ اس حدیث کا معنی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا روزہ اس دن ہے جس دن تم روزہ رکھو، تمھاری فطر اس دن ہے جس دن تم فطر کرو اور تمھاری اضحیٰ اس دن ہے جس دن تم اضحیٰ کرو۔''[1] اس لیے امام احمد سے ایک روایت میں منقول ہے: ''مطلع ابر آلود ہو کہ صاف امام اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ ہی روزہ رکھے۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔''

اس بنیاد پر شہر کے احکام متفرق ہو جاتے ہیں کہ کیا وہ تمام شہریوں کے لیے شہر (مہینا) ہے یا سب کے حق میں نہیں؟ یہ آیت اس کو بیان کرتی ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''تو تم میں سے جو اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس کا روزہ رکھے۔''

یہاں اس کو روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے جو شہر رمضان کو پالے اور پا لینا اسی شہر کے لیے ہوگا جو لوگوں کے درمیان مشہور ہو جائے، تاکہ اس کے پا لینے اور اس کو نہ پانے کا تصور واضح ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: ''جب تم اسے دیکھو تو روزہ رکھو، جب دیکھو تو فطر کرو اور چاند سے چاند تک روزہ رکھو۔''[2] جماعت کو خطاب ہے، لیکن جو شخص کسی ایسی جگہ ہو، جہاں اس کے علاوہ کوئی اور نہ ہو، وہ جب چاند دیکھ لے تو روزہ رکھ لے، کیوں کہ وہاں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ اسی بنیاد پر اگر وہ افطار (فطر) کر لے پھر کسی دوسری جگہ رؤیت ثابت ہو جائے یا نصف النہار ثابت ہو جائے تو اس پر قضا فرض نہیں۔ یہ امام احمد سے ایک روایت ہے۔

لوگوں کے حق میں شہر اسی وقت ہوگا جب وہ ظاہر ہو اور مشہور ہو جائے اور اس وقت سے امساک (کھانا پینا ترک کر دینا) لازمی ہو جائے گا، اہلِ عاشورا کی طرح جنھیں دن کے دوران میں روزے کا حکم دیا گیا اور صحیح مذہب کے مطابق انھیں قضا کا حکم نہیں دیا گیا تھا، قضا کی حدیث ضعیف ہے۔ واللہ أعلم[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٠، ١٠٨١)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٥/١١٩-١١٤)

حاکم شہر کے ہاں رؤیت کا عدمِ ثبوت مگر چند لوگوں کے ہاں رؤیت کا ثبوت

سوال کچھ شہریوں نے ذوالحجہ کا چاند دیکھا، لیکن حاکمِ شہر کے ہاں رؤیت ثابت نہ ہوسکی تو کیا وہ اس دن روزہ رکھیں گے جو بظاہر نواں ہے، گو بباطن دسواں ہو؟

جواب ہاں وہ جماعت کے ہاں ظاہر ومعروف نویں دن کا روزہ رکھیں گے، گو حقیقت میں وہ دسواں ہو، چاہے اس رؤیت کا ثبوت فرض کرلیا جائے۔ سنن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُومُونَ، وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُونَ، وَأَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّونَ» (أخرجه أبو داود وابن ماجه والترمذي وصححه)[1]

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فطر اس دن ہے جس دن لوگ فطر منائیں اور اضحیٰ اس دن ہے جس دن لوگ اضحیٰ منائیں۔'' (رواہ الترمذي)[2] مسلمانوں کے تمام ائمہ کے ہاں اسی پر عمل ہے۔

اگر لوگ دسویں ذوالحجہ کو غلطی سے عرفات میں وقوف کریں تو یہ وقوف بالاتفاق کفایت کر جائے گا۔ وہ دن ان کے حق میں عرفات کا دن ہی ہوگا۔ اگر غلطی سے آٹھ ذوالحجہ کو وقوف کرلیں تو اس کے کفایت کرنے میں اختلاف ہے، نیز وقوف کا صحیح ہونا ہی زیادہ ظاہر ہے۔ یہ مالک اور احمد وغیرہ کے مذہب میں ایک قول ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''عرفہ وہ دن ہے جس کو لوگ عرفہ سمجھیں۔''[3] اس کی اصل اور اساس یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم کو ہلال (چاند) اور شہر (مہینا) کے ساتھ معلق کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ ﴾ [البقرة: ١٨٩]

''وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں۔''

ہلال اس کا نام ہے جس سے مہینے کا آغاز اور اعلان و اظہار کیا جائے۔ اگر چاند آسمان میں طلوع ہو چکا ہو، لیکن لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکے اور اس سے آغاز نہ کریں تو وہ ہلال نہیں۔ اسی طرح شہر (مہینا) شہرت سے ماخوذ ہے۔ اگر وہ لوگوں میں مشہور نہ ہو سکے تو مہینا شروع نہیں ہوا ہوگا۔ اس جیسے مسئلے میں اس گمان کی بنا پر اکثر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٦٠) صحيح الجامع (٣٨٠٧، ٤٢٢٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٠٢)

[3] سنن الدارقطني (٢/٢٢٣، ٢٢٤) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/١٧٦) السلسلة الضعيفة (٣٨٦٣)

لوگ مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اگر چاند آسمان میں طلوع ہو چکا ہوتو وہ رات مہینے کی پہلی رات شمار کی جائے گی، خواہ لوگوں کے سامنے وہ ظاہر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور خواہ وہ اس سے مہینے کا آغاز کریں یا نہ کریں، حالانکہ ایسا نہیں، اس کا لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا اور لوگوں کا اس سے آغاز کرنا ازبس ضروری ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُومُونَ، وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُونَ، وَأَضْحَاكُمْ يَوْمَ تُضَحُّونَ»

یعنی یہ وہ دن ہے جس کے بارے میں تم کو علم ہے کہ وہ روزے، فطر اور اضحیٰ کا وقت ہے۔ اگر تمھیں اس کا علم نہ ہوتو اس پر حکم مرتب نہیں ہوتا۔ جس روزے میں شک ہو کہ وہ نویں ذوالحجہ کا ہے یا دسویں ذوالحجہ کا وہ بلا اختلاف جائز ہے، کیوں کہ اصل دسویں کا نہ ہونا ہے۔ جس طرح رمضان کی تیسویں رات لوگ چاند کے نکلنے یا نہ نکلنے میں شک کریں تو وہ بالاتفاق اس مشکوک دن کا روزہ رکھیں گے۔ شک کے جس دن میں کراہت منقول ہے وہ رمضان کا پہلا دن ہے، جس میں شک ہو، کیوں کہ شعبان کا باقی ہونا اصل ہے۔

اس باب میں یہ دو مسائل مشتبہ ہوتے ہیں:

1. اگر کوئی شخص اکیلا شوال کا چاند دیکھے یا اس کو کچھ لوگ بتائیں اور اس کو ان کے سچا ہونے کا یقین ہوتو کیا وہ فطر کرے یا نہیں؟
2. اگر کوئی شخص ذوالحجہ کا چاند دیکھے یا اس کو کچھ لوگ بتائیں اور اس کو ان کے سچا ہونے کا یقین ہو، کیا اس کے لیے اس رؤیت کے مطابق جو لوگوں میں مشہور نہیں ہوئی، نویں تاریخ کو یومِ عرفہ اور دسویں تاریخ کو یومِ نحر ہو گا یا وہ نویں اور دسویں تاریخ جو لوگوں کے ہاں مشہور ہو؟

پہلے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ اگر کوئی اکیلا شوال کا چاند دیکھ لے تو وہ بالاتفاق علانیہ روزہ نہ چھوڑے۔ اگر بیماری یا سفر کی طرح کا کوئی عذر ہو، جس میں روزہ کھولنا جائز ہوتا ہے تو الگ بات ہے، لیکن کیا وہ اندرونِ خانہ روزہ کھول سکتا ہے یا نہیں؟ علما کے دو اقوال ہیں، لیکن صحیح قول کے مطابق اندرونِ خانہ بھی اس کو روزہ نہیں کھولنا چاہیے۔ یہ امام مالک اور احمد کا مشہور مذہب ہے۔

حنفیہ اور شافعیہ کے مشہور قول کے مطابق وہ اندرونِ خانہ روزہ کھول سکتا ہے۔ ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں دو لوگوں نے شوال کا چاند دیکھا، ایک نے روزہ نہ رکھا اور دوسرے نے رکھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے روزہ نہ رکھنے والے سے کہا: ''اگر تیرا ساتھی نہ ہوتا تو میں تجھ کو اتنا مارتا کہ تو درد محسوس کرتا۔''

اس کا سبب یہ ہے کہ فطر کا دن وہ ہوتا ہے جس دن لوگ روزہ نہ رکھیں اور عید کریں، جس دن کسی شخص نے اپنی رؤیت کی بنا پر روزہ رکھا یہ وہ عید کا دن نہیں جس دن روزہ رکھنا منع ہے۔ آپ ﷺ نے فطر اور قربانی کے دن

روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«أَمَّا أَحَدُهُمَا فَيَوْمُ فِطْرِكُمْ مِنْ صَوْمِكُمْ، وَأَمَّا الآخَرُ فَيَوْمٌ تَأْكُلُونَ مِنْ نُسُكِكُمْ »[1]

''ایک دن وہ ہے جس دن تم اپنے روزے سے فارغ ہوتے ہو اور دوسرا دن وہ ہے جس میں تم اپنی قربانیوں کا گوشت کھاتے ہو۔''

تو جس دن کے روزے سے آنحضرت ﷺ نے منع کیا ہے یہ وہ دن ہے جس میں لوگ روزے سے فارغ ہو کر عید مناتے ہیں اور جس دن مسلمان قربانیاں کرتے ہیں۔

یہ دوسرے مسئلے میں واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اکیلے ذوالحج کا چاند دیکھا تو وہ لوگوں سے پہلے اس دن وقوف نہیں کر سکتا جو بظاہر آٹھواں دن ہوتا ہے، گو وہ اس کی رؤیت کے مطابق نواں ہی ہو، کیوں کہ آدمی کے اکیلے ہی وقوف اور قربانی کرنے میں بھی جماعت کی وہی مخالفت ہے جو اظہارِ فطر میں ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ جو خود چاند دیکھ لیتا ہے یا اس کو دو ثقہ اور قابلِ اعتماد آدمی رؤیت کی گواہی دیتے ہیں، اس کے لیے نویں کا روزہ، درآں حالیکہ وہ اس کے مطابق دسواں دن ہو اور وہ عام لوگوں کے ہاں معروف نہ ہوا ہو مگر بباطن رؤیت کے مطابق دسواں ہو تو اس مسئلے کی تخریج ذکر کردہ صورت کے مطابق ہوگی۔ یعنی اگر کسی نے شوال کا چاند دیکھ لیا مگر وہ بظاہر رؤیت کے مطابق رمضان کا تیسواں دن ہے تو اس حالت میں جو علما پس پردہ فطر کا حکم نہیں دیتے، ان کے نزدیک ذوالحجہ کی اس تاریخ کا روزہ رکھنا جائز اور مستحب ہے، کیوں کہ یہ یومِ عرفہ ہے، جس طرح وہ دن رمضان کا ہے۔ یہی صحیح رائے ہے جو کتاب وسنت اور صحیح قیاس سے ثابت ہوتی ہے۔ جو علما پہلی صورت میں ذاتی رؤیت کی وجہ سے پسِ پردہ فطر کا حکم دیتے ہیں وہ ذوالحجہ کے اس دن کے روزے سے منع کرتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ رؤیتِ ہلال کا ذمے دار اپنی ذمے داری میں غفلت برتتے ہوئے، دو عادل گواہوں کی گواہی رد کر دیتا ہے، یا ان کی عدالت کی تحقیق میں کوتاہی سے کام لیتا ہے، یا ذاتی عداوت یا دیگر غیر شرعی وجوہ یا ماہرینِ فلکیات پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی گواہی قبول نہیں کرتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو حکم ثابت ہو جائے اس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ رؤیتِ ہلال کا ذمے دار اجتہاد میں درست فیصلے تک پہنچا ہے یا اُس نے غلطی کھائی ہے، یا وہ کوتاہی کرتا ہے، کیوں کہ لوگوں کی کوششِ بسیار کے باوجود ہلال ظاہر اور مشہور نہیں ہوا۔ ذمے داران کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٧)

«يُصَلُّونَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصَابُوا فَلَكُمْ وَلَهُمْ، وَإِنْ أَخْطَئُوا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ»[1]

''وہ تمھیں نماز پڑھاتے ہیں، اگر وہ درست طریقے سے پڑھیں تو وہ تمھارے لیے بھی ہے اور ان کے لیے بھی۔ اگر غلطی کریں تو وہ تمھارے لیے ہے اور ان کے خلاف۔''

یعنی اس کی غلطی اور تفریط اسی کے سر ہے، ان مسلمانوں کے سر نہیں جنھوں نے غلطی کی نہ تفریط کی۔ نجوم اور فلکیات پر اعتماد نہ کرنا ہی صحیح احادیث اور اجماعِ صحابہ سے ثابت ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ»[2]

''ہم لکھنے پڑھنے اور حساب سے ناآشنا ہیں، چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ چھوڑ دو۔''

رؤیتِ ہلال کے معاملے میں صرف فلکیاتی حساب پر اعتماد کرنے والا شریعت میں گمراہ، دین میں بدعت کا موجد اور عقل اور علمِ حساب کی روشنی میں غلط ہے۔ ماہرینِ فلکیات اچھی طرح جانتے ہیں کہ رؤیت حساب سے منضبط نہیں ہوتی۔ حساب اگر درست ہو تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہوسکتا ہے کہ غروب کے وقت چاند سورج سے کتنے درجے دور ہے، لیکن رؤیت ان محدود و متعین درجات کے ساتھ منضبط نہیں ہوتی۔ یہ نظر کی تیزی و کمزوری، جس جگہ سے چاند دیکھا جا رہا ہو، اس کی بلندی و پستی اور موسم کے صاف و غبار آلود ہونے کے لحاظ سے مختلف ہو جاتی ہے۔ کوئی اسے آٹھ درجے دور دیکھتا ہے تو کوئی بارہ درجے، اس لیے ماہرینِ فلکیات قوسِ رؤیت (crescent width) میں بھی شدید اختلاف کے شکار ہیں۔ بطلیموس جیسے امامِ فن نے اس میں کوئی حرف نہیں لکھا، کیوں کہ اس کی کوئی حسابی دلیل نہیں۔

کوشیار دیلمی جیسے بعض متاخرین نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ شریعت نے بہت سے احکام ہلال کے ساتھ معلق کیے ہیں تو یہ رائے دی کہ حسابی طریقے سے رؤیت منضبط کی جا سکتی ہے، لیکن یہ کوئی صحیح اور معقول طریقہ نہیں، بلکہ تجربے سے اس کا بہت زیادہ غلط ہونا ثابت ہے۔ پھر اس سے رؤیت کے ثابت ہونے اور نہ ہونے میں بھی ان کا اختلاف رہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس چیز کو حساب کے ذریعے ضبط کرنے کی کوشش کی ہے جو حساب کے ذریعے معلوم ہی نہیں ہوسکتی، اس لیے انھوں نے راہ ہی غلط چنی ہے۔ میں نے اس پر تفصیلی گفتگو کسی دوسری جگہ کی ہے اور وہاں ثابت کیا ہے جو صحیح شریعت نے پیش کیا ہے۔ صریح عقل اس سے اتفاق کرتی ہے۔ میں نے دن کی تعریف پر بھی بحث کی اور ثابت کیا ہے کہ اس کو حساب کے ذریعے منضبط نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ دن اوپر کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٠)

چڑھتے ہوئے بخارات کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا جس نے عشا کے حصے کو فجر کے حصے سے لینا چاہا ہے، اس کی بات درست ہوتی اگر روشنی کے ظہور اور خفا کا سبب محض افق کے مقابل ہونا ہوتا جو حساب سے معلوم ہو سکتا ہے۔

اگر اس میں بخارات کی تاثیر ہے تو بخار گرمی اور خشک زمین کی نسبت سردی اور مرطوب زمین میں زیادہ ہوتا ہے جو حساب کے ذریعے منضبط نہیں ہو سکتا۔ اس طرح حسابی قیاس کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ اس لیے سردیوں کے موسم میں فجر کا حصہ، گرمیوں کے موسم سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو صرف حسابی قیاس سے کام لیتا ہے، اس کے لیے یہ معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کے نزدیک فجر کا حصہ دن کے تابع ہے۔ اس کی تفصیل اپنی جگہ گزر چکی ہے۔ واللہ أعلم

عام مسافر اور پیشہ ور مسافر کے لیے روزے کا حکم

سوال رمضان میں مسافر کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے یا روزہ چھوڑنا؟ مسافتِ قصر کیا ہے؟ نیز نیکی کے سفر اور نافرمانی کے سفر میں کیا فرق ہے؟ اسی طرح جو شخص ڈرائیور ہو اور سفر اس کا پیشہ ہو، کیا وہ بھی روزہ چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. روزہ چھوڑنا مسافر کے لیے بالاتفاق جائز ہے، چاہے وہ حج کا سفر ہو، جہاد کا، تجارت کا یا اس طرح کا کوئی بھی سفر ہو، جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ناپسند نہیں کیا۔

نافرمانی کے سفر میں اختلاف ہے، مثلاً ایک شخص رہزنی کے لیے سفر کرتا ہے تو کیا وہ بھی روزہ چھوڑ سکتا ہے یا نہیں؟ یا نماز قصر کر سکتا ہے یا نہیں؟

وہ سفر جس میں نماز قصر کرنا جائز ہو، اس میں روزہ چھوڑنا اور بعد میں قضا دینا بالاتفاق جائز ہے۔ ساری امت کا اتفاق ہے کہ مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہے، چاہے وہ روزہ رکھنے پر قادر ہو یا نہ ہو، اس پر روزہ گراں ہو یا نہ ہو، یعنی اگر اس کے پاس سفر میں سائے، پانی اور خادم کا انتظام بھی ہو تو بھی اس صورت میں، قصر بھی جائز ہے اور روزہ چھوڑنا بھی۔

اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ایسی صورت میں روزہ نہیں چھوڑنا چاہیے تو اس کی یہ بات کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔

اسی طرح مسافر کے لیے یہ سنت ہے کہ وہ چار رکعات والی نماز کی دو رکعات پڑھے۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک مسافر کے لیے چار رکعات پوری پڑھنے کی نسبت قصر کرنا افضل ہے۔

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۰۲-۲۰۸)

مسافر کے لیے روزہ چھوڑنے کے جواز میں امت کا کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف مسافر کے لیے روزہ رکھنے کے جواز میں ہے۔

سلف و خلف کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ سفر میں روزہ رکھنے والا شخص حضر میں روزہ چھوڑنے والے کی طرح ہے۔ اگر وہ روزہ رکھے بھی تو وہ اس کو کفایت نہیں کرے گا، بلکہ اس کو قضا ہی دینی ہوگی۔ یہ عبدالرحمان بن عوف، ابو ہریرہ اور دیگر اسلاف سے مروی ہے اور اہلِ ظاہر کا مذہب بھی یہی ہے۔

صحیحین میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ»[1] ''سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔''

تاہم ائمہ اربعہ کا مذہب ہے کہ مسافر کے لیے روزہ رکھنا بھی جائز ہے اور نہ رکھنا بھی، کیوں کہ صحیحین ہی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''ہم رمضان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے۔ ہم میں سے کچھ روزے سے ہوتے اور کچھ روزے کے بغیر، نہ روزے دار بے روز کو طعنہ دیتا نہ بے روز روزے دار کو۔''[2] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''اور جو بیمار ہو یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے۔ اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

مسند میں یہ حدیثِ مصطفیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں کہ اس کی رخصتوں کو لیا جائے، جس طرح یہ ناپسند کرتے ہیں کہ اس کی معصیت پر عمل نہ کیا جائے۔''[3]

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں بہت زیادہ روزے رکھتا ہوں۔ کیا میں سفر میں بھی روزہ رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو نہ رکھے تو بہتر ہے اور اگر رکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔''[4]

ایک دوسری حدیث میں ہے: «خِيَارُكُمُ الَّذِينَ فِي السَّفَرِ يَقْصُرُونَ وَيُفْطِرُونَ»[5] ''تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو سفر میں نماز قصر کرتے ہیں اور روزہ چھوڑتے ہیں۔'' جہاں تک یہ سوال ہے کہ قصر اور روزہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٦)

[3] مسند أحمد (١٠٨/٢) صحيح ابن حبان (٤٥١/٦) صحيح الجامع (١٨٨٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢١)

[5] مصنف عبد الرزاق (٥٦٦/٢) ضعيف الجامع (٢٨٧٢)

چھوڑنے کے لیے مسافت سفر کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے: ''دو دن میں جتنا پیدل اور اونٹ پر سفر کیا جا سکتا ہے، یہ قصر کی مسافت ہے جو سولہ فرسخ بنتے ہیں، جس طرح مکہ اور عسفان اور مکہ اور جدہ کے درمیان فاصلہ ہے۔''

ابو حنیفہ کا قول ہے: تین دن کی مسافت۔ سلف اور خلف کے ایک گروہ کا کہنا ہے: دو دن سے کم مسافت میں بھی نماز قصر کی جا سکتی ہے اور روزہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ قول زیادہ قوی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے تو عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں بھی قصر کرنا ثابت ہے۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں اہلِ مکہ بھی تھے اور دوسرے بھی، آپ ﷺ نے کسی کو نماز پوری کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر کوئی شخص دن کے دوران میں سفر کرے تو کیا اس کے لیے روزہ چھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں، جن میں جواز کا قول زیادہ واضح اور راجح ہے، کیوں کہ کتبِ احادیث میں موجود ہے کہ کچھ صحابہ کا عمل یہ تھا کہ جب وہ دن میں سفر کے لیے نکلتے تو روزہ چھوڑ دیتے اور اس کو رسول اللہ ﷺ کی سنت بتاتے، بلکہ صحیح بخاری میں خود رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے سفر میں روزے کی نیت کی، پھر پانی منگوایا اور لوگوں کی موجودگی میں روزہ کھول دیا۔[1]

دوسرے دن وہ بلاشبہہ روزہ چھوڑ دے۔ اگر اس کے سفر کی مقدار جمہور ائمہ اور امت کے مذہب کے مطابق دو دن کی مسافت ہو۔

اگر مسافر دن کے دوران میں واپس آ جائے تو کیا وہ شام تک کھانا پینا موقوف کر دے؟ اس مسئلے میں علما کا مشہور اختلاف ہے، لیکن وہ موقوف رکھے یا نہ رکھے، اس کو قضا دینا ہی ہوگی۔

سفر کرنا جس شخص کا معمول ہو، اگر اس کا کوئی ایسا علاقہ ہو جس میں اس کا ٹھکانا ہو تو وہ روزہ چھوڑ سکتا ہے، مثلاً وہ تاجر جو ساز و سامان لاتا ہو، وہ شخص جو اپنے جانور وغیرہ کرائے پر دیتا ہو، ڈاکیا جو مسلمانوں کے مفادات کے لیے سفر کرتا ہے، اسی طرح ملاح جس کا زمین پر کہیں گھر ہو، لیکن وہ شخص جس کے ساتھ بحری جہاز میں اس کی بیوی اور تمام لوازماتِ گھر موجود ہوں اور وہ سفر کرتا ہو تو یہ قصر کرے نہ روزے چھوڑے۔ وہ خانہ بدوش جو سردیاں ایک جگہ گزارتے ہیں اور گرمیاں دوسری جگہ، یہ لوگ اپنے سفر کے دوران میں تو قصر کریں گے اور روزہ بھی چھوڑ دیں گے، لیکن جب اپنی جگہ پڑاؤ ڈال لیں تو اس وقت قصر نہیں کریں گے اور روزہ بھی نہیں چھوڑیں گے، اگرچہ وہ اپنے جانوروں کے لیے چراگاہیں تلاش کرتے رہیں، واللہ أعلم۔[2]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨٤٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١١٣، ١١١٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٥/٢٠٩۔٢١٣)

آرام دہ سفر میں روزے کا حکم

سوال اگر کوئی شخص رمضان میں میں سفر کرے اور دورانِ سفر میں بھوک، پیاس اور تھکاوٹ محسوس نہ کرے تو اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے یا روزہ چھوڑنا؟

جواب مسافر بالاتفاق روزہ چھوڑ سکتا ہے، خواہ وہ کوئی مشقت محسوس نہ کرے، اس کے لیے روزہ چھوڑنا ہی افضل ہے، لیکن اگر روزہ رکھ لے تو اکثر فقہا کے نزدیک جائز ہے۔[1]

صبح کی اذان کے بعد سحری کھانے والے کا حکم

سوال اگر کوئی شخص رمضان صبح کی اذان کے بعد کھائے تو اس کے روزے کا کیا حکم ہے؟

جواب اگر موذن طلوعِ فجر سے پہلے اذان دیتا ہو، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ طلوعِ فجر سے پہلے اذان دیتے تھے اور جس طرح آج کل دمشق اور دیگر شہروں میں بھی موذن طلوعِ فجر سے پہلے اذان دیتے ہیں تو اس صورت میں اذان کے بعد بھی کچھ دیر تک کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر آدمی کو طلوعِ فجر میں شک ہو تو وہ اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک طلوع واضح نہ ہو جائے۔ اگر اس کو بعد میں پتا چلے کہ وہ طلوعِ فجر کے بعد تک کھاتا رہا ہے تو کیا اس دن کی قضا دے یا نہ دے؟ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ تاہم ظاہر یہی ہے کہ اس پر قضا نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی ثابت ہے اور سلف و خلف کی ایک جماعت کا موقف بھی یہی ہے، لیکن فقہائے اربعہ کے مذہب میں قضا ہی مشہور ہے، واللہ أعلم۔[2]

روزے توڑنے والے کا حکم

سوال کن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے اور کن چیزوں سے نہیں ٹوٹتا؟

جواب اس کی دو اقسام ہیں: ایک تو وہ ہے جس کا مفطر ہونا (روزہ توڑنے والی چیز) قرآن و سنت کے دلائل اور اجماع کی روشنی میں ثابت ہے، یہ کھانا، پینا اور ہم بستری کرنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ ﴾ [البقرة: ۱۸۷]

”تو اب ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمھارے لیے لکھا ہے اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۱۳/۲۵)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۱٦/۲۵)

تمھارے لیے سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا فجر کا خوب ظاہر ہو جائے، پھر روزے کو رات تک پورا کرو۔‘‘

اس آیت میں رمضان کی راتوں میں ہم بستری کی اجازت دی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ ہم بستری اور کھانے پینے سے رو کنے کا نام ہے، جب پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ تم پر روزے اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے، اس وقت انھوں نے روزے کا یہی معنی سمجھا تھا کہ یہ کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکنے کا نام ہے۔ لفظ ’’صیام‘‘ اسلام سے پہلے بھی معروف تھا اور عرب اس کو استعمال بھی کرتے تھے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ’’إِنَّ يَوْمَ عَاشُورَاءَ كَانَ يَوماً تَصُومُهُ قُرَيْشٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ‘‘[1] ’’عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں قریش جاہلیت میں روزہ رکھا کرتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ لفظ ’’صیام‘‘ ان کے ہاں معروف تھا۔

سنت اور اجماع سے یہ بھی ثابت ہے کہ حیض کا خون روزے کے منافی ہے، لہٰذا حائضہ روزہ نہیں رکھتی، بلکہ بعد میں قضا دیتی ہے۔ حضرت لقیط بن صبرہ کی حدیث کی روشنی میں سنت سے یہ بھی ثابت ہے کہ ناک کے ذریعے پانی اندر اتارنا روزہ توڑ دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا تھا: «وَبَالِغْ فِي الْاسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا»[2] ’’ناک میں مبالغے کے ساتھ پانی چڑھا مگر یہ کہ تو روزے سے ہو۔‘‘ جمہور علما کا قول بھی یہی ہے کہ جس شخص کو بے اختیار احتلام ہو جائے (خواب وغیرہ کی صورت میں) اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن جو شخص قصداً مشت زنی وغیرہ کے ذریعے انزال کرتا ہے اس کا روزہ بالاتفاق ٹوٹ جاتا ہے۔

جہاں تک سرمے، مقعد اور پیشاب کی نالی میں پچکاری کے ذریعے دوا داخل کرنے اور سر کے ہلکے اور گہرے زخموں پر دوا لگانے سے روزہ ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے کا مسئلہ ہے تو اس میں علما کا اختلاف ہے۔ کچھ ان میں سے کسی چیز کو بھی مفطر (روزہ توڑنے والا امر) نہیں کہتے اور کچھ سرمے کے سوا سب کو مفطر کہتے ہیں۔ کچھ سرمے اور آنکھ میں دوا ڈالنے کے سوا سب کو مفطر کہتے ہیں۔

تاہم زیادہ ظاہر یہی ہے کہ ان میں سے کسی چیز سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، بلکہ روزہ دین کا وہ حکم ہے جس کی معرفت اور علم کی ہر خاص و عام کو ضرورت رہتی ہے۔ اگر یہ امور روزے میں حرام ہوتے اور روزہ خراب کر دیتے تو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٢٧)

رسول اللہ ﷺ لازماً اُن کا ذکر کرتے۔ اگر آپ ﷺ نے اُن کا ذکر کیا ہوتا تو صحابہ کو علم ہوتا اور وہ امت تک ان کی تفصیل بھی اسی طرح پہنچاتے جس طرح انھوں نے ساری شریعت امت کو پہنچا دی۔ جب اس سلسلے میں کسی عالم نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح، ضعیف، مسند یا مرسل حدیث نقل نہیں کی تو معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے ایسی کوئی بات ذکر ہی نہیں کی۔

سرمے کے بارے میں جو حدیث نقل کی جاتی ہے وہ ابو داود[1] میں مروی ہے اور اس کو ائمہ حدیث نے انتہا درجے کی ضعیف قرار دیا ہے بلکہ ترمذی میں اس کے معارض حدیث بھی موجود ہے، اگرچہ وہ بھی ضعیف ہے اور امام ترمذی نے یہ فیصلہ سنایا ہے: اس باب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح بات ثابت نہیں۔[2]

جو لوگ کہتے ہیں: پچکاری سے یا سر کے گہرے زخم پر دوا لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، ان کے پاس حدیث سے کوئی دلیل نہیں، بلکہ انھوں نے قیاس سے کام لیا ہے۔ ان کی مضبوط ترین دلیل یہ قیاس ہے کہ حدیث میں روزے کی حالت میں مبالغے کے ساتھ ناک میں پانی چڑھانے سے منع کیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز انسان کے اپنے ارادے اور اختیار سے دماغ تک پہنچ جائے، اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح جو چیز پچکاری وغیرہ کے ذریعے انسان خود اپنے پیٹ تک پہنچاتا ہے اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے، چاہے وہ کھانے اور خوراک کی جگہ پہنچے یا پیٹ کے کسی فالتو حصے میں جائے۔

یہ جتنے قیاسات ہیں اس قابل نہیں کہ ان کو بنیاد بنا کر ان چیزوں کو مفطرِ صوم قرار دیا جائے، کیوں کہ قصاص گو شرعی حجت ہے، لیکن اس وقت معتبر ہے جب اس کے صحیح ہونے کی تمام شرطیں اس میں پائی جائیں۔ کوئی ایسی دلیل نہیں جس کا تقاضا ہو کہ وہ مفطر جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مفطر قرار دیا ہے۔ ہر وہ ایسی چیز ہے جو دماغ یا بدن تک پہنچتی ہے، یا کسی سوراخ کے ذریعے سے پیٹ میں پہنچتی ہے، جس طرح ان اقوال کے قائلین اس طرح کے معانی کو مناطِ حکم (شرعی حکم کی علت) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول نے کھانے پینے کو کھانے پینے اور جو دماغ اور پیٹ میں دوا داخل ہوتی ہے، سرمہ داخل ہوتا ہے اور مقعد اور پیشاب کے سوراخ میں پچکاری کے ذریعے دوا ڈالی جاتی ہے، اس میں اس اشتراک کی وجہ سے مفطر (روزہ توڑنے والا) قرار دیا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا: چونکہ اس حکم کو اس وصف کے ساتھ معلق کرنے کی کوئی دلیل نہیں، اس لیے کہنے والے کا یہ کہنا کہ ''اللہ اور اس کے رسول نے اسی بنا پر ان دونوں کو مفطر قرار دیا ہے'' ایک بلا علم قول ہے اور بلا علم اللہ کی طرف اس بات کا انتساب ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں۔ جو علما اسی مشترک کو مناطِ حکم قرار دیتے ہیں، یہ ان کا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٧٧) السلسلة الضعيفة (١٠١٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٢٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف الاسناد قرار دیا ہے۔

اجتہاد ہے جس کا ان کو ثواب ہوگا مگر ایسا قول نہیں جو شرعی حجت ہو اور جس کا ماننا مسلمان پر فرض ہو۔ قیاس اس وقت درست ہوتا ہے جب کلامِ شارع علتِ حکم پر دلالت نہ کرتا ہو۔ جب ہم اصل کے اوصاف کی پرکھ کریں تو اس میں وصفِ معین کے سوا کوئی ایسا وصف نہیں جو علت بن سکتا ہو اور جب ہم مناسبت یا دوران یا شبہہ مطرد کے ساتھ اصل کی علت ثابت کریں تو اس کے لیے اوصاف کو پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر اصل میں دو اوصاف ہوں اور دونوں ہی مناسب ہوں تو پھر حکم کو ایک ہی کے ساتھ معلق کرنا جائز نہیں ہوتا۔

یہ بات تو معلوم ہے کہ نص اور اجماع دونوں ہی کھانے، پینے، جماع اور حیض کو مفطر قرار دیتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے روزے دار کو وضو کرتے وقت مبالغے کے ساتھ ناک میں پانی چڑھانے سے منع کیا ہے لہٰذا ان لوگوں کا ناک میں پانی چڑھانے پر قیاس کرنا ان کی قوی ترین دلیل ہے، جس طرح پیچھے گزرا۔ مگر ان کا یہ قیاس کمزور ہے، کیوں کہ جو اپنی ناک کے ذریعے پانی چڑھاتا ہے پانی اس کے حلق اور پیٹ میں اتر آتا ہے اور وہی نتیجہ نکلتا ہے جو منہ کے ذریعے پینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس پانی سے انسان کا بدن غذا حاصل کرتا ہے، پیاس مٹ جاتی ہے اور معدے میں کھانا پک جاتا ہے، تو ناک کے ذریعے حلق اور پیٹ میں داخل ہونے والے پانی سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر اس کے متعلق حدیث میں ذکر نہ بھی ہوتا تو یہ بات عقل سے بھی معلوم تھی کہ یہ منہ کے ذریعے پانی پینے کی طرح ہی ہے۔ فرق صرف ذریعے کا ہے، ایک منہ کی طرف سے اور دوسرا ناک کی طرف سے اور یہ معتبر نہیں، بلکہ اکیلے پانی کا منہ میں داخل ہونا مفطر نہیں، مگر وہ اس کا ایک ذریعہ ہے، لیکن سرمہ، حقنہ اور سر کے زخم پر دوائی لگانا اس طرح نہیں، کیوں کہ سرمہ بدن کو غذا مہیا نہیں کرتا اور جزوِ بدن نہیں بنتا اور نہ کوئی سرمے کو اپنے منہ یا ناک کے ذریعے اپنے پیٹ میں داخل ہی کرتا ہے۔ اسی طرح حقنہ بھی غذا مہیا نہیں کرتا، بلکہ بدن کو خالی کر دیتا ہے، جس طرح کسی مسہل کو سونگھنا یا شدتِ گھبراہٹ انسان کے پیٹ کو ڈھیلا کر دیتی ہے، حالانکہ یہ چیزیں معدے تک نہیں پہنچتیں۔[1] وہ دوا جو سر کے زخم پر لگائی جائے اور معدے تک پہنچ جائے، تو وہ غذا کے مشابہ نہیں ہوتی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۸۳]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے۔"

نیز فرمانِ مصطفیٰ ﷺ ہے:

---

[1] امام صاحب کا فرمانا بجا ہے، لیکن عصرِ حاضر میں ایسے حقنے اور ٹیکے موجود ہیں جن کے ذریعے مریض کے بدن میں غذا داخل کی جاتی ہے، لہٰذا ایسا انجکشن جو قوت بخش اور غذا کا کام دیتا ہو، بلاشبہہ روزہ توڑ دیتا ہے۔

((اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ))[1] ”روزہ ڈھال ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا:

”شیطان ابن آدم میں خون کی طرح رواں ہوتا ہے، اس لیے روزہ رکھ کر اپنے بدن میں بھوک پیدا کر کے اس کے راستے تنگ کرو۔“[2]

روزے دار کو کھانے، پینے سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ یہ قوت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اس لیے کھانا پینا ترک کر دیا جاتا ہے جو بدن میں بہت زیادہ خون پیدا کرتا ہے، جس میں شیطان دوڑتا ہے۔ یہ خون غذا سے پیدا ہوتا ہے، حقنے یا سرمے سے نہیں، سر پر دوائی لگانے سے نہیں، آلہٗ تناسل کی نالی میں پچکاری مارنے سے نہیں۔ یہ اس پانی سے پیدا ہوتا ہے جو ناک کے ذریعے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے، اس لیے ناک کے ذریعے مبالغے کے ساتھ پانی کھینچنے سے ممانعت روزے کے اتمام کا ایک حصہ ہے۔ اگر یہ سب معانی اس اصل میں موجود ہیں جو نص اور اجماع سے ثابت ہے تو ان کا یہ دعویٰ کہ شارع نے حکم کو انھی اوصاف پر معلق کیا ہے جو انھوں نے ذکر کیے ہیں، ان اوصاف کے ساتھ معارض ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو کہ وہ وصف جس کے علت ہونے کا انھوں نے دعویٰ کیا ہے، وہی علت ہے کوئی اور نہیں تو معارضہ ہر طرح کے قیاس کو باطل کر دیتا ہے۔

نص اور اجماع سے روزے دار کے لیے کھانا پینا اور جماع کرنا منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ثابت ہے: ”شیطان ابن آدم میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔“ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خون کھانے پینے ہی سے بنتا ہے۔ جب کوئی انسان کھاتا یا پیتا ہے تو بدن میں شیطان کے راستے کھلے ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے حکم دیا ہے کہ بھوک کے ساتھ اس کے راستوں کو تنگ کر دو۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیطان کو جکڑ دیا جاتا ہے۔“[3] اس طرح روزے کے نتیجے میں بھوک کے ذریعے انسانی بدن میں شیطان کے راستے، جو خون ہے، تنگ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ راستے تنگ ہو جائیں تو دل نیک کاموں کی طرف اُمڈ آتے ہیں، جن کے ذریعے جنت کے دروازے کھلتے ہیں اور برائیوں کے ترک پر آمادہ ہو جاتے ہیں، جن کے ساتھ جہنم کے دروازے بند ہو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٥) ”اس کے راستے تنگ کرو...“ کے الفاظ بخاری و مسلم میں نہیں۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧٩)

جاتے ہیں، پھر شیطانوں کو جکڑ دیا جاتا ہے تو ان کی طاقتیں اور عمل کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ رمضان میں اپنی سرگرمیاں اسی طرح جاری نہیں رکھ سکتے جس طرح رمضان کے علاوہ دیگر مہینوں میں جاری رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ شیطانوں کو قتل کر دیا جاتا ہے، یا وہ مر جاتے ہیں، بلکہ فرمایا: ''ان کو جکڑ دیا جاتا ہے۔'' تو جکڑا ہوا شیطان اذیت تو پہنچا سکتا ہے، لیکن غیر رمضان کی نسبت رمضان میں کم ہوتی ہے۔ یہ روزے کے کمال اور نقص کے حسبِ حال ہے۔ جس کا روزہ کامل ہو وہ شیطان کو اتنی قوت سے روک سکتا ہے جتنی قوت سے ناقص روزے والا نہیں روک سکتا۔ روزے دار کو کھانے پینے کی ممانعت میں یہ مناسبت بالکل ظاہر ہے۔ حکم اسی کے مطابق ثابت ہے اور شارع علیہ السلام کا کلام اس وصف اور اس کی تاثیر کا اعتبار کرنے پر دلالت کرتا ہے، نیز یہ منع حقنے اور سرمے میں ناپید ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جماع سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اس میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: یہ احکام نص اور اجماع سے ثابت ہیں۔ ان کو ثابت کرنے کے لیے قیاس کی ضرورت نہیں، بلکہ علتیں مختلف بھی ہوسکتی ہیں۔ کھانے، پینے کی حرمت اور اس کے ذریعے روزے کا ٹوٹنا ایک علت کی وجہ سے ہے، جماع کی حرمت اور اس کے ذریعے روزے کا ٹوٹنا کسی دوسری علت کے سبب، تو حیض کی وجہ سے روزے کا ٹوٹنا کسی تیسری علت کے پیشِ نظر ہے۔ حیض کے بارے میں ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ حرام ہے، کیوں کہ یہ انسان کے اختیار میں نہیں، لیکن کھانا، پینا اور جماع اختیار میں ہے۔

نیز جماع منی خارج کرنے کے سبب کی حیثیت سے کوشش کر کے قے کرنے، حیض اور سینگی لگوانے کے قائم مقام ہے، تفصیل آگے آئے گی۔ یہ استفراغ (خالی کرنا) کی نوع ہے۔ کھانے اور پینے کی طرح امتلا (پیٹ بھرنا) کی نوع سے نہیں۔ لیکن دوسری طرف دو شہوتوں میں سے ایک کی حیثیت سے کھانے پینے کے قائم مقام بھی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا بھی دوں گا۔ وہ میرے لیے اپنی شہوت اور کھانا ترک کرتا ہے۔''

بنا بریں انسان کا اس چیز کو اللہ کی خاطر چھوڑنا جس کی اشتہا رکھتا ہو مطلوبِ عبادت ہے، جس پر اس کو اسی طرح ثواب ملتا ہے جس طرح احرام باندھنے والا معمول کا لباس اور خوش بو وغیرہ جیسی نعمتوں کو ترک کر کے ثواب کا حق دار بنتا ہے۔ جماع سب سے بڑی بدنی نعمت ہے۔ اس سے نفس کو سرور اور انبساط ملتا ہے، یہ شہوت، خون اور بدن کو کھانے کی نسبت زیادہ متحرک کرتا ہے۔ اگر شیطان ابن آدم میں خون کی طرح دوڑتا ہے اور غذا اس خون کو رواں اور چست کرتی ہے جس میں شیطان دوڑتا ہے، پھر جب انسان کھائے، پیے تو اس کا نفس شہوات کے لیے انگڑائیاں لینا شروع کر دیتا ہے اور عبادات کے لیے اس کا ارادہ اور محبت کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہ معنی ومفہوم جماع میں

اس سے کئی درجے زیادہ پایا جاتا ہے، کیوں کہ یہ شہوتوں کے لیے نفس کے ارادے کو مہمیز لگاتا ہے، اور نیکیوں کے لیے اس کے ارادے کو کمزور تر بنا دیتا ہے، جب کہ جماع تمام شہوتوں کی انتہا ہے اور اس کی خواہش کھانے اور پینے کی خواہش سے زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے روزے کی حالت میں جماع کرنے والے کا کفارہ وہی کفارہ قرار دیا گیا ہے جو ظہار کا کفارہ ہے جس میں غلام آزاد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یا اس کا وہ قائم مقام جو سنت اور اجماع سے ثابت ہے، کیوں کہ یہ زیادہ سخت ہے۔ اس کا محرک بھی زیادہ قوی ہے اور اس کی مفسدت زیادہ شدید ہے، چنانچہ یہ تحریم جماع کی دو حکمتوں میں سے بڑی حکمت ہے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ یہ استفراغ کی طرح بدن کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس طرح جماع (شہوت بھڑکانے کے اعتبار سے) کھانے اور (استفراغ کی وجہ سے بدن کمزور کرنے کے اعتبار سے) حیض کی طرح قرار پاتا ہے، لیکن یہ اس میں ان دونوں سے بہت آگے ہے، اس لیے اس کا روزے کو خراب کرنا بھی کھانے اور حیض کے ذریعے روزہ خراب کرنے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اب ہم حیض کی وجہ سے روزہ ٹوٹنے اور روزہ نہ ٹوٹنے کی حکمت کا ذکر کرتے ہیں جو قیاس کے مطابق ہے:

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ شریعت نے ہر چیز میں اعتدال قائم کرنے کا حکم دیا ہے، حتی کہ عبادات میں بھی اعتدال کا حکم دیا گیا ہے اور ان میں اسراف بھی جور ہی میں شمار ہوتا ہے جو منع ہے۔ اسی حکم کے پیشِ نظر سحری دیر سے کرنے اور روزہ جلدی کھولنے کا حکم دیا گیا ہے، اور وصالِ صیام (افطار کیے بغیر دو تین دن تک روزہ جاری رکھنا) سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین اور معتدل ترین روزہ داود علیہ السلام کا روزہ ہے، وہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑتے اور اگر دشمن سے مقابلہ ہو جاتا تو میدان چھوڑ کر نہ بھاگتے۔''[1] عبادات میں عدل اور میانہ روی شریعت کے بڑے مقاصد میں سے ایک ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ ﴾ [المائدة: ٨٧]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔''

اس آیت میں حلال کو حرام کرنا اس زیادتی میں شمار کیا گیا ہے جو عدل کے مخالف ہے۔ یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا:

﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ﴿١٦٠﴾ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ ﴾ [النساء: ١٦٠۔ ١٦١]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٧٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٥٩)

''تو جو لوگ یہودی بن گئے، ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے۔ اور ان کے سود لینے کی وجہ سے، حالانکہ یقیناً انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔''

انھوں نے ظلم کیا تو سزا کے طور پر ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئیں، لیکن امتِ وسط (درمیانی اور معتدل امت) کے عکس کہ اس کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور گندی حرام۔

اگر اعتدال کی یہ اہمیت ہے تو روزے دار کو جہاں کھانے پینے جیسی قوت بخش اشیا استعمال کرنے سے منع کیا گیا، وہیں جسم کو کمزور کرنے والی چیزوں اور اس مادے کے اخراج سے بھی منع کر دیا گیا جس سے بدن کو غذا ملتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزے دار کو ضرر پہنچتا اور وہ عبادت میں اعتدال قائم نہ رکھ سکتا۔

بدن سے نکلنے والی اشیا دو طرح کی ہیں: ایک وہ ہے جس سے انسان احتراز نہیں کر سکتا یا وہ انسان کے لیے ضرر رساں نہیں ہوتی، اس سے منع نہیں کیا گیا، مثلاً: بول و براز، ان کا نکلنا انسان کو نقصان دیتا ہے نہ ان سے احتراز ہی ممکن ہے۔ اگر انسان کوشش کر کے بھی ان کو نکالے تب بھی یہ اس کے لیے نقصان دہ نہیں، بلکہ فائدہ مند ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کو قے آ جائے اور اس سے احتراز کرنا ممکن نہیں ہوتا، نیند میں احتلام ہو جائے، اس سے بھی نہیں بچا جا سکتا، لیکن اگر کوشش کر کے قے کی جائے تو وہ اس کھانے پینے کو باہر نکال دیتی ہے جس نے معدے میں حل ہو کر جزوِ بدن بننا ہوتا ہے۔ مشت زنی بھی ایسے ہی ہے۔ ایک تو اس میں شہوت کی تسکین ہے اور دوسرے منی کو نکالنا ہے جو انسان کے لیے طاقت بخش عنصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اس کو نکالنے میں افراط اور بے اعتدالی سے کام لیا جائے تو انسان کو نقصان ہوتا ہے۔ حیض کے ذریعے نکلنے والا خون بھی عورت کو کمزور کر دیتا ہے۔ حائضہ کے لیے ان اوقات میں روزہ رکھنا ممکن ہوتا ہے جو حیض کے ایام نہیں ہوتے۔ اس حالت میں اس کا روزہ رکھنا معتدل ہو گا جس میں اس کے بدن سے خون نہیں نکلتا جو بدن کو طاقت مہیا کرتا ہے۔ اگر وہ حیض کی حالت میں روزہ رکھے تو خون نکلتا رہے گا، جس سے اس کو نقصان اور کمزوری کا سامنا کرنا پڑے گا اور اس کا روزہ اعتدال سے خارج ہو جائے گا، اس لیے اس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پاکی کے دنوں میں روزہ رکھے، لیکن استحاضہ کے عکس کہ یہ قے آنے کی طرح ہے اور اس سے احتراز ممکن نہیں، اس لیے اس کو حیض کے خون کی طرح روزے کے منافی قرار نہیں دیا گیا۔

اسی قیاس کا تقاضا ہے کہ فصد لگوانے اور پچھنے لگوانے کی وجہ سے نکلنے والے خون کو مفطر قرار دیا جائے، گو فقہا کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ آیا سینگی (پچھنے) لگوانے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ تاہم اکثر فقہائے حدیث کا یہی مذہب ہے کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی ہے:

«أَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُومُ»[1] ''سینگی لگانے اور لگوانے والے کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔''

سینگی اور فصد میں شرعاً اور طبعاً کوئی فرق نہیں۔ شرعاً اس طرح فرق نہیں کہ اگر سینگی کی ترغیب ہے تو اس کام کی ترغیب ہے جو اس کے ہم معنی ہے اور طبعاً اس طرح کہ گرم علاقے کے رہنے والوں کا خون جلد کی سطح پر آ جاتا ہے اور وہ سینگی کے ذریعے نکل آتا ہے، لیکن ٹھنڈے علاقے کے لوگوں کا خون رگوں میں گہرائی میں ہوتا ہے جو فصد کے ذریعے نکلتا ہے تو شرعاً اور عقلاً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

جو سینگی لگاتا ہے وہ چونکہ ہوا کھینچتا ہے تو امکان رہتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اس کے حلق میں خون داخل ہو جائے اور اس کے پیٹ میں اتر جائے، اس لیے اس گمان کے پیشِ نظر اس کا روزہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ملخصاً.

والحمد لله رب العالمين، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه تسليما كثيرا.[2]

روزہ توڑ کر مباشرت کرنے والے کا حکم

سوال ایک شخص نے رمضان کے مہینے میں دن کے وقت اپنی بیوی سے مجامعت کرنی چاہی تو اس نے پہلے کچھ کھا کر روزہ توڑا، پھر جماع کیا، کیا اس پر کفارہ ہوگا یا نہیں؟ نیز جو عذر کے بغیر روزہ توڑتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد لله. اس مسئلے میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں:

ایک یہ ہے کہ اس پر کفارہ لازم ہو جاتا ہے، یہ جمہور فقہا، جیسے: مالک احمد اور ابو حنیفہ وغیرہ کا موقف ہے۔

دوسرا قول ہے کہ اس پر کفارہ لازم نہیں ہوتا، یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

ان دونوں اقوال کی بنیاد اس بات پر ہے کہ آیا کفارے کا سبب روزہ توڑنا ہے یا جماع اور غیر جماع کے ساتھ صحیح روزہ توڑنا ہے؟ یہ مذاہب کا اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ اعلیٰ جنس کے ساتھ روزہ توڑنے کو معتبر سمجھتے ہیں۔ مالک مطلقاً توڑنے کو معتبر خیال کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص کنکری یا گٹھلی وغیرہ نگل کر روزہ توڑے۔ احمد سے ایک روایت ہے کہ اگر کوئی شخص حجامہ (سینگی) کے ذریعے روزہ توڑے تو وہ ان دیگر مفطرات کی طرح کفارہ ادا کرے گا جن کا مجامعت کی جنس سے تعلق ہے، لیکن کھانے پینے والی چیزوں کے ساتھ روزہ توڑنے میں کفارہ نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري (٦٨٤/٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٦٧_ ٢٣٧١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٧٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٦٥/٤) میں اسے صحیح کہا ہے۔

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١٩/٢٥_٢٥٨)

اس کے بعد فقہا کا اس جزئی میں بھی اختلاف ہے کہ کیا صحیح روزے کو توڑنا کفارے کے لیے شرط ہے؟ شافعی وغیرہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پہلے کھائے، پھر جماع کرے، یا اس نے رات روزے کی نیت نہیں کی تھی اور اسی عالم میں صبح کی، پھر جماع کیا، یا اس نے جماع کیا، کفارہ دیا، پھر جماع کیا، تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا، کیوں کہ اس نے صحیح روزے میں مجامعت نہیں کی۔ امام احمد وغیرہ کے مذہب میں ظاہر روایت کے مطابق ان تمام صورتوں میں کفارہ ہے، کیوں کہ رمضان کے مہینے میں کھانے، پینے اور جماع سے رکے رہنا واجب ہے۔ تو یہ فاسد روزہ ہے جو فاسد احرام کے مشابہ ہے۔ جس طرح حج کا احرام باندھنے والا اگر اپنے احرام کو کوئی مخالفِ احرام کام کر کے فاسد کر لے تو اس کے لیے تمام ممنوعاتِ احرام سے رکے رہ کر اس کو جاری رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ تو پھر اگر وہ کسی ممنوعہ حرام کام کا ارتکاب کرے تو اس پر وہی کفارہ لازم ہو جاتا ہے جو صحیح احرام میں ہوتا ہے۔

علی ہذا القیاس جس پر رمضان کا روزہ فرض ہو اس پر کھانے، پینے اور جماع سے اجتناب لازم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کھا پی کر، یا جماع کر کے یا نیت نہ کر کے اپنے روزے کو فاسد کر لے تو اس کے لیے ممنوعاتِ صیام سے رکے رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر وہ ان میں سے کچھ تناول کرے تو اس پر وہی لازم آئے گا جو صحیح روزے میں تناول کرنے سے لازم آتا ہے۔ ان دونوں جگہوں میں اس پر قضا ہے، کیوں کہ مہینے کی بے حرمتی دونوں جگہوں میں ہوئی ہے، بلکہ یہ اس جگہ زیادہ سخت ہے، کیوں کہ اس نے ایک مرتبہ روزہ توڑ کر نافرمانی کی اور پھر دوسری نافرمانی کی۔ تو اس پر کفارہ بھی زیادہ شدید ہونا چاہیے، کیوں کہ اگر اس جیسا کام کرنے والے پر کفارہ نہ ہو تو یہ کفارہ نہ دینے کا ذریعہ بن جائے گا اور کوئی بھی جو رمضان میں دن کے وقت جماع کرنا چاہتا ہو اس کو پہلے کھانا کھانے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہو گی، بلکہ یہ اس کے مقصود میں زیادہ معاون ثابت ہوگا۔ تو یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ اگر وہ کچھ کھانے سے پہلے جماع کرے تو اس پر کفارہ ہوگا، لیکن اگر وہ پہلے کھا کر روزہ توڑے اور پھر جماع کرے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا! اس طرح کی بات شریعت میں انتہائی بدنما ہے اور اس میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ بات ہر عقل و دین میں طے شدہ ہے کہ گناہ جتنا سنگین ہوگا سزا بھی اتنی ہی شدید ہوگی اور جتنا شبہہ قوی ہو گا، یہ بھی اتنی ہی قوی ہوگی۔

کفارے میں سزا کی آمیزش بھی ہے اور عبادت کی بھی اور گناہ کو مٹانے اور زجر و توبیخ کے لیے اس کا حکم دیا گیا ہے۔ بہرحال قوتِ سبب قوتِ مسبب کا تقاضا کرتی ہے۔

مزید برآں کچھ کھا پی کر روزہ توڑنا کفارے کو لازم کرنے والا مستقل سبب بھی نہیں، جس طرح امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا فرمانا ہے۔ لیکن یہ اس سے کم بھی نہیں کہ مستقل سبب کا معاون ہو، بلکہ اس کے حکم سے مانع ہوگا اور

یہ بات اصولِ شریعت سے بہت دور ہے۔ پھر رمضان میں دن کے وقت جماع کرنے والا بالعموم دخول سے پہلے کچھ کھا کر روزہ توڑتا ہے، اگر اسی قول کو اختیار کیا جائے تو اس کے مطابق اس سے کفارہ ساقط ہو جائے گا اور اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے۔ واللہ أعلم[1]

رمضان میں غلط فہمی کی بنا پر طلوعِ فجر کے بعد مجامعت کا مسئلہ

''کیا کلی کرتے وقت ناک...'' کے بعد (ص:۳۲)

سوال ایک شخص نے یہ سمجھتے ہوئے کہ رات ابھی باقی ہے، طلوعِ فجر کے وقت اپنی بیوی سے مجامعت کی، پھر اس کو معلوم ہوا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے، اس پر کیا عائد ہوتا ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین. اس مسئلے میں علما کے تین اقوال ہیں:

① اس پر قضا اور کفارہ واجب ہوتا ہے۔ یہ امام احمد کا مشہور مذہب ہے۔

② اس پر صرف قضا واجب ہے۔ یہ امام احمد کے مذہب میں دوسرا قول ہے اور ابو حنیفہ، شافعی اور مالک کا مذہب ہے۔

③ اس پر قضا ہے نہ کفارہ۔ یہ سعید بن جبیر، مجاہد، حسن، اسحاق داود، اس کے اصحاب اور خلف جیسے اسلاف کا مذہب ہے۔ ان کی دلیل ہے: جو طلوعِ فجر سمجھتے ہوئے کھاتا رہتا ہے، پھر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ فجر طلوع نہیں ہوئی، اس پر قضا نہیں۔ یہ سب سے درست قول ہے اور اصولِ شریعت اور کتاب وسنت کی دلالت کے سب سے زیادہ قریب۔ اصولِ احمد وغیرہ کا قیاس بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھولنے والے اور غلطی سے مخالفت کرنے والے سے مواخذہ ختم کر دیا ہے۔ اس شخص نے غلطی سے یہ کام کیا ہے۔ اللہ نے اس وقت تک کھانا پینا اور مجامعت کرنا جائز رکھا ہے جب تک سفید دھاری کالی دھاری سے واضح نہ ہو جائے۔ سحری تاخیر سے کرنا بھی مستحب ہے۔ جو انسان مندوب اور جائز کام کرتا ہے وہ کوتاہی کرنے والا نہیں۔ یہ اس کا عذر بھول کر کچھ کرنے والے کے عذر سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ واللہ أعلم[2]

بوس و کنار کا روزے پر اثر

سوال اگر بیوی سے بوس و کنار کرنے یا ہم آغوش ہونے سے مذی خارج ہو جائے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب اکثر علما کے نزدیک اس سے روزہ فاسد اور خراب ہو جاتا ہے۔[3]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۶۰۔۲۶۳)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۶٤)

[3] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲٦٥)

رمضان کا روزہ چھوڑنے والے کی سزا

سوال جو رمضان کا روزہ چھوڑ دیتا ہے، اس کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

جواب اگر کوئی شخص رمضان کے روزے کو حلال سمجھتے ہوئے چھوڑتا ہے، حالانکہ اس کو اس کے حلال سمجھنے کے حرام ہونے کا علم ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ اگر فاسق ہو تو امام جو سزا مناسب سمجھے، دے اور اگر جاہل ہو تو اس کو بتایا جائے، تاہم اس کا تعلق امام کے اجتہاد سے ہے۔ واللہ أعلم[1]

کلی، مسواک، کھانا چکھنے، قے کرنے، خون نکلنے اور تیل یا سرمہ لگانے سے روزے پر اثر

سوال کیا کلی کرنے، ناک میں پانی ڈالنے، مسواک کرنے، کھانا چکھنے، قے کرنے، خون نکلنے، تیل لگانے یا سرمہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا دونوں ہی بالاتفاق روزے دار کے لیے جائز ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روزے کی حالت میں کلی بھی کرتے تھے اور ناک میں پانی بھی ڈالتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے لقیط بن صبرہ سے کہا تھا: ''ناک میں پانی اوپر تک چڑھا، سوائے اس کے کہ تو روزے سے ہو۔''[2] اس حدیث میں آپ ﷺ نے ناک میں پانی چڑھانے سے منع نہیں کیا، صرف اس میں مبالغے سے منع کیا ہے۔

مسواک بلا اختلاف جائز ہے۔ زوال کے بعد اس کے مکروہ ہونے میں فقہا میں اختلاف ہے، لیکن اس کی کراہیت پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔

بلاضرورت کھانا چکھنا مکروہ ہے، لیکن اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ضرورت کے لیے چکھنا، یہ کلی کی طرح ہی ہے۔

قے اگر خود آ جائے تو روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر کوئی کوشش کر کے کرے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ تیل لگانے سے بھی بلاشبہہ روزہ نہیں ٹوٹتا۔

ایسا خون جس سے احتراز ممکن نہ ہو، جیسے: استحاضہ کا خون، زخموں سے رسنے والا خون، نکسیر پھوٹنے کے نتیجے میں اور ناک سے نکلنے والا خون وغیرہ، لیکن حیض اور نفاس کے خون سے بالاتفاق ٹوٹ جاتا ہے۔

سینگی کے متعلق دو اقوال ہیں، اکثر سلف کے نزدیک اور حنبلی مذہب میں اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٥/٢٦٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٦٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٧) صحيح الجامع (٩٢٧)

دماغ تک پہنچنے والا سرمہ احمد اور مالک کے مذہب میں روزہ توڑ دیتا ہے، لیکن شافعی اور ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے نہیں ٹوٹتا۔ واللہ أعلم[1]

رمضان میں بیمار ہوکر روزے نہ رکھ سکنے، پھر رمضان ہی میں فوت ہونے والے کے روزوں کا کفارہ

سوال ایک شخص رمضان کے مہینے میں بیمار ہوا اور روزے رکھنے پر قادر نہیں تھا، پھر رمضان ہی میں فوت ہوگیا اور اس پر کچھ روزے تھے، اسی طرح اس مدت میں وہ نماز بھی نہیں پڑھ سکا۔ اس کے والدین زندہ ہیں۔ اس کی طرف سے روزے رکھیں اور نماز پڑھیں تو کیا یہ اس سے ساقط ہو جائیں گی؟

جواب اگر مرض اس کو چمٹا رہا اور اس کے لیے قضا ممکن نہ ہوئی تو اس کے ورثا کے ذمے صرف اس کی طرف سے کھانا کھلا دینا ہے۔ فرض نماز کوئی کسی کی طرف سے نہیں پڑھتا، لیکن اگر کوئی میت کی طرف سے ان دونوں میں سے کوئی کام بطورِ نفل کرے، پھر اس کا ثواب اس کو ہدیہ کر دے تو اس کو فائدہ ہوگا، واللہ أعلم۔[2]

لیلۃ القدر کی تعیین اور علامات

سوال لیلۃ القدر کے بارے میں بتایئے؟

(امام صاحب سے یہ سوال ۷۰۶ھ میں پوچھا گیا۔ اس وقت آپ قلعۃ الجبل میں قید تھے)

جواب الحمد لله. لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«هِيَ فِيْ الْعَشْرِ الأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ»[3]

”یہ رمضان کے آخری دس دنوں میں ہوتی ہے۔“

اور یہ طاق راتوں میں ہوتی ہے، لیکن طاق راتیں گزرے ہوئے ایام کی نسبت سے ہوں گی۔ اس کو اکیسویں رات، تیسویں رات، پچیسویں رات، ستائیسویں رات اور انتیس رات میں ڈھونڈا جائے۔ اسی طرح طاق راتیں مہینے کے باقی ایام کی نسبت سے بھی ہوں گی، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«لِتَاسِعَةٍ تَبْقَى، لِسَابِعَةٍ تَبْقَى، لِخَامِسَةٍ تَبْقَى، لِثَالِثَةٍ تَبْقَى»[4]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۶۶۔۲۶۷)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۵/۲۶۹)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۱۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۵)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۱۷)

''اس کو تلاش کرو اس رات میں جس کے بعد نو دن باقی ہوں، اس رات میں جس کے بعد سات دن باقی ہوں، اس رات میں جس کے بعد پانچ دن باقی ہوں، اس رات میں جس کے بعد تین دن باقی ہوں۔''

اگر مہینا تیس دن کا ہو تو اس حدیث کی بنیاد پر لیلۃ القدر جفت راتوں میں آتی ہے۔ بائیسویں رات کے بعد نو دن بچیں گے۔ چوبیسویں رات کے بعد سات دن بچیں گے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے صحیح حدیث میں اس کی اس طرح تفسیر کی ہے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اس مہینے کو قائم کیا۔ اگر مہینا انتیس دن کا ہو تو پھر وہی باقی دنوں کے حساب سے بھی وہی تین راتیں بنیں گی، جو گزشتہ دنوں کے حساب سے بنتی ہیں تو اس بنیاد پر مومن کو چاہیے کہ اسے پورے آخری عشرے میں تلاش کرے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«تَحَرَّوْهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَتَكُونُ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ أَكْثَرُ»[1]

''اس کو آخری عشرے میں تلاش کرو اور یہ آخری سات دنوں میں اکثر ہوتی ہے۔''

لیلۃ القدر زیادہ تر ستائیسویں شب کو ہوتی ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہا کرتے تھے، یہ ستائیسویں شب ہی میں ہے۔ ان سے پوچھا گیا: آپ کو کیسے علم ہوا؟ ان کا جواب تھا: اس نشانی کے ذریعے جو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتائی۔ آپ ﷺ نے بتایا: ''اس دن کی صبح سورج تشت کی طرح طلوع ہو گا، شعاع کے بغیر۔''[2]

یہ علامت ابی بن کعب نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے اور یہ حدیث میں وارد علامات میں سے سب سے مشہور علامت ہے۔ ایک یہ علامت بھی مروی ہے کہ ''وہ بڑی روشن رات ہوتی ہے۔''[3]

یہ ساکن ہوتی ہے نہ گرمی کی طرح شدید نہ سردی کی طرح تند۔ کچھ لوگوں کو خواب میں یا بیداری میں اس کا کشف ہو سکتا ہے اور وہ اس کے انوار ملاحظہ کر لیتے ہیں۔ واللہ أعلم[4]

لیلۃ القدر اور شبِ معراج کی فضیلت اور فراق

سوال لیلۃ القدر افضل ہے یا شبِ معراج؟

جواب شبِ معراج رسول اللہ ﷺ کے لیے افضل ہے اور شبِ قدر امت کے حق میں افضل۔ رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج کی جو سعادت حاصل ہوئی، وہ شبِ قدر میں حاصل ہونے والی سعادت سے اکمل ہے اور امت کو

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٩)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٢)

(3) مسند أحمد (٦٠٤/١) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

(4) مجموع الفتاویٰ (٢٥/٢٨٤_٢٨٥)

لیلۃ القدر کی جو سعادت حاصل ہوئی وہ معراج کی رات کی سعادت سے زیادہ کامل ہے، گو ان کو اس میں بھی عظیم الشان سعادت حاصل ہے، لیکن اس کا فضل و شرف اور بلند رتبہ تو اس کے لیے ہے جو اس سے بہرہ ور ہوا اور وہ آپ ﷺ تھے۔ واللہ أعلم[1]

معراجِ رسول ﷺ کی کیفیت

سوال کیا رسول اللہ ﷺ کو بیداری کی حالت میں معراج کروائی گئی یا نیند کے عالم میں؟

جواب جمہور سلف اور خلف کے موقف کے مطابق آپ ﷺ کو بیداری کی حالت میں معراج کروائی گئی۔ درج ذیل آیات اس کی دلیل ہیں:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ [بني إسرائيل: ١]

''پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا جس کے ارد گرد کو ہم نے بہت برکت دی ہے۔''

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿13﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿14﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿15﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿16﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿17﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿18﴾ ﴾ [النجم: ١٣-١٨]

''حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آخری حد کی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس ہمیشہ رہنے کی جنت ہے۔ جب اس بیری کو ڈھانپ رہا تھا جو ڈھانپ رہا تھا۔ نہ نگاہ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

یاد رہے اس آیت: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ میں اس عظیم الشان نشانی کی تعظیم اور اس کو معرضِ وجود میں لانے والے رب کی تسبیح بیان کی گئی ہے۔ تسبیح عجیب و غریب، عظیم اور غیر مالوف امور کے وقت ہی ہوتی ہے۔ حالتِ نیند اور عالمِ خواب میں تو کوئی عام شخص بھی اپنے آپ کو مکہ سے شام سفر کرتا دیکھ سکتا ہے، اس لیے یہ اس اندازِ تعظیم میں بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس سورت میں ان شواہد اور دلائل کا ذکر کیا ہے جن کا اپنے رسول کو مشاہدہ کروایا ہے۔ اہلِ مکہ نے جب اسراء یعنی ایک رات میں مکہ سے شام کا سفر کروائے جانے کا انکار کیا اور چونکہ انھیں یہ یقین تھا کہ آپ ﷺ نے بیت المقدس نہیں دیکھا اس لیے انھوں نے آپ ﷺ کی سچائی جاننے کے لیے آپ سے بیت المقدس کی عمارت سے متعلق سوالات کیے۔ آپ ﷺ نے خود ان کو اس طرح اس کی

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٥/٢٨٦)

تفصیل بتائی جس طرح کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو راستے میں ان کے ایک قافلے کے متعلق بھی بتایا۔ اگر آپ ﷺ نے یہ سب خواب میں دیکھا ہوتا تو وہ اس سختی سے آپ کی بات کا انکار کرتے نہ آپ ﷺ سے اس کی وضع کے متعلق سوال ہی کرتے، کیوں کہ خواب میں کسی چیز کو دیکھنے والا بعض اوقات اس کی اصل حالت کے بالکل عکس اور الٹ دیکھتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ ﴾ [النجم: ۱۳۔۱۸]

''حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ آخری حد کی بیری کے پاس۔ اسی کے پاس ہمیشہ رہنے کی جنت ہے۔ جب اس بیری کو ڈھانپ رہا تھا جو ڈھانپ رہا تھا۔ نہ نگاہ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

یہ آیات صریح اسلوب میں بتاتی ہیں کہ آپ ﷺ کی آنکھ نے وہی دیکھا جو ملاءِ اعلیٰ (فرشتوں کے حضور) میں دیکھا۔ آپ ﷺ کی نگاہ ادھر ادھر ہوئی، نہ حد سے بڑھی۔ جنتِ ماویٰ اور سدرۃ المنتہیٰ دونوں آسمان میں ہیں، زمین پر نہیں۔ اگر آپ ﷺ نے اپنی آنکھ سے وہاں کے مناظر دیکھے ہیں تو اس کا خواب ہونا ناممکن ہے، اور یہ آپ کے جسم کے بھی وہاں ہونے کی دلیل ہے، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورت ''الاسراء'' میں ذکر فرمایا:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ﴾ [بني إسرائيل: ۱]

''پاک ہے وہ جو رات کے ایک حصے میں اپنے بندے کو حرمت والی مسجد سے بہت دور کی اس مسجد تک لے گیا۔''

تو اس میں سدرۃ المنتہیٰ میں آپ کے مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے بطورِ تمہید اس کے دلائل اور شواہد ذکر کیے۔ قرآن اس کی دلیل کے طور پر بیان کرتا ہے:

﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ﴾ [النجم: ۵۔۷]

''اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا۔ جو بڑی طاقت والا ہے، سو وہ بلند ہوا۔ اس حال میں کہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے پر تھا۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ [التكوير: ۲۳]

''اور بلاشبہ یقیناً اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔''

پھر سورت نجم میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ ﴾ [النجم: ١٣] ''حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے دیکھا ہے۔''

یعنی جس کو افقِ اعلیٰ پر دیکھا، اسی کو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جس کے پاس جنتِ ماویٰ ہے۔

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ کا موقف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے جس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو اپنے دل کے ساتھ دو مرتبہ دیکھا،[1] لیکن کسی صحابی اور امام احمد جیسے مشہور امام نے یہ نہیں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ سے اللہ کا دیدار کیا۔ معراج کی ثابت شدہ احادیث میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ بات عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت نقل کی ہے، لیکن اس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام احمد کے حوالے سے غلط فہمی یا غلطی واقع ہوئی ہے اور اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث مروی ہیں جن میں یہ ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اپنے رب کو خواب میں دیکھا۔ یہ معراج کی رات نہیں تھی، کیوں کہ معراج مکہ میں ہوئی تھی۔

سلف صالحین اور ائمہ کرام کا اتفاق ہے کہ مومن آخرت میں قیامت کے مختلف مراحل اور جنت میں اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ اس پر بھی ان کا اتفاق ہے کہ کوئی بشر بھی دنیا میں اللہ کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا، البتہ نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ان کا اختلاف ہے۔ تاہم اکابر صحابہ اور ائمہ کا یہی موقف ہے کہ دنیا میں کسی نے بھی اللہ کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

((نُورٌ أَنّٰی أَرَاهُ))[2] ''وہ نور ہے، میں اس کو کس طرح دیکھ سکتا ہوں۔''

یہ جو کچھ لوگ ذکر کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے کہا تھا کہ ''میں نے اس کو دیکھا ہے۔'' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''میں نے اس کو نہیں دیکھا۔'' یہ سب جھوٹ اور زٹل ہیں۔ کسی محدث نے ان کا ذکر تک نہیں کیا، بلکہ ان کے جھوٹ ہونے پر ان کا اتفاق ہے۔ صحیح مسلم وغیرہ میں یہ حدیث ہے:

((وَاعْلَمُوا أَنَّ أَحَداً مِنكُمْ لَنْ يَرَى رَبَّهُ حَتَّى يَمُوتَ))[3]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٦)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٨)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٩)

''جان رکھو! تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک اپنے رب کو نہیں دیکھ سکے گا جب تک مر نہ جائے۔''

جہاں تک آپ ﷺ کا حضرت جبرائیل علیہ السلام کو علاحدہ اور حالتِ بیداری میں دیکھنے کا تعلق ہے تو یہ بات کتاب وسنت کے منطوق سے ثابت ہے اور اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اس میں بزعمِ خود فلسفی قسم کے لوگ اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جبرائیل کوئی وجود نہیں، محض ایک خیالی پیکر ہے جو آپ کے خیال میں ظاہر ہوتا ہے یا وہ عقلِ فعال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کو آنکھ سے دیکھنا محال ہے۔ یہ قول وعقیدہ انبیا کی تعلیمات کے کفر وانکار پر مبنی اور مسلمانوں، بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کے دین کے بھی مخالف ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرشتوں اور ان کی صفات سے متعلق جو کچھ بتایا ہے، قرآن کریم میں ان کا صورتِ بشر آنے کا ذکر ہونا ان ملحدوں کے قول وعقیدے کی نفی اور آپ ﷺ کے جبرائیل علیہ السلام کو دیکھنے کا اثبات کرتا ہے۔ جبرائیل ایک عظیم الشان فرشتہ ہے۔ وہ نفس میں پیدا ہونے والا کوئی خیال نہیں، نہ فلاسفہ کی خیالی عقول میں سے کوئی عقل ہی ہے جن کا ذہن کی دنیا سے باہر حقیقت کی دنیا میں کوئی وجود وحقیقت نہیں، بلکہ وہ ایمان واسلام کے اعلیٰ اصول میں داخل ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے مگر محمد ﷺ کا اپنی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کا عقیدہ رکھنا کسی امام نے واجب قرار نہیں دیا، بلکہ قرآن کریم اور صحیح سنت میں بھی اس کا ذکر نہیں ہوا اور کسی صحابی اور ائمہ اربعہ جیسے مشہور ائمہ اسلام میں سے بھی کسی امام نے یہ عقیدہ رکھنا واجب نہیں کہا۔

عثمان بن سعید دارمی جیسے کئی ایک علما نے تو محمد ﷺ کے اپنے رب کا اپنی آنکھ سے دیدار نہ کرنے پر اجماع نقل کیا ہے۔

جو اہلِ سنت یا آخرت میں دیدارِ الٰہی کے اثبات کا عقیدہ رکھنے والا اہلِ اسلام کے معراج کی رات آنحضرت ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے پر اجماع کا دعویٰ کرتا ہے، جس طرح ابن شکر مصری وغیرہ نے یہ بات کہی ہے تو یہ کتاب وسنت اور کلامِ سلف سے جاہل شخص کی بات اور دعویٰ ہے۔ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ معراج دو مرتبہ ہوئی، ایک مرتبہ حالتِ بیداری میں اور دوسری مرتبہ عالمِ خواب میں۔ کچھ لوگوں نے اس کو تین مرتبہ قرار دیا ہے، لیکن درست ایک مرتبہ ہی ہے۔ اس رات پانچ نمازیں فرض ہوئیں اور یہ ایک مرتبہ ہی فرض ہوئی تھیں، دو مرتبہ نہیں۔ لیکن کچھ لوگوں کو بعض روایات کی بنا پر غلطی لگی اور کہہ دیا کہ نبوت سے پہلے خواب میں معراج کروائی گئی اور اس رات، نبوت کے بعد فرض ہونے سے پہلے، پانچ نمازیں فرض کی گئیں، مگر یہ بات غلط ہے۔[1]

---

[1] جامع المسائل (۷/۴۵۔۵۰)

ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں اور رمضان کے آخری عشرے میں سے افضل

سوال ذوالحجہ کے پہلے دس دن افضل ہیں یا رمضان کا آخری عشرہ؟

جواب ذوالحجہ کے پہلے دس دن رمضان کے آخری دس دنوں سے افضل ہیں اور رمضان کی آخری دس راتیں ذوالحجہ کے دس دنوں کی راتوں سے افضل ہیں۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں: ''اگر کوئی سمجھ دار اس جواب پر غور کرے تو اسے کافی سمجھے گا، کیوں کہ اللہ کو عشرہ ذوالحجہ کے دنوں کی نسبت کسی اور دن میں کیے گئے عمل زیادہ محبوب نہیں۔ انھی دنوں میں عرفات کا دن آتا ہے۔ نحر کا دن اور ترویہ کا دن آتا ہے۔''

جہاں تک رمضان کی راتیں ہیں تو وہ بیداری کی راتیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان ساری راتوں میں بیدار رہ کر عبادت میں مصروف رہتے اور انھی میں وہ رات بھی ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔[1]

جو شخص اس تفصیل کے بغیر جواب دے وہ صحیح دلیل پیش نہیں کر سکتا۔

یومِ عرفات، یومِ جمعہ، عیدِ فطر اور قربان میں سے افضل

سوال کیا عرفات کا دن افضل ہے، جمعہ کا دن، عید فطر کا دن یا قربانی کا دن؟

جواب الحمد لله. سب علما کا اتفاق ہے کہ جمعہ کا دن ہفتے کے دنوں میں سب سے افضل ہے، کیوں کہ اس دن آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، ان کو جنت میں داخل کیا گیا اور اس سے نکالا گیا۔ سال کے سارے دنوں میں قربانی کا دن افضل ہے۔ کچھ عرفات کے دن کو سال کا افضل دن بتاتے ہیں۔ لیکن صحیح بات پہلی ہے، کیوں کہ سنن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَفْضَلُ الْأَيَّام عِنْدَ اللهِ يَوْمُ النَّحْرِ، ثُمَّ يَوْمُ الْقَرِّ»[2]

''اللہ کے نزدیک افضل دن قربانی کا دن ہے، پھر اس سے اگلا دن۔''

کیوں کہ یہ شافعی، مالک اور احمد کے مذہب میں حجِ اکبر کا دن ہے۔

اس میں وہ اعمال کیے جاتے ہیں جو کسی دوسرے دن نہیں کیے جاتے۔ اسی دن مزدلفہ میں وقوف کیا جاتا ہے۔

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٨٧/٢٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٦٥) صحيح الجامع (١٠٦٤)

جمرہ عقبہ کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ قربانی کی جاتی ہے۔ سر منڈوایا جاتا ہے۔ طواف افاضہ کیا جاتا ہے۔ اس دن یہ کام سنت کی رو سے افضل ہیں اور علما کا اتفاق بھی اسی پر ہے۔ واللہ أعلم [1]

رجب، شعبان، رمضان کے روزے، اعتکاف کا مہینا اور خاموشی

سوال رجب، شعبان اور رمضان، ان تین ماہ کے روزوں کے بارے میں جو کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے۔ نیز کیا اعتکاف رمضان کے ساتھ ہی خاص ہے یا غیر رمضان میں بھی کیا جا سکتا ہے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ روزے اور اعتکاف کی حالت میں خاموش رہنا نیک اعمال میں شمار ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب خصوصیت کے ساتھ مکمل رجب یا شعبان کے روزے رکھنا یا ان کو اعتکاف کے لیے مخصوص کرنے کے بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی چیز ثابت ہے نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اور نہ ائمہ اسلام ہی سے، بلکہ صحیح بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ آپ ﷺ شعبان تک روزہ رکھتے اور آپ ﷺ پورے سال میں اتنے روزے نہیں رکھتے تھے، جتنے شعبان میں رکھتے تھے۔ یہ رمضان کے مہینے کے لیے ہوتا۔ [2]

جہاں تک بالخصوص رجب کے روزے کی بات ہے تو اس کے متعلق جتنی احادیث ہیں، سب ضعیف، بلکہ موضوع ہیں اور علما کے ہاں قابلِ اعتماد نہیں۔ وہ اس طرح کی ضعیف بھی نہیں جو فضائل میں روایت کی جاتی ہیں، بلکہ بالعموم موضوع اور جھوٹی ہیں۔ اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہے کہ جب رجب کا مہینا آتا تو آپ ﷺ فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ» [3]

''اے اللہ! رجب اور شعبان کو ہمارے لیے بابرکت بنا اور رمضان ہمارے نصیب میں فرما۔''

ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رجب کے روزے سے منع کیا۔ اس کی سند محلِ نظر ہے، [4] لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، وہ لوگوں کے ہاتھوں کو مارتے، تاکہ وہ رجب میں اپنے ہاتھ کھانے میں رکھیں اور کہتے: ''رمضان سے مشابہت نہ بناؤ'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر آئے، انھوں نے دیکھا، گھر والوں نے پانی کے لیے ایک کوزہ خریدا ہے اور روزے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ انھوں نے پوچھا: یہ کس لیے ہے؟ انھوں نے کہا: رجب ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم اسے رمضان کے مشابہ بنانا چاہتے ہو؟ اور

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۸۸/۲۵)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۸۶۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۵٦)

[3] مسند أحمد (۲۵۹/۱) المعجم الأوسط (۱۸۹/٤) شعب الإیمان (۳۷۵/۳) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٤۳۹۵)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۷٤۳) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٦۰۷۰)

انھوں نے وہ کوزہ توڑ دیا۔ اگر کچھ لوگ رکھ لیں، کچھ نہ رکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

مسند وغیرہ میں ایک حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت والے مہینوں میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے،[3] جو یہ چار مہینے ہیں: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ یہ حدیث چاروں ماہ کے روزے کے بارے میں ہے، رجب کے ساتھ خاص نہیں۔

ان مہینوں کو اعتکاف کے لیے مخصوص کرنے کے لیے کوئی حکم میرے علم میں نہیں، بلکہ جو شخص کوئی جائز روزہ رکھے اور اس کی وجہ سے اعتکاف کرنا چاہے تو یہ بلاشک وشبہہ جائز ہے، لیکن روزے کے بغیر اعتکاف میں اختلاف ہے۔ ابوحنیفہ اور مالک کا مذہب ہے کہ اعتکاف روزے کے بغیر نہیں ہوتا۔ شافعی کا قول ہے: روزے کے بغیر بھی ہو جاتا ہے اور حنبلی مذہب میں یہ دونوں اقوال ہیں۔

جہاں تک خاموش رہنے کا سوال ہے تو روزے میں یا اعتکاف میں مطلقاً بات چیت چھوڑ دینا اور مکمل خاموشی اختیار کر لینا ناپسندیدہ بدعت ہے۔ اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔

لیکن کیا یہ حرام ہے یا مکروہ؟ حنبلی مذہب میں اس کے متعلق دو اقوال ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ احمس قبیلے کی ایک عورت کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ خاموش ہے، بات نہیں کرتی۔ انھوں نے اس سے کہا: ''یہ جائز نہیں۔ یہ جاہلیت کا عمل ہے۔''[2] صحیح بخاری ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دھوپ میں کھڑا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ یہ ابو اسرائیل ہے۔ اس نے دھوپ میں کھڑے رہنے، سائے میں نہ آنے، بات نہ کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے کہو! بیٹھ جائے، سائے میں آئے، بات کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔''[3]

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاموش رہنے کی نذر ماننے کے باوجود بات کرنے، کھڑا رہنے کی نذر ماننے کے باوجود بیٹھنے، سائے میں نہ آنے کی نذر ماننے کے باوجود سائے میں آنے کا حکم دیا اور صرف روزہ پورا کرنے کا حکم دیا، جس سے صریحاً یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام اعمال اس قرب میں شامل نہیں جس کے حصول کے لیے نذر ماننے والے کو حکم دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤١) مسند أحمد (٢٨/٥) المعجم الكبير (٣٥٨/٢٢) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٦)

«مَنْ نَذَرَ أَنْ يُّطِيعَ اللّٰهَ فَلْيُطِعْهُ، وَمَنْ نَذَرَ أَنْ يَّعْصِيَ اللّٰهَ فَلَا يَعْصِهِ» [1]

''جس نے اللہ کی اطاعت کرنے کی نذر مانی تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اس کی نافرمانی کی نذر مانی تو وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''

اسی طرح نذر ماننے والے کو خاموش رہنے کی نذر ماننے پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، جو انسان اس کو بطورِ عبادت، قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ اور اللہ کی طرف پہنچانے والا دین اور طریقہ اختیار کر کے کرتا ہے، وہ گمراہ، جاہل اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کا مخالف ہے۔

یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ جو انسان اعتکاف وغیرہ کی نذر مانتا ہے تو وہ بطورِ دین اور ثواب ہی یہ کام کرتا ہے، لہٰذا جو خاموشی کی نذر مانتا ہے، اس کا مطمحِ نظر بھی یہی ہوتا ہے اور یہ حرام ہے، کیوں کہ ایسا انسان ایسے کام کو نیکی سمجھ رہا ہوتا ہے جو نیکی ہوتی ہی نہیں۔ وہ اس کام کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی پسند ہی نہیں، لہٰذا یہ حرام ہوا۔ تاہم جس نے علم سے پہلے یہ کام کیا، وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے معذور سمجھا جا سکتا ہے۔ جب اس کو علم ہو جائے، پھر اس کو توبہ کر لینی چاہیے۔

کلام اور بات چیت کے حوالے سے بڑی جامع نصیحت اس حدیث شریف میں ذکر ہوئی ہے۔ ارشادِ رسول ہے: ''جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔'' [2] اچھی بات کہنا تو فرض ہے یا مستحب اور اس میں خاموش رہنا بہتر نہیں، لیکن جو فرض ہو نہ واجب، اس سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بزرگ نے اپنے ساتھی سے کہا: ''شر کے بارے میں بات کرنے سے خاموشی بہتر ہے۔'' کسی دوسرے کا قول ہے: ''اچھائی کی بات خاموشی سے بہتر ہے۔'' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ [المجادلة: ٩]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو اور نیکی اور تقویٰ کی سرگوشی کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ١١٤]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧)

''ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کے جو کسی صدقے یا نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے اور جو بھی یہ کام اللہ کی رضا کی طلب کے لیے کرے گا تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔''

سنن میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ابن آدم کی ہر بات اس کے خلاف ہے، حق میں نہیں، مگر وہ بات جو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر یا ذکرِ الٰہی پر مشتمل ہو۔''[1]

جہاں خاموشی کی فضیلت پر بہت سی احادیث وارد ہیں وہیں اچھی بات کی اہمیت، اور جہاں بات کرنا ضروری ہو وہاں خاموشی اختیار کرنے کے ناجائز ہونے پر بھی بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں، چاہے انسان اس کو دینی مقام دے یا نہ دے، جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ انسان کو انہی کاموں سے محبت رکھنی چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں اور ان سے نفرت رکھنی چاہیے جو ان کو ناپسند ہوں۔ جو شریعت میں مباح ہے، اس کو مباح سمجھا جائے اور جو حرام ہے اسے حرام۔

مسنون اعتکاف کا طریقہ:

اعتکاف کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«مَا زَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ یَعْتَكِفُ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰهُ»[1]

''رسول اللہ ﷺ اپنی وفات تک آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے۔''

اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ رہے اور بطورِ ادا یا بطورِ قضا اعتکاف کرتے رہے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ثابت ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے اعتکاف کرنا چاہا تو آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ اعتکاف کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ ان میں سے کچھ کا ارادہ محض فخر و مباہات کا ہے تو آپ ﷺ نے خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا اور اس سال اعتکاف چھوڑ دیا۔ بعد میں شوال میں اس کی قضا دی۔[3]

آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں نو مرتبہ رمضان کے روزے رکھے۔ دو ہجری میں رمضان کی فرضیت ہوئی۔ اس سے پہلے آپ ﷺ نے عاشورے کا روزہ رکھا اور ایک مرتبہ لوگوں کو اس کا روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ ربیع الاول کے مہینے میں مدینے پہنچے۔ محرم گزر چکا تھا، اس لیے اس سال آپ ﷺ نے اس روزے کا حکم نہ دیا۔ دوسرے سال

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٧٤) السلسلة الضعيفة (١٣٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٧٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٧٢)

آپ ﷺ نے اس کے روزے کا حکم دیا تھا، لیکن کیا یہ فرض تھا یا مستحب، اس میں اختلاف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ فرض تھا۔ دن کے دوران میں اس کی ابتدا کی گئی، رات ہی کو ان کو نہیں کہا گیا تھا۔

سال کے دوران میں رجب بھی آیا، اور دیگر مہینے بھی اور جب رمضان آیا تو اس کے روزے فرض کر دیے گئے۔ اسی سال رمضان کے مہینے میں جو فرضیت کا پہلا سال تھا، سترہ رمضان کو جمعہ کے دن غزوۂ بدر ہوا۔ فتح کے بعد آپ ﷺ تین دن تک وہیں رکے۔ اس کے بعد مدینے واپسی کا سفر شروع کیا اور آخری عشرہ بھی شروع ہو گیا۔ آپ ﷺ کو آخری عشرے سے چند دن ہی مل سکے اور آپ ﷺ رمضان کے مکمل ہونے تک قیدیوں کے معاملات اور فدیے کے امور نپٹاتے رہے۔ جب آپ ﷺ نے فدیے کے معاملے میں صحابہ سے مشورہ کر لیا، تب اپنے گھر داخل ہوئے، اس لیے اس سال آپ ﷺ نے آخری عشرے کا اعتکاف نہ کیا۔ آپ ﷺ کے جو حالات منقول ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے وہ پورا عشرہ اعتکاف نہ کیا، لیکن یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے اس کی قضا دی ہو، جس طرح آپ ﷺ نے اپنے روزے کی قضا دی۔ نیز آپ ﷺ نے اس سال بھی اس کی قضا دی جس سال آپ ﷺ کی ازواج نے آپ ﷺ کے ساتھ اعتکاف کرنا چاہا اور آپ ﷺ نے خیمے اکھڑوا دیے۔

مزید برآں آٹھ ہجری کو فتح مکہ والے سال بھی آپ ﷺ نے رمضان میں سفر کیا اور رمضان کے دوران ہی میں مکہ میں داخل ہوئے۔ رمضان کے ابھی کچھ دن باقی تھے۔ آپ ﷺ مکہ میں فتح کے معاملات، مکہ کے اردگرد چھوٹے چھوٹے لشکر بھیجنے، مکہ میں اصولِ اسلام کے نفاذ اور غزوۂ ہوازن کی تیاری میں مصروف رہے۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں انیس راتیں قیام کیا اور نماز قصر کرتے رہے۔

علما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مکہ میں غزوۂ ہوازن کی وجہ سے قیام نہ کیا۔ آپ ﷺ وہاں مسافر تھے اور اس سال مکہ میں اعتکاف کے لیے فارغ نہ ہو سکے۔ ان تین سالوں میں آپ ﷺ نے رمضان میں اعتکاف نہ کیا۔ اس ایک سال کی قضا دی جس سال آپ ﷺ نے اعتکاف کرنا چاہا، لیکن خیمے اکھڑوا دیے۔ باقی دو سالوں کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ ﷺ نے روزے کے ساتھ ان کی قضا دی یا نماز کے ہر ایک حصے کے ساتھ نہ دی، کیوں کہ حدیث میں ہے: ''جب بندہ بیمار ہو جائے یا سفر کرے، اس کے لیے وہ عمل لکھ دیا جاتا ہے جو وہ صحت کی حالت یا اقامت کی حالت میں کرتا تھا۔''[1] ایک حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ اور نماز کا ایک حصہ ختم کر دیا ہے۔''[2] یعنی روزہ ادا کر کے اور نماز کا ایک حصہ ادا اور قضا دونوں کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٣٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٠٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧١٥) صحيح الجامع (١٨٣٥)

ساتھ، تو اعتکاف ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کے ساتھ ملحق ہے۔

یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے سفر کی وجہ سے اعتکاف کی قضا دی ہو، لہٰذا جواز ثابت نہیں ہوتا، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے عموم کی وجہ سے امکان باقی رہتا ہے۔ واللہ أعلم [1]

صوم دہر کا مفہوم اور حکم

سوال نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «مَنْ صَامَ الدَّهْرَ فَكَأَنَّهُ لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ» [2] ''جس نے صومِ دہر یعنی سارا سال روزے رکھے گویا اس نے روزہ رکھا نہ افطار ہی کیا۔'' کیا آپ ﷺ کا فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس طرح روزہ رکھنے سے روزے کی مشقت ختم ہو جاتی ہے یا یہ مراد ہے کہ اس کا کوئی ثواب ہوتا ہے نہ گناہ؟

جواب اس کا جواب اس قاعدے پر مبنی ہے کہ صومِ دہر جس کا ذکر رسول کریم ﷺ نے کیا ہے، کیا یہ دو عیدوں اور منیٰ کے تین ایام اور کل ملا کر پانچ ممنوع ایام کو چھوڑ کر باقی سارا سال بلا انقطاع تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنے کا نام ہے یا بشمول ان ممنوع ایام کے سارا سال بلا انقطاع تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنا منع ہے؟

یہاں علما کے دو مشہور اقوال ہیں:

1. صوم الدہر ان پانچ ایام کا روزہ رکھنے کی وجہ سے مکروہ ہے، لہٰذا اگر کوئی ان پانچ ایام کا روزہ نہیں رکھتا ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ اکثر فقہا و عباد کا قول ہے، بلکہ امام مالک، شافعی اور احمد وغیرہ سے بھی منقول ہے۔

   ان فقہا میں سے امام شافعی سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنا ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنے سے افضل ہے۔

2. جو شخص ہمیشہ بلا انقطاع روزے رکھتا ہے وہ صوم الدہر کے زمرے میں آتا ہے، خواہ ممنوع یا پانچ ایام کے روزے نہ رکھتا ہو، یہ بھی اہلِ علم کے کچھ گروہوں کا قول اور رائے ہے اور یہی درست ہے، کیوں کہ اگر رسول کریم ﷺ کی مراد پانچ دنوں کا استثنا ہوتا تو آپ ایسے روزے کا ذکر نہ کرتے جو تین سو پچاس دنوں سے زیادہ ایام پر مشتمل ہو اور اس میں سے صرف پانچ دنوں کے روزے کی کراہت مراد لیتے، آپ ﷺ کے الفاظ حقیقت اور مجاز میں اس مفہوم کا احتمال نہیں رکھتے، نیز ان پانچ ایام کے دن کے روزے کی ممانعت انھی کے ساتھ خاص ہے، چاہے کوئی ان کے علاوہ دیگر ایام کے روزے رکھے یا نہ رکھے۔ اگر کوئی انسان صرف ان پانچ ایام کے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۹۰_۲۹۷)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۶۲)

روزے رکھتا ہے اور آگے پیچھے کوئی روزہ نہیں رکھتا تو اس کو اس سے منع کیا جائے گا، چاہے وہ صوم الدھر نہ رکھتا ہو، پھر اگر کوئی شخص ان ایام کے روزے نہیں رکھتا تو اس کو اس اساس پر منع نہیں کیا جائے گا چاہے وہ سارا سال روزے رکھتا رہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں اس شخص کو روکنے میں صوم الدھر یعنی سارے سال کے روزے رکھنے کی کوئی تاثیر نہیں۔

مزید یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں کا روزہ عید کے ایام ہونے کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے اور ان کے روزے کے بارے میں یہ نہیں کہا: ''نہ اس نے روزہ رکھا نہ چھوڑا'' مگر صوم الدھر کے بارے میں آپ نے یہ بات فرمائی ہے۔

اسی طرح صوم الدھر کو ساری رات کے قیام کی ممانعت اور تین دن سے پہلے ختم قرآن کی ممانعت سے جوڑ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے جس طرح وہاں سارا وقت ایک ہی عبادت میں صرف کرنے سے منع کر دیا گیا اور ایک تہائی، دو تہائی اور نصف وقت کی اجازت دی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی سارے سال کی ممانعت مراد ہے، صرف پانچ دنوں کا استثنا نہیں اور ایک تہائی، دو تہائی اور زیادہ سے زیادہ نصف کی اجازت ہے جس طرح عبداللہ بن عمرو اور ابو قتادہ کی حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

رہا وہ قول جس میں صوم الدھر کو صیامِ داود علیہ السلام سے، جو بہترین روزے ہوتے ہیں، افضل کہا گیا ہے تو اس میں صریح سنت کے مقابلے میں رائے کو ترجیح دی گئی ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس تقریر کی بنا پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صوم الدھر پر عمل نہ کرنا اولیٰ ہے یا یہ مکروہ اور ممنوع ہے؟ امام احمد وغیرہ کے مذہب میں اس سے متعلق دو آرا ہیں۔

جن کے نزدیک اس پر عمل نہ کرنا اولیٰ ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں کیا، لیکن یہ فرمایا: جو اس پر عمل کرتا ہے گویا اس نے روزہ رکھا نہ افطار کیا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اس پر عمل کرتا ہے اس کو اس کا عادی ہونے کی وجہ سے روزے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ اس لذت کو حاصل کر پاتا ہے جو روزہ نہ رکھنے والے حاصل کرتے ہیں، یعنی نہ وہ اس کے ساتھ دینی فائدہ حاصل کر پاتا ہے اور نہ دنیاوی، اس لیے اس پر عمل نہ کرنا ہی اولیٰ اور زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث ہے: ((مَنْ صَامَ الدَّهْرَ ضُيِّقَتْ عَلَيْهِ جَهَنَّمُ)) [1] ''جو صوم دہر رکھتا ہے اس پر جہنم تنگ کر دی جاتی ہے۔'' کیوں کہ تسلسل کے ساتھ روزہ رکھنے کی وجہ سے جہنم کے دروازے اس پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ دوسری رائے کے مطابق اس پر عمل کرنا مکروہ ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو اس

[1] مسند أحمد (٤/٤١٤) یہ روایت موقوف ہے۔

سے منع کیا تھا اور فرمایا تھا: اگر تو نے اس پر عمل کیا تو تیری آنکھیں اندر کو دھنس جائیں گی، دل اکتا جائے گا اور فرمایا:

''تجھ پر تیرے نفس کا حق بھی ہے، بیوی کا حق بھی ہے۔ پس ہر ایک حق والے کو اس کا حق دے۔''[1]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے بیان کیا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے یا اس کی وجہ سے کوئی لازمی حق چھوٹ سکتا ہے، اس لیے اس طرح کے کام سے منع کیا جائے، کیوں کہ مشروع اور جائز اعمال میں ان کی مصلحت کا ان کی مفسدت پر راجح ہونا ضروری ہے۔ اس اساس پر کہا جا سکتا ہے کہ صومِ دہر کچھ لوگوں کے لیے حرام ہوگا جو اس کی وجہ سے کسی واجب کو چھوڑ دیں یا نفس کو نقصان پہنچانے جیسے کسی حرام کام کا ارتکاب کر بیٹھیں۔

ایسے لوگوں کے لیے مکروہ ہوگا جو اس کی وجہ سے مکروہ افعال کے عادی ہو جائیں یا مامور کو مکروہ انداز میں کرنا سیکھ لیں، مثلاً کوئی شخص اس کی وجہ سے بدخلق بن جائے اور خوف ہو کہ گھر والوں سے بھی بدسلوکی کرے گا یا بے دلی سے نمازیں پڑھنے لگ جائے۔

البتہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں طرح کے مفاسد سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اس کی حیثیت وہی ہے کہ نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ افطار ہی کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کی وجہ سے کسی واجب یا مستحب کو ترک نہیں کرتے اور اس کی وجہ سے کسی حرام یا مکروہ کام کا ارتکاب بھی نہیں کرتے۔ ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کو اس کا ثواب ملتا ہے نہ گناہ۔ اسلاف میں جو اس پر عمل پیرا تھا ممکن ہے ان کو غلطی کے باوجود حسنِ نیت اور اجتہاد کا ثواب ملے۔ یا ممکن ہے وہ تسلسل کے ساتھ اس پر عمل نہ کرتے ہوں، کبھی کر لیتے ہوں اور کبھی چھوڑ دیتے ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے اگرچہ وہ نیکیوں کے حصول میں اس سے فائدہ نہ اٹھا پائے ہوں، مگر انھوں نے اس کے ذریعے گناہ چھوڑنے میں معاونت حاصل کی ہو، کیوں کہ اگر انسان نے روزہ نہ رکھا ہو تو وہ گناہ کر لیتا ہے۔ شاید اس وجہ سے وہ مسلسل روزہ رکھتے ہوں کہ اگر نیکی نہیں ملی تو گناہ بھی نہیں کیا اور گناہوں سے سلامتی بھی ایک مطلوبہ چیز ہے۔ بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ صومِ دہر کی ممانعت عمومی نہیں، بلکہ عبداللہ بن عمرو وغیرہ جیسے خاص معاملے میں وارد ہوئی ہے، عمومی طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ «لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ» ''اس نے روزہ رکھا نہ چھوڑا'' سائل نے جو یہ پوچھا ہے کہ کیا یہ مشقت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے یا ثواب و گناہ کے نہ ہونے کے اعتبار سے؟ تو جواب ہے: یہ روزے کے فائدے اور مقصود کے انتفا اور نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ثواب کا انتفاء اور نہ ہونا مقصود کے انتفا کے تابع ہے، کیوں کہ جس عمل کا مقصود حاصل نہ ہو، اس کا ثواب بھی وجود نہیں رکھتا، مثلاً حدیث شریف میں ہے: ''جس نے جھوٹی بات اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٦٧)

اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا، اللہ کو اس کے بھوکے پیاسے ہونے کی کوئی حاجت نہیں۔''[1] اسی طرح ایک حدیث میں ہے: کچھ ایسے روزے دار بھی ہوتے ہیں جن کو روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔[2] اس کے باوجود اس شخص سے روزے کی وجہ سے سزا دور کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ روزہ نہ رکھتا تو سزا پاتا، اور اگر متقیوں جیسا روزہ رکھتا تو ثواب پاتا۔ معلوم ہوا جب اس نے فاجروں اور نافرمانوں جیسا روزہ رکھا تو اس کی وجہ سے اس کو سزا تو نہیں ملے گی، لیکن ثواب بھی نہیں ملے گا، کیوں کہ ایک طرف اس کا عمل اچھا تھا تو دوسری طرف برا اور حساب برابر۔

صائم الدھر یعنی سارا سال تسلسل سے روزہ رکھنے والا حقیقت میں اپنے دن کو بھی رات بنا دیتا ہے اور اس کا عادی ہو جاتا ہے، اس لیے اس شخص کو روزے کی وجہ سے تقویٰ حاصل نہیں ہوتا جو اس کا اصل مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٨٣]

''تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ۔'' واللہ أعلم[3]

میلاد النبی کے موقع پر ختم قرآن کا حکم

سوال ایک شخص ہر سال میلاد النبی کے موقع پر قرآن مجید ختم کرتا ہے، کیا اس کا یہ عمل مستحب ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ. عیدین اور ایامِ تشریق کے موقع پر کھانے کے لیے لوگوں کو جمع کرنا سنت اور اسلامی شعار ہے۔ رمضان میں غریبوں کو کھانا کھلا کر ان کی مدد کرنا بھی اسلام کی ایک سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ))[4]

''جس نے روزے دار کو افطاری کرائی اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا روزے دار کو ملتا ہے۔''

غریب قراء کو دینا، ان کی مدد کرنا بھی نیک عمل ہے اور جو ان کی معاونت کرتا ہے، اجر میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ لیکن غیر شرعی مواقع کے علاوہ اپنی طرف سے ایسے مواقع گھڑ لینا، بدعت ہے۔ سلف نے انھیں اچھا سمجھا ہے نہ ان پر عمل کیا ہے، جیسے: ربیع الاول کے مہینے میں میلاد النبی کی رات، رجب کی کوئی رات، ۱۸ ذوالحجہ کا دن، رجب کا پہلا جمعہ یا آٹھ شوال جسے جاہل نیکیوں کی عید کا نام دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ یہ سب بدعات ہیں۔ واللہ أعلم[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٤)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٩٠) صحيح الجامع (٣٤٨٨)

[3] جامع المسائل (٩/٢٣١-٢٣٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٦) صحيح الجامع (٦٤١٤، ٦٤١٥)

[5] مجموع الفتاوىٰ (٢٥/٢٩٨)

عاشورا کے دن کیے جانے والے اعمال کی حقیقت

سوال لوگ عاشورے کے دن سرمہ لگاتے ہیں، نہاتے ہیں، منہدی لگاتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، چیزیں پکا کر تقسیم کرتے ہیں اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں، کیا کسی صحیح حدیث میں ان چیزوں کا ذکر ہوا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا یہ کام بدعت ہوں گے یا نہیں؟ پھر ان کے عکس ایک دوسرا گروہ غم اور ماتم کا اظہار کرتا ہے، پیاسا رہتا ہے، نوحہ گری کرتا ہے، پیٹتا ہے، کیا ان کاموں کی کوئی دلیل ہے یا نہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

ان کاموں میں سے کوئی کام بھی کسی صحیح حدیث میں ذکر نہیں ہوا اور کسی صحابی سے بھی منقول نہیں۔ ائمہ اسلام اور ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی امام سے یہ اعمال ثابت نہیں، کتبِ احادیث کی جتنی اقسام ہیں، ان میں سے کسی کتاب میں بھی ایسی کوئی صحیح یا ضعیف حدیث نہیں ملتی، بلکہ قرونِ اولیٰ میں اس طرح کی کوئی حدیث معروف نہیں تھی۔ بعد میں آنے والے کچھ لوگوں نے اس طرح کی کچھ روایات ذکر کی ہیں جن میں ذکر ہوا ہے: جو شخص عاشورے کے دن سرمہ لگائے اس سال میں وہ آشوبِ چشم میں مبتلا نہیں ہوگا۔ جو عاشورے کے دن نہائے وہ اس سال بیمار نہیں ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

متاخرین نے عاشورا کے دن نمازِ عاشورا کی فضیلت میں بھی روایات نقل کی ہیں۔ ایک روایت میں ہے: اس دن آدم علیہ السلام نے توبہ کی، نوح علیہ السلام کا سفینہ جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہرا، یوسف علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کو واپس مل گئے، ابراہیم کو آگ سے نجات ملی اور مینڈھے کے فدیے کے عوض، ذبیح (اسماعیل علیہ السلام) ذبح ہونے سے بچ گئے۔

ایک من گھڑت روایت یہ بھی ذکر کی جاتی ہے کہ "جو شخص عاشورا کے دن اپنے اہل و عیال کو فراخی مہیا کرتا ہے، اللہ سارا سال اس کو فراخی سے رکھتا ہے۔"[1] یہ ساری روایات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر گھڑی گئی ہیں اور جھوٹی ہیں۔

یہ روایت سفیان بن عیینہ عن ابراہیم بن محمد بن منتشر عن ابیہ کی سند سے ذکر کی جاتی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن محمد بن منتشر کوفی ہے۔

اہلِ کوفہ میں دو گروہ تھے، ایک رافضی جو اہلِ بیت کے ساتھ عقیدت و محبت کا اظہار کرتے تھے، لیکن دلی طور پر ملحد زندیق یا جاہل اور خواہش پرست تھے۔ دوسرا ناصبیوں کا گروہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے نفرت کرتا تھا، کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے نتیجے میں پھوٹنے والے فتنے میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں اور وہ ان کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

---

[1] شعب الإيمان (٣٦٥/٢، ٣٦٦) المعجم الكبير (٧٧/١٠) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٨٧٣)

«سَيَكُونُ فِي ثَقِيفٍ كَذَّابٌ وَمُبِيرٌ» [1]

''ثقیف میں ایک کذاب ہوگا، دوسرا مبیر (سفاک، ظالم)۔''

کذاب، مختار بن عبید ثقفی تھا، وہ اہلِ بیت کی عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ اس نے عراق کے گورنر عبید اللہ بن زیاد کو قتل کیا، جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا لشکر ترتیب دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے نبوت اور جبرائیل کے نزول کا دعویٰ کیا۔ لوگوں نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ﴾ [الشعراء: ۲۲۱، ۲۲۲]

''کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گنہگار پر اترتے ہیں۔''

مبیر، حجاج بن یوسف تھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف تھا۔ پہلا رافضی تھا اور یہ دوسرا ناصبی۔ پہلے کا جھوٹ، افترا پردازی اور الحاد زیادہ خطرناک تھا، کیوں کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرا ہر ایسے شخص کے لیے موت کا فرشتہ ثابت ہوتا جو اس کے امیر اور سربراہ عبدالملک بن مروان کی نافرمانی کے الزام میں نامزد ہوتا۔

کوفے میں ان دونوں گروہوں کے درمیان لڑائی اور فتنہ فساد جاری رہتا۔ عاشورا کے دن ہی ظالم اور باغی گروہ نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت کے مرتبے پر فائز کیا، جس طرح اہلِ بیت کے دیگر افراد، حضرت حمزہ، حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کے ذریعے ان کا مقام و مرتبہ سربلند کیا۔ وہ اور ان کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں۔ بلند مرتبے آزمایش کے بغیر نہیں ملتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کن لوگوں کی آزمایش سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ''انبیا، پھر صالحین، پھر درجہ بدرجہ بہتر لوگوں کی۔ آدمی اپنے دین کے مطابق ہی آزمایا جاتا ہے۔ اگر اس کے دین میں مضبوطی ہو تو اس کی آزمایش بڑھا دی جاتی ہے اور اگر اس کے دین میں نرمی ہو تو اس کی آزمایش میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ مومن مسلسل آزمایش سے گزرتا رہتا ہے، حتی کہ وہ زمین پر اس حالت میں چلتا ہے کہ اس کی کوئی غلطی نہیں رہتی۔'' (رواہ الترمذی) [2]

چنانچہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے بلند مرتبہ لکھ دیا تھا اور ان کو اس طرح کی آزمایش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جس سے ان کے پاکیزہ اور قابلِ احترام بزرگ گزرے۔ وہ جب پیدا ہوئے، اس وقت اسلام سربلند

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۴۵)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۳۹۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۰۲۳) السلسلة الصحيحة (۱۴۳)

تھا۔ انھوں نے عزت اور کرامت کے سائے تلے تربیت پائی۔ مسلمان ان کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اس وقت وہ کم سن تھے اور سمجھ داری کی عمر کو نہیں پہنچے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام کیا کہ ان کو ایسی آزمایش سے گزارا جس کے ساتھ وہ اپنے بزرگوں اور آبا و اجداد کے ساتھ جا ملے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے باپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی آزمایا جو ان دونوں سے افضل ہیں اور وہ شہید کیے گئے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اسی طرح لوگوں میں فتنوں اور شورش کا باعث بنی، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی وجہ سے فتنوں کی آگ پھیل گئی اور امت آج تک فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

«ثَلَاثٌ مَنْ نَجَامِنْهُنَّ فَقَدْ نَجَا: مَوْتِي وَقَتْلُ خَلِيْفَةٍ مُضْطَهدٍ وَالدَّجَّالُ»[1]

''جو شخص تین سے نجات پا گیا وہ (حقیقت میں) نجات پا گیا: میری موت، مظلوم خلیفہ کا قتل اور دجال۔''

رسول اللہ ﷺ کی موت بہت سے لوگوں کے فتنے میں مبتلا ہونے اور ارتداد کا بہت بڑا سبب تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا اور ان کے ذریعے ایمان میں استقامت پیدا ہوئی اور پہلی سی حالت پھر قائم ہو گئی۔ مرتدوں کو اسی دروازے سے داخل کیا گیا جس سے وہ نکلے تھے۔ اہلِ ایمان کو اسی دین پر ثابت قدم کیا جس میں وہ داخل ہوئے تھے، جس میں دشمنانِ خدا کے خلاف سختی اور جہاد تھا اور خدا کے محبوب بندوں کے لیے نرمی۔ ان جیسے اقدام کی بنا پر وہ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ثابت ہوئے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے جنھوں نے مجوسیوں، اہلِ کتاب اور دیگر کافروں کو مغلوب کیا، اسلام کو عزت دی، شہر آباد کیے، وظائف مقرر کیے، محکمے قائم کیے، عدل کا بول بالا کیا، سنت کو نافذ کیا اور اسلام اس طرح غالب ہوا جس سے مندرجہ ذیل آیات اور احادیث کی تصدیق ہو گئی:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾

[الفتح: ٢٨]

''وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ گواہ کے طور پر کافی ہے۔''

نیز فرمایا:

[1] مسند أحمد (١٠٥/٤، ١٠٦، ١٠٩، ١١٠، ٢٣/٥، ٢٨٨) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٦٤٥/٧) میں کہا ہے کہ اسے احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے۔ احمد کے رجال صحیح والے رجال ہیں سوائے ربیعہ بن لقیط کے اور وہ ثقہ ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ﴾ [النور: ٥٥]

''اللہ نے ان لوگوں میں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا، جس طرح ان لوگوں کو جانشین بنایا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور ہی اقتدار دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اور ہر صورت میں انھیں ان کے خوف کے بعد بدل کر امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہو گا۔ جب قیصر ہلاک ہو گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہو گا۔ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ان دونوں کے خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے جائیں گے۔''[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ وہ شخصیت تھے، جنھوں نے ان دونوں کے خزانے خرچ کیے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے یہ خزانے اللہ کی راہ میں خرچ کیے تھے اور وہ خلیفہ راشد اور ہدایت یافتہ تھے۔

اس کے بعد انھوں نے خلیفہ کے انتخاب کا معاملہ چھے رکنی مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دیا تو مہاجرین اور انصار نے متفقہ طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام پیش کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کام کے لیے کوئی ترغیبی مہم چلائی نہ ڈرانے دھمکانے کا ہتھیار استعمال کیا۔ تمام لوگوں نے راضی وخوشی اور کسی طرح کی ناپسندیدگی کے بغیر ان کی بیعت کر لی۔ آپ کی خلافت کے آخری ایام میں ایسے اسباب رونما ہوئے جن کے نتیجے میں جاہل اور سرکش قسم کے لوگ اہلِ علم پر غالب آ گئے اور انھوں نے شر پسندی اور فتنہ انگیزی کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیے جن کے نتیجے میں خلیفہ کو کسی ایسے سبب کے بغیر جس کی رو سے اس کا خون بہانا جائز ہوتا، مظلومانہ قتل کر دیا اور انھوں نے بڑے صبر اور ثواب کی امید کے ساتھ ان تمام حالات کا مقابلہ کیا، لیکن کسی مسلمان کو قتل نہ کیا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو دل جدا جدا ہو گئے، بے چینیاں بڑھ گئیں، شر پسند غالب آ گئے، اچھے اور شریف رسوا ہو گئے۔ ہر اس شخص نے فتنے کی آگ میں ایندھن ڈالا جو ڈال سکتا تھا اور اصلاح پسند اور بھلائی کے طالب بے دست و پا ہو گئے۔ ان حالات میں لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی جو اس وقت باقی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٩٥٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩١٨)

رہنے والے لوگوں میں سے سب سے بہتر اور خلافت کے زیادہ حق دار تھے، لیکن دل بکھرے ہوئے تھے، فتنے کی آگ بھڑک رہی تھی، اس لیے لوگوں کا اتفاق نہ ہو سکا اور خلیفہ اور امت کے بہترین لوگ بھلائی کو قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ اس فرقہ بندی اور فتنہ پسندی میں کئی اقوام داخل ہو گئیں اور ایک حروریہ نامی جماعت سامنے آئی جو کثرتِ صوم و صلاۃ اور تلاوتِ قرآن میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، لیکن ان کا دین سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ وہ اس سے نکل چکے تھے۔ انھوں نے حضرت علی اور ان کے ساتھیوں سے جنگ کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مصداق ان سے جنگ کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''تم اپنی نماز کو ان کی نماز، اپنے روزے کو ان کے روزے اور اپنی تلاوت کو ان کی تلاوت کے سامنے حقیر سمجھو گے، اس کے باوجود ان کی تلاوت ان کے حلق سے آگے نہیں جائے گی، وہ اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے، تم جہاں ان کو پاؤ، ان کو قتل کرو، جو ان کو قتل کرے گا اس کو اللہ کے ہاں قیامت کے دن اجر ملے گا۔''[1]

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«تَمْرُقُ مَارِقَةٌ عَلَى حِينَ فُرْقَةٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، يَقْتُلُهُمْ أَدْنَى الطَّائِفَتَيْنِ إِلَى الْحَقِّ»[2]

''مسلمانوں کی تقسیم کے موقع پر ایک جماعت نکلے گی جو دین سے خارج ہو گی، ان کو دو گروہوں میں سے وہ گروہ قتل کرے گا جو حق کے زیادہ نزدیک ہو گا۔'' (متفق علیہ)

یہ حروریہ ہی مارقہ (خارجی) جماعت تھی۔ جب مسلمانوں کے درمیان تقسیم ہو گئی تھی، لیکن یاد رہے کہ مومنوں کے درمیان لڑائی ان کو ایمان سے خارج نہیں کرتی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ﴾ [الحجرات: ٩، ١٠]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤١٤، ٣٤١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤، ١٠٦٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آپس کی لڑائی اور بغاوت کے باوجود وہ مومن اور بھائی بھائی ہیں۔ ان کے درمیان صلح کرا دی جائے۔ اگر ایک گروہ سرکشی اختیار کرے تو اس سرکش اور باغی جماعت کی سرکوبی کی جائے، لیکن لڑائی کا آغاز نہ کیا جائے۔

حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ دین سے نکلنے والے گروہ کو دو گروہوں میں سے وہ گروہ قتل کرے گا جو حق کے زیادہ نزدیک ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں ہی نے ان خارجیوں کو قتل کیا تھا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ وہ حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کی نسبت حق کے زیادہ قریب تھے، لیکن تھے دونوں گروہ ہی مومن۔

انہی خارجیوں میں عبدالرحمان بن ملجم نامی ایک شخص تھا جس نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہادت وعزت کا تاج پہنایا۔ ان کے بعد مسلمانوں نے ان کے بیٹے حضرت حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح ان کی وہ فضیلت بھی ظاہر ہوگئی جو اس صحیح حدیث میں مذکور ہے: ''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا۔''[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ان کی تعریف پر مشتمل ہے، نیز اس بات کی دلیل بھی ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان صلح کروانا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔

اس کے بعد وہ فوت ہوگئے اور اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت واکرام میں منتقل ہوگئے تو کچھ گروہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے خط کتابت کی اور انھیں نصرت و معاونت کی یقین دہانی کروائی، لیکن وہ عہد شکن لوگ تھے۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا زاد کو ان کے پاس بھیجا تو انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا اور ان لوگوں کو پکڑوا دیا جنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ساتھ دینے کی یقین دہانی کروائی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم جیسے صائب الرائے اور مخلص بزرگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ نہ جانے اور ان کی پیش کش قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا، کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا وہاں جانا ٹھیک نہیں، اس کا انجام خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا اور اللہ کی تقدیر غالب آ گئی۔

جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفے کے لیے نکل پڑے اور انھوں نے دیکھا کہ صورتِ حال بدل چکی ہے تو انھوں نے تین مطالبے کیے: ایک یہ کہ انھیں واپس جانے دیا جائے، دوسرا یہ کہ انھیں کسی سرحدی علاقے میں جہاد کے لیے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٧)

جانے دیا جائے اور تیسرا یہ کہ انھیں اپنے عم زاد یزید سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔ لیکن ان کی کوئی درخواست بھی قبول نہ کی گئی بلکہ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ وہ بھی لڑے اور ان کے ساتھ کچھ لوگ بھی اور آخر کار انھیں مظلومانہ شہید کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی شہادت کے بلند مرتبے پر فائز کر کے ان کے اہلِ بیت اور پاکیزہ خانوادے کے ساتھ ملا دیا اور جنھوں نے آپ کو ظلم و زیادتی کا شکار بنایا، ان کو رسوا کر دیا۔ نیتجتاً لوگوں میں شر اور افتراق پھیل گیا اور ظالم اور جاہل لوگوں کے دو گروہ بن گئے، ایک ملحد و منافق اور دوسرا گمراہ و گم گشتہ۔ انھوں نے حسین رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت کی محبت و عقیدت کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

عاشورا، یعنی دسویں محرم کو ماتم، غم اور نوحے کا دن قرار دیا اور اس دن گریبان چاک کرنے، گریہ کرنے اور سینہ کوبی جیسے زمانۂ جاہلیت کے اندازِ ماتم کو اپنا امتیازی نشان اور شعار بنا لیا۔ مصیبت اور دکھ اگر تازہ ہو تو اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ صبر کیا جائے، ثواب کی امید رکھی جائے اور "إنا لله وإنا إليه راجعون" پڑھا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٥٥ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝١٥٦ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٥-١٥٧]

''اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دے۔ وہ لوگ کہ انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے کئی مہربانیاں ہیں اور بڑی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رخساروں پر تھپڑ مارے، گریبان چاک کیے اور جاہلیت کی آوازیں لگائیں، وہ ہم سے نہیں۔''[1]

ایک حدیث میں ہے: ''میں ہر اس عورت سے بری ہوں جس نے (مصیبت کے وقت) آواز بلند کی، سر منڈوایا اور کپڑے پھاڑے۔''[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو اس کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور اس پر گندھک اور خارش کی قمیص ہو گی۔''[3]

مسند میں فاطمہ بنت حسین اپنے باپ حسین کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

نے فرمایا: ''جس آدمی کو بھی کوئی مصیبت پہنچے وہ اپنی مصیبت یاد کرے، چاہے پرانی ہی ہو جائے اور اس وقت ''إنا لله وإنا إليه راجعون'' پڑھے تو اللہ اس کو اتنا ہی اجر دیتے ہیں جتنا اجر مصیبت کے دن ملا تھا۔''[1]

یہ اللہ تعالیٰ کا مومنوں کے لیے انعام و اکرام ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یا کسی کی بھی مصیبت اور سانحے کو اگر ایک طویل عرصے کے بعد یاد کیا جائے تو مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد کی روشنی میں اس وقت إنا لله پڑھنا چاہیے، تاکہ وہ اس جیسے اجر کے مستحق بن جائیں، جو مصیبت کے دن مصیبت زدہ کو ملتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے مصیبت کو یاد کرتے وقت صبر اور ثواب کی امید رکھنے کا حکم دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گمراہوں اور جاہلوں نے شیطان کی ملمع کاری میں آکر عاشورا کے دن ماتم کرنے، نوحہ کرنے، پیٹنے، مرثیے پڑھنے اور جھوٹی کہانیاں بیان کرنے جیسے جو کام اختیار کر لیے ہیں، وہ صحیح ہیں۔ ان لوگوں نے فتنوں، لڑائیوں اور اہلِ اسلام کے خلاف عداوتوں اور نفرتوں کا وہ بازار گرم کر دیا ہے کہ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف بدزبانی کرنا، وسیع پیمانے پر جھوٹ بولنا، فتنے بھڑکانا اور اہلِ اسلام کے خلاف کافروں کی مدد کرنا اس گمراہ فرقے کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ خارجیوں سے بھی برے اور دو ہاتھ آگے ہیں۔ انھی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«يَقْتُلُوْنَ أَهْلَ الْإِسْلَامِ وَيَدْعُوْنَ أَهْلَ الْأَوْثَانِ»[2]

''وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔''

یہ فرقہ اہلِ بیت اور امتِ اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ اور مشرکوں کی مدد کرتا ہے۔ بغداد میں انھوں نے مشرکوں اور تاتاریوں کی اعانت کی۔ عباسی خلیفہ کا تختِ خلافت تاراج کروایا جو خاندانِ رسالت اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھا۔ دیگر اہلِ بیت اور مسلمانوں کو قیدی بنایا گیا، قتل کیا گیا اور دیارِ اسلام ویران کر دیے گئے۔

انھوں نے اہلِ اسلام کو اتنا نقصان پہنچایا ہے کہ کوئی فصیح سے فصیح شخص بھی اس کو اتنا شمار اور بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے مقابلے میں ایک دوسرے گروہ نے جنم لیا جن میں ایک ناصبیوں کا گروہ تھا جو حضرت حسین اور اہلِ بیت کے خلاف عداوت رکھتے تھے اور دوسرے جاہل عوام تھے، جنھوں نے فساد کا فساد سے، جھوٹ کا جھوٹ سے، شر کا شر سے اور بدعت کا بدعت سے مقابلہ کیا۔ ان لوگوں نے عاشورا کے دن خوشی اور مسرت کے مظاہر کی فضیلت میں احادیث گھڑ لیں، سرمہ لگانا، منہدی لگانا، اہل و عیال پر فراخ دلی سے خرچ کرنا اور کھانے تقسیم کرنا نیکی قرار دیا گیا۔ ان لوگوں

---

(1) مسند أحمد (٢١٠/١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٠٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥٥١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

نے دسویں محرم کو عید کی طرح کا خوشی کا تہوار بنالیا اور عقیدت مندوں نے اس دن کو ماتم اور اظہارِ غم کا دن قرار دیا ہے۔

یہ دونوں فرقے ہی غلط اور سنت سے خارج ہیں، اگرچہ وہ زیادہ بدنیت، زیادہ جاہل اور زیادہ ظالم ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے عدل و احسان کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا، بہت سے اختلاف دیکھے گا۔ تو تم میری سنت اور میرے بعد میرے خلفا کی سنت اختیار کرنا، اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا، بدعتوں سے بچو، کیوں کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

اگر رسول اللہ ﷺ کی سنت اور خلفا کی سنت کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس میں عاشورا کے موقع پر خوشی اور مسرت کے مظاہر یا غم و اندوہ کے شعار کا کوئی تذکرہ ملتا ہو۔ صرف اتنی بات ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی عاشورا کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے کہا: اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو غرق ہونے سے بچایا، اس لیے ہم روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم تمھاری نسبت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ (تعلق نبھانے) کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔'' لہٰذا آپ ﷺ نے دسویں محرم کا روزہ رکھا اور اس کا حکم بھی دیا۔[2] نیز قریش جاہلیت میں بھی اس دن کی تعظیم کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ایک دن روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ ربیع الاول کے مہینے میں مدینے تشریف لائے تھے۔ اگلے سال آپ ﷺ نے عاشورا کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا، اسی سال رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشورا کا روزہ منسوخ ہو گیا۔

اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ کیا عاشورا کا روزہ فرض تھا یا مستحب؟ لیکن صحیح ترین قول کے مطابق یہ فرض تھا۔ اس کے بعد یہ مستحب ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی لوگوں کو اس کا روزہ رکھنے کا حکم نہ دیا، بلکہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''یہ عاشورا کا دن ہے، میں اس دن روزہ رکھ رہا ہوں، جو چاہے روزہ رکھ لے۔''[3]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''عاشورا کے دن کا روزہ ایک سال کا کفارہ بنتا ہے اور عرفہ کے دن کا روزہ دو سال کا کفارہ بنتا ہے۔''[4]

آخری عمر میں آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ یہود کے نزدیک یہ دن عید کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٣٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٦٢)

''اگر میں اگلے سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ ضرور رکھوں گا۔''[1] تاکہ یہودیوں کی مخالفت ہو اور دسویں محرم کو عید کی حیثیت دینے میں ان کی مشابہت نہ ہو۔ کچھ صحابہ اور علما اس دن روزہ نہیں رکھتے تھے اور اس کو مستحب بھی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اکیلی دسویں محرم کا روزہ مکروہ سمجھتے تھے جس طرح علمائے کوفہ کے ایک گروہ سے منقول ہے۔ تاہم کچھ علما کے نزدیک یہ مستحب ہے، جب کہ صحیح یہ ہے کہ جو دسویں محرم کا روزہ رکھے اس کے ساتھ نویں کا بھی رکھے، کیوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری امر تھا، کیوں کہ بعض روایات میں اس طرح بھی آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو دسویں کے ساتھ نویں کا بھی روزہ رکھوں گا۔''

دسویں محرم کے متعلق یہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اس کے علاوہ اس دن کھانے تقسیم کرنے، نئے کپڑے پہننے، گھر والوں کو عیش کروانے، اسی دن سارے سال کی ضروریات خریدنے، کوئی مخصوص نماز پڑھنے، جانور ذبح کرنے، سرمہ لگانے، مہندی لگانے، غسل کرنے، ایک دوسرے سے ملاقات کرنے، مسجدوں یا مزاروں کی زیارت کرنے جیسے جتنے کام کیے جاتے ہیں، سب منکر اور بدعت ہیں۔ نہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں سنت قرار دیا ہے نہ آپ ﷺ کے خلفا نے۔ اسی طرح امام مالک، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابو حنیفہ، اوزاعی، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ یا ان جیسے کسی بھی امام اور عالمِ دین نے اس دن ان کاموں کو مستحب تک نہیں کہا۔ اگرچہ متاخرین اس دن ان میں سے کچھ کاموں کا حکم دیتے تھے اور بطورِ دلیل کچھ روایات اور آثار بھی نقل کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے کچھ روایات صحیح ہیں لیکن جو لوگ علومِ حدیث کے شناور ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی کوئی روایت صحیح نہیں۔ جو ان روایات کو صحیح کہتا ہے، اس کو غلطی لگی ہے۔ حرب کرمانی نے اپنے ''مسائل'' میں ذکر کیا ہے: امام احمد بن حنبل سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا: جس نے عاشورا کے دن اپنے اہل وعیال پر وسعت کی ......الخ''، تو انھوں نے کہا: ''اس حدیث کی کوئی حیثیت نہیں۔''

ان لوگوں کی عمدہ ترین دلیل سفیان بن عیینہ کا یہ اثر ہے جس میں انھوں نے کہا: ''ہم نے ساٹھ سال سے اس کا تجربہ کیا ہے اور اس کو صحیح پایا ہے۔'' اس کی سند میں ابراہیم بن محمد کوفے کا رہنے والا تھا اور اس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ اس نے یہ بات کس سے سنی یا کس سے اس کو پہنچی۔ ممکن ہے کہ اس بات کو کہنے والا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے بغض رکھنے والا کوئی بدعتی ہو جو جھوٹ کے ساتھ رافضہ کا مقابلہ کرنے اور فاسد کا فاسد اور بدعت کا بدعت سے توڑ کرنا روا سمجھتا ہو۔

اگر ابن عیینہ کے اس اثر کو صحیح سمجھا جائے، تب بھی اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۳۴)

انھیں وافر رزق عطا کیا تھا تو اللہ تعالیٰ کے ان پر اس فضل میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ اس وسعت اور کشایش کا سبب عاشورا کے دن اہل و عیال پر فراخی کرنا ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے امت کے بہترین افراد صحابہ کرام کو بھی مال و دولت سے نوازا تھا اور وہ خصوصی طور پر عاشورا کے دن اپنے اہل و عیال پر کشائش کرنے کا قصد و ارادہ نہیں کرتے تھے۔

مزید برآں بہت سے لوگ کسی کام کے لیے نذر مانتے ہیں۔ اللہ ان کا کام کر دیتا ہے تو وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کا یہ کام نذر ماننے کے سبب ہوا، حالانکہ صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا: ''یہ خیر نہیں لاتی، اس کے ذریعے تو محض بخیل سے نکلوایا جاتا ہے۔''[1] جو یہ سمجھتا ہے کہ نذر کی وجہ سے اس کا کام ہوتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کو غلط کہتا ہے۔ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، آپ ﷺ کے دین اور راستے کی پیروی اور آپ ﷺ کی ہدایت اور دلیل کے پیچھے چلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی اس عظیم الشان نعمت کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے کہ اس نے اپنے رسول کو مبعوث کیا، جو ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے اور ان کا تزکیہ و تطہیر کے لیے آیا۔

ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''بہترین سیرت محمد ﷺ کی سیرت ہے، بدترین امور بدعت ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[2]

دینِ اسلام کا اصل معیار کتاب و سنت اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی مطابقت ہے اور اسلام کی بنیاد ان دو اصول پر قائم ہے:

1. ہم صرف اللہ کی عبادت کریں۔
2. اللہ کی عبادت اس کی نازل کردہ شریعت کے مطابق کریں، نہ کہ بدعت کے ساتھ۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صٰلِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ [الکهف: ١١٠]

''پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''

عملِ صالح وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہو اور وہی مسنون اور شرعی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٣١٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٣٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کیا کرتے تھے:

"اللهم اجعل عملي كله صالحاً، واجعله لوجهك خالصا، ولا تجعل لأحد فيه شيئا"

''اے اللہ! میرا سارا عمل صالح بنا دے، اس کو خالص اپنی رضا کے لیے کر دے اور اس میں کسی کا حصہ نہ رکھنا۔''

عبادت کے اس مفہوم کے پیشِ نظر اسلام کے اصول مندرجہ ذیل تین احادیث کے گرد گھومتے ہیں:

۱ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوى»[1]

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر عمل ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔''

۲ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[2]

''جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں، وہ مردود ہے۔''

۳ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَ ذَلِكَ أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ ...»

''حلال بھی واضح ہے، حرام بھی، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ تو جو شبہات سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور جو شبہات میں پھنس گیا وہ حرام میں پھنس گیا، اس چرواہے کی طرح جو چراگاہ کے اردگرد چرواتا رہتا ہے، قریب ہے کہ وہ اس میں (جانوروں کو) داخل کر دے۔ یاد رکھو! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں، آگاہ رہو! جسم میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ صالح (صحیح) رہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے، اگر وہ خراب (فاسد) ہو جائے تو سارا جسم خراب (فاسد) ہو جاتا ہے۔ وہ دل ہے۔''[3]

والله أعلم. وصلى الله على نبيه محمد ﷺ.[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

[2] صحيح البخاري (٧٥٣/٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

[4] مجموع الفتاویٰ (٢٩٩/٢٥_٣١٧)

غیر مسلموں کے تہواروں کو منانا اور ان کو چیزیں فروخت کرنا

سوال کیا مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں کے تہواروں کی نقل کرنا، ان جیسے کام کرنا، کھانے پکانا اور ان مواقع پر ان کو چیزیں بیچنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب الحمد للہ. مسلمانوں کے لیے کسی بھی ایسی چیز میں ان کی مشابہت کرنا جائز نہیں جو ان کے تہواروں کی خاص ہو، نہ کھانا پکانا، نہ لباس و غسل کا اہتمام کرنا، نہ آگ جلانا اور نہ کسی معاشی رواج یا عبادت کو روکنا اور معطل کرنا وغیرہ۔ اسی طرح کھانے کی دعوت، تحائف کا تبادلہ اور ایسی اشیا کی فروخت جو خاص اس موقع پر کی جانے والی سرگرمیوں کے لیے معاون ثابت ہو اور اسی کے لیے ان کا اہتمام کیا جائے، ناجائز ہے۔ بچوں وغیرہ کو ایسے کھیلوں میں شرکت کرنے کی اجازت نہ دی جائے جو ایسے تہواروں پر کھیلے جاتے ہیں اور ان کو بنا سنوار کر باہر نہ نکالا جائے۔ بالجملہ وہ اپنے تہواروں پر اپنے کسی بھی شعار کے اظہار کے مجاز نہیں۔ مسلمانوں کے ہاں ان کے تہوار کا دن عام دنوں کی طرح ہی ہونا چاہیے، جس کو وہ ان کی کسی خصوصیت کے ساتھ مختص نہ کریں۔ اگر مسلمان قصداً اس کو پائیں تو یہ سلف و خلف کی ایک جماعت کے نزدیک مکروہ ہے، مذکورہ اشیا کے ساتھ اس کو خاص کرنے کی ممانعت کے معاملے میں علما میں کوئی اختلاف نہیں، بلکہ اکثر علما ایسے شخص کے کفر کے قائل ہیں جو یہ سب کرتا ہے، کیوں کہ ان میں کفر کے شعائر کی تعظیم ہے، بلکہ ایک جماعت کا کہنا ہے: ''جو ان کے تہوار کے دن نطیحہ ذبح کرتا ہے، گویا وہ خنزیر ذبح کرتا ہے۔''

عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کا قول ہے: جو عجمی بلاد کو نمونہ بناتا ہے، ان کے نیروز اور میلے مناتا ہے، مرنے تک ان کی مشابہت کرتا ہے وہ قیامت کے دن ان کے ساتھ ہی اٹھایا جائے گا۔'' سنن ابو داود میں ثابت بن ضحاک سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے ''بوانہ'' نامی جگہ پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں نے بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا وہاں کوئی جاہلیت کا بت تھا، اللہ کے سوا جس کی پوجا کی جاتی تھی؟'' اس نے کہا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا وہاں ان کا کوئی تہوار ہوتا تھا؟'' اس نے کہا: نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کر، اللہ کی نافرمانی میں کوئی نذر نہیں اور انسان جس کا مالک نہ ہو اس کی نذر بھی نہیں۔''[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو اس وقت تک نذر پوری کرنے کی اجازت نہیں دی، حالانکہ نذر پوری کرنا واجب ہے، جب تک پوچھ نہیں لیا کہ وہاں کوئی

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣١٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٥١)

جاہلیت کا تہوار تو نہیں منایا جاتا تھا اور ساتھ ہی فرمایا: اللہ کی نافرمانی میں نذر پوری نہیں کی جاتی۔ اگر ایسی جگہ جانور ذبح کرنا منع ہے جہاں ان کا کوئی تہوار منایا جاتا ہو تو اس تہوار میں شرکت کرنا کیسے جائز ہوگا؟ بلکہ امیر المومنین عمر بن خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام ائمہ اسلام نے کافروں پر یہ شرط عائد کی کہ وہ دار الاسلام میں اپنے تہواروں کو علانیہ نہیں منائیں گے۔ اگر خود مسلمان ان کے تہواروں کو علانیہ منانا شروع کر دیں تو یہ کتنا غلط کام ہوگا؟! بلکہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک حکم دیا تھا کہ ''عجمیوں کی ذاتی زبان نہ سیکھو، مشرکوں کے تہواروں کے موقع پر ان کے گرجوں میں ان کے ساتھ شریک نہ ہو، کیوں کہ ان پر اللہ کی ناراضی اترتی ہے۔''

اگر محض تفریح یا کسی اور کام کی غرض سے ان کے گرجے میں داخل ہونے سے ناراضی اترتی ہے تو جو شخص وہ کام کرنا شروع کر دے جس کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہوتا ہے اور پھر وہ ان کے شعائر سے بھی ہو تو اس کا جرم کتنا سنگین ہوگا؟ اس آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ﴾ [الفرقان: ٧٢] کی تفسیر میں کئی ایک سلف نے کہا ہے: اس سے کافروں کی عیدیں اور تہوار مراد ہیں۔ اگر صرف وہاں شرکت کرنا اور ان جیسا کوئی کام نہ کرنا اس وعید میں شامل ہے تو ان کے خاص افعال میں شرکت کرنے والا کتنا بڑا مجرم ہوگا؟!

مسند اور سنن میں یہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) [1]

''جس نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ ان ہی میں سے ہے۔''

ایک روایت میں ہے: ''وہ ہم سے نہیں جس نے ہمارے غیر سے مشابہت اختیار کی۔'' [2]

یہ حدیث عمدہ ہے۔ اگر صرف ان کے ساتھ مشابہت سے متعلق یہ وعید ہے، خواہ وہ عادات اور رواج ہی میں سے ہو تو جو ایسے امور میں ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرتا ہے جو رواج سے بہت آگے ہیں، اس سے متعلق کیا کہا جائے گا؟!

جمہور علما کے نزدیک ان کا وہ گوشت کھانا مکروہ تحریمی یا تنزیہی ہے جو ایسے جانوروں کا ہوتا ہے جن کو وہ اپنے تہواروں اور قربانیوں کے موقع پر ذبح کرتے ہیں، وہ اس کو ﴿ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٧٣] جو غیر اللہ کے نام پر اور آستانوں پر ذبح ہو اس میں داخل کرتے ہیں، اس طرح ان کے تہواروں کے موقع پر ان کو تحائف دے کر یا چیزیں بیچ کر ان کی معاونت کرنا بھی منع لکھا ہے۔

ان کا کہنا ہے: مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کو ان کے تہوار کے مفاد کے لیے استعمال ہونے والی کوئی بھی چیز

---

[1] مسند أحمد (٢/٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١) صحيح الجامع (٦١٤٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٩٥) السلسلة الصحيحة (٢١٩٤)

فروخت کرنا منع ہے، وہ گوشت ہو، خون ہو، کپڑا ہو یا سواری کرائے پر دینا ہو، ان کے دین میں کسی طرح بھی ان کی معاونت نہ کریں، کیوں کہ اس سے شرک کی تعظیم اور ان کے کفر پر ان کی اعانت ہوتی ہے، بادشاہ مسلمانوں کو اس سے روکیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ ﴾ [المائدة: ٢]

''اور نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

پھر شراب کشید کرنے اور اس سے متعلق دیگر کاموں میں ان کی معاونت کرنا بھی کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں، کیوں کہ یہ کفر کا شعار ہے۔ اگر اس میں ان کی معاونت کرنا حرام ہے تو اس کا ارتکاب کتنا بڑا جرم ہوگا؟ واللہ أعلم [1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٥/٣٣٢_٣٢٩)

حج وعمرہ

عمرے کا حکم

سوال کیا عمرہ واجب ہے؟ اگر واجب ہے تو دلیل کیا ہے؟

جواب عمرے کے واجب ہونے میں علما کے دو اقوال ہیں: شافعی اور احمد کے نزدیک واجب ہے۔ مالک اور ابو حنیفہ کے نزدیک واجب نہیں اور یہی قول راجح ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت:

﴿وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ [آل عمران: ٩٧]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے۔''

میں حج فرض کیا ہے، عمرہ نہیں۔ صرف ان دونوں کو پورا کرنا فرض کیا ہے اور ان دونوں کو پورا کرنا اس پر فرض ہے جو ان کو شروع کرتا ہے۔ ابتدا میں صرف حج فرض کیا ہے۔ اسی طرح تمام صحیح احادیث میں بھی صرف حج کو فرض کیا گیا ہے، کیوں کہ عمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں جو حج میں نہ ہو؛ احرام باندھنا، کھولنا، طواف کرنا اور صفا و مروہ کی سعی کرنا، یہ سب کام حج کے افعال میں داخل ہیں۔ اگر عمرہ انہی افعال کا نام ہے تو اللہ تعالیٰ نے حج کے افعال میں کوئی کام بھی دو مرتبہ فرض نہیں کیا، لہٰذا دو وقت فرض نہیں کیے، دو طواف فرض نہیں کیے، دو سعیں فرض نہیں کیں اور دو مرتبہ حج فرض نہیں کیا۔

طوافِ وداع حج کا رکن نہیں، واجب ہے اور حج کے اتمام میں بھی داخل نہیں۔ صرف یہ ہے کہ جو مکے سے نکلے، الوداعی طواف کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں مقیم صحیح قول کے مطابق طوافِ وداع نہیں کرتا۔ اس کا وجوب صرف اس حیثیت سے ہے کہ مکہ سے نکلنے والا نکلتے نکلتے آخری مرتبہ بیت اللہ سے ملاقات کرے، جس طرح کسی عارضی سبب کی وجہ سے (علما کے ایک قول کے مطابق) احرام کے ساتھ داخل ہونا واجب ہوتا ہے۔

نیز مکہ میں مقیم صحابہ، نہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور نہ خلفا کے عہد ہی میں مکے میں عمرہ کرتے تھے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اکیلی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے مکہ میں قیام کے دوران میں عمرہ نہیں کیا اور وہ بھی ایک عارضی سبب کی وجہ سے تھا۔ اس کی تفصیل کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔[1]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٦/٥-٦)

عمرہ حج میں داخل ہے

سوال ایک شخص نے حج کیا، لیکن عمرہ نہ کیا اور اسے عمداً یا بھول کر چھوڑ دیا تو کیا وہ حج کی وجہ سے اس سے ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب عمرے کے واجب ہونے میں دو اقوال ہیں، لیکن راجح قول کے مطابق واجب نہیں، لہٰذا جس نے حج کیا، لیکن عمرہ چھوڑ دیا، خواہ جان بوجھ کر یا بھول کر، اس پر کچھ عائد نہیں ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت میں یہ کہا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ [آل عمران: ۹۷]

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے۔''

قرآن میں لفظ حج، عمرے پر نہیں بولا جاتا، بلکہ جہاں اللہ نے عمرہ مراد لینا چاہا ہے، وہاں حج کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے:

﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] ''اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔''

نیز فرمایا:

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ [البقرة: ۱۵۸]

''تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا خوب طواف کرے۔''

جب اللہ نے پورا کرنے کا حکم دیا اس وقت حج اور عمرے دونوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا۔ یہ آیت بالاتفاق چھے ہجری میں حدیبیہ کے سال نازل ہوئی اور آلِ عمران کی آیت اس کے بعد نو یا دس ہجری میں نازل ہوئی اور اس میں حج فرض کیا گیا، لہٰذا صحیح ترین قول کے مطابق حج کی فرضیت بعد میں ہوئی۔ جس نے پورا کرنے کا حکم دینے والی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے حج چھے ہجری ہی کو فرض ہو گیا تھا، اس کا استدلال غلط ہے، کیوں کہ اس آیت میں اس شخص کو ان دونوں کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ان دونوں کو شروع کرتا ہے۔ اس آیت میں ابتداءً حج اور عمرے کا حکم نہیں دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کے اترنے سے پہلے عمرۂ حدیبیہ کیا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ پر حج فرض تھا نہ عمرہ۔ جب مشرکوں نے آپ ﷺ کو روک دیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم دیا اور اس محصور کا حکم بیان کیا جس کے لیے پورا کرنا مشکل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے علما کا اتفاق ہے کہ حج اور عمرہ شروع کرنے سے لازم ہو جاتے ہیں اور ان کو پورا کرنا فرض ہو جاتا ہے، البتہ روزے نماز اور اعتکاف میں اختلاف ہے۔

نیز عمرے کے تمام مناسک وہی ہیں جو حج کے ہیں اور اللہ نے حج کے مناسک ایک ہی مرتبہ فرض کیے ہیں دو

مرتبہ نہیں، لہٰذا معلوم ہوا عمرہ فرض نہیں۔

یہ جو حدیث بیان کی جاتی ہے کہ «إِنَّ الْعُمْرَةَ هِيَ الْحَجُّ الْأَصْغَرُ»[1] عمرہ حجِ اصغر ہے اور اس سے عمرے کے وجوب پر استدلال کیا جاتا ہے یہ استدلال بھی درست نہیں، بلکہ یہی حدیث اس کے عدمِ وجوب پر دلالت کرتی ہے، کیوں کہ یہ حجِ اکبر اور حجِ اصغر دو حجوں پر دلالت کرتی ہے، جس طرح قرآن میں بھی ہے:

﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ [التوبة: ٣] ''حج اکبر کے دن۔''

اگر عمرہ واجب ہوتو ہم حجِ اکبر اور حجِ اصغر دو حجوں کو فرض کر دیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دو حج نہیں، بلکہ ایک ہی حج فرض کیا ہے۔

مطلق حج، حجِ اکبر ہے۔ وہی اللہ نے بندوں پر فرض کیا ہے۔ اس کا وقت مقرر کیا ہے کسی اور کا نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ [التوبة: ٣] عمرے کے عکس کہ وہ کسی وقت کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ سال کے ہر مہینے میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کہ عمرہ حج کے ساتھ غسل کے ساتھ وضو کی طرح ہے۔ جو غسلِ جنابت کرتا ہے اس کے لیے وہی کافی ہوتا ہے اور جمہور علما کے نزدیک اس پر (دوبارہ) وضو فرض نہیں ہوتا، اسی طرح حج ہے۔ یہ ایک ہی جنس کی دو عبادات ہیں، ایک چھوٹی، دوسری بڑی۔ اگر کوئی بڑی عبادت کر لے تو اس پر چھوٹی فرض نہیں ہوتی، لیکن اگر چھوٹی عبادت بھی کر لینا زیادہ بہتر اور کامل ہے جس طرح وضو غسل کے ساتھ زیادہ بہتر اور کامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے بھی ایسے ہی کیا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ان کو تمتع یعنی حج کے احرام کے ساتھ عمرہ کرنے کا حکم دیا تھا اور فرمایا:

«دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»[2]

''عمرہ حج میں قیامت تک داخل ہے۔'' واللہ أعلم[3]

بار بار حج کرنا افضل ہے یا غریبوں پر صدقہ کرنا؟

سوال ایک صاحبِ حیثیت شخص نے فریضہ حج بھی ادا کیا اور عمرہ بھی۔ پھر دوبارہ اس کے دل میں حج کا شوق پیدا ہوا۔ اب اس کے لیے حج کرنا بہتر ہے، یا غریبوں پر صدقہ کر دینا، یا اپنے باپ کی طرف سے حج کرنا یا کوئی اور عمل؟

---

[1] صحیح ابن حبان (٥٠١/١٤) المستدرك للحاكم (٥٥٢/١) سنن الدارقطني (٢٨٥/٢) المعجم الكبير (٤٤/٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١٨) سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٧٩٠)

[3] مجموع الفتاویٰ (٢٦/٦-٧)

جواب حج غریبوں کو دینے اور صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ اگر کوئی والدین کی طرف سے حج کرے تو یہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی ایک شکل ہے۔ حسنِ سلوک میں ماں باپ سے مقدم ہے، لیکن اگر باپ پر فرض ہو گیا تھا تو اس صورت میں وہ مقدم ہو گا، جس طرح اگر باپ صلہ رحمی کا محتاج ہو، لیکن ماں خوش حال ہو تو باپ کے ساتھ تعاون کرنا مقدم ہوتا ہے۔[1] والله أعلم.[2]

عورت کا محرم کے بغیر حج کرنا اور حجِ بدل کرنا

سوال کیا عورت کے لیے محرم کے بغیر حج کرنا جائز ہے؟ نیز کیا عورت حجِ بدل کر سکتی ہے؟

جواب اگر وہ سنِ یاس کو پہنچ چکی ہو، یعنی اتنی عمر کو پہنچ چکی ہو کہ اس کو ماہواری آنا بند ہو گئی ہو، نکاح میں بھی کوئی رغبت نہ رکھتی ہو اور قواعد، یعنی بیٹھی رہنے والیوں میں شمار ہوتی ہو، پھر اس کا محرم بھی نہ ہو تو علما کے ایک قول کے مطابق اس کے لیے ایسے شخص کی معیت میں حج کرنا جائز ہے جس کے ساتھ وہ پرامن ہو۔ یہ احمد سے ایک روایت اور مالک و شافعی کا مذہب ہے۔

اسی طرح ایک عورت دوسری عورت کی طرف سے حجِ بدل بھی کر سکتی ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ چاہے وہ اس کی بیٹی ہو یا کوئی اور ہو، بلکہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے نزدیک عورت مرد کی طرف سے بھی حجِ بدل کر سکتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خثعم قبیلے کی عورت کو اپنے باپ کی طرف سے حج کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے کہا تھا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ بہت بوڑھا ہے، مگر اس پر حج فرض ہو چکا ہے، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے کہا تھا: اس کی طرف سے حج کر،[3] حالانکہ مرد کا احرام عورت کے احرام سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ والله أعلم[4]

مال کے عوض میت کی طرف سے حج کرنے کا حکم

سوال مال کے عوض میت کی طرف سے حج کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر اس مال کو بطورِ خرچہ لیا جائے تو بالاتفاق جائز ہے، لیکن اگر اس کو بطورِ اجرت یا کرایہ لیا جائے تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے، خواہ وہ مال جس کے ساتھ حج کیا گیا، کسی خاص شخص کے لیے اس کی وصیت کی گئی تھی، یا

---

[1] سائل نے یہ سوال منظوم کیا تھا اور امام صاحب نے جواب بھی منظوم ہی دیا تھا۔
[2] مجموع الفتاویٰ (۱۰/۲٦)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۷۵۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۳٤)
[4] مجموع الفتاویٰ (۱۳/۲٦)

وہ مطلق مال تھا یا خرچ کیا گیا یا ترکے سے نکالا ہوا۔

بعض شافعی فقہا اسے مستحب کہتے ہیں اور اس کو پاکیزہ ترین روزی میں شمار کرتے ہیں، کیوں کہ یہ حجِ بدل کرنے والا ایک تو نیک عمل کرتا ہے اور دوسرے پاکیزہ رزق سے کھاتا ہے۔

امام احمد کا قول ہے: ''میں اسلاف میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کام کیا ہو۔'' امام احمد اسے بدعت اور ناپسندیدہ سمجھتے تھے اور اس میں اجرت اور اجارہ کو مکروہ سمجھتے تھے۔

میرے نزدیک حقیقتِ امر یہ ہے کہ اگر حاجی کا مقصود ان دو چیزوں میں سے ایک ہو تو اس کے لیے مستحب ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں:

1. جس کی طرف سے حج کیا جائے اس کے ساتھ احسان مقصود ہو۔
2. یا وہ اس حج کو اپنے لیے کرنا چاہتا ہو۔

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اگر میت پر حج فرض تھا تو وہ اس کے ذمے واجب الادا ہوگا۔ اس صورت میں اس کی طرف سے حج کر دینا اس کے ذمے واجب الاداء فریضے کو ادا کر کے اس کے ساتھ احسان کرنا ہے، جس طرح میت کی طرف سے قرض ادا کر کے اس کے ساتھ احسان اور نیکی کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی خثعم قبیلے کی عورت سے کہا تھا: ''تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا؛ تو اسے اتارتی، تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا؟'' اس نے کہا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کا حق ادا کیا جائے۔''[1] اس مفہوم کی اور بھی احادیث مذکور ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور کرم کی وجہ سے اس کے قرض کو قبول کرتا ہے جس کی طرف سے ادا کیا جائے۔

اگر حاجی کا مقصود اس واجب الادا قرض کو پورا کرنا ہو تو یہ اس کے ساتھ احسان کرنے والا ہے اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ عمل مستحب ہوگا۔

اس احسان کا عموماً کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، مثلاً وہ اس کا رشتے دار ہو، اس کا دوست ہو، اس کے کسی احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہو تو وہ صرف اتنا مال لے لے جو حج کے لیے ضروری ہو۔ اس کی علامت یہ ہوگی کہ وہ صرف اتنا مال طلب کرے گا جو حج کے لیے کافی ہو۔

اس بنا پر ہم نے حج کا خرچہ بلانزاع جائز کہا ہے۔ اسی طرح اگر میت نے مستحب حج کی وصیت کر رکھی ہو اور ایصالِ ثواب کی توقع رکھی ہو۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٤)

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی کے دل میں حج کا شوق ہو اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی تڑپ ہو، لیکن وہ اخراجاتِ سفر نہ رکھتا ہو اس کو جو مال حج کے لیے دیا جائے اس سے حج کرنے میں معاونت لے لے۔

اس طرح کے شخص کو حج کرنے کے لیے مال دیا جا سکتا ہے، لیکن کسی کی طرف سے نہیں، جس طرح مجاہد کو جہاد اور جنگ کے لیے مال دیا جاتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ جس نے اپنے بدن کے ساتھ حج کیا، اس کو حج کا ثواب ملے گا اور جس نے مال دیا تھا اس کو اپنے مال کی وجہ سے حج کا ثواب ملے گا، جس طرح جہاد میں ہوتا ہے۔ جو لڑنے والے کو تیار کرتا ہے وہ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے خود لڑتا ہے۔

کبھی کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنے کے لیے بھی مال دیا جاتا ہے، اس میں دینے والے کا مقصود اس کی طرف سے حج کرنا ہوتا ہے جس کی طرف سے وہ مال دیتا ہے، لیکن حج کرنے والے کا مقصود وہ اجر ہوتا ہے جو اس کو اس حج سے حاصل ہوتا ہے، دوسرے کے ساتھ احسان کرنے کی وجہ سے نہیں۔

یہ بات امام ابوحنیفہ کے اس قاعدے پر مبنی ہے جس میں انھوں نے کہا ہے: حج، حج کرنے والے کی طرف سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور دینے والے کو خرچ کرنے کا اجر ملتا ہے، جس طرح جہاد میں ہوتا ہے۔

ہمارے اس قاعدے کی بنیاد پر نماز پڑھنے والا، روزہ رکھنے والا، دوسرے کی طرف سے صدقہ کرنے والا اور دوسرے کی طرف سے حج کرنے والا اس عمل میں نیک ارادہ رکھتا ہے اور دوسرے کی طرف سے اپنے عمل میں بھی نیک ارادہ رکھتا ہے۔ اگر رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا ہوا ہے کہ ''امانت دار خازن، جس کو جو دینے کا حکم دیا جاتا ہے، وہ اس کو پورا پورا، کامل اور خوش دلی سے دیتا ہے، وہ دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہوتا ہے۔''[1] اس حدیث میں آپ ﷺ نے صدقے میں نائب کے لیے بھی وہی اجر قرار دیا ہے جو نائب بنانے والے کو ملتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہوا ہے: ''اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے گھر سے مال، خراب کیے بغیر، خرچ کرتی ہے تو اس کو خرچ کرنے کا اجر ملتا ہے، خاوند کو کمانے کا اور خادم کو بھی اتنا ہی۔''[2] اسی طرح حجِ نیابت کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے اور وہ تمام اعمال جن میں نیابت قبول کی جاتی ہے ان میں نائب بننے والے کو اجر ملتا ہے۔

یہ شخص بھی اتنا ہی خرچہ لے گا جتنا حج میں آ سکتا ہے، جس طرح جہاد کرنے والا جو لیتا ہے اس کو جہاد اور لڑائی ہی میں صرف کر سکتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں مستحب اور جائز ہیں۔ وہ حج پر آنے والا خرچہ قبول کرے اور زائد واپس کر دے۔

اگر وہ اس کے ذریعے مال کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور زائد مال کو اپنے پاس رکھ لے تو یہ اجارے اور اجرت کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٤)

صورت ہے جو صحیح قول کے مطابق مستحب نہیں، گو اسے جائز کہا گیا ہے، کیوں کہ جو کام دنیا کے لیے کیا جائے وہ فی نفسہٖ عملِ صالح نہیں رہتا۔ اگر اس سے صرف مال بنانا مقصود ہو تو اس کو مباح کاموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جو آخرت کے عمل کے ذریعے دنیا کمانا چاہتا ہو اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اگر ہم ایسے نیکی کے کاموں کے لیے اجارہ اور اجرت لینا جائز کہیں جن کا فاعل اہلِ قرب سے ہو تو اس حالت میں ان کو مباحات کے قائم مقام ہی قرار دے سکتے ہیں، قرب اور نیکی کے باب سے نہیں۔

اس کی تین اقسام بنتی ہیں:

1. اس نیت کے ساتھ عمل کرنے پر سزا ملے۔
2. اس نیت کے ساتھ عمل کرنے پر ثواب ملے۔
3. اس نیت کے ساتھ عمل کرنے پر سزا ملے نہ ثواب۔

اس طرح اس بنیاد پر جو مال لیا گیا ہے وہ منع ہو گا یا مستحب یا مباح، لیکن اس صورت میں اجارہ راجح ہے کہ وہ شخص حج کے دوران میں اس زائد مال کا ضرورت مند ہو اور حج سے واپسی پر بھی یا اس نے قرض دینا ہو۔ یہاں بھی تین اقسام بنتی ہیں:

1. وہ محض حج اور احسان کا ارادہ رکھتا ہو۔
2. وہ صرف جائز خرچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔
3. یا دونوں کا ارادہ رکھتا ہو۔

اگر پہلا قصد ہو تو یہ بہترین ہے۔ اگر ایک ساتھ دونوں ہی مقصود ہوں تو یہ بھی ان شاء اللہ حسن اور بہتر ہی ہے، کیوں کہ دونوں نیک مقاصد ہیں، لیکن اگر صرف مال کمانا مقصود ہو تو یہ صورت محلِ نظر ہے۔ واللہ أعلم [1]

قرض اتارنے کے لیے حجِ بدل کرنے کا حکم

سوال اپنا قرض اتارنے کے لیے کسی کی طرف سے حج (بدل) کرنا کیسا ہے؟

جواب اپنا قرض ادا کرنے کے لیے کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنے میں علما کا اختلاف ہے کہ اس میں افضل عمل کیا ہے۔ صحیح تر قول کے مطابق نہ کرنا افضل ہے، کیوں کہ اس نیت سے حج کرنا کہ انسان خرچے سے کچھ بچا لے، سلف کی روش نہیں۔ امام احمد کا قول ہے: ''میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو کسی سے کچھ لے کر حج کیا کرتا

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٦/١٤۔١٧)

تھا۔'' اگر یہ نیک عمل ہوتا تو سلف اس میں آگے ہوتے، نیک اعمال کے ذریعے رزق حاصل کرنا نیک لوگوں کا وتیرہ نہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ اگر عمل سے مال کمانا مقصود ہو، اس مقروض کے لیے پیسوں کے حصول کی نیت سے حج کرنے اور پھر ان سے قرض اتارنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی سے زکات لے کر اپنا قرض چکا لے، کسی سے پیسے لے کر حج کرنا صرف دو لوگوں کے لیے جائز ہے:

① کوئی شخص حج سے محبت رکھتا ہو اور دیارِ مقدسہ کی زیارت کا طالب ہو، مگر مالی وسائل نہ رکھتا ہو، وہ اپنی نیک خواہش پوری کرنے کے لیے کسی دوسرے سے مال لے کر اس کی طرف سے حج کر سکتا ہے۔

② ایسا شخص جو میت کو حج کی ذمے داری سے سبکدوش کرنا چاہتا ہو، خواہ وہ اس کا کوئی عزیز ہو یا مسلمانوں کے ساتھ عمومی شفقت اور رحم دلی رکھتا ہو، وہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے پیسے لے سکتا ہے۔ اس مسئلے میں سو بات کی ایک ہی بات ہے کہ انسان حج کرنے کے لیے پیسے لے نہ کہ پیسے کمانے اور لینے کے لیے حج کرے۔

یہ بات ان تمام کمائیوں پر صادق آتی ہے جو نیک اعمال کے ذریعے انسان حاصل کرتا ہے، علم سیکھنے، سکھانے یا جہاد کرنے کے لیے روزینہ لینا جائز اور مستحسن ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَثَلُ الَّذِينَ يَغْزُونَ مِنْ أُمَّتِي وَيَأْخُذُونَ أُجُورَهُمْ مَثَلُ أُمِّ مُوسَى تُرْضِعُ وَلَدَهَا وَتَأْخُذُ أَجْرَهَا»①

''میری امت سے لڑنے والوں اور اس پر اجرت لینے والوں کی مثال موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی مثال ہے جو اپنے بیٹے کو دودھ پلا کر اپنی اجرت بھی لیتی تھی۔''

آپ ﷺ نے ان کو ایسے شخص سے تشبیہ دی جو کسی کام کو ایسی دلچسپی کی وجہ سے کرتا ہے جیسی دلچسپی اور رغبت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دودھ پلانے میں تھی۔ کرائے کی دودھ پلانے والی دائیہ کے عکس جو غیر رشتے دار ہو۔ تاہم جو انسان نیک عمل کو پیشہ اور کمائی کا ذریعہ بناتا ہو اس کا یہ عمل دنیوی ہے۔

دین کو مقصود اور دنیا کو ذریعہ بنانے اور دنیا کو مقصود اور دین کو ذریعہ مقصود بنانے میں بہر حال فرق واضح ہے۔ جو دین کو ذریعہ بناتا ہے اس سے متعلق راجح گمان یہی ہے کہ آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں، جس طرح قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہوتا ہے، یہاں ان کو بیان کرنے کا موقع نہیں۔②

---

① سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٧/٩) السلسلة الضعيفة (٤٥٠٠)

② مجموع الفتاویٰ (١٨/٢٦۔١٩)

مقروض کو حج کروانا

سوال ایک شخص کسی دوسرے شخص کا محتاج ہے، قرض خواہ بغداد میں ہے اور قرض دار مصر میں۔ قرض دار تنگدست ہے، ایک شخص اپنے وسائل سے اس مقروض کو حج کرانا چاہتا ہے تو کیا یہ اس کے لیے جائز ہے؟

جواب اگر تنگدست مقروض کو کوئی دوسرا حج کروا دے تو یہ جائز ہے، اس میں اس کے کمانے سے قاصر ہونے یا قرض دار کے دور ہونے کی وجہ سے کما کر اس کا قرض ادا کرنے کی سکت نہ رکھنے کی دونوں صورتوں میں قرض کے حق کا ضیاع نہیں۔ واللہ أعلم[1]

دورانِ سفر میں فوت ہو جانے والے حاجی کے حج کا حکم

سوال ایک شخص زادِ راہ لے کر حج پر نکلا، راستے میں اس کی موت واقع ہو گئی، کیا اس سے فرض ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟

جواب الحمد لله رب العالمين. اس وجہ سے اس سے فریضہ ساقط نہیں ہوگا۔ اگر وہ اسی وقت حج کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا جب اس پر حج فرض ہوا تھا اور اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی تھی تو وہ نافرمان فوت نہیں ہوا۔ اگر اس نے حج فرض ہونے کے بعد کوتاہی کی تھی تو وہ نافرمان فوت ہوا۔ وہ جہاں پہنچا تھا وہیں سے اس کی طرف سے حج کرنے کے لیے کسی کو نائب بنا دیا جائے۔ اگر وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ کر گیا ہو تو علما کے ظاہر قول کے مطابق اس سے خرچ نکالنا واجب ہے۔ اس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے کہ جب وہ زادِ راہ اور سواری کے ساتھ صاحبِ استطاعت ہو گیا تو بالاتفاق اس پر حج فرض ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد حسبِ امکان وہ حج کے لیے نکل گیا اور راستے میں فوت ہو گیا۔ اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور وہ نافرمان فوت نہیں ہوا۔ اس کو اس کی نیت اور قصد کا اجر ملے گا۔

اگر اس نے کوتاہی برتی، پھر بعد میں حج کے لیے نکلا اور حج ادا کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو وہ نافرمان اور گناہ گار فوت ہوا (کیوں کہ اس نے تاخیر کی) اس کو اس کے فعل کا اجر ملے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے فرض ساقط نہیں ہوا۔ حج اس کے ذمے باقی ہے اور وہ جہاں پہنچا تھا وہیں سے اس کی طرف سے حج کیا جائے۔ واللہ أعلم[2]

---

1. مجموع الفتاویٰ (۲۶/۲۰)
2. مجموع الفتاویٰ (۲۶/۲۱)

احرام اور حج کی نیت کا حکم

سوال کیا احرام حج کا رکن ہے یا نہیں؟ فقہائے حنابلہ نے ذکر کیا ہے کہ احرام سے مراد حج کی نیت ہے۔ اگر نیت کے بغیر شرعی حج کا وجود نہیں تو اس میں اختلاف کا تصور کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

اس سوال کا جواب ایک اجمالی ہے اور دوسرا تفصیلی۔

اجمالی کی تفصیل اس طرح ہے کہ حج اور عمرے کے لیے نیت میں ہمارے اصحاب اور تمام مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج اس کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ وہ نیت حاجی خود کرتا ہے یا جس کے ساتھ حج کرتا ہے، جس طرح بچے کا سرپرست حج کرتا ہے۔

اگر آدمی حج کے اعمال قصد کے بغیر کرے تو اس کا حج درست نہیں ہوتا، جس طرح نماز اور روزہ نیت کے بغیر نہیں ہوتے۔ خواہ یہ کہا جائے کہ حج صرف نیت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے یا یہ کہا جائے کہ حج خالی نیت کے ساتھ منعقد نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ قول یا فعل کی شکل میں کوئی دوسرا کام بھی کرنا ہوتا ہے، مثلاً تلبیہ پڑھنا، یا حج کے لیے قربانی کے جانور کو پٹا ڈالنا وغیرہ، علما کے یہ دو مشہور اقوال ہیں۔ نیز چاہے ہم یہ کہیں کہ احرام رکن ہے یا رکن نہیں ہے، یہ معاملہ اختلاف کو قبول نہیں کرتا، کیوں کہ مقصودِ عبادات میں یہ چیز ناممکن اور عقلاً ممتنع ہے کہ وہ عباداتِ مامورہ تو ہوں، لیکن نیت کے بغیر ہوں۔

رہی یہ بات کہ کیا احرام خالی نیت سے انعقاد پذیر ہو جاتا ہے، سو اس میں فقہی اختلاف ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ وہ نیت جو حج کے لیے شرط ہے اور وہ نیت جس کے ساتھ احرام منعقد ہو جاتا ہے ان دونوں میں فرق ہے۔ آدمی اپنے گھر سے نکلتے وقت بھی حج کی نیت کر سکتا ہے جس طرح امرِ واقع ہے۔

وہ اسی نیت کو ساتھ لے کر ذکراً اور حکماً وقوف کرتا ہے، طواف کرتا ہے، اگرچہ اس نے احرام کا قصد نہ کیا ہو اور اس کے دل میں اس کا خیال بھی نہ آیا ہو۔

اس کی اصل کچھ اس طرح ہے کہ عبادات میں نیت معہودہ (جو ذہن میں ہو) دو امور پر مشتمل ہوتی ہے: ایک قصدِ عبادت اور دوسرا قصدِ معبود۔ قصدِ معبود وہی وہ اصل ہے جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [البينة: ٥]

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو

خالص کرنے والے ہوں۔''

یہ حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے:

''جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے تھی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، جس کی ہجرت دنیا پانے کی تھی یا کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''[1]

آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں مقصود، مقصود میں فرق کیا ہے اور مختصراً ہر اختیاری فعل میں اس مقصود کا ہونا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَصْدَقُ الْأَسْمَاءِ حَارِثٌ وَهَمَّامٌ»[2]

''(سب سے) سچے نام حارث (کھیتی کرنے والا) اور ہمام (ہمت والا) ہیں۔''

ہر بشر، بلکہ ہر حیوان کے لیے ہمت کا ہونا لازمی ہے اور ہمت ارادے کا نام ہے۔ اسی طرح حرث کا ہونا بھی ضروری ہے جو عمل کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ متحرک بالارادہ ہونا حیوان کا لازمہ ہے، پھر جس کا وہ قصد کرتا ہے وہ اس کی غایت اور منزل ہوتی ہے، اگرچہ بعض اوقات اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اس قصد کے بعد کوئی دوسرا قصد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم نفوس اپنے مقصود کو پا لینے پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک قصدِ عبادت کا تعلق ہے تو وہ ایک خاص عمل کا قصد ہوتا ہے۔ جو انسان اپنے عمل کے ذریعے اللہ اور آخرت کا ارادہ کرتا ہے وہ کبھی نماز کے ساتھ اس کا ارادہ کرتا ہے تو کبھی حج کے ساتھ۔ اسی طرح جو اس کے دیے گئے حکم کی بجا آوری کر کے اس کی اطاعت اور فرماں برداری کا ارادہ کرتا ہے وہ اس عمل میں اس کی اطاعت کرتا ہے اور بعض اوقات اس عمل میں وہ اس کی اطاعت کا قصد کرتا ہے۔ یہ دوسرا قصد خاص نماز کا قصد کرنے کی طرح ہے، روزے کا نہیں۔ پھر ظہر کے وقت ظہر کا قصد ہے، عصر کا نہیں۔ پھر فرض کا قصد ہے، نفل کا نہیں۔ یہ وہ نیت ہے جو غالباً متاخر کتبِ فقہ میں ذکر کی جاتی ہے۔ تاہم دونوں نیتیں بالجملہ فرض ہیں، پہلی نیت کے ساتھ خالص اللہ کی عبادت کرنے والا طاغوت کی عبادت کرنے والے سے یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک کرنے والے سے ممتاز ہو جاتا ہے اور آخرت کا طلب گار دنیا کے طلب گار سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی وہ دینِ خالص ہے جس میں تمام شریعتیں مشترک ہیں اور انبیائے کرام نے اس (دینِ خالص) میں تفرقے بازی سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٧)

[2] مسند أحمد (٣٤٥/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٥٠) السلسلة الصحيحة (١٠٤٠)

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ [الشوریٰ: ۱۳]

''دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ۔''

اسی لیے تمام انبیا کا دین ایک تھا، اگرچہ ان کی شریعتیں متنوع تھیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

نیز فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاریات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اور فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ ﴾ [البقرة: ٢١] ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔''

دوسری نیت کے ساتھ عبادات کی انواع اور احکام کی اجناس و اقسام ممتاز ہو جاتی ہیں۔ نماز پڑھنے والا حاجی اور روزے دار سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ ظہر کی نماز پڑھنے والا اور رمضان کے روزے کی قضا دینے والا عصر کی نماز

پڑھنے والے اور شوال کا روزہ رکھنے والے سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ فرض زکات دینے والا نذر یا کفارہ ادا کرنے والے سے علاحدہ ہو جاتا ہے۔

عبادات کی اصناف میں احکام متنوع اور مختلف ہوتے ہیں، کیوں کہ دین کا قوام اور جان تو شریعت ہے۔ دلی اعمال بدنی اعمال کے بغیر پورے نہیں ہوتے، جس طرح روح کا قوام بدن کے بغیر نہیں ہوتا، یعنی اس دنیا میں۔ کلام کے معانی الفاظ کے بغیر مکمل نہیں ہوتے، لفظ اور معنی کے مجموعے کے ساتھ ہی کلام کلام بنتا ہے، اگرچہ معنی اختلافِ اُمم سے مختلف نہیں ہوتا، لیکن لفظ تنوع امم سے متنوع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ قوموں کی زبانیں معنی کی تکمیل میں دوسری قوموں کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتی ہیں، بلکہ ایک ہی زبان کے کچھ الفاظ کسی معنی کو بیان کرنے کے لیے دوسرے الفاظ کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔

بہرحال عام دین دل کے قصد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اس کے بعد بدنی عمل کا ہونا ضروری ہے، جس کے ساتھ قصد مکمل اور پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بدنی اعمال بھی متنوع ہو جاتے ہیں اور مشیتِ الٰہی، رحمتِ الٰہی اور حکمتِ الٰہی کی وجہ سے بھی یہ متنوع اور مختلف صورتیں رکھتے ہیں، اس لیے دونوں نیتوں کا ہونا فرض اور لازمی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ فرض کیا ہے کہ ہم اس کے دین کو اس شریعت کے مطابق قائم کریں جو اس نے اپنے رسول کو دے کر مبعوث کیا، وہ ہم سے یہ قبول نہیں کرتا کہ ہم محمد ﷺ کی شریعت کے بغیر کسی اور شریعت کے مطابق عمل کریں۔

مشروع اور جائز اعمال مخصوص اقوال اور افعال کا مجموعہ ہوتے ہیں، بسا اوقات ان کے لیے مخصوص اوقات، مخصوص جگہوں اور صفات کا اعتبار بھی کیا جاتا ہے، چونکہ اللہ کی عبادت ہم پر فرض ہے اور عبادت مخصوص ہیئت اور اوصاف کی حامل ہوتی ہے، اس لیے ہم پر وہ قصد کرنا بھی فرض ہے جس کے ساتھ ہم عابد بن سکتے ہیں اور وہ قصد جس کے ساتھ ہم عابد بنتے ہیں وہ اسی عمل کے ساتھ ہوگا جس کا حکم دیا گیا ہو۔ پھر یہ بھی جان لو کہ نیتیں کبھی بالجملہ حاصل ہوتی ہیں، کبھی تفصیلاً اور کبھی بذریعہ تلازم۔ نیتیں مختلف بھی ہوتی ہیں، بلکہ کچھ نیتیں کچھ نیتوں سے افضل ہوتی ہیں کہ فرض تو ادنیٰ نیت کے ساتھ ساقط ہو جاتا ہے، لیکن جو اعلیٰ نیت کو پیشِ نظر رکھتا ہے وہ فضیلت حاصل کر لیتا ہے۔ کبھی چیز دوسرے قصد کے ساتھ مقصود ہوتی ہے، پہلے کے ساتھ نہیں، پھر کبھی انسان دوسرا قصد ذہن میں رکھتا ہے اور پہلے قصد کو بھول جاتا ہے۔

انسان اپنی عبادت میں کبھی بالجملہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا قصد کرتا ہے یا اس کی اطاعت کا، یا اس کی عبادت کا، یا اس کا قرب چاہنے کا، یا اس کا ثواب چاہنے کا، لیکن کسی مخصوص ثواب کا احساس کیے بغیر، یا وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں کسی خاص ثواب کی امید رکھتا ہے، یا اس کی سزا سے بالجملہ یا تفصیلاً خوف کھاتا ہے۔ ان نیتوں کی تفاصیل کا باب بڑا وسیع ہے۔

اس اعتبار سے ایسا ہوسکتا ہے کہ انسان کے لیے بدنی اعمال میں سے کسی نوع میں غرض ہو کسی میں نہ ہو، مگر اس اعتبار سے کہ اس کو عمل واجب کی نوعیت کی نیت پر قیاس کیا جائے، مثلاً جو حج کا قصد کرتا ہے اس نے بالجملہ حج کا احساس کرلیا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے مخصوص جگہ کا قصد کیا ہوتا ہے تو جس کا اس نے احساس کیا ہوتا ہے، علم کے بغیر اس کا قصد کرتا ہے۔ اس نے وقوف، طواف اور ممنوعات کے ترک وغیرہ کی طرح کے حج کے تفصیلی اعمال کا قصد نہیں کیا ہوتا، بلکہ حج کے اعمال کی تفاصیل مقصود ہو جاتی ہیں، جب وہ ان کا احساس کرلے۔ بسا اوقات وہ حج کے اعمال کی جنس سے واقف ہوتا ہے کہ یہ وقوف اور طواف وغیرہ ہیں، کیوں کہ یہ اس کے لیے بیان کر دیے جاتے ہیں، اگرچہ اس کو بعینہٖ اس کی جگہ اور طواف کی صورت کا علم نہیں ہوتا تو وہ ان اعمال کی نیت کر لیتا ہے، بسا اوقات انسان کو ان تمام اعمال کا علم ہوتا ہے تو جس کا علم رکھتا ہے اس کی نیت کر لیتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی کافر مسلمان ہو تو ہم اس سے کہیں گے: تجھ پر نماز واجب ہوگئی ہے، تو وہ اجمالاً اس کا احساس کر کے اس کا التزام اور نیت کرتا ہے، اگرچہ وہ اس کی کیفیت اور طریقے سے ناواقف ہو، بلکہ ہر وہ شخص جو رسول اللہ ﷺ پر پختہ ایمان رکھتا ہے، اس کا ایمان آپ ﷺ کی دی ہوئی ہر خبر کی تصدیق اور آپ ﷺ کے دیے گئے ہر حکم کی فرماں برداری پر مشتمل ہوتا ہے، اگرچہ اس کو آپ ﷺ کی دی گئی خبروں اور بتائے گئے اعمال کا علم ہو نہ اس نے ان کی انواع کا قصد ہی کیا ہو۔ پھر جب تفصیل کا علم ہو جائے تو اس وقت وہ تصدیق اور اطاعت کر کے ایمان داروں اور نیک اعمال کرنے والوں میں شامل ہو جائے گا یا مخالفت کرے گا تو اس صورت میں منافق بن جائے گا، یا گناہ گار فاسق وغیرہ۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ قصد و نیت کی تین اقسام بنتی ہیں:

① کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کا قصد کرتا ہے اور کسی مخصوص مامور بہ عمل کا قصد نہیں کرتا، مثلاً کوئی مالدار محض اللہ کی رضا کی خاطر مانگنے والے کو بھی دیتا ہے، محروم کو بھی۔ اس کے ذہن میں زکات کا خیال ہوتا ہے نہ کسی کفارے کا اور نہ یہ کہ وہ مصارفِ زکات کی آٹھ اقسام میں سے کسی ایک قسم میں صرف کر رہا ہے، کسی میں نہیں۔ اس شخص کو اس عمل کا ثواب ملے گا جو وہ اللہ کے لیے کرتا ہے، لیکن واجبات کا حکم اس کے ذمے باقی رہتا ہے۔

② ایک شخص کسی مخصوص عمل کا قصد کرتا ہے، لیکن اللہ کی اطاعت اور عبادت اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتی، مثلاً جو محض اپنی جان بچانے کے لیے، اپنا مال بچانے کے لیے یا اپنی حرمت اور حقوق کی حفاظت کے لیے سلطان کو زکات دیتا ہے، یا نماز پڑھتا ہے، جو عموماً منافقوں اور خصوصاً ریاکاروں کی روش ہوتی ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے:

﴿ وَإِذَا قَامُوٓا إِلَى ٱلصَّلَوٰةِ قَامُوا كُسَالَىٰ ﴾ [النساء: ۱۴۲]

''اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴾ [الماعون: ٤۔٧]

''پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے۔ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں۔''

مزید فرمایا:

﴿ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كٰرِهُونَ ﴾ [التوبة: ٥٤]

''اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر اس طرح کہ سست ہوتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں۔''

③ انسان کو جس مخصوص عمل کا حکم دیا جائے وہ اس کو صرف اللہ کے لیے کرنے کا قصد کرے۔ فقہا کا اتفاق ہے کہ واجب عمل کی نوع میں اجمالاً نیت کرنا ضروری ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ نماز کے وقت نماز کا قصد کرے، حج کے وقت حج کا اور روزے کے وقت روزے کا۔ فقہا کے ہاں اس کی فروع میں تفصیل اور اختلاف ہے جس کے ذکر کا یہ محل نہیں۔

پہلی نیت، جو اللہ کی طرف منسوب کرنے کی نیت ہے، فقہا کے ہاں اختلافی ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے کچھ کہتے ہیں: اللہ کی طرف منسوب کرنے کی نیت فرض نہیں۔ کچھ نماز، حج اور روزے کی طرح کی عباداتِ مقصودہ اور طہارت و تیمم جیسی غیر مقصودہ عبادات میں فرق کرتے ہیں۔ شافعی فقہا بھی اللہ کی طرف نسبت کرنے کی نیت کا اعتبار نہیں کرتے، کیوں کہ نیت بذاتِ خود فعلِ عبادت ہے جو اللہ کی طرف نسبت پر مشتمل ہے، جس طرح رکعات کی تعداد پر بھی مشتمل ہے، کیوں کہ نماز اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز ہی نہیں، اسی طرح حضر میں نمازِ ظہر کی چار رکعات ہی ہوتی ہیں، اس لیے نسبت کرنے کی نیت فرض نہیں۔

مزید برآں حکمی نیت متحضر (ذہن میں حاضر کی گئی) کے قائم مقام ہوتی ہے۔ اگرچہ متحضر نیت زیادہ کامل اور افضل ہے۔ اگر بندہ شروع ہی سے نمازِ ظہر کی نیت کر لے تو حکمی نیت کو ساتھ رکھنا اس کو کفایت کر جائے گا۔ اسی طرح وہ بندۂ مومن جس کے دل میں ایمان داخل ہو گیا ہو وہ عمومی نیت کر لیتا ہے۔ اس کی عبادات اسی کے لیے ہوتی ہیں کسی دوسرے کے لیے نہیں، کیوں کہ اگر اس طرح نہ ہو تو وہ منافق ہو گا۔

اگر وہ نماز یا روزے جیسی کسی مخصوص عبادت کی نیت کرے تو وہ عبادات کی تمام انواع کے لیے اس عمومی نیت کے حکم کو اپنے ساتھ رکھنے والا ہو گا۔

جس طرح نماز میں اگر وہ نماز کے دوران میں رکوع اور سجدے کی نیت کرتا ہے تو وہ ظہر یا عصر کی نماز کے تمام اعمال کی عمومی نیت کے حکم کو ساتھ رکھتا ہے پھر اگر وہ کوئی ایسا کام کرے جو اس کے معارض ہو تو وہ نیت کو خراب کر دے گا اور اس کو فسخ کر دے گا، مثلاً وہ نماز کے دوران میں نماز کی نیت توڑ دے۔ اگر وہ اپنی جان یا مال بچانے کے لیے نماز پڑھتا ہے یا زکات دیتا ہے تو وہ اس ایمانی نیت کو فسخ کر دیتا ہے۔

لہٰذا ہمارے اور اکثر علما کے نزدیک یہ عبادت فاسد اور خراب ہو جاتی ہے۔ اس نیت کے ساتھ فرض ساقط نہیں ہوتا۔ ہماری رائے کے مطابق دکھاوا کرنے والوں کی فرض عبادات باطل اور لغو ہوتی ہیں۔ اگر سلطان ایسے شخص سے جبراً زکات وصول کرتا ہے جو ادا کرنے سے انکار کرتا ہے تو صحیح رائے کے مطابق وہ باطن میں ادا نہیں ہوتی، لیکن چونکہ اکثر مسلمان مسلمان ماں باپ کے ہاں جنم لیتے ہیں، اس لیے وہ حکماً مسلمان ہوتے ہیں، ان میں بالفعل ایمان موجود نہیں ہوتا۔ جب بالغ ہوتے ہیں اس وقت کچھ کو بالفعل ایمان نصیب ہوتا ہے اور وہ فرائض ادا کرتا ہے۔ کچھ لوگ محض رسماً اپنے رشتے داروں یا اہلِ شہر یا ماحول کی وجہ سے فرائض بجا لاتے ہیں، مثلاً کوئی محض اس وجہ سے زکات دیتا ہو کہ اس کی جبری وصولی سلطان کا معمول ہو۔ اس کو اپنے اوپر اس کی فرضیت کا اجمالاً یا تفصیلاً، علم نہ ہو تو اس کے نزدیک خود ساختہ ٹیکسوں اور فرض زکات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یا اہلِ مکہ میں سے جو ہر سال عرفات جاتا ہو، کیوں کہ یہ ایک معمول ہو اور اس کو اجمالاً یا تفصیلاً قطعاً یہ احساس نہ ہو کہ یہ اللہ کے لیے عبادت ہے۔

یا جو شخص اس لیے کافروں سے لڑے کہ اس کا قبیلہ ان سے لڑتا ہے، لہٰذا وہ بھی اپنے قبیلے کی متابعت میں ان کے خلاف لڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کی عبادت بلاتردد صحیح نہیں، بلکہ کتاب وسنت اور اجماعِ امت کا فیصلہ ہے کہ اس طرح کے اعمال فرض کو ساقط نہیں کرتے۔ لہٰذا کوئی گمان کرنے والا یہ گمان نہ کرے کہ یہ فقہا نے جو کہا ہے کہ اللہ کی طرف نسبت کی نیت واجب نہیں تو اس سے اس طرح کے لوگ مراد ہیں، بلکہ فقہا کے اس قول میں محض حکمی نیت پر اکتفا کرنے کا ذکر ہے، جس طرح ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

لہٰذا جو شخص اپنے عمل میں نہ اجمالاً نہ تفصیلاً اللہ کی رضا کا ارادہ کرتا ہے، اس میں اور اس میں بہت فرق ہے جو اجمالاً اللہ کی رضا کا ارادہ کرتا ہے، لیکن کسی مخصوص عمل میں تفصیلاً نیت کرنے سے بھول جاتا ہے یا غافل ہو جاتا ہے۔

کوئی امام یہ نہیں کہتا کہ پہلا شخص اللہ کے لیے عبادت کرنے والا ہے، بلکہ وہ اصلاً اس کو ادا ہی نہیں کرتا جس

کا حکم اس کو دیا گیا تھا، یہ بالکل ظاہر ہے۔ ہمارے اصحاب میں سے جس نے مخصوص عمل کے وقت اس نیت کی شرط لگائی ہے، اس کا کہنا ہے: نماز میں جو فرض نیت ہے وہ یہ ہے کہ وہ بعینہٖ اس فعلِ نماز کو ادا کرنے کا اعتقاد رکھے جو اللہ نے اس پر فرض کیا ہے اور ریا کاری اور شہرت طلبی کے بغیر اس فرض حکم کی بجا آوری کا ارادہ رکھے۔ وہ طہارت اور نماز وغیرہ میں نیت کے فرض ہونے پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [البينة: ۵]

''اور انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے ہوں۔''

ان کے بقول: دین کو خالص کرنے سے مراد نیت ہے۔ جو محض ٹھنڈک یا صفائی کے لیے غسل کرتا ہے وہ دین کو اللہ کے لیے خالص نہیں کرتا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴾ [الشوریٰ: ۲۰]

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں۔''

وہ کہتے ہیں جو ٹھنڈک یا صفائی کے لیے غسل کرتا ہے وہ آخرت کی کھیتی کا ارادہ نہیں کرتا۔

معلوم ہوا یہ دونوں آیات عمل کو محض اللہ اور آخرت کے لیے کرنے کے فرض ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور مخصوص عمل کی نیت کے وجوب پر دلالت کرنے سے زیادہ بلیغ ہیں۔

جو پہلی رائے کی تائید کرتے ہیں ان کے نزدیک نوع کی نیت جنس کی نیت کو مستلزم ہے۔ جو مخصوص عمل کی نیت کرتا ہے وہ اپنے ایمان کے موجب اللہ کے لیے عمل کی نیت کرتا ہے۔

جو دوسری رائے کی تائید کرتے ہیں، ان کے نزدیک نیت فرض عمل پر بیس سال مقدم نہیں ہوتی، بلکہ کچھ تھوڑا سا مقدم ہوسکتی ہے یا وجوب کے اول وقت سے ہوسکتی ہے۔

مزید برآں دلیل ظاہر ہے، قیاس تمام عبادات میں نیت کو حاضر رکھنے پر دلالت کرتا ہے، صرف عبادت کے دوران میں اس کو ساتھ رکھنا معاف ہے، کیوں کہ اس میں مشقت ہے، لیکن ہر فعل عبادت کے وقت عبادت میں اللہ کے لیے نیت کرنا باعثِ مشقت نہیں۔ نیز اکثر لوگوں کا اسلام حکمی ہے، وہ اگر کسی کے دل میں داخل ہو تو دورانِ امر ہی داخل ہوتا ہے، اس لیے اگر ان پر یہ نیت لازم نہ کی جائے تو وہ اس کا قصد ہی نہ کریں۔ نتیجتاً ان کے دل اس سے

خالی ہو جائیں گے اور وہ منافق بن جائیں گے، جو وہ عمل کرتے ہیں محض رسمی طور پر دوسروں کی متابعت ہی میں کرتے ہیں، جس طرح اکثر لوگوں کا حال ہے۔

طواف کے لیے طہارت کا حکم

سوال حائض، جنبی اور بے وضو طواف کر سکتے ہیں کہ نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

《اَلْحَائِضُ تَقْضِيُ الْمَنَاسِكَ كُلَّهَا إِلَّا الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ》[2]

''حائضہ تمام مناسکِ حج ادا کرے گی، سوائے طواف کے۔''

آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا:

《اِصْنَعِيُ مَا يَصْنَعُ الْحَاجُّ غَيْرَ أَنْ لَّا تَطُوفِيُ بِالْبَيْتِ》[3]

''جو حاجی کرتا ہے وہ (اعمالِ حج) کر، مگر یہ کہ طواف نہ کرنا۔''

جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ حضرت صفیہ کو بھی ماہواری آ گئی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ ہمیں روک دے گی؟'' آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ اس نے طوافِ افاضہ کر لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر نہیں۔''[4]

آپ ﷺ نے جب نو ہجری کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا تو ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا: 《أَنْ لَّا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ》[5] ''برہنہ طواف نہ کیا جائے۔'' کسی صحابی نے آپ ﷺ سے یہ نقل نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے طواف کرنے والوں کو وضو کا حکم دیا ہو اور نجاست سے اجتناب کرنے کا کہا ہو، جس طرح نماز پڑھنے والوں کو وضو کا حکم دیا ہے۔

حائضہ کو طواف سے منع یا تو مسجد کی وجہ سے کیا ہے، کیوں کہ اس کے لیے مسجد میں ٹھہرنا منع ہے اور طواف میں ٹھہرا جاتا ہے، یا مطلقاً اس میں داخل ہونے سے منع ہے، خواہ گزرنے کے لیے ہو یا ٹھہرنے کے لیے یا اس وجہ سے کہ طواف حیض کی حالت میں حرام ہے جس طرح اس کے لیے نماز اور روزہ نص اور اجماع کی دلیل سے حرام ہے

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/۲٦ـ۳۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٦٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤٧)

اور قرآن کریم چھونا عام علما کے نزدیک، اسی طرح ایک قول کے مطابق تلاوتِ قرآن بھی ممنوع ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا: ''مجھے مسجد سے چٹائی پکڑاؤ۔'' میں نے کہا: میں حیض سے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارا حیض تمھارے ہاتھ میں نہیں۔''[1]

ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سر ہم میں سے کسی کی گود میں رکھتے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور وہ حیض سے ہوتیں۔ ہم میں سے ایک اٹھتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چٹائی مسجد میں بچھا آتی اور وہ حیض سے ہوتی۔'' (رواہ النسائی)[2] ابو داود میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مسجد کو جنابت والے اور حیض والی کے لیے حلال نہیں کرتا۔''[3] اس کو ابن ماجہ نے امِ سلمہ سے روایت کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں کلام کیا گیا ہے۔ اس لیے احمد، شافعی اور اکثر علما ان احادیث کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لیے مسجد سے گزرنے اور مسجد میں ٹھہرنے میں فرق کرتے ہیں۔ ابو حنیفہ اور مالک ٹھہرنے اور گزرنے دونوں سے منع کرتے ہیں۔ کچھ علما حائض پر مسجد کو حرام نہیں کہتے۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ ﴾ [النساء: ٤٣]

''اور نہ اس حال میں کہ جنبی ہو، مگر راستہ عبور کرنے والے۔''

احمد وغیرہ نے وضو کر کے مسجد میں ٹھہرنے کو جائز کہا ہے اور عطا بن یسار کے اس اثر سے استدلال کیا ہے جو مسند احمد اور دیگر کتب میں ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''میں نے اصحابِ رسول میں سے کئی مردوں کو دیکھا وہ جنابت کی حالت میں نماز جیسا وضو کر کے مسجد میں بیٹھ جاتے تھے۔'' اور یہ شاید اس وجہ سے، ویسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ مسجد فرشتوں کا گھر ہے اور فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی جنابت والا ہو، جس طرح سنن میں مروی ہے، اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنابت والے کو وضو کے بغیر سونے سے منع کیا ہے۔

یحییٰ بن سعید نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، وہ کہتی تھیں: ''تم میں سے کوئی ایک جب اپنی بیوی سے مجامعت کرے، پھر سونا چاہے تو اس وقت تک نہ سوئے جب تک نماز کے جیسا وضو نہ کر لے، اسے کیا معلوم کہ نیند ہی میں چل بسے۔''[4] ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اگر وہ فوت ہو جائے تو فرشتے اس کے جنازے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٣، ٣٨٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٥) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٦١١٧)

[4] الموطأ (٤٧/١) مصنف ابن أبي شيبة (٦٠/١)

میں شریک نہیں ہوتے۔"[1] نبی اکرم ﷺ نے جنابت والے کو کھانے پینے کے وقت اور دوبارہ مجامعت سے پہلے وضو کا حکم دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وضو کے ساتھ جنابت اعضائے وضو سے دور ہو جاتی ہے اور اس کی جنابت مکمل نہیں رہتی، گو اس پر ایک حد تک ناپاکی رہتی ہے، جس طرح اگر کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو اس پر حدثِ اصغر، یعنی چھوٹی ناپاکی رہتی ہے، لیکن جنابت نہیں تو وضو کر لینے سے اگرچہ اس کی ناپاکی حدثِ اصغر سے کچھ زیادہ ہوتی ہے، لیکن جنابت سے کم ہوتی ہے، جو فرشتوں کو حاضر ہونے سے نہیں روکتی، اس لیے وہ مسجد میں سو بھی سکتا ہے اور ٹھہر بھی سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنابت اجزا میں تقسیم ہو جاتی ہے جو بعض بدن سے زائل ہو جاتی ہے، بعض سے نہیں، جس طرح جمہور علما کا موقف ہے۔ جہاں تک حائضہ کی بات ہے تو اس کا حدث دائمی ہوتا ہے۔ اس کی ایسی طہارت ممکن نہیں ہوتی جو دوام سے روک دے، اس لیے وہ اپنے ٹھہرنے، سونے اور کھانے وغیرہ میں معذور ہے، اس لیے اس کو ان کاموں سے نہیں روکا جائے گا جن سے جنبی کو روکا جاتا ہے۔ جب اس کو ان کاموں کی ضرورت بھی نہ ہو۔ اس بنا پر علما کا زیادہ ظاہر قول یہی ہے کہ اس کو تلاوتِ قرآن سے نہ روکا جائے۔ اگر اس کو اس کی ضرورت ہو۔ یہ مالک کا مذہب، شافعی کا ایک قول اور احمد سے ایک روایت ہے۔ تو وہ اس کی ضرورت مند ہوتی ہے، لیکن جس طرح جنابت والے کے لیے طہارت ممکن ہوتی ہے اس کے لیے اس طرح ممکن نہیں ہوتی، اگرچہ اس کا حدث اس اعتبار سے جنابت والے کے حدث سے زیادہ سخت ہے کہ وہ اس وقت تک روزہ نہیں رکھ سکتی جب تک حیض بند نہ ہو، جب کہ جنابت والا روزہ رکھ سکتا ہے، پھر اس حالت میں اس کو نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی اور آدمی کو اس کے ساتھ جماع کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے اس کے حق میں حظر، یعنی منع کا تقاضا زیادہ قوی ہے، لیکن جب وہ فعل کی ضرورت مند ہو تو محظور، یعنی ممنوع، مسببِ حظر کے ہوتے ہوئے، ضرورت کی وجہ سے مباح ہو جاتا ہے، جس طرح خون، مردار اور خنزیر کے گوشت جیسے تمام محرمات ضرورت کے ساتھ مباح ہو جاتے ہیں، اگرچہ جو چیز حرمت میں ان مذکورہ چیزوں سے کم ہو وہ بھی حاجت کے بغیر مباح نہیں ہوتی، مثلاً ریشم پہننا اور سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا اور اس طرح کی چیزیں۔

اسی طرح بے پردگی کے ساتھ غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنا اور بدن اور کپڑے میں نجاست کے ساتھ نماز پڑھنا، دیگر چیزوں کی نسبت زیادہ سخت حرام ہیں، مگر وہ حاجت کے ساتھ مباح، بلکہ واجب ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ چیزیں جو حرمت میں ان مذکورہ کاموں سے کم ہوں، ضرورت کے بغیر مباح نہیں ہوتیں، مثلاً: تلاوتِ قرآن۔

اگر جنابت والے کے لیے بھی کوئی ایسی صورت بن جائے جس کی وجہ سے اس کی جنابت دائمی ہو جائے اور

---

[1] مسند أبي يعلیٰ (۲۳۱/۱۱)

وہ غسل یا تیمّم کرنے پر قادر نہ ہو تو یہ بھی اس رخصت میں حیض والی کی طرح ہو جائے گا، اگرچہ یہ بہت نادر ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے حیض والیوں کو عید کے لیے نکلنے، بھلائی میں حاضر ہونے اور مسلمانوں کی دعا میں شریک ہونے اور لوگوں کے ساتھ تکبیر کہنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے حیض اور نفاس والی کو احرام باندھنے اور تلبیہ پڑھنے کا حکم دیا۔ ان دونوں میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے ان کو عرفات میں حاضر ہونے کا بھی کہا ہے۔ جمرات کو کنکریاں مارنے کا بھی حکم دیا ہے۔ ان دونوں کاموں میں بھی ذکر اور دعا ہوتی ہے۔ یہ کام ان کے لیے مکروہ نہیں، بلکہ واجب ہیں، لیکن جنبی کے لیے یہ کام اس وقت تک مکروہ ہیں جب تک وہ غسل نہ کرے، کیوں کہ وہ حائضہ کے عکس طہارت پر قادر ہوتا ہے۔

ان مسائل اور ان کی انواع میں یہ ایک عظیم الشان قاعدہ ہے۔ لہٰذا ممانعت کا تقاضا کرنے والی مفسدت کی شدت اور غلاظت ہی کو نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اس کے ساتھ اس حاجت کو بھی دیکھنا چاہیے جو اجازت یا استحباب یا وجوب کو لازم کرتی ہے۔

ہر وہ چیز جس کے ساتھ نماز حرام ہو جاتی ہے، ضرورت کے وقت اس کے ساتھ واجب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر نماز صرف اس صورت میں پڑھنا ممکن ہو، کیوں کہ ان امور کے ساتھ نماز ادا کر لینا چھوڑ دینے سے تو بہتر ہے۔ اگر کوئی انسان پانی کے استعمال پر قادر ہو، پھر بھی تیمّم کر کے نماز پڑھے تو نماز حرام ہو گی، لیکن جب وہ پانی استعمال کرنے پر قادر نہ ہو تو اس وقت تیمّم کے ساتھ وقت پر پڑھنا واجب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مردار کھانا، خون پینا اور خنزیر کا گوشت استعمال کرنا اس وقت حرام ہوتا ہے جب انسان اس سے مستغنی ہو، لیکن ضرورت کے وقت ان چیزوں کو کھانا جمہور علما اور ائمہ اربعہ کے نزدیک واجب ہو جاتا ہے۔

مسروق کا قول ہے کہ جو ان چیزوں کو کھانے کے لیے مجبور ہو جائے، لیکن پھر بھی نہ کھائے، حتی کہ مر جائے، وہ جہنم میں جائے گا، کیوں کہ اس حالت میں جو کھانا اس کے لیے مباح ہو چکا تھا، اس نے اس کو ترک کر کے اپنے قتل پر آپ معاونت کی ہے، لہٰذا وہ خودکشی کرنے والا سمجھا جائے گا، لیکن جہاد میں جان پیش کرنے والے مجاہد اور ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے والے کے عکس، کیوں کہ یہ شخص مجاہد قتل کیا جاتا ہے اور اس کے قتل میں دین کی مصلحت ہوتی ہے۔

حائضہ کو طواف سے روکنے کی جو یہ علت بیان ہوئی ہے کہ یہ مسجد کی حرمت کی وجہ سے ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کچھ حنفی فقہا بھی اس کی یہی علت بیان کرتے ہیں۔ ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ طواف کے لیے طہارت واجب ہے، فرض اور شرط نہیں، لیکن یہ تعلیل اس قول کے بھی مناسب ہے کہ بے وضو کا طواف حرام نہیں۔ منصور بن معتمر اور حماد بن ابو سلیمان کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام احمد نے یہ ان دونوں سے نقل کیا ہے۔

عبداللہ بن احمد نے اپنے ''مناسک'' میں اپنے باپ کی سند سے نقل کیا ہے۔ شعبہ نے حماد اور منصور نے ہمیں بتایا کہ اس نے ان دونوں سے وضو کے بغیر طواف کرنے والے کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ عبداللہ بن احمد کہتے ہیں: میں نے اس کے بارے میں اپنے باپ سے پوچھا تو انھوں نے کہا: ''وضو کی حالت میں طواف کرنا میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے، کیوں کہ طواف نماز ہے۔'' امام احمد سے اس سلسلے میں دو روایات منقول ہیں۔

کچھ حنفی بھی کہتے ہیں کہ طواف میں طہارت واجب نہیں، بلکہ سنت ہے، لیکن ساتھ ہی ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ اس کو ترک کرنے میں دم لازم آتا ہے۔ جو کہتا ہے: حائضہ اور جنبی کے برخلاف بے وضو کے لیے طواف کرنا جائز ہے، اس کو منع کے لیے مسجد کی حرمت علت ہو سکتی ہے بالخصوص طواف نہیں، کیوں کہ طواف میں بات چیت کرنا، کھانا، پینا جائز ہے، اس لیے وہ نماز کی طرح نہیں۔ نیز طہارت نماز کی کنجی، تکبیر اس کی تحریم اور سلام اس کی تحلیل ہے اور طواف اس طرح نہیں ہوتا۔ بے لباس طواف کرنے سے ایک تو مسجد کی حرمت کی وجہ سے اور دوسرے لوگوں کی نظر پڑنے کی وجہ سے منع کیا گیا جو اس بات کا قائل ہے وہی یہ بھی کہتا ہے کہ مطاف تمام مساجد سے اشرف ہے اور وہ شاید ہی کبھی کسی طواف کرنے والے سے خالی رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ [الأعراف: ٣١] ''ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسجد میں داخل ہوتے وقت زینت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ نماز کے برخلاف ہے، کیوں کہ نمازی کو نفسِ نماز کے لیے ستر ڈھانپنا ہوتا ہے اور نماز ہر جگہ پڑھی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اندھیرے گھر میں بھی نماز پڑھے تو اس حالت میں بھی اس کو نماز کے لیے ستر ڈھانپنے کا حکم ہے، لیکن طواف کے عکس کہ وہ صرف مسجدِ حرام میں ہوتا ہے اور اعتکاف کے لیے جنسِ مسجد کا ہونا شرط ہے۔

ان لوگوں کے قول کے مطابق جب جنبی اور حائضہ طواف کے لیے مجبور ہوں تو ان کے لیے طواف حرام نہیں، جس طرح ان کے ہاں بے وضو کے لیے طواف حرام نہیں ہوتا، کیوں کہ اس صورت میں ان کے لیے مسجد میں جب داخل ہونا حرام نہیں، اگر وہ اس کے لیے مجبور ہو جائیں تو اس بے وضو سے تو جواز کا زیادہ حق رکھتے ہیں جو کسی عذر کے بغیر حدث کے ساتھ (وضو کے بغیر) طواف کر سکتا ہے۔

آپ دیکھتے نہیں کہ بے وضو انسان کو طہارت پر قادر ہونے کی صورت میں نماز پڑھنے اور قرآن پاک چھونے سے منع کیا جاتا ہے، لیکن جنبی کے لیے یہ تیمّم کے ساتھ جائز ہیں۔ اگر تیمّم بھی نہ کر سکتا ہو تو علما کے ایک قول کے مطابق تیمم اور غسل کے بغیر ہی پڑھ لے۔ یہ امام شافعی اور احمد کا مشہور مذہب ہے۔ صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ صحابہ نے تیمّم کی آیت اترنے سے پہلے جنابت کی حالت ہی میں نماز پڑھ لی تھی۔ حائضہ کو روزے سے منع کیا گیا ہے۔ وہ

حالتِ حیض میں روزے کی محتاج نہیں۔ وہ رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں اپنے روزے پورے کر سکتی ہے۔ اگر مسافر اور مریض کو روزے کا امکان رکھنے کے باوجود رمضان کے علاوہ کسی دوسرے مہینے میں روزے رکھنے کا اختیار حاصل ہے تو حائضہ جس کو ویسے ہی روزہ رکھنا منع ہے، وہ کیوں کسی دوسرے میں نہیں رکھ سکتی؟! جب اس کو روزے کی قضا دینے کا حکم دیا گیا ہے تو ایک ہی مہینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس پر بھی وہی عائد ہوتا ہے جو دوسروں پر عائد ہوتا ہے۔ اس لیے اگر وہ استحاضہ میں مبتلا ہو تو استحاضہ کے ساتھ روزہ رکھے گی، کیوں کہ اس سے احتراز ممکن نہیں اور وہ قضا کے وقت بھی اس کا شکار ہو سکتی ہے۔ نماز دن رات میں پانچ مرتبہ تکرار کے ساتھ آتی ہے اور حیض نماز سے روکتا ہے۔ اگر کہا جاتا کہ وہ ضرورت اور حاجت کی وجہ سے حیض کے ساتھ نماز پڑھ لے تو معمول کے مطابق حیض نماز میں مانع نہ ہوتا اور روزہ اور طواف نماز سے زیادہ حرمت والے ہو جاتے، لیکن اس طرح نہیں، بلکہ یہ نماز کی حرمت ہے کہ وہ حیض کے وقت نماز نہیں پڑھ سکتی، اگر اس کو طواف سے محض مسجد کی وجہ سے منع کیا گیا ہے تو پھر یہ سیدھی بات ہے کہ اس کا عذر کی وجہ سے مباح ہونا قرآن پاک کو عذر کی وجہ سے چھونے سے اولیٰ ہے۔

اگر حائضہ کا قرآن پاک ہو اور اس کے لیے کسی وجہ سے اس کو چھونا ناگزیر ہو جائے تو اس کے لیے یہ جائز ہو جاتا ہے، حالانکہ بے وضو قرآن پاک کو نہیں چھوتا، لیکن بے وضو کے لیے مسجد میں داخل ہونا جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مصحف، یعنی قرآن پاک کی حرمت مسجد کی حرمت سے بڑھ کر ہے۔ اگر حائضہ کے لیے ضرورت کی وجہ سے مصحف کو چھونا جائز ہے تو مسجد میں داخل ہونا کیوں جائز نہیں، جس کی حرمت قرآن پاک کی حرمت سے کم ہے؟

عورتوں کو دورانِ حج میں پیش آنے والے مسائلِ حیض

سوال حج کے موقع پر عورتوں کی بہت بڑی تعداد ماہواری سے ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے، اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، کچھ عورتیں ابتدائے احرام سے حالتِ حیض میں ہوتی ہیں۔ کچھ کو ایامِ تشریق میں حیض آ جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس میں عورتیں مبتلا ہوتی ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ عورت کو مہینے کے شروع میں حیض آ جائے اور اس کے لیے حالتِ حیض کے سوا طواف کرنا ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو پانچ سے لے کر نو تاریخ کے درمیان حیض آ جائے اور اس کا حیض سترہ تاریخ یا

---

(1) مجموع الفتاویٰ (٢٦/١٧٦ـ١٨٤)

اس سے بھی زیادہ تک رہے تو وہ وقوف بھی حالتِ حیض میں کرے گی۔ رمی جمرات بھی اور طوافِ افاضہ بھی، اس کے لیے عمرہ کرنا ممکن نہیں ہو گا۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ اگر عورت کو طوافِ افاضہ سے پہلے حیض آ جائے۔

ان صورتوں میں عورتوں کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب الحمد لله رب العالمين.

پہلا مسئلہ:

پہلی صورت کا جواب یہ ہے کہ حائضہ حالتِ حیض میں طواف کے سوا حج کے باقی اعمال اور مناسک ادا کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت بھی یہی ہے اور اس پر ائمہ کا اتفاق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَائِضُ تَقْضِي الْمَنَاسِكَ كُلَّهَا إِلَّا الطَّوَافَ »[1]

''حائضہ طواف کے سوا تمام مناسک ادا کرے۔''

حضرت اسما بنت ابی بکر ذی الحلیفہ کے مقام پر نفاس سے ہو گئیں تو آپ ﷺ نے ان کو غسل کر کے احرام باندھنے کا حکم دیا۔[2] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب مقامِ سرف پر حیض آ گیا تو آپ ﷺ نے ان کو غسل کر کے احرام باندھنے اور عرفات میں ٹھہرنے سے پہلے طواف نہ کرنے کا حکم دیا۔[3]

یہ عورت جو عرفات میں ٹھہرنے سے پہلے حیض کی حالت میں مکے میں داخل ہوئی، یہ طواف نہ کرے، لیکن عرفات میں وقوف کرے، چاہے حیض ہی سے ہو۔ اگر وہ پیلا یا مٹیالا پن (حیض کی رطوبتوں کی کیفیات) دیکھے تو پھر کیا کرے؟ یاد رہے پیلا پن اور مٹیالا پن کے حوالے سے فقہا کے تین اقوال ہیں:

1. یہ مطلق حیض ہے۔
2. یہ مطلق حیض نہیں۔
3. اگر یہ کالے اور سرخ خون کے ساتھ معمول کے مطابق آتا ہو تو حیض شمار ہو گا ورنہ نہیں۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس روئی بھیجتیں جس پر زرد رنگ کی رطوبتیں ہوتیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان سے کہتیں کہ جلدی نہ کریں تا آنکہ سفید رطوبت (ماہواری سے پاک ہونے کی علامت) نہ دیکھ لیں۔ اس طرح یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٦٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٤٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

خواتین سفید رطوبت سے پہلے کی حالت کو حیض ہی پر محمول کرتیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے:

«كُنَّا لَا نَعُدُّ الصُّفْرَةَ وَالْكُدْرَةَ بَعْدَ الْحَيْضِ شَيْئًا »[1]

''ہم پاک ہونے کے بعد گدلے پن اور زرد پن کو کوئی حیثیت نہیں دیتی تھیں۔''

حج کے مناسک اور اعمال میں طواف کے سوا کسی عمل میں طہارت واجب نہیں۔ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے طہارت واجب ہے اور اس پر سب علما کا اتفاق ہے، لیکن صفا و مروہ کی سعی کرنے میں اختلاف ہے۔ جمہور کا موقف ہے کہ سعی کے لیے طہارت واجب نہیں۔

البتہ طواف کے لیے طہارت کے متعلق علما کا یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ (طہارت) طواف کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے، جس طرح نماز کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے یا یہ واجب ہے جس کو چھوڑ دیا جائے تو دم سے اس کا ازالہ ہوسکتا ہے؟ جس طرح میقات سے احرام نہ باندھنے یا رمی جمرات کو چھوڑ دینے وغیرہ جیسے کاموں کا ازالہ دم دینے سے ہو جاتا ہے۔

طہارت کے شرط یا واجب ہونے میں دو مشہور اقوال ہیں اور امام احمد سے دونوں روایات منقول ہیں۔

ان کا مشہور قول یہ ہے کہ طواف کے لیے طہارت شرط ہے۔ اگر کوئی انسان جنابت کی حالت میں یا بے وضو یا حیض کی حالت میں بھول کر یا لاعلمی کی بنا پر طواف کرتا ہے، پھر اس کو معلوم ہو جائے تو وہ طواف دہرائے۔ مالک اور شافعی کا مذہب بھی یہی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ واجب ہے۔ اگر کوئی طہارت کے بغیر طواف کرے تو دم سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، لیکن ابوحنیفہ کے نزدیک جنابت اور حیض کی حالت میں اونٹ کا دم ہے اور بے وضو کے لیے بکری۔

امام احمد نے دم کو لازم قرار دیا ہے، لیکن اونٹ کی تعیین نہیں کی۔

جو علما اس کو شرط قرار دیتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ طواف نماز کی طرح ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نسائی میں منقول ہے کہ ''بیت اللہ کا طواف نماز ہی ہے۔ صرف اس میں بات کرنے کی اجازت ہے، لہٰذا جو بات کرے، بھلائی ہی کی کرے۔''[2]

جو علما اس کو شرط نہیں کہتے، وہ یہ کہتے ہیں کہ حج میں ایسی اشیا واجب ہیں جن کا دم سے ازالہ ہو جاتا ہے۔ وہ حج کے صحیح ہونے کے لیے شرط نہیں۔ اگر حاجی انھیں عمداً یا سہواً چھوڑ دے تو دم سے ان کا ازالہ ہو جاتا ہے، نماز کے برخلاف۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٢٢) صحيح الجامع (٣٩٥٤)

دوسرا مسئلہ:

دوسرے مسئلے کا جواب یہ ہے کہ عورت کو اگر حیض آ جائے اور وہ یوم النحر سے پہلے پاک ہو جائے تو اس سے طوافِ قدوم ساقط ہو جاتا ہے۔ وہ یوم النحر کو طوافِ افاضہ کرے۔ اسی طرح اگر عورت نے طوافِ افاضہ کر لیا ہو، اس کے بعد اس کو ماہواری آ جائے اور وہ واپسی سے پہلے پاک نہ ہو تو اس سے طوافِ وداع ساقط ہو جاتا ہے، کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو اس کی رخصت دی ہے، جس طرح حضرت صفیہ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر عورت کو طوافِ افاضہ سے پہلے حیض آ جائے اور اس کے لیے رکنا ممکن ہو تو اتنی دیر تک وہیں ٹھہرے جب تک پاک نہیں ہو جاتی، جو اس کے ساتھ ہو وہ بھی رکے، اگر اس کے لیے رکنا ممکن ہو۔

سلف کے زمانے میں راستے پُر امن تھے، لوگ سارا سال مکہ آتے جاتے رہتے تھے اور عورت کے لیے اتنی دیر تک رکنا ممکن ہوتا تھا، جتنی دیر میں وہ پاک ہو جاتی اور طواف کر لیتی، اس لیے علما اس کو یہی حکم دیا کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات کسی کو امیر مقرر کر دیا جاتا جو حیض کی وجہ سے رکا رہتا، تاوقتیکہ عورتیں پاک ہو جاتیں، لیکن آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر عورتوں کے لیے گروپ کے بعد رکنا ممکن نہیں ہوتا اور گروپ عموماً ایامِ تشریق کے پہلے دوسرے یا تیسرے دن واپسی کی راہ پکڑ لیتے ہیں۔ عورت کو اگر یوم النحر کی رات حیض آ جائے تو وہ کم از کم سات دن تک تو پاک نہیں ہوتی اب اس کے لیے اتنے دن اکیلے مکے میں رہنا خرچہ نہ ہونے یا رفقا کے نہ ہونے کی وجہ سے ممکن نہیں ہوتا کہ جن کے ساتھ وہ ٹھہرے اور انھی کے ساتھ واپس چلی جائے۔ جان اور مال کا خوف ایک علاحدہ عذر ہے۔ بسا اوقات قافلے والوں کے لیے اس کا انتظار کرنا ممکن نہیں ہوتا تو یہ عمومِ بلویٰ کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ عورت حالتِ حیض میں طواف کرے اور دم دے کر اس کا ازالہ کر لے تو ان فقہا کے نزدیک یہ کافی ہوگا جو طہارت کو شرط قرار نہیں دیتے۔ یہ معذور سمجھی جائے گی۔ لیکن کیا اس کے لیے عذر کے ساتھ طواف کرنا مباح ہے؟ یہ محلِ نظر ہے۔ اس طرح جو اس کو شرط کہتے ہیں تو کیا عدمِ استطاعت کے وقت یہ شرط ساقط ہو جاتی ہے کہ نہیں اور طواف صحیح ہوگا؟ لوگوں کو اس کا حکم جاننے کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اس کے بارے میں رائے کا اظہار کیا جاتا ہے جو اس طرح ہے کہ وہ واجباتِ حج میں سے جو ادا کرنے پر قادر ہو اس کو ادا کرے اور جس کو کرنے سے عاجز ہو وہ اس سے ساقط ہو جائے گا، لہٰذا وہ طواف کر لے اور اگر حائضہ ہو تو غسل کر لے، جس طرح احرام کے لیے غسل کرتی ہے اور لنگوٹ وغیرہ باندھ لے، جس طرح مستحاضہ لنگوٹ وغیرہ باندھتی ہے۔

مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر یہ رائے زیادہ مناسب ہے۔

ایسی عورت کے لیے پانچ امکانات ہو سکتے ہیں، جو اس طرح ہیں:

1 اس کو اس وقت تک قیام کرنے کا حکم دیا جائے جب تک وہ پاک ہو کر طواف نہیں کر لیتی، خواہ اس کے پاس

خرچہ نہ ہو۔ مکے میں رہنے کے لیے جگہ بھی نہ ہو، اپنے ملک لوٹنا ممکن نہ ہو۔ اگر مکے میں قیام کی صورت میں اس کو بدمعاشوں کے ہاتھ چڑھنے، اپنی عزت اور مال گنوا دینے کا اندیشہ ہو، پھر بھی وہ اتنی دیر انتظار کرے گی۔

2 اس سے کہا جائے کہ وہ طواف کے بغیر واپس چلی جائے اور اس وقت تک احرام ہی میں رہے جب کہ اس کے لیے مکے دوبارہ آنا ممکن ہو، اگر دوبارہ مکے آنا ممکن نہ ہو سکے تو وہ موت تک حالتِ احرام میں رہے گی۔

3 اس سے کہا جائے کہ وہ محصَر (جس کو راستے میں دشمن یا بیماری کی وجہ سے رک جانا پڑے) کی طرح احرام کھول دے اور باقی حج اس کے ذمے فرض ہی رہے گا۔

4 جس کو یہ خدشہ ہو کہ اس کو حج کے دوران میں ماہواری آ جائے گی اور اس کے لیے پاکیزگی کی حالت میں طواف کرنا ممکن نہیں ہوگا اس کو فرض یا نفل حج کا حکم ہی نہ دیا جائے۔

چاروں وجوہ کئی اعتبار سے قابلِ عمل نہیں اور بہت سے احکام کے منافی ہیں۔ اب پانچویں صورت باقی رہ جاتی ہے جو یہ ہے:

5 وہ جو کام کرنے پر قادر ہے، اسے کرے اور جسے کرنے سے عاجز ہے وہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت ہے جس پر وہ نصوص دلالت کرتی ہیں جو اس مسئلے پر بحث کرتی ہیں اور اس سے ملتے جلتے اصول کا تقاضا بھی یہی ہے، نیز اس میں اصول کی مخالفت بھی نہیں۔

وہ نصوص اور روایات جو وجوبِ طہارت پر دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

1 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حائضہ طوافِ کعبہ کے سوا تمام مناسک ادا کرے۔''[1]

2 حدیثِ رسول ﷺ ہے: ''اللہ تعالیٰ تم میں سے کسی کی نماز قبول نہیں کرتا، حتی کہ وہ وضو کرے۔''[2]

3 آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جوان عورت کی نماز دوپٹے کے بغیر قبول نہیں کرتا۔''[3]

4 آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کو کھرچ کر صاف کرے، پھر دھو لے، پھر اس میں نماز پڑھ لے۔''[4]

5 رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ننگا بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔''[5]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٦٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٤٤)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٥)

(3) سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٣٨٣)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩١)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤٧)

یہ بھی معلوم ہے کہ اس میں وجوبِ قدرت استطاعت کے ساتھ مشروط ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

« إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ »[1]

''جب میں تم کو کوئی حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو۔''

جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ عورت کو عجز و عدمِ استطاعت اور اپنی جان، دین اور مال میں ضرر کے خطرے کے پیشِ نظر مکے میں قیام کی اجازت نہیں دی جا سکتی، اس کو ساری زندگی کے لیے احرام کا پابند بنا کر رکھنے اور عدمِ استطاعت کے باوجود واپس آنے کا نہیں کہا جا سکتا، پھر سفر کا تکرار، ضرر کا باقی رہنا، اس کی طرف سے تفریط بھی نہ ہو، احرام کھول دینا بھی کافی نہیں، کیوں کہ اس کے ساتھ فرض ساقط نہیں ہوتا تو پھر وہی صورت قابلِ قبول نظر آتی ہے جس کی طرف اشارہ ہو گزرا ہے۔

مزید برآں ستر ڈھانپنا، نجاست سے بچنا، ان تمام شرطوں کی نماز میں زیادہ تاکید ہے۔ طواف زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نماز سے مشابہ ہو اور طواف میں کوئی ایسی نص نہیں جو عدمِ طہارت اور بے پردگی میں طواف کی قبولیت کی نفی کرتی ہو، جس طرح نماز میں ہے۔ لیکن اس میں اس کے وجوب کا تقاضا ضرور موجود ہے، اسی لیے علما میں اختلاف ہے کہ طہارت طواف کے لیے شرط ہے کہ واجب؟ لیکن نماز کے حوالے سے یہ اختلاف نہیں۔ وہاں سب کا اتفاق ہے کہ طہارت نماز کے لیے شرط ہے۔

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ طہارت طواف کے لیے شرط ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ نماز میں اس کا شرط ہونا زیادہ تاکیدی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو عجز اور عدمِ استطاعت کے وقت نماز کی شرطیں بھی ساقط ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا عجز کی صورت میں طواف کی شرطوں کا ساقط ہو جانا زیادہ مناسب اور قرینِ قیاس ہے۔

یہ طہارت کی ایک نوع ہے جو دیگر انواعِ طہارت کی طرح عجز کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ طواف کی ایک شرط ہے جو دیگر شرائط کی طرح عجز کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ تفصیل جو میں نے ذکر کی ہے، ان عام اصولِ منصوصہ کا تقاضا ہے جو اس صورت کا لفظی اور معنوی طور پر احاطہ کرتے ہیں۔ ملتے جلتے اصول پر قیاس اور اعتبار سے بھی یہی اخذ ہوتا ہے۔ مجھے اصل میں اس مخصوص واقعے کے متعلق ائمہ متبوعین کا کلام نہیں ملا۔ اسی طرح اگر کسی انسان کو مجبوراً برہنگی کی حالت میں طواف کرنا پڑ جائے تو وہ کیا کرے؟ اس کے متعلق بھی ان کا کلام نہیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧)

ملا، کیوں کہ جو صورتیں ان کے زمانوں میں رونما نہیں ہوئیں، ان کے لیے ان کے بارے میں سوچنا اور ان پر بات کرنا بھی کوئی ضروری نہیں۔ اس باب میں ان کا باب **مطلق** ہے جو صرف عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

بلاشبہہ جو کہتے ہیں: طواف میں طہارت واجب ہے، شرط نہیں، ان کو یہ کہنا بھی بنتا ہے کہ اس صورت میں عدمِ قدرت کی وجہ سے طہارت واجب نہیں۔ پھر صحیح بخاری میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حائضہ سے طواف وداع ساقط کر دیا۔[1] تو جو طہارت کو فرض اور شرط کہتے ہیں، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اس میں اس کا شرط ہونا نماز میں شرط ہونے سے بڑا نہیں تو جب شروطِ نماز عجز کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہیں تو طواف کی شرطیں عجز کی حالت میں کیوں ساقط نہ ہوں؟ یہ اس مسئلے میں میرا نقطہ نظر ہے، اچھائی کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت صرف اللہ ہی کی مدد کے ساتھ مہیا ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کو علمی اور عملی طور پر اس مسئلے کی ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی بات کرنے کی جرأت نہ کرتا، کیوں کہ مجھے اس میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کی بات نہیں مل سکی۔ ضرورت کے وقت اجتہاد کرنے کا حکم خود اللہ نے دیا ہے، جو میں نے کہا ہے اگر وہ درست ہے تو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے اور اس پر اللہ کا شکر ہے۔ جو میں نے کہا ہے اگر وہ غلط ہے تو وہ میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔ اللہ اور رسول غلطی سے بری ہیں، گو غلطی کرنے والے کی غلطی معاف ہے۔ ملخصاً

والله سبحانه و تعالى أعلم، والحمد لله وحده، وصلى الله على محمد و آله وسلم تسليما.[2]

مکی کے لیے طواف افضل ہے یا عمرہ؟

سوال جو مکے میں ہو، اس کے لیے بیت اللہ کا طواف کرنا افضل ہے یا حرم سے باہر جانا، تا کہ وہاں سے عمرے کا احرام باندھ کر واپس آئے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جو مکے میں ہو، اس کے لیے رمضان یا غیر رمضان میں بکثرت عمرہ کرنا مستحب ہے یا اس کے بدلے طواف کرنا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا غیر مکی کے لیے کثرت سے عمرے کرنا مستحب ہے؟ نیز مکے سے عمرہ کرنے والے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا جعرانہ سے عمرہ کرنے اور عمرۂ حدیبیہ میں دلیل موجود ہے، جس طرح آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تنعیم سے عمرہ کرنے کا حکم دیا تھا؟

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢٨)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢١٩/٢٦ـ٢٤١)

ایک سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ''رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''[1] آفاق سے آنے والے کا عمرہ ہے یا مکے میں رہنے والے کو بھی شامل ہے جو رمضان میں حرم سے باہر جا کر احرام باندھ کر عمرہ کرتا ہے؟

جواب جس شخص نے مکے کو وطن بنایا ہو، وہاں رہ رہا ہو، یا وہاں آ گیا ہو، اس کے لیے عمرے کی نسبت طواف افضل ہے، خواہ وہ اس مقصد کے لیے ادنیٰ حِل (قریب ترین حدِ حرم) تک جائے، جو تنعیم ہے اور وہاں مسجد عائشہ کے نام سے مسجد تعمیر کر دی گئی ہے یا کسی بھی جانب سے اَقصائے حِل (بعید ترین حدِ حرم) تک جائے، وہ جعرانہ کی طرف سے ہو یا حدیبیہ کی طرف سے یا کسی اور جگہ سے۔ اس بات پر سلف کا اتفاق ہے، میں اس میں کسی ایسے امام کو نہیں جانتا جو مکی عمرے کا مخالف ہو۔

جہاں تک میقات سے عمرہ ہے کہ آدمی میقات جائے، وہاں سے احرام باندھے، یا اپنے ملک/شہر واپس چلا جائے، پھر وہاں سے عمرے کے لیے از سرِ نو سفر کرے تو یہ مکی عمرہ نہیں، بلکہ مکمل عمرہ ہے اور یہاں اس پر بحث نہیں ہوگی۔

اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ کیا مکے میں قیام کرنا افضل ہے یا اپنے ملک یا میقات جانا؟ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

سرِ دست اس سے بحث ہے کہ کیا مکی کے لیے عمرے کے لیے حدودِ حرم سے نکلنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اسی طرح باہر سے آنے والے کے لیے ایک سے زیادہ عمرے کرنا اور کثرت سے عمرے کرنا کس حکم میں ہے؟

جہاں تک یہ بات ہے کہ مکے میں رہنے والے کے لیے طواف عمرے سے افضل ہے، اس میں ایسے کسی شخص کو کوئی شک نہیں ہو سکتا جو رسول اللہ ﷺ کی سنت، آپ ﷺ کے خلفا کے طریقے اور اسلافِ امت کی روش سے آگاہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مقدس اور رسول اکرم ﷺ نے اپنے فرامین میں جن عبادات اور نیکیوں کو افضل قرار دیا ہے، طواف ان میں سے ایک ہے۔ یہ اہلِ مکہ، یعنی مکے کے مستقل شہری اور عارضی قیام کرنے والوں کی سب سے عظیم عبادت ہے اور یہ ان کی وہ دائمی عبادت ہے جو ان کو دیگر علاقوں کے شہریوں سے ممتاز کرتی ہے۔

اہلِ مکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک اور خلفا اور صحابہ کے دور ہی سے ہر وقت بکثرت طواف کرتے آئے ہیں۔

نبیِ رحمت ﷺ نے بھی بیت اللہ کے نگرانوں کو لوگوں کو عمومی اوقات میں طواف سے روکنے سے منع کیا ہے۔

حضرت جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ لَا تَمْنَعُوا أَحَداً طَافَ بِهَذَا الْبَيْتِ وَصَلَّى فِيهِ أَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ» (رواه مسلم)[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٦٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٠٠) یہ روایت مسلم میں نہیں ہے۔

”اے بنی عبد مناف! کسی کو اس گھر میں دن یا رات میں کسی وقت طواف کرنے اور نماز پڑھنے سے مت روکو۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے خلیل اور حنفا (موحدین) کے امام، ابراہیم علیہ السلام سے کہا، جس کو بیت اللہ تعمیر کرنے اور لوگوں کو حج کے لیے بلانے کا حکم دیا:

﴿ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ [البقرة: ١٢٥]

”میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔“

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَالْقَآئِمِيْنَ ﴾ [الحج: ٢٦] ”اور قیام کرنے والوں۔“

ان آیات میں تین انواع بیان کی گئی ہیں:

① طواف کرنا۔ ② اعتکاف کرنا۔ ③ رکوع کے ساتھ سجدہ کرنا۔

اور ترتیب وار پہلے سب سے زیادہ خاص کو ذکر کیا، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم۔ سب علما کا اتفاق ہے کہ بیت اللہ کے علاوہ کسی اور جگہ طواف جائز نہیں، اس لیے سب علما ایسے شخص کو گمراہ قرار دیتے ہیں جو بیت اللہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ طواف کرتا ہے، مثلاً بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ کا طواف، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کا طواف، عرفات کی مسجد کا طواف، کسی پیر کی قبر کا طواف، اہلِ بیت کے کسی فرد کی قبر کا طواف، جس طرح بہت سے جاہل مسلمان کرتے ہیں۔ الغرض بیت اللہ کے سوا کسی جگہ کا طواف کرنا جائز نہیں، اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، بلکہ یہ دینِ اسلام میں بداہتاً معلوم ہے۔ اس لیے جو کسی دوسری جگہ کا طواف بطور نیکی اور دین کرتا ہے اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دین نہیں، اگر پھر بھی وہ اصرار کرے تو مسلمان حکمران اس کو تہہ تیغ کر دے۔

یہ طواف کا حکم تھا، دوسری عبادت اعتکاف ہے جو مسجد میں بھی ہو سکتا ہے، مسجد کے بغیر بھی اور تیسری عبادت رکوع و سجدہ ہے جو عمومی زمین پر جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

”میرے لیے زمین کو مسجد اور طہور (پاک اور پاک کرنے والی) بنایا گیا ہے، میری امت کے جس فرد کو نماز کا وقت پا لے تو اس کے پاس اس کی مسجد بھی ہے اور طہور بھی۔“[1]

اس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، اگرچہ کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں کسی عارضی وصف کی بنا پر نماز پڑھنی منع ہے، جس طرح قبرستان ہے، نجاست کی جگہ ہے یا بیت الخلا ہے یا اس طرح کی دیگر جگہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢١)

یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو مقدم کیا ہے جو اس خطے کے ساتھ مخصوص ہے، پھر اس کا ذکر کیا جو اس سے کم خاص ہے۔ لہٰذا طواف کو مقدم کیا، کیوں کہ وہ مسجدِ حرام کے ساتھ خاص ہے۔ پھر اعتکاف کا ذکر کیا، کیوں کہ وہ اس میں بھی ہوتا ہے اور ہر اس مسجد میں بھی جس میں مسلمان پانچ نمازیں باجماعت پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد نماز کا ذکر کیا، کیوں کہ اس کی جگہ زیادہ عام ہے۔ طواف کی یہ خصوصیات ہیں کہ وہ اکیلا بھی جائز ہے، عمرے کے ضمن میں بھی کیا جا سکتا ہے اور حج کے ساتھ بھی۔ طواف کے سوا کوئی ایسا حج کا عمل نہیں جو اکیلا کرنا جائز ہو۔ حج کے اعمال اور مناسک کے تین درجات ہیں:

1. ایک وہ جو صرف حج میں ہوتا ہے، اس میں وقوفِ عرفات اور مزدلفہ میں اس کے تابع مناسک ہیں۔
2. دوسرے وہ جو حج یا عمرے میں ہوتے ہیں۔ ان میں احرام باندھنا، احرام کھولنا اور صفا و مروہ کی سعی شامل ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ ﴾ [البقرة: ١٥٨]

”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا خوب طواف کرے۔“

3. تیسرا وہ جو حج میں بھی ہوتا ہے۔ عمرے میں بھی اور مستقل حیثیت سے اکیلا بھی۔ یہ طواف ہے۔ نیز طواف وہ عمل ہے جو حج میں سب سے زیادہ کیا جاتا ہے۔ جو حج کے لیے آتا ہے، اس کے لیے پہلے طوافِ قدوم مشروع ہے اور جاتی دفعہ طوافِ وداع۔ یہ طوافِ افاضہ کے علاوہ ہیں جو فرض ہے اور عرفات میں وقوف کے بعد کیا جاتا ہے۔

منیٰ میں قیام کے دوران میں بھی طواف کرنا مستحب ہے، بلکہ عموماً سارے سال کے دوران میں طواف کرنا مستحب عمل ہے۔

مکی کا عمرے کے لیے حدودِ حرم سے باہر جانا:

رہا یہ مسئلہ کہ مکی عمرہ کرنے کے لیے حدودِ حرم سے باہر جائے تو یہ کام رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے بھی نہیں کیا اور آپ ﷺ نے ان کو بھی اس کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مراجعت کی، اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت دی تھی۔ باقی رہے آپ ﷺ کے وہ سارے صحابہ جنھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ حج کیا تھا، ان میں سے کوئی ایک بھی عمرے کے لیے، نہ حج سے پہلے نہ حج کے بعد، نہ تنعیم گیا، نہ جعرانہ، نہ حدیبیہ اور نہ کسی دوسری جگہ۔ اسی طرح مکے کے شہریوں

میں سے بھی کوئی فرد عمرے کے لیے حدودِ حرم سے باہر نہیں گیا۔ یہ متفق علیہ بات ہے اور ان تمام علما کو معلوم ہے جو آپ ﷺ کی سنت اور شریعت سے واقف ہیں۔

اسی طرح آپ ﷺ کے وہ صحابہ جو آٹھ ہجری کو رمضان کے مہینے میں فتح مکہ کے دن سے آپ ﷺ کی وفات تک مکے میں مقیم تھے، ان میں سے کسی ایک نے بھی حدودِ حرم سے باہر جا کر وہاں سے احرام باندھ کر عمرہ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ جب مکے میں تھے تو آپ ﷺ نے بھی کوئی عمرہ نہ کیا، نہ حدیبیہ سے، نہ جعرانہ سے اور نہ کسی اور دوسری جگہ سے۔

رسول اللہ ﷺ کے عمرے:

آپ ﷺ نے چار عمرے کیے تھے۔ تین علاحدہ علاحدہ اور ایک حج کے ساتھ۔ آپ ﷺ نے جتنے عمرے کیے تھے، آپ ﷺ ان میں باہر سے مکے آئے تھے، یہ نہیں کہ آپ ﷺ مکے سے حدودِ حرم سے باہر نکلے ہوں اور وہاں سے عمرہ کیا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے عمرۂ حدیبیہ ذی الحلیفہ سے کیا تھا جو اہلِ مدینہ کا میقات ہے۔ آپ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے وہ صحابہ بھی تھے جنھوں نے اس عمرے میں درخت کے نیچے آپ ﷺ کی بیعت کی تھی، جب مشرکوں نے آپ ﷺ کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اس وقت آپ ﷺ نے مشرکوں سے جو معاہدہ کیا تھا وہ مشہور ہے۔ اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ اگلے سال عمرۃ القضا کر سکیں گے۔

حدیبیہ کے مقام پر آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے صحابہ نے عمرے کا احرام کھول دیا اور اس سال آپ ﷺ مکے میں داخل نہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل سورت فتح میں ذکر کی ہے، پھر یہ آیت اتری:

﴿ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۶]

''اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرو)۔''

امام شافعی وغیرہ نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اسی سال اتری تھی۔ اس کے بعد اگلے سال فتح خیبر کے بعد سات ہجری میں۔ یاد رہے حدیبیہ سے واپسی کے فوراً بعد خیبر فتح ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کیا جس کو عمرۃ القضا کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ عمرہ ذی قعدہ سات ہجری میں تھا۔ اس سے پہلے عمرۂ حدیبیہ بھی ذی قعدہ میں تھا اور عمرۂ جعرانہ بھی ذی قعدہ ہی میں تھا۔ آپ ﷺ کے سارے عمرے ذی قعدہ کے مہینے میں تھے جو حج کا درمیانی مہینا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے اس عمل سے اپنی امت کے لیے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنے کا جواز بیان کیا ہے۔

جب آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کے ساتھ کچھ صحابہ نے عمرۃ القضا کیا تھا تو اس وقت بھی انھوں نے ذوالحلیفہ ہی سے احرام باندھا تھا، اس کے بعد وہ مکے میں داخل ہوئے اور انھوں نے وہاں تین راتیں قیام کیا۔ اسی سال آپ ﷺ نے میمونہ بنت حارث سے شادی کی۔ اس کے بعد آٹھ ہجری کو جب اہلِ مکہ نے معاہدۂ صلح توڑ دیا تو نبی اکرم ﷺ نے تقریباً دس ہزار کے لشکر کے ساتھ رمضان کے مہینے میں غزوہ فتح مکہ لڑا۔ آپ ﷺ احرام کے بغیر مکے میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ کے سر مبارک پر خود تھا۔ آپ ﷺ نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ آپ ﷺ وہاں سترہ راتوں تک قیام پذیر رہے اور آپ ﷺ نے اپنے اس داخلے کے موقع پر عمرہ نہیں کیا تھا۔

آپ ﷺ کو خبر ملی کہ ہوازن نے آپ ﷺ کے خلاف قبائل کو اکٹھا کیا ہے تو آپ ﷺ نے حنین کے مقام پر ان سے غزوۂ حنین لڑا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا، لیکن اس کو فتح نہ کیا۔ جعرانہ کے مقام پر آپ ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا اور اس وقت جعرانہ سے از سرِ نو عمرہ کیا، اس عمرے میں بھی آپ ﷺ باہر سے مکے آئے، مکے سے جعرانہ نہیں گئے۔

جو انسان ایسی جگہ سے حج یا عمرہ شروع کرتا ہے جو میقات کی حدود کے اندر ہو، وہ وہیں سے احرام باندھتا ہے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ، اہلِ شام کے لیے جحفہ، اہلِ نجد کے لیے قرنِ منازل اور اہلِ یمن کے لیے یلملم کو میقات مقرر کیا۔ یہ ان کے لیے بھی میقات ہے اور اس کے لیے بھی جو ان ممالک کا رہایشی تو نہ ہو لیکن انہی جہتوں سے آئے جو حج اور عمرے کا ارادہ رکھتا ہو اور جو ان کے اندر رہتا ہو تو وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھے، اسی طرح اہلِ مکہ بھی مکہ ہی سے احرام باندھیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ کا جعرانہ سے احرام اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ نے وہاں غزوے اور مالِ غنیمت کی تقسیم کے لیے قیام کیا اور وہیں سے عمرے کو شروع کیا اور اس کا ارادہ کیا۔

معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے مکے سے آتے ہوئے حدیبیہ سے احرام باندھا تھا۔ مکے سے نکل کر وہاں جا کر احرام باندھا تھا، بلکہ جب مشرکوں نے آپ ﷺ کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روک دیا تو اس جگہ آپ ﷺ نے اپنے عمرے کا احرام کھولا تھا۔ جعرانہ سے آپ ﷺ نے چونکہ از سرنو عمرہ شروع کیا تھا، اس لیے وہاں سے احرام باندھا تھا۔ یہ امور متفق علیہ اور تواتر سے معلوم ہیں جن کو سیرت اور سنت سے ادنیٰ سی واقفیت بھی ہے، ان کی اس میں دو رائے نہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٨١)

جس نے یہ گمان کر لیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکے سے نکلے اور آپ ﷺ نے حدیبیہ یا جعرانہ جا کر عمرے کا احرام باندھا، اس کو بہت بڑی غلطی لگی ہے۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو سیرت و سنت کی معرفت سے دور کا واسطہ بھی نہیں، اگر چہ کچھ بڑے بڑے علما نے مکے سے عمرہ کرنے میں اس سے غلط استدلال کیا ہے۔ یہ بالکل عیاں حقیقت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے بھی آپ ﷺ کی زندگی میں مکہ فتح ہو جانے اور اس کے دار الاسلام بن جانے کے بعد مکے سے عمرہ نہیں کیا۔ اسی طرح فتح مکہ سے پہلے بھی جب وہ دارِ کفر تھا، کسی نے بھی اس سے عمرہ نہیں کیا۔ وہاں ہجرت کے بعد بھی کچھ صحابہ مقیم تھے اور ہجرت سے پہلے بھی، وہ صرف بیت اللہ کا طواف کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی عمرہ کرنے کے لیے حدودِ حرم سے باہر نہیں گیا۔ طواف تو بعثتِ رسول کے آغاز ہی سے شروع تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اور اس سے پہلے بھی طواف کیا جاتا تھا۔ اگر مکے میں مقیم مسلمان رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت سے لے کر آپ ﷺ کی وفات تک مکے سے عمرہ نہیں کرتے تھے، بلکہ طواف کرتے تھے، وقتاً فوقتاً سال بعد حج بھی کرتے تھے اور ہر وقت عمرے کے بغیر طواف کرتے تھے تو اس سے یہ یقینی علم معلوم ہو جاتا ہے کہ اہلِ مکہ کے لیے طواف کا حکم ہے اور عمرہ کے لیے باہر نکلنے کے بجائے یہی ان کے لیے افضل ہے، کیوں کہ یہ ناممکن سی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے عہد میں سارے صحابہ مفضول (کم تر حیثیت کا عمل) پر ہمیشگی کرنے اور افضل کو چھوڑنے پر اتفاق کر لیں، ان میں سے کوئی بھی افضل عمل نہ کرے اور رسول اللہ ﷺ بھی ان کو اس کی ترغیب نہ دیں؟ یہ بات کوئی اہلِ ایمان نہیں کہہ سکتا۔

اہلِ مکہ کے لیے عمرے کا حکم:

اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا حج کے وجوب کی بنا پر عمرے کے وجوب میں اختلاف ہے۔ اس میں علما کے دو مشہور اقوال ہیں اور یہ اختلاف صحابہ سے بھی مروی ہے۔ عمر اور ابن عباس وغیرہما سے وجوب منقول ہے اور ابن مسعود سے عدمِ وجوب منقول ہے۔ پہلا شافعی اور احمد کا مشہور مذہب ہے اور دوسرا ابو حنیفہ اور مالک کا قول اور احمد کا ایک قول۔ اس اختلاف کے باوجود جو صحابہ اور تابعین عمرے کو واجب کہتے ہیں، ان سے صریحاً منقول ہے کہ یہ اہلِ مکہ پر واجب نہیں۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما عمرے کو واجب خیال کرتے تھے اور کہتے تھے: اے اہلِ مکہ، تم پر عمرہ نہیں، تمھارا عمرہ تمھارا بیت اللہ کا طواف کرنا ہی ہے۔''

عطا بن ابی رباح کا، جو تمام تابعین سے زیادہ مناسکِ حج کا علم رکھتے تھے اور ان میں لوگوں کے امام تھے، قول ہے: ''اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو صاحبِ استطاعت ہے اس پر حج اور عمرہ واجب ہیں اہلِ مکہ کے سوا۔ ان پر

حج تو فرض ہے، عمرہ نہیں، کیوں کہ وہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں، وہی ان کو کفایت کر جاتا ہے۔''

طاؤس کا قول ہے: ''اہلِ مکہ پر عمرہ نہیں۔'' (رواہ ابن أبي شيبة)

ان اسلاف کے کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ عمرے کو اہلِ مکہ کے لیے واجب قرار دینا تو درکنار مستحب بھی نہیں کہتے تھے۔

بنا بریں امام احمد کا محقق مذہب یہ ہے کہ عمرہ اگر فرض ہے تو اہلِ مکہ پر فرض نہیں، البتہ کچھ شافعیوں سے منقول ہے کہ وہ اہلِ مکہ پر بھی عمرہ لازم قرار دیتے ہیں، لیکن یہ انتہائی ضعیف قول ہے جو سنتِ ثابت اور اجماعِ صحابہ کے خلاف ہے۔ اگر یہ ان پر فرض ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ان کو اس کا حکم دیتے اور وہ اس پر عمل کرتے۔ تاہم یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اہلِ مکہ اصل میں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عمرہ کرتے ہی نہیں تھے اور کسی کے لیے آپ ﷺ کے عہد مبارک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی سے یہ نقل کرنا ممکن ہی نہیں کہ اس نے مکے سے عمرہ کیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب محدثین نے احادیث کی کتابیں مرتب کیں اور مکے سے عمرہ کرنے کی سنت ذکر کرنا چاہی تو ان کے پاس صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مسئلہ تھا۔ اگر اس کے علاوہ بھی کوئی مثال ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی۔ اگر سارے یا کچھ اہلِ مکہ آپ ﷺ کے زمانے میں حدودِ حرم سے باہر جا کر وہاں سے عمرہ کرنے کے لیے احرام باندھتے تو یہ باتیں نقل کی جاتیں، جس طرح حج میں ان کا عرفات جانا منقول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کیا، آپ ﷺ کے ساتھ اہلِ مکہ بھی عرفات تک گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کسی نے حج کے بعد یا حج سے پہلے قریب ترین حدودِ حرم سے باہر جا کر عمرہ نہیں کیا تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی یہی معمول تھا، بلکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا وغیرہ نے عہدِ نبوت کے بعد کہا تھا: ''اے اہلِ مکہ! تم پر عمرہ فرض نہیں، تمھارا عمرہ بیت اللہ کا طواف کرنا ہی ہے۔'' اگر اہلِ مکہ آپ ﷺ کے زمانے میں عمرہ کرتے اور ان کو اس کا حکم دیا جاتا تو یہ بات کم از کم ابن عباس جیسے امامِ اہلِ مکہ اور امت کے سب سے بڑے عالم پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔

ان کے بعد مکے کے امام عطا بن ابی رباح کو بھی اس کا علم ہونا چاہیے تھا جو حج کے احکام میں سب لوگوں کے امام تھے۔

مزید برآں حج اور عمرہ دونوں ہی اللہ کے گھر کا قصد اور ارادہ کرنے کو شامل ہیں، جسے اللہ کے حرم نے اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی عبادت کے لیے حل وحرم کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ انسان حل (حدودِ حرم سے باہر) سے حرم کا قصد کرنے والا شمار ہو، تاکہ اس میں اللہ کی طرف قصد کرنے اور اس کے گھر اور حرم کی طرف رخ کرنے کا معنی ظاہر ہو۔

اس بنا پر جس کا گھر حرم سے باہر ہو وہ حل سے حرم اور بیت اللہ کا قصد کرنے والا ہوتا ہے۔

لیکن جو حرم میں ہو، جیسے اہلِ مکہ ہیں، ان کے لیے حج میں عرفات جانا ضروری ہوتا ہے، عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے۔ لہٰذا اگر وہ عرفات سے بیت اللہ کی طرف لوٹیں تو اس وقت وہ حل سے بیت اللہ کا قصد کرنے والے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فرض طواف، یعنی طوافِ افاضہ، عرفات میں وقوف کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس میں حل سے کعبہ کا قصد ہوتا ہے جو حج کی حقیقت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: «اَلْحَجُّ عَرَفَةٌ» [1] حج عرفات میں وقوف کا نام ہے۔ اس لیے جو عرفات میں وقوف پا لیتا ہے وہ حج پا لیتا ہے اور جو عرفات میں وقوف سے محروم رہ جاتا ہے وہ حج سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب عرفات کے دن کے بعد یوم النحر کی فجر طلوع ہوتی ہے تو اس وقت وقوفِ عرفات کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تو حج کی حقیقت جس طرح مکے کے باہر سے آنے والوں کے حق میں ممکن ہوتی ہے، اسی طرح اہلِ مکہ کے حق میں بھی ممکن ہے، کیوں کہ عرفات میں وقوف سے پہلے کے اعمال مثلاً: طوافِ قدوم وغیرہ لازمی امور نہیں۔

نبی اکرم ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ان کو ماہواری شروع ہو گئی ہے تو آپ ﷺ نے ان کو سر کھولنے، کنگھی کرنے، حج کا تلبیہ پڑھنے اور عمرہ چھوڑنے کا حکم دیا، کیوں کہ انھوں نے حجِ تمتع کی نیت کی ہوئی تھی۔ [2]

یہ طوافِ افاضہ کے برخلاف ہے، کیوں کہ جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ حضرت صفیہ کو حیض آ گیا ہے تو آپ ﷺ نے پوچھا: کیا وہ ہمیں روکنے والی ہے؟ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ انھوں نے طوافِ افاضہ کر لیا ہوا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: پھر نہیں۔ [3] اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ اس وقت تک کوئی واپس نہ جائے، جب تک اس کا آخری عمل طوافِ وداع نہ ہو، لیکن آپ ﷺ نے حائضہ کو طوافِ وداع سے پہلے واپس آنے کی رخصت دے دی۔ جو عمل عذر کی وجہ سے ساقط ہو وہ حج کے ناگزیر ارکان میں نہیں ہوگا، اس لیے اہلِ مکہ کے لیے طوافِ قدوم ہے نہ طوافِ وداع، کیوں کہ ان کے حق میں ان دونوں طوافوں کا معنی اور مقصود غیر موجود ہے، کیوں کہ وہ جب تک وہاں مقیم ہوں، وہاں آتے ہیں نہ وہاں سے رخصت ہوتے ہیں۔

اس سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حج جس کی اصل عرفات میں وقوف ہے، اس کے بعد طوافِ مشروع

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٨٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠١٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٧٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

ہے، کیوں کہ اس کی حقیقت اہلِ مکہ میں بھی موجود ہوتی ہے۔ جہاں تک عمرے کے اعمال ہیں تو ان میں اصل دو چیزیں ہیں: ایک طواف اور دوسری صفا ومروہ کی سعی اور یہ دونوں کام حرم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمیشہ حرم ہی میں کیے جاتے ہیں۔ عمرے میں صفا ومروہ کی سعی عمرہ میں تابع ہے، اس لیے طواف کے بعد کی جاتی ہے اور حج اور عمرے میں اس کو تکرار کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرے کا سب سے بڑا مقصود طواف ہے جو اہلِ مکہ کے لیے حدودِ حرم سے نکلے بغیر بھی ممکن ہے، اس لیے ان کو وہاں سے نکلنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی، نیز جو مکہ آتا ہے اس کا مقصود طواف کرنا اور اعتکاف بیٹھنا ہوتا ہے اور یہ مقصود اہلِ مکہ کو گھر بیٹھے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا جو انسان وسائل کے بغیر مقصود حاصل کرنے پر قادر ہو، اس کو مقصود چھوڑ دینے اور وسیلے میں مصروف و مشغول ہونے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ مزید برآں بیت اللہ کے اردگرد چلنے والے کا چلنا اور چکر لگانے والے کا چکر لگانا عبادتِ مقصودہ ہے اور اس کا حدودِ حرم کے باہر سے چل کر جانا اس عبادت کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ تو جو انسان اس چلنے کو چھوڑ کر جو عبادتِ مقصودہ ہے، وسیلے میں مشغول ہو جائے، وہ گمراہ اور دین کی حقیقت سے ناواقف ہے، بلکہ وہ ایسے جاہل سے بھی بڑا جاہل ہے جو مسجد کے پڑوس میں رہتا ہو، جمعہ کا دن ہو اور اس کے لیے صبح صبح مسجد پہنچنا اور وہاں نماز پڑھنا ممکن ہو، لیکن وہ کسی دور کی مسجد میں جانے کا ارادہ کرے اور وہاں جا کر اپنے آپ کو اس مقصود نماز سے محروم کرے جو اس مسجد میں بھی ادا کی جا سکتی تھی۔ اس کی مزید وضاحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ عمرے کا لغوی مطلب آبادکاری ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ ﴾ [البقرة: ١٥٨] ''تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [التوبة: ١٩]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا۔''

مسجد کی آبادکاری اس میں عبادت کرنے اور اس کا رخ کرنے سے ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

« إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ »[1]

''جب تم کسی آدمی کو مسجد میں جانے کا عادی دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔''

کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٠٢) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٠٩)

﴿ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة: ۱۸]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا۔''

لہٰذا جو انسان بیت اللہ میں مقیم ہو وہ اس کی آباد کاری کا اس شخص کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے جو باہر سے اس کا قصد کر کے آتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ عمرہ زیارت کا نام ہے، کیوں کہ عمرہ کرنے والے کے لیے حدود کے حرم سے باہر آنا ضروری ہے، تب ہی وہ زائر کہلانے کا مستحق ٹھہرے گا، لیکن جو مکے میں رہ کر بیت اللہ کا قصد کرتا ہے اس کو زیارت نہیں، بلکہ ''عمارۃ'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے: آباد کرنا۔ لفظ عمارۃ لفظ عمرۃ سے زیادہ خوب صورت ہے، کیوں کہ لفظ میں اضافہ ہو تو معنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے، کوئی صحابی کہنے لگا: مجھے کوئی پروا نہیں کہ میں اسلام لانے کے بعد مسجدِ حرام کی آباد کاری کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کروں۔ دوسرا کہنے لگا: مجھے کوئی پروا نہیں کہ اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا کوئی دوسرا عمل نہ کروں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اللہ کی راہ میں جہاد ان کاموں سے افضل ہے جو تم نے ذکر کیے ہیں۔ حضرت عمر کہنے لگے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس اپنی آوازیں بلند نہ کرو۔ جب جمعہ ہو جائے گا تو میں ان شاء اللہ آپ کے پاس جاؤں گا اور آپ سے پوچھوں گا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ [التوبة: ۱۹]

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا۔''[1]

اگر معاملہ اس طرح ہے تو جو بیت اللہ میں مقیم ہوتا ہے وہ اس میں طواف کرنے والا ہوتا ہے اور عبادت کے ساتھ اس کو آباد کرنے والا۔ یہ کام کر کے وہ ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جو عمرہ کرنے والے کے معنی سے زیادہ کامل ہے اور وہ عمرے کے مقصود کو بھی بجا لاتا ہے، اس لیے اس کے لیے یہ قطعاً مستحب نہیں کہ وہ عبادت کے ذریعے مسجد کی آباد کاری کا جو کام کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر وہاں سے نکلے اور دوبارہ وہاں آئے اور اس کے بعد مسجد کو آباد کرنے والا بنے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے وہ اعلیٰ کام کو ادنیٰ میں تبدیل کر رہا ہے۔

تنعیم سے عمرہ کرنے کی حقیقت:

ہماری یہ معروضات جن سے معلوم ہوا کہ طواف افضل ہے، اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ مکے سے عمرہ کے لیے حدودِ حرم سے باہر جانا، پھر عمرہ کرنا اور طواف نہ کرنا مستحب عمل نہیں، بلکہ مکے میں رہتے ہوئے طواف کرنا عمرے سے افضل ہے۔

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۷۹)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سلف کا طرزِ عمل نہیں تھا، کتاب وسنت میں اس کا حکم نہیں دیا گیا اور اس کے مستحب ہونے پر کوئی شرعی دلیل نہیں۔ جو اس طرح کا عمل ہو، وہ بالاتفاق بدعت ہوتا ہے، اس لیے سلف اور ائمہ اس سے منع کرتے تھے۔ سعید نے اپنی سنن میں ابن عباس کے جلیل القدر ساتھی طاؤس سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ تنعیم سے عمرہ کرتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ انھیں اجر ملے گا یا سزا؟ پوچھا گیا: سزا کیوں ملے گی؟ جواب دیا: کیوں کہ وہ بیت اللہ کا طواف چھوڑتا ہے اور چار میل باہر جاتا ہے، پھر آتا ہے، جتنی دیر میں اس نے چار میل چلنا ہوتا ہے، اتنی دیر میں وہ دو سو طواف کر سکتا ہے اور اس میں کیا شک کہ طواف بے مقصد چلنے سے کہیں بہتر ہے۔

ابو طالب ناقل ہے، امام احمد سے مُحرم کے عمرے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: اس میں کیا ہے؟ میرے نزدیک عمرہ وہ ہے جس کے لیے تو اپنے گھر سے قصد کرے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ۱۹۶]

اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''عمرہ تھکاوٹ اور خرچے کے مطابق ہے۔'' حضرت علی اور عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے: ''عمرے کا پورا کرنا یہ ہے کہ تو اس کے لیے اپنے گھر سے احرام باندھے۔''

ابو طالب کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس کا مذکورہ بالا قول امام احمد کے سامنے بیان کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی۔

کچھ صحابہ وتابعین نے اس کی اجازت بھی دی ہے، لیکن انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔ ابن ابی شیبہ میں یہ آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔

مکی یا غیر مکی کا رمضان میں کثرت سے عمرے کرنا:

مکی یا غیر مکی کا رمضان میں کثرت سے عمرے کرنے پر تین مسائل مرتب ہوتے ہیں:

① سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنا۔

② غیر مکی کا عمرہ کرنا۔

③ مکی کا کثرت سے عمرہ کرنا۔

کثرت سے عمرہ کرنے کی جائز صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گھر سے نکلے اور میقات سے عمرے کا احرام باندھے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا عمل تھا اور ان کے نزدیک یہی عمرے کی مشہور صورت تھی۔ اس میں علما کا اختلاف ہے کہ یہ عمرہ سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ کرنا مستحب ہے یا مکروہ۔ جن فقہا نے اس کو

مکروہ کہا ہے ان میں حسن بصری، ابن سیرین اور مالک شامل ہیں۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے: وہ سال میں صرف ایک مرتبہ عمرہ کرتے تھے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ایک ہی عمرہ کرتے تھے، وہ سال میں دو مرتبہ عمرہ نہیں کرتے تھے، سو جو ان کا فعل تھا، اس سے زیادہ مکروہ ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمرو بن حزم کے لیے خط لکھوایا تھا، اس میں ایک یہ بات بھی تھی: ''عمرہ حجِ اصغر ہے۔'' قرآن کریم بھی اس پر دلالت کرتا ہے، ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ [التوبة: ٣] ''حج اکبر کے دن۔''

حج سال میں صرف ایک مرتبہ کیا جاتا ہے، اسی طرح عمرہ بھی ایک ہی مرتبہ ہونا چاہیے۔ دوسرے تابعین اور فقہا نے سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ عمرہ کرنے کی رخصت دی ہے۔ ان میں مکے سے عطا، طاؤس اور عکرمہ ہیں۔ امام شافعی اور احمد کا مذہب بھی یہی ہے اور یہی حضرت علی، ابن عمر، ابن عباس، انس اور عائشہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک مہینے میں دو مرتبہ عمرہ کیا، ایک وہ عمرہ جو انھوں نے حج کے ساتھ کیا اور دوسرا وہ جو انھوں نے ذوالحجہ کی چودھویں رات، جس کو لیلۃ الحصبہ کہا جاتا ہے اور یہ ایامِ منیٰ کے بعد والی رات ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کیا۔

نیز صحیحین وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِّمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزاء إِلَّا الْجَنَّةَ»[1]

''ایک عمرے سے لے کر دوسرا عمرہ درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے اور حجِ مقبول کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔''

یہ حدیث اپنے عموم اور اطلاق کے باوجود حج اور عمرے کے درمیان فرق کا تقاضا کرتی ہے، کیوں کہ اگر عمرہ بھی سال میں ایک مرتبہ ہی فرض ہوتا تو وہ حج کی طرح ہو جاتا اور حدیث میں یہ ہونا چاہیے تھا، ایک حج سے لے کر دوسرے حج تک۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔ امام شافعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''ہر مہینے میں ایک مرتبہ۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''جب ان کے سر پر بال اُگ آتے وہ عمرے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''اگر میں طاقت رکھوں تو مہینے میں کئی عمرے کروں۔'' سعید بن منصور میں ہے: حضرت انس جب مکے میں ہوتے اور ان کے سر کے بال اُگ آتے، وہ تنعیم جاتے اور عمرہ کرتے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٤٩)

یہ ۔واللہ أعلم۔ مُحرم کا عمرہ ہے۔ وہ مکے میں محرم تک قیام کرتے تھے، پھر عمرہ کرتے۔ اس اثر کا تقاضا ہے کہ مکے سے عمرہ بالجملہ مشروع اور جائز ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے جواز پر ائمہ کا اتفاق ہے، ابن سیرین سے مروی اس مرسل حدیث کا مفہوم بھی یہی ہے جس میں انھوں نے کہا ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ کے لیے تنعیم کو میقات مقرر کیا۔''

عکرمہ کا قول ہے: ''جب سر پر استرا پھروانا ممکن ہو تو آدمی عمرہ کر سکتا ہے، اگر چاہے تو مہینے میں دو مرتبہ بھی عمرہ کر سکتا ہے۔''

مزید برآں حج کی طرح عمرے کا وقت مقرر نہیں کہ وقت گزر جائے تو آدمی اس سے محروم ہو جائے۔ اگر عمرے کا وقت عام ہے اور سارا سال کیا جا سکتا ہے تو یہ سال میں ایک ہی مرتبہ ہونے کے پہلو سے حج سے مشابہت نہیں رکھتا۔

کثرت اور تسلسل سے عمرہ کرنا:

دوسرا مسئلہ: کیا عمرہ کثرت سے اور پے در پے کرنا چاہیے؟ کسی شخص کا گھر حرم کے قریب ہو، وہ ہر روز ایک عمرہ کرے یا دو عمرے کرے یا جو انسان میقات کے قریب رہتا ہو تو مہینے میں دو، تین، چار، پانچ عمرے کرے یا جو مکے سے عمرہ کرنا جائز سمجھتا ہے تو ہر روزہ عمرہ کرتا رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عمل باتفاقِ سلف مکروہ ہے، اسلاف میں سے کوئی اس طرح نہیں کرتا تھا، اگرچہ کچھ شافعی اور حنبلی فقہا نے کہا ہے، لیکن ان کے پاس عام قیاس کے سوا کوئی دلیل نہیں، انھوں نے عمرے کی فضیلت کی عمومی روایات سے استدلال کیا ہے یا اس کو کثرتِ عبادت میں شامل کیا ہے۔

جن علما نے سال میں ایک سے زیادہ عمرے کرنے کی رخصت دی ہے ان میں سے اکثر نے یہی کہا ہے کہ جب آدمی کے لیے سر پر استرا پھروانا ممکن ہو تو عمرہ کرے یا مہینے میں دو مرتبہ عمرہ کر لے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے عہد میں یہ ثابت نہیں۔ حجۃ الوداع کے متعلق جو تواتر کے ساتھ ثابت ہے وہ یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے تمام صحابہ کو حکم دیا تھا کہ جب وہ طواف اور سعی کر لیں تو احرام کھول دیں اور اس کو عمرہ بنا لیں، لیکن جو اپنے ساتھ قربانی کا جانور لے کر آیا ہے وہ قربانی کے دن اس وقت تک احرام نہ کھولے جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت تک کے لیے عمرہ حج میں داخل ہو چکا ہے۔''[1]

نبی اکرم ﷺ کا عمرہ اور آپ ﷺ کے حکم سے آپ ﷺ کے تمام صحابہ کا عمرہ ان کے حج میں داخل تھا، ان میں کوئی فرق نہیں تھا، لیکن وہ اکثر جن کے ساتھ قربانی نہیں تھی، انھوں نے احرام کھول دیا اور جن کے پاس قربانی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٩٠)

تھی، انھوں نے احرام نہ کھولا اور وہ اس سب کو حجِ تمتع کہتے تھے، جس طرح ان احادیث میں ذکر ہوا ہے جو قارن کو بھی متمتع قرار دیتی ہیں۔

بنا بریں تیسرے مسئلے کا جواب یہ ہے کہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ جو شخص میقات سے احرام باندھ کر عمرہ کرتا ہے اس کے لیے ایک عمرہ کرنے کے بعد بار بار عمرے کرنا مستحب عمل نہیں، بلکہ مکروہ ہے۔ تو معلوم ہوا جو رمضان یا غیر رمضان میں مکے میں رہتے ہوئے بار بار عمرہ کرے، اس کا یہ عمل بھی کراہت سے خالی نہیں، کیوں کہ اس سے دو ممنوع امور لازم آتے ہیں: ایک مکے سے عمرہ کرنا جس کو طواف کے بدلے اختیار کرنا مکروہ ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے اور دوسرے تسلسل سے عمرے کرنا، اس کے عدمِ استحباب پر بھی اتفاق ہے، بلکہ میرے نزدیک اس کے لیے مطلق مکروہ ہے جو اس کے عوض پر اکتفا نہیں کرتا، قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پھر طواف مستحب ہے، بالخصوص باہر سے آنے والوں کے لیے۔ جمہور علما کا یہ موقف ہے کہ باہر سے آنے والوں کا طواف کرنا مسجدِ حرام میں نماز پڑھنے کی نسبت افضل ہے، حالانکہ مسجدِ حرام میں نماز کی بڑی فضیلت ہے۔

رمضان میں عمرہ:

رمضان میں عمرے کے متعلق درج ذیل احادیث مروی ہیں:

صحیحین اور سنن میں عطا سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ حدیث سناتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری سے کہا، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کا نام لیا تھا، لیکن میں بھول چکا ہوں: ''تمھیں ہمارے ساتھ حج کرنے سے کس نے روکا؟'' اس نے کہا: ہمارے پاس صرف دو اونٹ تھے، بچے کا باپ ایک اونٹ کو لے کر حج کے لیے چلا گیا اور ہمارے لیے دوسرا اونٹ چھوڑ گیا۔ ہم اس کو آب برداری کے لیے استعمال کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب رمضان کا مہینا آئے تو تُو عمرہ کر لینا، کیوں کہ رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''[1]

صحیحین میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: «عُمْرَةٌ فِي رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً» ''رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔''[2]

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری خاتون امِ سنان سے کہا: ''رمضان میں میرے ساتھ عمرہ حج کی قضا ہے۔''[3] امام بخاری نے یہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے تعلیقاً روایت کی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

امِ معقل سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے۔'' (رواہ ابن ماجه والترمذي)[1]

امِ معقل سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کیا تو ہمارے پاس ایک اونٹ تھا، ابو معقل نے اس کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ ہم بیماری کا شکار ہو گئے اور ابو معقل فوت ہو گیا۔ آپ ﷺ حج کے لیے نکل گئے۔ جب آپ ﷺ حج سے فارغ ہوئے تو میں آپ ﷺ کے پاس گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے امِ معقل! تجھے حج سے کس نے روکا؟ میں نے جواب دیا: ہم نے تیاری کی تھی، لیکن ابو معقل فوت ہو گیا، ہمارے پاس ایک اونٹ تھا، ہم اس پر حج کرنا چاہتے تھے، ابو معقل نے اس کو اللہ کی راہ میں وقف کرنے کی وصیت کر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اسی پر نکل آتی، حج بھی اللہ کی راہ میں نکلنے کا کام ہے۔'' (رواہ أبو داود)[2] مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے کہا تھا: ''حج اور عمرہ بھی اللہ کی راہ میں نکلنے کے کام ہیں۔''[3]

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے وہ عمرہ مراد لیا ہے جس کو مخاطب جانتے تھے اور اس کی یہی صورت تھی کہ آدمی عمرے کی نیت سے مکے جاتا، یہ نہیں تھی کہ مکی مکے سے نکلے، حدودِ حرم کے باہر جائے اور عمرہ کرے، یہ صورت ان کے ہاں معروف نہیں تھی، اس لیے اس پر ان کا عمل تھا نہ وہ اس کا حکم ہی دیتے تھے۔ اس لیے اس حدیث سے یہ صورت مراد لینا جائز نہیں، کیوں کہ یہ عورت مدینے میں تھی اور اس کا عمرہ میقات ہی سے ہونا تھا، مکے سے نہیں۔

پھر حیرانی کی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو رمضان میں مکی عمرے کی ترغیب دی ہو اور وہ نیکیوں میں شدید ترین رغبت رکھنے کے باوجود اور اس عمل کے اتنے اجر کے ہوتے ہوئے بھی اس کو نہ کریں! کیا آپ ﷺ نے مکے میں مقیم اہلِ مکہ کو اس کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ بھی ہر سال رمضان میں عمرہ کرتے؟!

اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بات اس کو بتائی جو مدینے میں تھا اور جس نے حج کا سفر نہ کر سکنے کی رکاوٹ ذکر کی تھی تو آپ ﷺ نے اس کو بتایا کہ حج اللہ کی راہ میں نکلنے کا کام ہے اور رمضان میں عمرہ حج کے برابر ہے، یہ تو ظاہر ہے، کیوں کہ رمضان میں عمرہ کرنے والا جب اپنے شہر واپس جاتا ہے تو وہ رمضان مبارک میں آمد و رفت کی صورت میں عمرے کا مکمل سفر کرتا ہے، اس کے لیے رمضان کی حرمت اور عمرے کی حرمت دونوں اکٹھی ہو جاتی ہیں، جس کے ساتھ اس کو زمان و مکان کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ زمانی شرف میں بھی حج

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٩٣) صحيح الجامع (١٥٩٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٨٩) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (٤٠٥/٦) شیخ البانی رحمہ اللہ نے إرواء الغليل (٣٧٣/٣) میں اسے صحیح کہا ہے۔

کے برابر ہو جاتا ہے، کیوں کہ حج کا ایک شرف اس کے مہینوں کی وجہ سے بھی ہے اور مکانی شرف میں بھی اس کے برابر ہو جاتا ہے، اگرچہ مشبہ تمام وجوہ سے مشبہ بہ کی طرح نہیں۔

صحیح بخاری کے کچھ طرق میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں، آپ ﷺ نے اس عورت سے کہا تھا: ''رمضان میں عمرہ میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔''[1] آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی تھی کہ اس نے آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن کسی عذر کی بنا پر نہ کر پائی تو آپ ﷺ نے اس کو وہ عمل بتایا جو اس کے قائم مقام ہوسکتا تھا۔

کوئی سمجھ دار اس سے یہ مراد نہیں لے سکتا جو کچھ جاہل سمجھ بیٹھے ہیں کہ اگر ہم میں سے کوئی فرد میقات سے یا مکے سے عمرہ کرے تو وہ آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے کے برابر ہوگا، کیوں کہ یہ بات ضروریاتِ دین میں شامل ہے اور جس کو دین سے ادنیٰ واقفیت ہو وہ بھی جانتا ہے کہ مکمل حج رمضان میں عمرہ کرنے سے افضل ہے۔ ہم میں سے اگر کوئی فرض حج بھی ادا کرے تو وہ آپ ﷺ کے ساتھ حج کرنے کی طرح نہیں ہوسکتا، عمرہ تو ایک طرف رہا!

اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ رمضان میں ہم میں سے کسی کا میقات سے عمرہ کرنا حج کے برابر ہو۔ یہ بات اس شخص سے بھی کہی جا سکتی ہے جس نے حج کا ارادہ کیا ہو، لیکن کسی وجہ سے نہ کر سکے تو وہ رمضان میں عمرہ کرنے کے ساتھ حج کی نیت بھی رکھے تو دونوں کی وجہ سے اس کا عمرہ حج کے برابر ہوگا، صرف ایک کی وجہ سے نہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''حج اور عمرہ میں متابعت کرو (یعنی تسلسل کے ساتھ) یہ دونوں اسی طرح گناہوں اور فقر کو زائل کر دیتے ہیں جس طرح پھونکنی لوہے، سونے اور چاندی سے گندگی زائل کر دیتی ہے۔ حجِ مبرور (مقبول) کا ثواب جنت کے سوا کچھ نہیں۔'' (رواه النسائي والترمذي من حديث ابن مسعود)[2] اس حدیث میں جو آپ ﷺ نے فرمایا ہے: «تَابِعُوا بَيْنَ الْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ» ''حج وعمرہ تسلسل سے کرو۔'' اس سے مکے سے عمرہ کرنا مراد نہیں لیا، اگر یہی مراد ہوتا تو صحابہ آپ ﷺ کے اس حکم پر عمل کرتے، خواہ یہ حکم وجوب کے معنی میں ہو یا استحباب کے۔

اور صحابہ اور تابعین کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے آپ ﷺ کی سنتوں کی پیروی چھوڑ دی اور ان سب نے اس میں رغبت نہ رکھی، حتی کہ اس کے بعد لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے یہ کام کیا۔ اگر وہ مکے سے عمرہ نہیں کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ حدیث کا یہ مقصود بھی نہیں تھا۔ اس سے وہی عمرہ مقصود تھا جس کو وہ جانتے اور کرتے تھے اور وہ باہر سے آنے والے کا عمرہ ہی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٥٦)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديج (٢٨٨٧) السلسلة الصحيحة (١٢٠٠)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ادنیٰ حل (قریب ترین حدِ حرم) سے عمرہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، حالانکہ وہ حج اور عمرہ کے درمیان متابعت کرنے والی تھی، جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی درخواست کی تھی، اگر مکی عمرہ ہی مراد تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہا تھا کہ جو کام انھوں نے کر لیے ہیں، وہی کافی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«طَوَافُكِ بِالْبَيْتِ، وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ يَكْفِيكِ لِحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ »[1]

''تمھارا بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرنا ہی تمھارے حج اور عمرے کے لیے کافی ہے۔''

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اور اصرار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ اگر یہ ایسا کام ہوتا جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کو ترک کرنے اور جو اس کے علاوہ تھا، اس پر اکتفا کرنے کا حکم نہ دیتے، حالانکہ وہ ایسے کام کی اجازت مانگ رہی تھیں جس میں تمام لوگ رغبت رکھ سکتے ہیں۔

صحیحین، سنن ابو داود اور نسائی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''ہم حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، ہم نے عمرے کا تلبیہ پڑھا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس قربانی ہو وہ عمرے کے ساتھ حج کا تلبیہ بھی پڑھ لے، پھر اس وقت تک حلال نہ ہو (احرام نہ کھولے) جب تک دونوں سے حلال نہ ہو جائے، پھر میں حالتِ حیض میں مکے پہنچی، اس لیے طواف کر سکی نہ سعی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنا سر کھول لے اور کنگھی کر لے، حج کا تلبیہ پڑھ لے اور عمرہ چھوڑ دے۔'' میں نے ایسے ہی کیا۔ جب ہم نے حج کر لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عبدالرحمان بن ابوبکر کے ساتھ تنعیم بھیجا اور میں نے عمرہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تیرے عمرے کی جگہ ہے۔'' وہ فرماتی ہیں: وہ لوگ جنھوں نے عمرے کا تلبیہ پڑھا تھا، انھوں نے طواف کیا اور سعی کی، پھر حلال ہو گئے (احرام کھول دیا) اس کے بعد انھوں نے اپنے حج کا ایک اور طواف کیا جب منیٰ سے واپس آئے۔ وہ لوگ جنھوں نے حج اور عمرے کو اکٹھا کیا تھا، انھوں نے ایک ہی طواف کیا۔''[2] صحیحین اور سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں یہ حدیث مروی ہے۔ وہ کہتی ہیں: ہم نے حج کا تلبیہ پڑھا۔ جب ہم ''سرف'' نامی جگہ پر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٨٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٦٤)

پہنچے تو میں حیض سے ہوگئی۔ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور میں رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: اے عائشہ! کیوں رو رہی ہو؟ میں نے کہا: مجھے ماہواری آ گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ چیز اللہ نے آدم کی بیٹیوں کے نصیب میں لکھ دی ہے۔ تو تمام مناسکِ حج ادا کر۔ صرف طواف چھوڑ دے۔ جب ہم مکے داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اس کو عمرہ بنانا چاہے عمرہ بنا لے، مگر جس کے پاس قربانی ہو۔''

رسول اللہ ﷺ نے یوم النحر میں اپنی بیویوں کی طرف سے گائے ذبح کی۔ جب بطحا کی رات ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاک ہوگئیں تو کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول! کیا میرے ساتھ آئی ہوئی حج اور عمرے کے ساتھ واپس جائیں گی اور میں صرف حج کے ساتھ واپس جاؤں گی؟ آپ ﷺ نے عبدالرحمان بن ابوبکر کو حکم دیا تو انھوں نے ان کو تنعیم سے عمرہ کروا دیا، لہٰذا وہ بھی عمرے کے ساتھ لوٹیں۔ (1)

صحیحین، سنن ابی داود اور نسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے دل میں یہ بات آ رہی ہے کہ میں نے جب حج کیا تھا تو طواف نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے کہا: ''اے عبدالرحمان! اس کو لے جاؤ اور تنعیم سے عمرہ کروا لاؤ۔ یہ "ليلة الحصبة" تھی۔'' (2)

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ بڑے نرم خو تھے۔ جب وہ کچھ چاہتی تو آپ ﷺ ان کی ہم نوائی کرتے۔ آپ ﷺ نے ان کو عبدالرحمان بن ابوبکر کے ساتھ بھیجا۔ انھوں نے تنعیم سے عمرے کا تلبیہ پڑھا۔'' (3)

مسلم میں طاؤس کی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: انھوں نے عمرے کا تلبیہ پڑھا، مکہ تشریف لائیں، لیکن حیض کی وجہ سے طواف نہ کر سکیں۔ باقی تمام مناسک ادا کیے تو انھوں نے حج کا تلبیہ پڑھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یوم النفر کو ان سے کہا: تیرا طواف تیرے حج اور عمرے کے لیے کافی ہے، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ نے ان کو عبدالرحمان کے ساتھ تنعیم بھیجا تو آپ رضی اللہ عنہا نے حج کے بعد عمرہ کیا۔ (4)

صحیح مسلم میں مجاہد کی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: وہ ''سرف'' میں حیض سے ہوگئیں اور عرفات

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٩١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٦٣)

(3) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٣)

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

میں پاک ہوئیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا: ''تمھارا طواف اور صفا و مروۃ کی سعی تمھارے حج اور عمرے، دونوں کے لیے کافی ہے۔''[1]

یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے، ان کے عمرے کے متعلق فقہا کے دو اقوال ہیں:

مالک، شافعی اور احمد وغیرہ جیسے جمہور فقہائے حدیث و حجاز کا موقف ہے کہ وہ جب حیض سے ہوئیں۔ اس وقت انھوں نے عمرے سے حج تک فائدہ اٹھانے کا احرام باندھا تھا۔ یعنی حجِ تمتع کا ارادہ کیا ہوا تھا۔ حیض کی وجہ سے وہ عمرے کا طواف نہ کر سکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو پہلا احرام باقی رکھتے ہوئے حج کا احرام باندھنے اور نیت کرنے کا حکم دیا۔ اب وہ حجِ قران کرنے والے کی صف میں داخل ہو گئی، کیوں کہ قارِن (حجِ قران کرنے والا) اس کو کہا جاتا ہے جو ابتداءً حج اور عمرے دونوں کا احرام باندھے، یا عمرے کا احرام باندھے، پھر عمرے کا طواف کرنے سے پہلے حج کو اس میں داخل کر لے۔ ان فقہا کا کہنا ہے کہ احادیث بتاتی ہیں کہ قارِن کے عمل میں مفرد (صرف حج کرنے والا) کے عمل سے قربانی کے سوا کوئی چیز زائد نہیں، اس لیے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے احرام کھول دیا تو آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''تم اپنے حج اور عمرے دونوں سے حلال ہو گئی ہو۔''[2]

امام ابو حنیفہ اور ان کے تائید کنندگان کا موقف ہے، جب ان کو حیض آ گیا تو آپ ﷺ نے ان کو عمرہ چھوڑ دینے اور عمرے سے حج میں منتقل ہو جانے کا حکم دیا۔ ان دونوں میں فرق نہ کرے، بلکہ حجِ افراد میں باقی رہے۔ ان کا کہنا ہے: جب انھوں نے احرام کھولا تو وہ صرف حج سے حلال ہوئیں، جو عمرہ چھوڑا تھا اس کی قضا باقی تھی۔ ان کے قول کے مطابق انھوں نے جو عمرہ کیا تھا، واجب تھا، کیوں کہ وہ اس کی قضا تھا جس کو انھوں نے چھوڑا تھا، تاہم جمہور کے قول کے مطابق وہ واجب نہیں تھا بلکہ جائز تھا۔ اب جو عورت حجِ تمتع کی نیت لے کر احرام باندھے، لیکن طواف سے پہلے حیض سے ہو جائے تو کیا اس کو حجِ قران بنانے کا کہا جائے گا یا عمرہ چھوڑنے کا؟

اس میں ایک تیسرا قول امام احمد سے ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجِ قران تھا اور قارِن کا عمرہ اسلام کے عمرے سے کفایت نہیں کرتا، اس لیے آپ ﷺ نے ان کو اسلام کا عمرہ (بطور مستقل عبادت) کرنے کا حکم دیا۔

چوتھا قول کچھ مالکیوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ حیض کی وجہ سے طوافِ قدوم نہ کر سکیں اور یہ عمرہ عمرۂ اسلام تھا، تاہم یہ کمزور ترین قول ہے اور اس سے پہلا قول بھی اسی طرح کمزور ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٦٣)

اصولِ نزاع اور اختلاف یہ ہے کہ دوسرے قول کے قائلین کے نزدیک قارن کو پہلے عمرے کے لیے طواف اور سعی کرنی چاہیے، پھر حج کا طواف اور سعی کرنی چاہیے، اس لیے ان کے نزدیک ان کا حجِ قران نہیں تھا اور تمتع بھی نہیں، لیکن پہلے فریق کے نزدیک قارِن پر ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی واجب ہوتی ہے، جس طرح حجِ افراد کرنے والے پر ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی واجب ہوتی ہے۔ اگر عورت حیض سے ہو تو اس سے طوافِ قدوم ساقط ہو جاتا ہے اور وہ سعی کو طوافِ افاضہ کے بعد تک موخر کر دے، اس سے زیادہ اس پر کچھ نہیں۔

دوسرے قول والوں کو رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ ملے جو صحیح بخاری میں موجود ہیں: آپ ﷺ نے ان سے کہا: «ارْفِضِي عُمْرَتَكِ»[1] "اپنا عمرہ چھوڑ دے۔" انھوں نے سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو تنعیم سے عمرہ کرنے کا حکم دیا تھا، اس لیے جس عمرے کو چھوڑا تھا اس کی وجہ سے یہ عمرہ ان پر واجب ہو گیا۔ عمرہ چھوڑنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ جب حجِ افراد میں داخل ہو گئی تو انھوں نے عمرہ چھوڑ دیا۔

مگر پہلے قول والوں تک وہ علم پہنچا جو دوسروں تک نہیں پہنچ پایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ان سے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے متعدد وجوہ سے مروی ہے۔ ذرا دیکھیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا کہا اور رسول اللہ ﷺ نے کیا کہا۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا: «قَدْ حَلَلْتِ مِنْ حَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ جَمِيعًا»[2] "تم اپنے حج اور عمرے سب سے حلال ہو گئی ہو۔" «سَعْيُكِ وَطَوَافُكِ لِحَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ»[3] "تمھاری سعی اور طواف تمھارے حج اور عمرے کے لیے ہے۔"

ایک روایت میں فرمایا: «يُجْزِئُ عَنْكِ طَوَافُكِ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ عَنْ حَجِّكِ وَعُمْرَتِكِ»[4] "تمھارا صفا و مروہ کے درمیان چکر لگانا تمھارے حج اور عمرے سے کفایت کر دے گا۔"

یہ صریح الفاظ ہیں جو بتاتے ہیں کہ وہ حج اور عمرہ میں تھیں۔ اکیلے حج میں نہیں تھیں، نیز ایک ہی طواف نے ان کو کفایت کر دی اور ان کو دو طوافوں کی ضرورت نہیں تھی۔

مزید برآں صحیح اور صریح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھ وہ صحابہ جو قربانیاں ساتھ لے کر آئے تھے، وہ مکے کے باہر سے آئے تھے اور جب وہ آئے تو انھوں نے ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٧٦٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٩٧) السلسلة الصحيحة (١٩٨٤)

کی تھی، مذکورہ احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ابتداءً عمرہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ جب انھوں نے اپنی تمنا اور حسرت کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے عبدالرحمان کو بھیج کر ان کو تنعیم لے جانے کا حکم دیا۔ ملخصاً، واللہ أعلم[1]

افضل حج

سوال حجِ قران، تمتع اور افراد میں سے کون سا حج افضل ہے؟

جواب جو آدمی اپنے ساتھ قربانی لے کر آتا ہے اس کے لیے قران افضل ہے۔ جو قربانی ساتھ لے کر نہ آئے، لیکن حج وعمرہ جمع کرنا چاہے اس کے لیے حجِ تمتع افضل ہے اور اگر حج کے لیے علاحدہ اور عمرے کے لیے علاحدہ سفر کرے تو اس کے لیے افراد افضل ہے۔ لیکن اگر مطلقاً احرام باندھے اور اس کے دل میں ان باتوں کا خیال پیدا نہ ہو اس کا حج درست ہوگا، جب اسی طرح حج کرے، جس طرح دیگر مسلمان حج کرتے ہوں۔ واللہ أعلم

عرفات کے اوقات میں بیت المقدس کی زیارت اور وہاں وقوفِ عرفہ کرنے کا حکم

سوال کچھ لوگ وقوفِ عرفات کے اوقات میں نیکی اور قربتِ الٰہی تصور کرتے ہوئے بیت المقدس کی زیارت کرنے کا ارادہ باندھتے ہیں۔ کچھ لوگ صخرۂ بیت المقدس کا طواف کرتے ہیں اور وہاں گہوارۂ عیسیٰ، قبہ معراج، قبۂ سلسلہ اور قبرِ ابراہیم جیسی مشہور جگہوں پر نماز پڑھتے ہیں، کیا یہ کام درست ہیں؟ نیز زائرِ بیت المقدس کے لیے کیا مستحب اور کیا حرام ہے؟

جو عورتیں ان اوقات میں بن ٹھن کر اور خوش بو میں نہا کر زیارت کے لیے آتی ہیں، کیا ان کا یہ عمل مستحب ہے، اگر نہیں تو کیا ان کے ذمے داران ان کو منع کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

جواب الحمد للہ رب العالمین.

بیت المقدس میں نماز پڑھنے، اعتکاف کرنے، تلاوتِ قرآن کرنے، دعا مانگنے اور ذکر اذکار وغیرہ کے لیے سفر کرنا اصلاً مستحب اور بالاتفاق جائز اور مشروع ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین مساجد: مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری اس مسجد کے علاوہ کسی اور کی طرف سفر کرنے کے لیے کجاوے نہ کسے جائیں۔''[2]

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۶/۲٤۸)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۱۳۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۹۷)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حدیث میں ہے: ''جب انھوں نے بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ سے تین دعائیں کی: ① اللہ انھیں ایسی بادشاہت دے جو ان کے علاوہ کسی اور کے لائق نہ ہو۔ ② اللہ ان کے فیصلے کو اپنے فیصلے کے مطابق کر دے۔ ③ جو اس گھر میں نماز پڑھنے کے ارادے سے آئے، اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔''[1]

لہٰذا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیت المقدس آتے، مسجد میں داخل ہو کر دو رکعات ادا کرتے، پھر نکل جاتے اور اس میں پانی نہ پیتے۔ گویا وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا مصداق بننے کی جستجو کرتے، وہ صخرہ بیت المقدس (بیت المقدس میں معلق پتھر) کی زیارت نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی عمر بن عبدالعزیز، اوزاعی اور سفیان ثوری جیسے سلف صالحین بھی ان مقامات کی زیارت کے لیے نہیں آتے تھے جو یہاں مقاماتِ زیارت بنے ہوئے ہیں۔

جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس فتح کیا تو کعب سے پوچھا: لوگوں کے لیے جائے نماز اس پتھر کے آگے تعمیر کی جائے یا پیچھے؟ اس نے کہا: پیچھے تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا: یہودی کے بیٹے! یہودیت تیرے اندر رچی ہوئی ہے۔ میں تو اس کے سامنے ہی بناؤں گا۔ ہمارے لیے مساجد کا اگلا حصہ ہے۔

حضرت عمر، عثمان، علی، معاویہ، یزید اور مروان کے ادوار میں اس پتھر پر یہ گنبد موجود نہیں تھا۔ مروان اور عبداللہ بن زبیر کے درمیان خلافت کے معاملے میں تنازعہ چل رہا تھا۔ لوگ حج کے لیے جاتے تو عبداللہ بن زبیر کی بیعت کرتے، عبدالملک ان کو حج سے منع نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اس نے اس پتھر پر گنبد تعمیر کروا کر اس کی شان و عظمت کے گن گانے شروع کر دیے اور لوگ بھی اسے اہمیت دینے لگے۔

اگر کوئی انسان بیت المقدس جانے اور وہاں کوئی عبادت کرنے کی نذر مانے تو مالکی اور شافعی مذہب میں اس کو پورا کرنا لازمی ہے اور ان کے دوسرے قول میں لازمی نہیں، کیونکہ نذر کے ذریعے وہی عبادت لازم ہوتی ہے جس کی جنس اور اصل شریعت میں واجب ہو تو بالخصوص مکہ میں جانا واجب ہوتا ہے، مگر مسجدِ نبوی اور بیت المقدس میں جانا واجب نہیں، مستحب ہے۔ پہلا قول صحیح ہے، کیونکہ صحیح بخاری میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو اللہ کی فرمانبرداری کرنے کی نذر مانے تو اس کی فرمانبرداری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانے وہ اس کی نافرمانی نہ کرے۔''[2]

اس مقدمے سے معلوم ہوا، بیت المقدس بلکہ مسجدِ نبوی کے ساتھ بھی کوئی عبادت مختص نہیں، نماز، اعتکاف، ذکر، دعا اور تلاوتِ قرآن جیسی عبادات جو دیگر مساجد میں کرنا جائز ہیں، ان دو مساجد میں بھی مشروع اور جائز ہیں۔ مگر مسجدِ حرام کے عکس کہ اس کے ساتھ طواف، استلام اور حجرِ اسود کو چومنے جیسی عبادات خاص ہیں جو کسی دوسری مسجد

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٦٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٩٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣١٨)

میں جائز نہیں، اس لیے بیت المقدس میں معلق پتھر یا کوئی دوسری علامت قابلِ طواف نہیں، اس طرح مسجدِ نبوی میں بھی حجرۂ نبوی یا کوئی دوسری علامت قابلِ طواف نہیں، اسی طرح مسجدِ نبوی میں بھی حجرۂ نبوی یا کوئی دوسری چیز چومنے یا ہاتھ لگانے کا حکم نہیں رکھتی۔ یہ امور ائمہ اسلام کے ہاں متفقہ ہیں۔ کوئی بھی بیت المقدس میں یا مسجدِ حرام کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں طواف، تقبیل اور استلام وغیرہ کو مستحب قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح یہ رسول اللہ ﷺ، ائمہ امت اور قابلِ اتباع سلف صالحین سے بھی ثابت نہیں، بلکہ جو شخص بیت المقدس کے معلق پتھر یا کسی دوسری جگہ کو طوافِ عبادت کے لیے خاص کرتا ہے، اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کرے تو صحیح، ورنہ قابلِ گردن زدنی ہے۔

بیت المقدس میں طواف کرنا اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے بڑا گناہ ہے، حالانکہ وہ مسلمانوں کا پہلا قبلہ تھا، ایسے ہی اس کو یا اس کی کسی علامت کو بوسہ دینا یا حصولِ برکت کے لیے چھونا سب بدعت اور گمراہی کے کام ہیں۔ بیت المقدس میں جس جگہ کو نقشِ پائے رسول قرار دیا جاتا ہے، وہاں نماز پڑھنے کی کوئی فضیلت نہیں۔ بہترین اسلافِ امت سے یہ کام ثابت نہیں۔ یہ اگرچہ اسلام کے آغاز میں قبلہ رہا ہے، مگر ہفتے کے دن کی تعظیم کے منسوخ ہونے کی طرح منسوخ ہو چکا ہے۔ اگر اب اس کو یہود کا قبلہ ہونے کے باوجود تعظیم وعبادت کے لیے خاص کیا جائے تو یہ ہفتے کے دن کو تعظیم کے لیے مخصوص کرنے کی قبیل سے ہوگا۔ بنابریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں نے مسلمانوں کی عبادت گاہ کا اس (گنبد) کے پیچھے بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مکروہ جانا، تاکہ یہود کے ساتھ مشابہت نہ ہو جائے۔

مسجدِ اقصیٰ میں بالخصوص جس جگہ اور مقام کا قصد کیا جاتا ہے وہ مسجد ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعمیر کروائی تھی۔ عام لوگ اس کو اقصیٰ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کے قبہ المعراج، سلسلہ اور مہدِ عیسیٰ وغیرہ جیسے مقامات ہیں۔ ان مقامات میں سے کسی ایک کو عبادت اور زیارت کے لیے خاص کرنا مستحب نہیں، کیوں کہ ان میں سے اکثر چیزیں خود ساختہ ہیں، مثلاً جس پتھر کو مہدِ عیسیٰ کہا جاتا ہے، حقیقی نہیں، البتہ کہا جاتا ہے کہ جب وہاں عیسائیوں کا قبضہ تھا تو اس وقت انھوں نے اس جگہ کو بپتسمہ دینے کے لیے خاص کیا ہوا تھا، کیونکہ بیت المقدس مدتِ دراز تک عیسائیوں کے قبضے میں رہا ہے۔

آج کچھ لوگ عیدِ قربان کے موقع پر بیت المقدس جاتے ہیں، وقوفِ عرفات کی طرح وہاں وقوف کرتے ہیں، جانور ذبح کرتے ہیں، سر منڈواتے ہیں، طواف کرتے ہیں، یہ سب بدعات اور منع کردہ امور ہیں۔ وہاں ان میں سے کوئی کام کرنا بھی جائز نہیں اور وقوفِ عرفات کے اوقات میں وہاں عرفہ بنانا کسی متبوع امام سے ثابت یا مستحب نہیں۔ ایسے ہی وقوفِ عرفات کے اوقات میں کسی دوسری جگہ وقوفِ عرفات کرنے کے لیے وہاں کا سفر کرنا خواہ وہ

عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کا مقام ہو یا محمد بن تومرت کی قبر، ایسے تمام سفر ناجائز، ممنوع بلکہ حرام ہیں، کیونکہ یہ کام ایسے دین کی بنیاد پر عبادت کرنا ہے جو اللہ نے اتارا ہی نہیں اور ایسے ہی ہے جیسے کوئی جب بیت المقدس جائے تو کہیں سے احرام باندھ لے اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دے، لہٰذا جو اس طرح کے خود ساختہ دین کی بنیاد پر عبادت کرتا ہو اس سے توبہ کروائی جائے، اگر توبہ کر لے تو صحیح، ورنہ قابلِ گردن زنی ہے۔

اگر حج کے ایام میں وہاں عرفات منانے کے لیے سفر کرنا ممنوع ہے تو مقدس جمعرات وغیرہ جیسے کافروں کے ایامِ عبادت میں وہاں کا رخ کرنا کتنا سنگین ہو گا! جو انسان کافروں کے یہاں کرسمس، مقدس جمعرات اور ایسٹر جیسے ایام کو مقدس جانتا ہے اور ان کی تعظیم کرتا ہے، اس کا یہ کام بہت بڑی برائی ہے جس سے روکنا فرض ہے، چاہے وہ اپنے گھر ہی میں منائے۔ کسی مسلمان کے لیے کافروں کے مقدس ایام اور مقدس مقامات کو مقدس سمجھنا اور منانا جائز نہیں، کیوں کہ دینِ اسلام میں اس کی کوئی اصل اور دلیل نہیں، آج لوگوں نے کافروں کے ان تہواروں کو اپنے تہوار بنا لیا ہے جو بہت بڑی بدعت ہے۔

اگر کوئی شخص کافروں کے تہواروں میں شریک ہونے کے لیے قدس کا سفر کرتا ہے تو وہ کئی مفاسد اور برائیوں کو کشید کرتا ہے، بلکہ جو دن کافروں کے نزدیک مقدس ہوں ان کو کسی نیکی کے لیے خاص کرنا بھی منع ہے، بہت سے اسلاف کے نزدیک اور تو اور ان دنوں کو روزے کے لیے خاص کرنا بھی مکروہ ہے۔

بیت المقدس کو حرم نہیں کہا جاتا، حرم وہ جگہ ہے جہاں کا شکار کرنا اور پودے درخت اکھاڑنا اللہ نے حرام قرار دیا ہو، جس حرم پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے وہ حرمِ مکہ ہے۔ مدینہ طیبہ بھی امام مالک، شافعی اور احمد جیسے جمہور ائمہ کے نزدیک حرم اور حرمت والا ہے۔ اور یہ مشہور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس کے سوا اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ کوئی حرم نہیں۔ البتہ طائف کی ایک وادی وَجّ کے حوالے سے امام شافعی کا قول ہے کہ یہ بھی حرم ہے، کیوں کہ مسند احمد کی ایک روایت میں اس کا ذکر ہوا ہے۔[1] لیکن جمہور یعنی ابو حنیفہ، مالک اور احمد کے نزدیک یہ حرم نہیں اور انھوں نے اس سے متعلق حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ ان تین مقامات کے سوا اہلِ اسلام کے اتفاق کے ساتھ کوئی جگہ حرم کا درجہ نہیں رکھتی۔

اگر کوئی شخص اپنے شہر میں وقوفِ عرفات کرتا ہے، یعنی عرفہ کی صبح اپنے شہر کی مسجد میں جا کر ذکر اذکار اور دعا میں مشغول ہو جاتا ہے تو یہ بھی علما کے ہاں اختلافی کام ہے۔ ابو حنیفہ اور مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔ احمد کے نزدیک اس کی اجازت ہے، لیکن انھوں نے نہ خود یہ کیا نہ کسی کو کرنے کا حکم ہی دیا، البتہ شافعی سے اس سے متعلق کچھ بھی

[1] مسند أحمد (١٦٥/١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٣٢) ضعيف الجامع (١٨٧٥)

منقول نہیں۔ امام احمد نے بھی اس بنا پر رخصت دی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بصرہ میں اس کی رخصت دی تھی اور عمرو بن حریث نے کوفہ میں۔ یہ انسان کا اپنے شہر میں عرفہ کے دن عرفہ منانے کی صورت ہے۔ لیکن کسی دوسرے شہر میں عرفہ منانے کے لیے نکلنا خواہ وہ فلسطین میں مسجدِ اقصیٰ ہو یا مدینہ میں مسجدِ نبوی، بالاتفاق حرام اور ناجائز ہے اور بیت اللہ کے علاوہ کسی دوسرے گھر کا حج کرنے کی قبیل سے ہے اور اس غرض کے لیے کسی قبر کا رخ کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور شرک و بدعت کے زمرے میں آجاتا ہے، کیونکہ قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا اصلاً مشروع ہے نہ مستحب، اس لیے اگر کوئی ایسی نذر مانے تو اس کو پورا کرنا بالاتفاق ضروری نہیں۔ ہاں اگر کوئی بیت المقدس جانے کی نذر مانتا ہے تو علما کے ایک قول کے مطابق اس کو پورا کرنا واجب اور دوسرے قول میں مستحب ہے۔

قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا متاخرین کے نزدیک اختلافی امر ہے۔ کچھ نے رخصت دی ہے اور ابن بطہ اور ابن عقیل وغیرہما نے مکروہ کہا ہے، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ سفرِ معصیت ہے، اس لیے اس سفر کے دوران میں نمازِ قصر جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''تین مساجد کے سوا رختِ سفر نہ باندھا جائے۔''[1] اس لیے قبروں کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھنا مشروع نہیں۔

لہٰذا کوئی بھی صحابی اور تابعی شام فتح کرنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی وہاں موجود انبیا کی قبروں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے نہیں جاتا تھا، بلکہ خود رسول اکرم ﷺ نے بھی اسرا و معراج کی رات وہاں کسی قبر کی زیارت نہیں کی تھی۔ صحیح کی حدیث سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بیت المقدس میں دو رکعت نماز پڑھی۔[2]

جس حدیث میں یہ ذکر ہوا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے باپ ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے، اتریے اور اس میں نماز پڑھیے۔ یہ آپ کے بھائی عیسیٰ کی جائے پیدائش بیت اللحم ہے، اتریے اور اس میں نماز پڑھیے۔ موضوع اور من گھڑت حدیث ہے۔

جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شام میں سکونت پذیر تھے، یا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہاں گئے مگر رہے نہیں تھے، وہ انبیا علیہم السلام کی طرف منسوب ان آثار و مقامات کو کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انھوں نے ایک سفر کے دوران میں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ انھوں نے ایک جگہ کو نماز کے لیے خاص کیا ہوا تھا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ اس جگہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی تو انھوں نے کہا: ''کیا تم اپنے انبیا کے آثار کو مساجد بنانا چاہتے ہو؟ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ جس کو یہاں نماز کا وقت ہو جائے وہ تو یہاں پڑھ لے ورنہ سفر جاری رکھے۔'' ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ سارے جہاں سے افضل ہیں، مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے کسی اثر اور نقشِ پا کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٩٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢)

سجدہ گاہ نہیں بنایا، تو جن مساجد کو آپ نے تعمیر کروایا، ان کے علاوہ کوئی مقام لائق زیارت نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلی وحی کے مہبط غارِ حرا اور ہجرت کی راہ کے غارِ ثور کی زیارت بھی نہیں کرتے تھے جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے:

﴿ ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ ﴾ [التوبة: ٤٠]

''جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے۔''

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش اور شعب ابی طالب وغیرہ کی قدم بوسی کے لیے بھی نہیں نکلتے تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھی ان آثار کو اہمیت دی جو مناسک کا حکم رکھتے ہیں، مقامِ ابراہیم کا تذکرہ خود قرآن میں ہے:

﴿ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة: ١٢٥]

''اور تم ابراہیم کی جائے قیام کو نماز کی جگہ بناؤ۔''

اس کے باوجود وہ مقامِ ابراہیم کو چومتے تھے نہ بطورِ تبرک چھوتے ہی تھے۔

عبادات توقیف اور اتباع پر مبنی ہیں، ہوائے نفس اور بدعت سازی پر نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ ﴾ [الشورىٰ: ٢١]

''یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

لہٰذا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا تو فرمایا: ''بخدا! مجھے معلوم ہے تو ایک پتھر ہے جو نقصان پہنچاتا ہے نہ فائدہ دیتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔''[1]

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب زیارت بھی ثابت نہیں۔

سلف صالحین نے تو اس شخص کی بھی تردید کی ہے جو طور کی زیارت کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے۔ وہ طور جس پر موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہم کلام ہوئے جو وادیِ مقدس اور بابرکت بقعہ ہے۔ دیگر مقاماتِ انبیا تو ایک طرف رہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سے متعلق بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے زیارت کا لفظ نہیں نکلا، درود و سلام کا لفظ آیا ہے جو قرآن کے بھی مطابق ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴾ [الأحزاب: ٥٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس پر صلاۃ بھیجو اور سلام بھیجو، خوب سلام بھیجنا۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٠)

سنن ابو داود میں ہے: ''جو بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے اللہ اس کا جواب دینے کے لیے مجھ میں میری روح لوٹا دیتا ہے۔''[1] ابو داود کی ایک حدیث میں ہے: ''جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت درود بھیجا کرو، تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔''[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کا جسم مبارک تو رزقِ خاک ہو چکا ہوگا، پھر کس طرح آپ پر ہمارا درود پیش کیا جاتا ہوگا؟ فرمایا: ''اللہ نے زمین پر انبیا کے جسم کھانا حرام کر دیا ہے۔''

البتہ وہ احادیث اس معنی میں جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ایک ہی سال میری اور میرے باپ کی زیارت کی۔ میں اس کو اللہ سے جنت لے کر دینے کی ضمانت دیتا ہوں۔'' یا ''جس نے میری اور یسع کی زیارت کی'' یا ''جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی، گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی، میں اس کو اللہ سے جنت لے کر دینے کی ضمانت دیتا ہوں'' یا ''جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی، اس نے مجھ سے جفا کی'' یہ سب موضوع اور من گھڑت روایات ہیں۔

امام مالک وغیرہ نے ''میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کی زیارت کی'' کہنا بھی مکروہ کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے ہاں اس لفظ کا استعمال بدعت تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سب سے زیادہ جانتے اور سب سے زیادہ اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادوار میں حجاز و شام، یمن و عراق اور مصر و مشرق وغیرہ کی جگہ کسی نبی یا غیر نبی کی قبر پر کوئی درگاہ نہیں تھی جس کی زیارت کے لیے لوگ جاتے ہوں۔ یہ ساری چیزیں قرونِ اولیٰ کے بعد کی پیداوار ہیں، کیونکہ ان تمام کاموں سے روکنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں فرمایا: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔''[3] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کام سے خبردار کرتے ہوئے یہ کہا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''اگر یہ خدشہ نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر باہر نکال دی جاتی، لیکن سجدہ گاہ بنا لیے جانے کے خدشے سے ایسا نہ کیا۔''[4]

صحیح مسلم میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا تھا: ''وہ لوگ بدترین ہوں گے جو قیامت قائم ہونے کے وقت زندہ ہوں گے اور جو قبروں کو مساجد بناتے ہیں۔''[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٤١) السلسلة الصحيحة (٢٢٦٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٤٧) السلسلة الصحيحة (١٥٢٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[4] أيضاً.

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٢)

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن کریم میں مساجد کا ذکر تو کیا ہے، مشاہد (قبریں، درگاہیں) کا نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن: ۱۸]

''اور یہ کہ بلاشبہہ مساجد اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔''

یہاں مشاہد نہیں کہا۔ فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [التوبة: ۱۸]

''اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے۔''

فرمایا:

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [البقرة: ۱۱۴]

''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟ یہ لوگ، ان کا حق نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

دینِ اسلام میں یہ بات قاعدے کی حیثیت رکھتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے مسجد کے سوا کوئی ایسی جگہ اور مقام نہیں جہاں عبادت کی غرض سے رختِ سفر باندھنا جائز ہو۔ کسی غار، گپھا، چلہ گاہ، کسی نبی یا غیر نبی کے کسی اثر اور نشان کا قصد کرنا مسلمانوں کے دین میں نہیں۔ ان کے لیے ساری زمین ہی مسجد کا حکم رکھتی ہے۔ اس عموم اور اباحت کی بنا پر وہ اونٹوں کے باڑوں، قبرستانوں اور حمام وغیرہ جیسی ممنوعہ جگہوں کے علاوہ ہر جگہ کسی علاقے اور مقام کو خاص کیے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں، مگر قبر پر مساجد تعمیر کرنا اور قبر کو سجدہ گاہ بنانا حرام ہے، کیوں کہ یہ کام شرک کی بنیادوں میں داخل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴾ [نوح: ۲۳۔۲۴]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی ودّ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو۔ اور بلاشبہہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور تو ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا۔''

سلف صالحین نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں بزرگ تھے۔ جب فوت ہو گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں پر ڈیرے ڈال لیے اور ان کی مورتیاں گھڑ لیں۔ وقت گزرتا گیا اور لوگوں نے ان کی پوجا شروع کر دی۔ بنا بریں قبروں کی زیارت کی دو صورتیں ہیں: ایک شرعی زیارت اور دوسری بدعی یعنی غیر شرعی زیارت۔

شرعی زیارت کا مقصد، میت اگر مومن ہو تو اس کو سلام کہنا اور اس کے لیے دعا کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا مقصد موت یاد کرنا ہے، خواہ میت مومن ہو یا کافر، جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کے لیے استغفار کرنے کی اجازت چاہی مگر مجھے اجازت نہ ملی، پھر میں نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت چاہی تو اس کی اجازت مل گئی، لہٰذا قبروں کی زیارت کیا کرو، یہ تم کو آخرت کی یاد دلاتی ہے۔''[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قبرستان جانے کی یہ دعا یاد کروایا کرتے تھے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ، وَيَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُتَقَدِّمِيْنَ مِنَّا وَالْمُتَأَخِّرِيْنَ، نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ»

مومن کی قبر کی زیارت، وہ نبی ہو یا غیر نبی، اس کا جنازہ پڑھنے کی قبیل سے ہے، جس طرح جنازے میں اس کے لیے دعا کی جاتی ہے، ایسے ہی زیارت کے وقت بھی اس کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ بدعی یا غیر شرعی زیارت عیسائیوں، مشرکوں کی زیارت کی قبیل سے ہے جس کا مقصود میت سے مانگنا، حصولِ برکت کے لیے اس کی قبر کو چھونا، بوسہ دینا، اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا اور اس کو خدا کا شریک بنانا ہوتا ہے، خدا اور رسول نے ان میں سے کسی کام کا حکم نہیں دیا، کسی امام نے اسے پسند نہیں کیا اور کوئی صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر یا کسی دوسرے کی قبر کے پاس ان میں سے کوئی کام نہیں کرتا تھا، بلکہ قحط سالی کے ایام میں وہ استسقاء کے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر نہیں جاتے تھے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور شفاعت کو وسیلہ بناتے تھے لیکن آپ کی وفات کے بعد انھوں نے آپ کی ذات کو وسیلہ نہیں بنایا، بلکہ استسقاء کے لیے آپ کے چچا عباس کی دعا کو وسیلہ بنایا، صحابہ کرام اللہ کو مخلوق میں سے کسی کا واسطہ نہیں دیتے تھے، وہ نبی ہوتا یا غیر نبی۔ اسی طرح اللہ کے سوا کسی فوت شدہ یا غیر موجود نبی یا غیر نبی سے مدد مانگتے تھے نہ کسی چیز کا سوال کیا کرتے تھے، بلکہ فضلائے صحابہ تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ [الانشراح: ۷،۸]

''تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر۔ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر۔''

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۶)

کو یقینی بنانے کے لیے اللہ کے علاوہ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے تھے۔ ادھر عبداللہ بن عباس کو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت بھی تھی:

«إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ »[1]

''جب مانگے تو اللہ سے مانگ، جب مدد طلب کرے تو اللہ سے طلب کر۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے متعلق مسند احمد میں آتا ہے کہ ''اگر ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو کسی سے یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ مجھے یہ پکڑا دو۔'' وہ کہا کرتے تھے: ''میرے خلیل نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگوں۔''[2] عوف اشجعی وغیرہ کو بھی رسول اللہ ﷺ نے کسی سے کچھ نہ مانگنے کی نصیحت کی تھی،[3] کیوں کہ دین کا لبِ لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کی عبادت اس کی شریعت کے مطابق کریں، بدعت کے مطابق نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢]

''تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔''

فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر میں کہا: ''أخلصه وأصوبه'' وہ دیکھے کہ کس کا عمل زیادہ خالص اور زیادہ درست ہے۔ ان سے پوچھا گیا: خالص تر اور صواب تر ہونے کا مطلب کیا ہے؟ انھوں نے کہا: عمل اگر خالص لوجہ اللہ ہو مگر درست یعنی سنت کے مطابق نہ ہو تو قبول نہیں ہوتا، ایسے ہی اگر درست یعنی سنت کے مطابق ہو مگر خالص لوجہ اللہ نہ ہو تو بھی قبول نہیں ہوتا۔ ان مسائل پر تفصیلی بحث کسی دوسری جگہ گزر چکی ہے۔

عورتیں اگر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے لیے بھی اظہارِ زیبایش کے ساتھ نکلیں تو ان کو بالاتفاق اس سے منع کیا جائے گا اور اگر کسی بدعت میں شریک ہونے کے لیے نکلیں تو یہ کئی وجوہ سے غلط اور برائی ہے۔ خاوند یا باپ وغیرہ کو انھیں اس کام کی اجازت نہیں دینی چاہیے، بلکہ اس سے روکنا چاہیے۔

عورت اگر کسی خاص تہوار یا سفر کے بغیر بیت المقدس کی زیارت کرتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔[4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦) صحيح الجامع (٧٩٥٧)

[2] مسند أحمد (١١/١) ضعيف الترغيب والترهيب (١٢٤/١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٣)

[4] جامع المسائل (٤١٣/٧۔٤٣١)

قربانی اور شکار

قربانی کے لیے قرض لینا

سوال کیا قربانی کے لیے قرض لینا جائز ہے؟

جواب اگر وہ قرض ادا کر سکتا ہو تو قربانی کے لیے قرض لے کر قربانی کرنا بہتر ہے، لیکن ایسا کرنا اس پر لازم نہیں۔
واللہ أعلم[1]

میت کی طرف سے قربانی کرنا

سوال کیا میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے؟

جواب جس طرح میت کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے، صدقہ کیا جا سکتا ہے اور بیت اللہ میں اس کی طرف سے حج کرتے وقت قربانی کی جاتی ہے، اسی طرح عید کے موقعے پر بھی اس کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے، لیکن کسی قبر کے پاس قربانی یا صدقے کا جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔

سنن ابو داود میں ہے: «إِنَّهُ نَهَى عَنِ الْعَقْرِ عِنْدَ الْقَبْرِ»[2] ''آپ ﷺ نے قبر کے پاس جانور ذبح کرنے سے منع کیا۔''

امام احمد نے ایسے جانور کا گوشت کھانا مکروہ قرار دیا ہے جو قبر کے پاس ذبح کیا جاتا ہے، کیوں کہ یہ بتوں کے پاس ذبح کرنے کے مشابہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے! انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[3] آپ ﷺ نے یہ بات ان کے فعل سے خبردار کرتے ہوئے فرمائی۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''قبروں پر نہ بیٹھو اور ان کی طرف رخ کر کے نماز بھی نہ پڑھو۔''[4]

---

[1] مجموع الفتاوىٰ (٢٦/٣٠٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢٢) السلسلة الصحيحة (٢٤٣٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٦٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٩)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

ایک حدیث میں ہے: ''قبرستان اور غسل خانے کے سوا ساری زمین مسجد ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے قبروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا، تا کہ ان لوگوں کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو جو ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

مشرک قبروں کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے لیے قربانیاں پیش کرتے۔ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی بڑا آدمی فوت ہو جاتا تو مشرکین اس کی میت کی تعظیم کے لیے اس کی قبر کے پاس اونٹ اور گھوڑا ذبح کرتے، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ان سب کاموں سے منع کر دیا۔

اگر کوئی اس طرح کی نذر مانے یا شرط لگائے تو اس کو پورا نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح قبروں کے پاس صدقہ کرنا، وہاں کھانے پینے کی چیزیں رکھنا اور اس طرح کے کام مسلمانوں کا طریقہ نہیں۔[2]

ذبح کرنے کا شرعی طریقہ

سوال قربانی کا جانور ذبح کرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے؟

جواب جانور کو قبلہ رخ کر کے اس کے بائیں پہلو پر لٹایا جائے اور ذبح کرنے والا اپنا دایاں پاؤں اس کی گردن پر رکھے اور یہ دعا پڑھے:

"بِسۡمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكۡبَرُ، اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلۡ مِنِّيۡ كَمَا تَقَبَّلۡتَ مِنۡ إِبۡرَاهِيۡمَ خَلِيۡلِكَ، إِنِّيۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِيَ لِلَّذِيۡ فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضَ حَنِيۡفاً، وَمَا أَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ، (قُلۡ) إِنَّ صَلَاتِيۡ وَنُسُكِيۡ وَمَحۡيَايَ وَمَمَاتِيۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ، لَا شَرِيۡكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرۡتُ وَأَنَا أَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ"

اس کا ایک حصہ صدقہ کر دے، ایک حصہ تحفہ دے دے اور باقی کھا لے۔ اگر زیادہ کھا لے یا تحفہ دے دے یا کھا لے یا پکا لے اور لوگوں کی دعوت کر دے تو بھی جائز ہے۔

قصاب کی اجرت اپنے پاس سے دے اور کھال سے خود فائدہ اٹھائے یا صدقہ کر دے۔

کچھ لوگ جانور کو اس کے دائیں پہلو پر لٹاتے ہیں، اپنا بایاں پاؤں اس کی گردن پر رکھتے ہیں اور الٹے ہاتھ سے ذبح کرنے کا تکلف کرتے ہیں۔ یہ سنت سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو بھی عذاب میں ڈالتا ہے اور جانور کو بھی، تاہم ایسا جانور کھانا جائز ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٧٢)

[2] مجموع الفتاویٰ (٢٦/٣٠٦)

جانور کو اس کے بائیں پہلو پر لٹانا اس کے لیے زیادہ آرام دہ اور اس کو ذبح کرنے اور اس کی روح نکلنے میں زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے، سنت بھی یہی ہے اور مسلمانوں اور تمام امتوں کا عمل بھی یہی ہے، نیز ایک بکرا ایک خاندان کی طرف سے کفایت کر جاتا ہے۔ واللہ أعلم

مسلمان کا ذبیحہ اولیٰ ہے

سوال اگر کسی شہر میں ذبح کرنے والے یہودی، عیسائی اور مسلمان ہوں تو کس کا ذبیحہ اولیٰ اور زیادہ لائق ہے؟

جواب الحمد للہ. بلاشبہہ مسلمانوں کا ذبیحہ اولیٰ ہے، بلکہ اہلِ علم کے ایک گروہ کے نزدیک ذمیوں کو مسلمانوں کے قصاب مقرر کرنا مکروہ ہے۔ اسی طرح ان کو خزانے یا کرنسی کے لین دین سے وابستہ کرنا بھی مکروہ ہے، کیوں کہ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ بسا اوقات وہ ایسے کام بھی کر سکتے ہیں جو دینِ اسلام میں جائز نہیں، مثلاً: ذبیحے پر غیر اللہ کا نام لینا، ایسا ذبیحہ جمہور کے نزدیک حرام ہے، اسی طرح جو وہ اپنے لیے ذبح کرتے ہیں وہ ہمارا کھانا نہیں ہوتا، اس لیے یہ منصب ان کو نہیں دینا چاہیے، بلکہ مسلمانوں کے سپرد کرنا اولیٰ اور زیادہ ضروری ہے۔ واللہ أعلم [2]

حاملہ جانور کی قربانی

سوال حاملہ جانور کی قربانی جائز ہے یا ناجائز؟

جواب حاملہ جانور کی قربانی جائز ہے۔ اگر اس کا بچہ مردہ نکلے تو امام شافعی اور احمد کے نزدیک اس کی ماں کو ذبح کرنا اس کو ذبح کرنے سے کفایت کر جاتا ہے، خواہ محسوس کرے یا نہ محسوس کرے۔ اگر زندہ نکلے تو اس کو ذبح کیا جائے گا، امام مالک کا مذہب ہے کہ اگر وہ محسوس کرے تو حلال ہے، ورنہ نہیں۔ امام ابو حنیفہ کا موقف ہے کہ اس کو نکلنے کے بعد جب تک ذبح نہ کیا جائے، وہ حلال نہیں ہوتا۔ واللہ أعلم [3]

جنگلی جانوروں اور پرندوں کے شوقیہ شکار کا حکم

سوال بھوک اور ضرورت کے بغیر محض شوقیہ جنگلی جانوروں اور پرندوں کا شکار حرام ہے یا مکروہ؟

جواب جس شکار میں گھوڑے کو اذیت دی جائے یا فصل تباہ کی جائے یا اس طرح کی کوئی بھی زیادتی کی صورت رونما ہو، حرام ہے۔ اگر اس میں کسی طرح کی زیادتی کا پہلو نہ ہو اور آدمی وقت پر نماز پڑھنے والا اور حقوق و فرائض کا

---

(1) مجموع الفتاویٰ (۳۰۸/۲٦)

(2) جامع المسائل (۳٦٦/۹)

(3) مجموع الفتاویٰ (۳۰۷/۲٦)

پابند ہو تو حرام نہیں، مگر دینی و دنیاوی مصالح اور مفادات سے بے نیاز ہو کر بے مقصد کام میں مشغول رہنا مکروہ ہے۔

اگر اس کا مقصد کسی بھی طرح کے نقصان کے بغیر جہاد کی تربیت کے لیے گھڑ سواری کی مشق ہو تو پھر اچھا عمل ہے، کیوں کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی نیت کا بویا ہوا ہی کاٹتا ہے۔ واللّٰہ أعلم[1]

تیر اندازی اور بندوق بازی کا حکم

سوال تیر اندازی اور بندق[2] (گولا/غلیل بازی) اندازی کا کیا حکم ہے؟

جواب الحمد للّٰہ رب العالمین. تیر اندازی نیک کام ہے اور اللہ و رسول نے اس کا حکم دیا ہے:

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ﴾ [الأنفال: ٦٠]

''اور ان کے (مقابلے کے) لیے قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے تیاری کرو، جتنی کر سکو، جس کے ساتھ تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے۔''

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تیر اندازی کرو اور سواری کرو، سواری کرنے کی نسبت تمھارا تیر اندازی کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ جس نے تیر اندازی سیکھ کر بھلا دی اس نے نعمت کا انکار کیا۔''[3]

آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''تیر اندازی، گھوڑے کی تربیت اور بیوی سے دل لگی کے سوا ہر کھیل لغو ہے، یہ صحیح ہیں۔''[4]

خود رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب بھی تیر اندازی کیا کرتے تھے، بلکہ تیر اندازی میں شرط بدھنا بھی جائز ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''اونٹ کی دوڑ، گھوڑے کی دوڑ اور تیر اندازی، ان تین چیزوں کے سوا کسی میں شرط بدھنا جائز نہیں۔''[5]

جہاں تک بندق، یعنی گولہ باری کا سوال ہے (اس کو جلاہق اندازی بھی کہا جاتا ہے) سلف کے ہاں اس کا

---

1. جامع المسائل (٣٦٦/٩)
2. بندق (مٹی کی پختہ گولی)
3. یہ الفاظ ایک ہی حدیث کے نہیں ہیں بلکہ ''تیر اندازی کرو .... مجھے زیادہ پسند ہے۔'' کے الفاظ سنن أبي داود (٢٥١٣) سنن النسائي (٣٥٧٨) اور سنن ابن ماجه (١٨١١) کے ہیں۔ اور ''جس نے تیر اندازی سیکھ کر بھلا دی وہ ہم سے نہیں۔'' کے الفاظ صحیح مسلم (١٩١٩) میں ہیں۔ اور ''اس نے نعمت کا انکار کیا'' کے الفاظ المعجم الصغیر (١٩٧/١) کے ہیں جن کے بارے میں ابو حاتم الرازی نے العلل (٩٣٩) میں کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١١) شواہد کی بنیاد پر یہ روایت حسن ہے۔
5. سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٧٨) صحيح الجامع (٧٤٩٨)

رواج نہیں تھا، کچھ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں یہ بدعت ایجاد کی تھی اور انھوں نے اس سے روک دیا تھا۔ کچھ علما نے ذکر کیا ہے کہ یہ قومِ لوط کا ایک عمل تھا۔

بندق اندازی کے نتیجے میں مرنے والا جانور وقیذ (چوٹ کے نتیجے میں مرنے والا) ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق ائمہ اربعہ کے اتفاق کے ساتھ اس کو کھانا جائز نہیں، مگر تیر کا شکار (اس صورت میں) جائز ہے جب اس کو اللہ کا نام پڑھ کر چھوڑا جائے اور اس پر سب علما کا اتفاق ہے۔

بندق اندازی نے بہت سی بدعات بھی ایجاد کر رکھی ہیں، انہی میں سے ایک بدعت بندق کی قسم ہے، یہ لوگ بندق کی قسم کھاتے ہیں اور اس پر یقین بھی کرتے ہیں، یہ اہلِ ایمان کا شیوا نہیں۔ ان کے سردار جھوٹی قسم کھانے والے کو کچھ نہیں کہتے، مگر جب کوئی بندق کی جھوٹی قسم کھائے تو اس کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیتے ہیں، پھر ان لوگوں نے ایسے قوانین بھی بنا رکھے ہیں جو آسمانی شریعت کے مخالف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المائدة: ٤٤]

''اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔''

ان کے فیصلہ ساز جہالت کی بنیاد پر اور اللہ کی نازل کردہ شریعت کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، اللہ اور رسول کی مرضی کے خلاف جس کو چاہتے ہیں بلند کرتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں مٹی میں ملا دیتے ہیں اور جو ان کے خانہ ساز قوانین کی خلاف ورزی کرے اس کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف فیصلہ سناتے ہیں۔

سلف صالحین میں بندق اندازی جیسی بدعات کا کوئی سراغ نہیں ملتا، بندق اندازی کے موقع پر اکثر شر اور نقصان پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں بہت کم بھلائی اور فائدے کی امید ہوتی ہے۔ آج تک اس کے ساتھ نہ تو کسی دشمن کو شکست دی گئی ہے، نہ کوئی شہر فتح ہوا ہے اور نہ دین ہی کو کوئی تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اس کے نتیجے میں مرنے والا جانور حرام ہوتا ہے، اکثر یہ پرندوں کو نشانہ بناتے ہیں، اس کا شکار ہونے والے پرندوں کا گوشت حلال نہیں ہوتا۔

تیر اندازی یا تو دشمن کو مارنے کے لیے کی جاتی ہے یا شکار کرنے کے لیے، مگر بندق اندازی کا مقصود نہ دشمن کو قتل کرنا ہوتا ہے نہ اس کا شکار ہی حلال ہوتا ہے، لوگ اس لغو اور بے کار کام کو محض شوق و افتخار کے لیے کرتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے کسی جاندار چیز کو نشانے بازی میں استعمال کرنے سے منع کیا ہے[1] اور آپ ﷺ نے ایسا کام کرنے والے کو ملعون قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٨)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی چوپائے یا پرندے کو تیر اندازی کی مشق کے لیے بطور نشانہ اور ہدف نصب کرنا جائز نہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے جانور کو بلا مفاد اذیت دی جاتی ہے جو جائز نہیں، اللہ تعالیٰ نے جانور کو ذبح کرنے کے لیے اور سواری میں استعمال کے لیے اذیت دینے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ اس میں بنی آدم کا مفاد ہے، لہٰذا کسی پرندے کو بھی نشانے بازی کے لیے ہدف نصب کرنا جائز نہیں، کیوں کہ یہ اس کو راجح مصلحت و مفاد کے بغیر اذیت دینے کا باعث بنتا ہے۔

بندق بازی کرنے والوں کا مقصد اس کے ذریعے کسی جانور یا پرندے کو کھانے کے لیے ذبح و شکار کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ صرف اپنا نشانہ سیدھا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی جاندار کو نشانہ بازی کے لیے ہدف باندھنا، بلکہ اگر تیراندازی کے لیے بھی کسی پرندے یا جانور کو ہدف باندھا جائے گا جس کا مقصد اس کو شکار کے ذریعے ذبح کر کے کھانا نہ ہو تو یہ بھی جائز نہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی چڑیا کو بھی ناحق قتل کیا وہ قیامت کے دن اس حالت میں اللہ کے حضور پیش ہوگی کہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا ہوگا۔''[1] ایک روایت میں ہے: ''جس نے بے مقصد کسی چڑیا کو بھی مار ڈالا وہ قیامت کے دن اللہ سے کہے گی: اے اللہ! اس سے پوچھ، اس نے کیوں مجھے قتل کیا؟''[2] ایک حدیث میں ہے: ''جس نے ناحق کسی چڑیا کو قتل کیا، اللہ اس سے قیامت کے دن پوچھے گا۔'' (رواہ احمد)[3] آپ ﷺ سے یہ فرمان بھی مروی ہے: ''کسی جانور کو کھانے کے بغیر کسی اور کام کے لیے قتل کرنا منع ہے۔''[4]

یہ لوگ پرندوں کو کھانے کے لیے قتل نہیں کرتے، بلکہ ناحق اور فضول مارتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے تو کنکری سے بھی منع فرمایا اور کہا: ''یہ نہ کسی کو شکار کرتی ہے نہ کسی دشمن کو زیر کرتی ہے، مگر آنکھ پھوڑ دیتی ہے اور دانت توڑ دیتی ہے۔''[5]

معلوم ہوا جس تیر اندازی کا مقصد شکار کرنا اور دشمن کو زیر کرنا نہ ہو وہ منع ہے۔ بندق بازی کے نتیجے میں کوئی جانور مر بھی جائے تو اس کا کھانا جائز نہیں ہوتا۔ آج تک کوئی شہر بندق بازی کے نتیجے میں فتح نہیں کیا گیا۔ اس کے

---

[1] ان الفاظ میں یہ روایت نہیں ملی ہے۔

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٤٦) ضعيف الجامع (٥٧٥١)

[3] مسند أحمد (٢/١٩٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٤٥) ضعيف الجامع (٥٧٥٠)

[4] مرفوعاً یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی ہے، البتہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: الموطأ (٢/٤٤٧) سنن سعيد بن منصور (٢/١٤٨) سنن البيهقي الكبرىٰ (٩/٨٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٥٤)

ذریعے کسی دشمن کو شکست نہیں دی گئی اور اقامتِ دین میں اس کا کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اس کھیل کود کے دلدادہ ایسے کام میں لگے ہوئے ہیں جس سے مسلمانوں کو کوئی دینی اور دنیاوی فائدہ نہیں۔ نیز اس کام میں فضول خرچی اور بے مصرف پیسے کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو دینی اور دنیاوی فوائد سے دور کرتا ہے، نیز برائی، بدکاری اور مسلمانوں کے بچوں کو خراب کرنے کا باعث بنتا ہے، ان کے پاس بیٹھنے والے نوعمر اکثر مسلمانوں میں بری شہرت رکھتے ہیں اور یہ طوائفوں اور حماموں کے لونڈوں کی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو عام مسلمانوں کے نزدیک قابلِ مذمت ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم[1]

گھوڑے کے گوشت کا حکم

سوال کیا گھوڑے کا گوشت حلال ہے؟

جواب الحمد للہ. یہ شافعی، احمد اور صاحبین جیسے جمہور علما اور عام فقہائے حدیث کے نزدیک حلال ہے۔ صحیحین میں ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے سال گدھوں کا گوشت حرام اور گھوڑے کا گوشت حلال کیا۔''[2]

حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک گھوڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت کھایا۔[3]

گھوڑوں کے گوشت اور دودھ کا حکم

سوال گھوڑوں کا گوشت اور دودھ مباح ہے یا نہیں؟

جواب گھوڑے کا گوشت اکثر علمائے اسلام کے نزدیک مباح ہے۔ شافعی، احمد، احناف میں سے ابو یوسف، محمد، پھر ثوری، عبداللہ بن مبارک، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، ابن منذر اور صحابہ میں سے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔

صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کا گوشت حرام قرار دیا اور گھوڑوں کے گوشت کی اجازت دی۔''[4] صحیحین میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک گھوڑی ذبح کی اور اس کا گوشت کھایا۔''[5] گھوڑے کا گوشت حرام کرنا کسی صحیح

---

[1] جامع المسائل (۷/۳۰۱۔۳۰۷)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۲۰۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۴۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۱۹۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۴۲) مجموع الفتاویٰ (۳۵/۲۰۸)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۲۰۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۴۱)

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۱۹۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۴۲)

حدیث سے ثابت نہیں۔ قرآن بھی اس کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے:

﴿ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا ﴾ [النحل: ٨]

''اور گھوڑے اور خچر اور گدھے، تاکہ تم ان پر سوار ہو۔''

یہاں اس فائدے کو بطور احسان ذکر کیا ہے جو بالعموم ان سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کے گوشت کو حرام قرار دینا قطعاً مقصود نہیں، کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد خیبر کے دن گدھوں کا گوشت کھایا، تاآنکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا۔ یہ آیت مکی ہے۔ اگر اس میں ان کا گوشت حرام ہونے کی دلیل ہوتی تو صحابہ کو اس کا بخوبی علم ہوتا۔ البتہ امام ابوحنیفہ وغیرہ نے ان کا گوشت مکروہ قرار دیا ہے۔ ایک قول کے مطابق مکروہ تحریمی ہے اور دوسرے قول کے مطابق مکروہ تنزیہی۔

جہاں تک گھوڑے کے دودھ کی بات ہے، اگر یہ نشہ پیدا نہیں کرتا تو گھوڑوں کے گوشت کی طرح مباح ہے۔ اگر نشہ پیدا کرتا ہے تو حرام ہے۔

بخاری و مسلم میں آیا ہے، مسلم کے الفاظ ہیں:

«كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ، وَكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ» [1] ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔''

ہر نشہ آور چیز کا حرام ہونا مالک، شافعی اور احمد اور احناف میں سے محمد بن حسن وغیرہ کا مذہب ہے، لہٰذا آدمی اس کا گوشت بھی کھا سکتا ہے اور دودھ بھی پی سکتا ہے، اگر نشہ پیدا نہ کرے جس طرح گوشت کو دودھ کے ساتھ مطلقاً تناول کرنا جائز ہے، گوشت کے ساتھ دودھ پینا صرف یہودیوں نے حرام قرار دیا ہے، جنھوں نے اپنے ظلم اور گناہوں کی وجہ سے پاکیزہ اور حلال چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی ہیں۔ واللہ أعلم [2]

لگڑ بھگے، لومڑی، جنگلی بلی اور گیدڑ کے گوشت اور کھال کا حکم

سوال کیا لگڑ بھگے، لومڑی، جنگلی بلی اور گیدڑ کی کھال پہننا اور ان سب یا کچھ کا گوشت کھانا حلال ہے؟ نیز کیا ان کی کھالیں دباغت دینے (رنگنے کے بعد) پاک ہو جاتی ہیں؟

جواب مالکی، شافعی اور حنبلی مذہب میں لگڑ بھگے کا گوشت جائز ہے اور اس کی کھال رنگنے کے بعد شافعی، حنفی اور ایک مالکی روایت اور ایک حنبلی روایت میں پاک ہو جاتی ہے اور یہی صحیح تر قول ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠١)

[2] جامع المسائل (٤/٣٤٣)

اس کے مرنے کے بعد اس کی کھال کو رنگا جائے، اگر اس کو ذبح کیا جائے اور دباغت دیا جائے تو وہ ائمہ کے مذاہب میں پاک ہے۔

بلی اور لومڑی کے حلال ہونے میں دو اقوال ہیں جو امام احمد سے دو روایات ہیں:

1. ایک قول ہے کہ وہ حلال ہیں۔ لہٰذا اگر ان کو ذبح کیا جائے تو ان کی کھال بھی پاک ہوگی۔ مالک اور شافعی کا مذہب بھی یہی ہے۔ اس قول کی اساس پر ان کے مرنے کے بعد ان کی کھال دباغت دینے کے بعد پاک ہو جاتی ہے۔
2. دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں حرام ہیں۔ یہ ابو حنیفہ کا مذہب اور امام احمد کی دوسری روایت ہے۔ اس قول کے مطابق اگر ذبح کر لیا جائے تو ابو حنیفہ کے نزدیک اس کی کھال پاک ہو جائے گی، لیکن احمد کے نزدیک نہیں۔ اسی طرح اگر یہ مر جائے اور مرنے کے بعد دباغت کے ساتھ اس کی کھال ابو حنیفہ کے نزدیک پاک ہو جائے گی اور احمد کے مذہب میں ایک توجیہ یہی ہے مگر ظاہر مذہب کے مطابق یہ پاک نہیں ہوگی۔

ابو حنیفہ، شافعی اور احمد کے نزدیک گیدڑ حرام ہے۔ اس کی کھال ابو حنیفہ اور شافعی کے نزدیک دباغت کے ساتھ پاک ہو جاتی ہے۔ حنبلی مذہب میں بھی ایک یہ توجیہ موجود ہے مگر ظاہر مذہب کے مطابق یہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔ البتہ دلیل اس قول کی تائید کرتی ہے کہ درندوں کا گوشت بھی حرام ہے اور کھال بھی ممنوع ہے۔ سنن میں کئی اسناد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں کی کھالوں سے منع کیا اور ان کا گوشت حرام کیا[1] تو جس کا درندہ ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً چیتا، گیدڑ، نیولا وغیرہ اس کا گوشت حلال نہیں اور اس کی کھال کی بنی ہوئی فر پہننا بھی جائز نہیں۔ جو لگڑ بھگے وغیرہ کی طرح حرام درندہ نہ ہو، اس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے اور کھال پہنی جا سکتی ہے۔ البتہ لومڑی اور جنگلی بلی میں اختلاف ہے۔ واللہ أعلم[2]

جاگیر کرائے پر دینے کا حکم

سوال کیا جاگیر کرائے پر دینا صحیح ہے یا باطل؟ کہا جاتا ہے کہ شافعی مذہب میں دو اقوال ہیں اور ان میں سے کچھ نے اس کے صحیح ہونے کا فیصلہ بھی دیا ہے؟

جواب جاگیر وہ زمین جو کوئی کسی کو دے دیتا ہے، اسے کرائے پر دینا صحیح ہے۔ کئی ایک علما نے صراحت سے اس کا ذکر کیا ہے۔ میرے علم کے مطابق نہ ائمہ اربعہ کے اصحاب نے اور نہ کسی مسلمان عالم نے اس کے صحیح نہ ہونے کا فتویٰ نہیں دیا، آج ہمارے زمانے کے جن لوگوں نے اس کے صحیح نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے ان کے پاس ائمہ اربعہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣١، ٤١٣٢) السلسلة الصحيحة (١٠١١)

[2] جامع المسائل (٦/٣٩٣۔٣٩٤)

میں سے کسی امام یا کسی دوسرے مسلمان عالم کا کوئی قول منقول نہیں۔ ان کا اعتماد صرف اس بات پر ہے کہ ان کے کچھ شیوخ نے اس کے صحیح نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ جو جاگیر دے دیتا ہے وہ اس سے حاصل ہونے والی منفعت کا مالک نہیں رہتا تو مستاجر یعنی کرائے پر لینے والا بھی منفعت اور اس کے فائدے کا مالک نہیں بن سکے گا۔ اس طرح اجارہ متذبذب رہے گا، لہٰذا ناجائز ہے، جس طرح اگر کوئی کسی چیز کو کسی سے عاریتاً لیتا ہے تو آگے اس کو کرائے پر نہیں دے سکتا، یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ یہاں گفتگو کے دو محور ہیں:

کسی انسان کو اس جیسے عام معاملے میں جس پر لوگ نسل درنسل عمل پیرا ہوں، اسلام میں کوئی ایسا نظریہ ایجاد کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ اگر اس کو اس میں کوئی اعتراض نظر آئے تو وہ شریعت پر تنقید کرنے والے گمراہوں کے اعتراضات کی نوع سے ہوگا۔ اس کا جواب دو طرح سے ہے:

1. عاریتاً دی گئی چیز کے اجارے میں اختلاف ہے، اگر اس کا مالک اس کو کرائے پر دینے کی اجازت دے دے تو جائز ہوگا، جاگیر عطا کرنے والا سلطان یا بادشاہ بھی جس کو جاگیر دیتا ہے اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا چاہے وہ اس سے غلہ حاصل کرے، چاہے اس کو ٹھیکے پر دے، چاہے اس میں کھیتی باڑی کرے۔

2. یہ حاصل ہونے والے فوائد عاریہ کی طرح نہیں، سلطان ان منافع اور فوائد کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ یہ مسلمان کا حق اور ملکیت ہوتے ہیں۔ سلطان محض تقسیم کار ہوتا ہے جو ان کے درمیان انھیں تقسیم کرتا ہے۔ وہ حقِ ملکیت اور استحقاق سے مستحق بنتے ہیں، استعمال کے محض جائز اور مباح ہونے کی حیثیت سے نہیں، جس طرح اہلِ وقف اپنے وقف کا فائدہ پورا اٹھاتے ہیں اور موقوف علیہ یعنی جن کے لیے وقف خاص کر دیا گیا ہو، اگر وہ اجارے پر دے تو جائز ہوتا ہے، اگرچہ جمہور کے نزدیک اجارہ موقوف علیہ کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے اور بطنِ ثانی یعنی دوسرا قبیلہ اور مستفید وقف کو وقف کرنے والے سے لیتا ہے، پہلے بطن سے نہیں۔ اس لیے جمہور کا کہنا ہے کہ اجارہ اس میت کی موت سے ختم نہیں ہوتا، جس کے ورثا تک وہ چیز منتقل ہو جاتی ہے، یہ مالک، شافعی اور احمد کا مذہب ہے۔ ابو حنیفہ کے نزدیک اجارہ ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ ان کے مذہب کا یہ اصول ہے کہ مستاجر (کرائے پر لینے والا) اس کے فائدے اور منفعت کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنا حق وصول کرنے کا مالک ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منفعت میت کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتی، بلکہ وارث کی ملکیت میں چلی جاتی ہے، اس کے باوجود ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ اگر وہ کرائے پر دی گئی چیز بیچ دے تو جائز نہیں، کیوں کہ اس کی منفعت کرائے پر لینے والے کا حق ہے۔ نیز کرائے پر دینے والا اجارہ ختم کرنے کا اختیار

نہیں رکھتا۔ تاہم جمہور علما کے نزدیک موت کے ساتھ اجارہ ختم نہیں ہوتا، چاہے یہ کہا جائے کہ مستاجر، منفعت کا مالک ہے یا اپنا حق وصول کرنے کا مالک ہے اور کرائے پر دی گئی چیز کی منفعت وارث تک منتقل نہیں ہوتی۔

اگر مؤجر (کرائے پر دینے والا) ہی موقوف علیہ بھی ہو تو اس صورت میں ظاہر تر قول کے مطابق اجارہ فسخ ہو جائے گا، یہ شافعی اور احمد کے مذہب میں ایک قول ہے، کیوں کہ پہلا بطن دوسرے بطن کے حق میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا اِلا یہ کہ موجر دونوں بطنوں کا نگران ہو، جاگیر دینے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، اگر فرض کیا جائے کہ جاگیر دینے والا مر جاتا ہے یا اس سے جاگیر لے لی جاتی ہے تو وہ موقوف علیہ کی طرح ہو گا جس میں جمہور کے نزدیک اجارہ ختم ہو جاتا ہے اور کرائے پر لینے والے کی کھیتی قابلِ احترام رہے گی، اس کو اجرت مثل کے ساتھ باقی رکھا جائے گا، تاآنکہ وہ پک کر تیار ہو جائے، جس طرح وقف کا معاملہ ہوتا ہے، اسی طرح یہاں بھی پہلے کی اجازت دوسرے کے لیے ضروری نہیں۔

شرعی دلائل میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو یہ ضروری قرار دیتی ہو کہ اجارہ صرف ایسے فائدے اور منفعت میں صحیح ہوتا ہے جس میں انفساخ اجارہ نہ ہو سکتا ہو، بلکہ کتاب وسنت اور اجماع کی دلیل سے بچے کو دودھ پلوانے کے لیے دایہ (انّا) کا اجارہ اس جواز کے ساتھ کہ عورت کے فوت ہونے سے اجارہ بالاجماع فسخ ہو جائے گا، جائز ہے۔ ایسے ہی اگر بچہ فوت ہو جائے تو اکثر کے نزدیک اجارہ فسخ ہو جائے گا۔ یہ شوافع اور حنابلہ کا ظاہر مذہب ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ بچے کے فوت ہونے سے اجارہ فسخ نہیں ہوتا، بلکہ اس کی جگہ دوسرا بچہ لایا جائے گا۔ بہرحال پہلا قول زیادہ درست ہے، کیوں کہ اجارہ بعینہٖ اس پر مقرر کیا گیا تھا اور اگر کرایہ پر دی گئی چیز جیسے: غلام، اونٹ وغیرہ، تلف ہو جائے تو بالاجماع اجارہ فسخ ہو جاتا ہے، اس کے نظائر اور مثالیں بے شمار ہیں۔ لہٰذا اجارہ نص اور اجماع کی روشنی میں متعدد جگہوں پر جائز ہے، حالانکہ مدتِ اجارہ میں اس کے ختم ہونے کا امکان باقی ہوتا ہے، اگر کوئی امتناعِ فسخ، یعنی فسخ نہ ہونے کی شرط لگائے تو وہ نص اور اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔

جو یہ کہتا ہے کہ جاگیر کا اجارہ درست نہیں، اس کے پاس ائمہ اربعہ اور دیگر علما میں سے کسی کا کوئی مُفتیٰ بہا قول نہیں، اس لیے کسی کے لیے ایسا قول پیش کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا ہو، چاہے وہ مجتہد ہو یا مقلد۔ اس قول کے قائل کی دلیل زیادہ سے زیادہ عاریہ پر قیاس ہے، کیوں کہ وہ معرضِ انفساخ میں ہوتا ہے، لیکن اگر فرضِ محال اس قیاس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو عاریہ میں حکم کی علت اس کا معرضِ انفساخ میں ہونا نہیں، بلکہ عاریہ پر لینے والے کا اس کے فائدے کا قبض و وصول کے بغیر مالک نہ بننا علت ہے وہ اس پر معاوضہ نہیں دے سکتا جس طرح جس کا مالک نہیں ہوتا اس کا معاوضہ نہیں دے گا، تو خیرات اور عطیوں کی ملکیت (اس کے قائلین کے نزدیک) قبضے میں کرنے کے بعد ہی ثابت ہوتی ہے، لہٰذا کرائے پر لینے والے کا اجارہ درست ہے، اگرچہ اس کے فسخ

ہونے کا امکان ہو، تو جس کو جاگیر عطا کی جائے وہ عاریتاً لینے والے کی نسبت کرائے پر لینے والے اور موقوف علیہ کے زیادہ مشابہ ہے، کیوں کہ وہ اپنا حق اور اپنے کام کا عوض لیتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اصلِ اجارہ میں اختلاف ہے تو اس میں اجماع کا دعویٰ کیسے درست ہے؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اسلاف سے اجارے میں جو اختلاف منقول ہے وہ زمین کے اجارے میں ہے، دایہ کے اجارے، سواری کے لیے جانور اور اس کے امور کے اجارے میں اسلافِ امت میں سے کسی ایک کا اختلاف بھی منقول نہیں، اگر اس میں کسی ملحد نے اختلاف کیا ہے تو اس سے پہلے نص کی بنیاد پر اجماع واقع ہو چکا تھا۔ واللہ أعلم [1]

جنگلی گدھے اور گھوڑے سے پیدا ہونے والے خچر کا حکم

سوال ایک خچر جنگلی گدھے اور گھوڑی سے پیدا ہوا، کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے؟

جواب اگر خچر، جنگلی گدھے اور گھوڑی یا گھوڑے اور جنگلی گدھی سے پیدا ہو تو اس کو کھانا جائز ہے۔ اسی طرح ہر وہ جانور جو دو مباح اصلوں کے درمیان جفتی کے نتیجے میں پیدا ہو، حلال ہوتا ہے۔ وہ جانور حرام ہوتا ہے جو حلال اور حرام کی جفتی سے جنم لے، مثلاً: گھریلو گدھے اور گھوڑوں سے پیدا ہونے والا خچر، بجو اور بھیڑیے سے پیدا ہونے والا بجو وغیرہ۔ واللہ أعلم [2]

اہلِ کتاب کے ذبیحے کا حکم

سوال اہلِ کتاب کے ذبیح کا حکم کیا ہے؟

جواب آج کے زمانے میں جو یہود و نصاریٰ کے ہاتھ سے ذبح ہونے والے جانور کھانے کی مذمت کرتا اور اس سے روکتا ہے، اس کا عمل درست نہیں۔ ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حرام نہیں۔ جو اس کا انکار کرتا اور اس سے روکتا ہے، وہ نادان، غلط اور مسلمانوں کے اجماع کا مخالف ہے۔

اس مسئلے میں مسلمانوں کا اختلاف مشہور اور قدیم ہے۔ اجتہادی مسائل میں محض اندھی تقلید کرتے ہوئے انکار کر دینا جائز نہیں ہوتا، بلکہ دلیل و حجت بیان کر کے موقف واضح کیا جاتا ہے، پھر دوسری بات کی تردید کی جاتی ہے۔ بلا سوچے سمجھے کسی بات کی تردید کر دینا نادانوں اور خواہش پرستوں کا شیوا ہوتا ہے۔ ان کے ذبیحہ کے کھانے کو حرام قرار دینے کا قول آج ہی کیا، پہلے علما کے نزدیک بھی انتہائی کمزور اور جو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ و تابعین کے

---

[1] جامع المسائل (٦/٤٠١۔٤٠٤)

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٥/ ٢٠٨)

احوال معلوم ہوئے ہیں، ان کے مخالف ہے، کیوں کہ جو انکار کرتا ہے، وہ دو اقوال اور آرا سے خارج نہیں، یا وہ ان لوگوں کی صف میں شامل ہوگا جو اہلِ کتاب کے ذبح کردہ جانوروں کو مطلقاً حرام کہتے ہیں، یہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا اور ان کے ذبیحے کھانا دونوں کو حرام کہتے ہیں۔ یہ موقف بعض رافضہ کا ہے۔ مشہور فتویٰ دینے والے مسلمانوں کے ائمہ اور ان کے پیروکاروں میں سے کسی نے بھی یہ موقف اختیار نہیں کیا، یہ کتاب وسنت اور قدیم اجماع کے مخالف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [المائدۃ: ۵]

''اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے، جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی۔''

اگر اعتراض کیا جائے: یہ آیت ان آیات کے معارض ہے:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾ [البقرۃ: ۲۲۱] ''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔''

نیز:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ [الممتحنۃ: ۱۰] ''اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو۔''

تو اس کا جواب تین وجوہ سے ہوگا:

(1) قرآن میں جہاں مطلق شرک کا ذکر ہوا ہے، اس میں اہلِ کتاب داخل نہیں، بلکہ وہ شرکِ مقید میں داخل ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ﴾ [البینۃ: ۱]

''وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، باز آنے والے نہ تھے۔''

یہاں مشرکوں کو اہلِ کتاب سے الگ ایک قسم شمار کیا ہے، نیز فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا﴾ [الحج: ۱۷]

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ اور مجوس اور وہ لوگ جنھوں نے شرک کیا۔''

شرکِ مقید میں ان کا داخل ہونا اس آیت میں ذکر ہوا ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة:٣١]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرک قرار دیا ہے۔

ان کو مطلقاً مشرک قرار نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اصلِ دین میں شرک نہیں جو الہامی کتابوں کی صورت میں انبیائے کرام نے پیش کیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

فرمایا:

﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥]

''اور ان سے پوچھ جنھیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں، جن کی عبادت کی جائے؟''

فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦]

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''

لیکن ان لوگوں نے اس اصل دین میں تبدیلی کر دی اور شرک کی بدعت نکال لی، جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری چنانچہ ان میں شرک ان کی اپنی بدعت سازی کے نتیجے میں آیا، اصل دین کے اعتبار سے نہیں۔ جہاں تک یہ آیت ہے: ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾ تو یہاں ان کافر عورتوں کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں کے عقد میں تھیں اور وہ مشرک تھیں، اہلِ مکہ وغیرہ کی کتابی عورتیں نہیں تھیں۔

(2) اگر فرض کیا جائے کہ لفظ ﴿الْمُشْرِكَتِ﴾ اور ﴿الْكَوَافِرِ﴾ ''کتابیات'' یعنی اہلِ کتاب کی عورتوں کو عام ہے تو مائدہ کی آیت خاص ہو گی، جو متاخر ہے اور بالاتفاق بقرہ اور ممتحنہ کے بعد نازل ہوئی۔ حدیث میں بھی ہے:

''مائدہ قرآن کی آخری نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے، اس لیے اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔''[1]

وہ آیت جو خاص ہو اور متاخر ہو، بالاتفاق پہلے نازل ہونے والی عام آیت کو ختم کر دیتی ہے، تاہم جمہور اہلِ علم اس کو اس کی مفسر قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تخصیص کی صورت عام لفظ میں وارد نہیں ہوئی، ایک گروہ اس کو منسوخ کہتا ہے۔

(3) اگر دونوں آیات کو خاص فرض کیا جائے تو ایک آیت نے ان کے ذبیحوں اور نکاحوں کو حرام کیا اور دوسری نے حلال، ایسی صورت میں حلال قرار دینے والی آیت اور نص دو وجوہ کی بنا پر قابلِ ترجیح ہو گی:

پہلی وجہ: سورت مائدہ کے متاخر ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اس لیے وہ پہلے نازل ہونے والی نص کی ناسخ ہو گی۔

اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے دو مرتبہ حکم کو منسوخ کرنا لازم آئے گا، کیوں کہ تحریم سے پہلے اس پر عمل کسی شرعی خطاب اور دلیل کی وجہ سے نہیں تھا جس نے اسے حلال کیا ہو، بلکہ عدمِ تحریم کی وجہ سے تھا، جس طرح شراب پینا اور خنزیر کا گوشت کھانا جیسے امور جو تحریم سے پہلے کسی حلال کرنے والی نص کی وجہ سے کھائے نہیں جاتے تھے، بلکہ عدمِ تحریم کی وجہ سے استعمال کیے جاتے تھے۔ ابتداءً کسی کام کو حرام قرار دینا فعل کے حکم کے استصحاب (یعنی اس کے سابقہ حکم) کا نسخ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر کچلی والے درندے اور ہر پنجے سے شکار کرنے والے پرندے کو حرام قرار دینا[2] قرآن کے اس مدلول کا ناسخ نہیں تھا جس میں ذکر ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ﴾ [الأنعام: ١٤٥]

''کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے یہ تین اصناف حرام کی تھیں، جن کا ذکر اس آیت میں ہوا، اس آیت کے نزول کے وقت اس آیت نے ان تین اصناف کے ماسوا کی تحریم کی نفی کی ہے، اس سے ان کے ماسوا کی حلت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ جو ان تین کے ماسوا تھا، وہ محض معاف تھا، حلال وحرام سے تعلق نہیں رکھتا تھا،

---

(1) مسند أحمد (١٨٨/٦) المستدرك للحاكم (٣١١/٢)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣٤)

جس طرح بچے اور پاگل کا فعل ہوتا ہے، حدیث میں بھی ہے:

''حلال وہ ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جو اس نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، جس سے سکوت اختیار کیا ہے، وہ معاف ہے۔''[1]

یہ سلمان فارسی کی موقوف روایت ہے یا مرفوع ہے۔

یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ اللہ نے سورت مائدہ میں یہ الفاظ کہے ہیں:

﴿ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ ﴾ [المائدة: ٥]

''آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں۔''

ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ اس دن اللہ نے ان طیبات کو حلال کیا، سورت مائدہ بالاجماع مدنی ہے اور سورت انعام بالاجماع مکی، اس سے معلوم ہوا کہ طیبات کی تحلیل مدینہ میں ہوئی، مکہ میں نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ قُلْ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُکَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَ اذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَ طَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ ... الخ ﴾ [المائدة: ٤،٥]

''تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہہ دے تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جو تم نے سدھائے ہیں، (جنھیں تم) شکاری بنانے والے ہو، انھیں اس میں سے سکھاتے ہو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے تو اس میں سے کھاؤ جو وہ تمھاری خاطر روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام ذکر کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے، جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے .....''

اس آیت سے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا ثابت ہوتا ہے، وہ اس سے پہلے صحیح موقف کے مطابق یا معاف تھا یا حرام تھا، پھر منسوخ ہوگیا۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سورت مائدہ کی آیت کو کسی چیز نے منسوخ نہیں کیا۔

دوسری وجہ: اہلِ کتاب کا کھانا کتاب و سنت اور اجماع کی روشنی میں حلال ہے۔ ان کی عورتوں کی حلت پر بحث ان کے ذبیحوں پر گفتگو کی طرح ہی ہے۔ اگر ایک کا حلال ہونا ثابت ہو جائے تو دوسرے کی حلت از خود ثابت ہو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٦) السلسلة الصحيحة (٢٢٥٦)

جاتی ہے، ان کے کھانے کے حلال ہونے کے معارض اور مخالف اصلاً کوئی دلیل نہیں۔

حضرت حذیفہ بن یمان نے ایک یہودی عورت سے شادی کی تھی اور کسی صحابی نے ان کی تردید نہیں کی تھی، جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس کے جواز پر متفق تھے۔

اگر اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت:

﴿ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ [المائدة: ٥]

''اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے،، جنھیں کتاب دی گئی۔''

صرف پھلوں اور غلے پر محمول ہے تو یہ اعتراض کئی وجوہ سے غلط ہے:

1. پھل اور غلہ اہلِ کتاب سمیت مشرکوں اور مجوسیوں کا بھی جائز ہے، اس لیے اہلِ کتاب کے ساتھ اس کی تخصیص میں کوئی فائدہ نہیں۔
2. کھانے کی نسبت ان کی طرف کرنا یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ان کے فعل کی وجہ سے ان کا کھانا بنا۔ یہ صرف ذبیحوں میں ممکن ہے جو جانور ذبح کرنے کے بعد گوشت بن جاتے ہیں، پھل تو اللہ نے پیدا ہی خوردنی حالت میں کیے ہیں، وہ آدمی کے فعل کے نتیجے میں کھانا نہیں بنتے۔
3. اللہ نے کھانے کی حلت کو عورتوں کی حلت کے ساتھ متصل ذکر کیا ہے اور ہمارا کھانا ان کے لیے مباح کیا ہے، اسی طرح ان کا کھانا ہمارے لیے اور یہ بھی معلوم ہے کہ عورتوں کا حکم اہلِ کتاب کے ساتھ خاص ہے، مشرکوں کی عورتوں کے ساتھ نہیں، اسی طرح کھانے کا حکم بھی ان کے ساتھ ہے، پھل اور اناج اہلِ کتاب کے ساتھ خاص نہیں۔
4. لفظ طعام (کھانا) عام ہے، اس کا گوشت کو شامل ہونا پھل کو شامل ہونے سے زیادہ قوی ہے، اس لیے لفظ کو اس کے عموم پر رکھنا ضروری ہے، بالخصوص اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی پیوستہ ہیں: ﴿ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ﴾ [المائدة: ٥] اور ہمارے لیے اپنے ہمہ انواع کے کھانے، ان کو کھلانا جائز ہے، اسی طرح ہمارے لیے بھی ان کے ہمہ انواع کے کھانے کھانا جائز ہے۔

مزید برآں کتبِ صحاح میں حدیث مشہور ہے:

''خیبر کے سال ایک یہودی عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بھنی ہوئی بکری تحفے میں دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ایک لقمہ کھایا، پھر فرمایا: یہ لقمہ مجھے بتاتا ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔،،[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥١٠، ٤٥١٢)

اگر ان کے ذبیحے کھانا حلال نہ ہوتا تو آپ ﷺ اس بکری کے گوشت کو ہاتھ بھی نہ لگاتے۔ صحیح بخاری میں ہے:

''غزوۂ خیبر کے موقع پر کسی صحابی کو چربی کا ایک تھیلا ملا اور اس نے کہا: آج میں اس سے کسی کو نہیں کھلاؤں گا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف توجہ کی تو آپ ﷺ مسکرا رہے تھے اور آپ ﷺ نے اس کی تردید نہ کی۔''[1]

اس حدیث سے علما نے تقسیمِ غنیمت سے پہلے اسلامی لشکر کے مخالف فوج کے کھانے سے کھانے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی کی دعوت قبول کی، جس نے جو کی روٹی اور پرانی چربی پر بلایا۔[2] یہ چربی ان کے ذبیحے ہی سے حاصل کی گئی تھی، جس کو وہ بطور سالن استعمال کرتے تھے اور یہ ان کے برتنوں ہی میں پکتی تھی۔ اگر ان کے ذبیحے حرام ہوتے تو ان کے برتن بھی حرام ہوتے، جس طرح مجوسیوں وغیرہ کے برتن حرام ہیں۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نے ان کے برتنوں میں کھانے سے منع کیا، پھر دھو کر استعمال کرنے کی اجازت دی۔[3]

یہ بھی مشہور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب شام، عراق اور مصر کے علاقے فتح کیے تو وہ یہود و نصاریٰ کے ذبیحے کھا لیتے تھے، مگر مجوسیوں کے ذبیحوں سے اجتناب کرتے تھے۔

اہلِ کتاب کے ذبیحوں کی حلت کے حوالے سے ایک یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ موجودہ اہلِ کتاب کے متعلق یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ان اہلِ کتاب کی اولاد ہیں جنھوں نے اس منسوخی اور تبدیلی سے پہلے یہودیت یا عیسائیت قبول کی تھی، اس لیے آج کے اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں۔

یہ نیا اعتراض نہیں۔ اہلِ سنت علما نے بھی یہ گرفت کی ہے اور اس میں ان کا اختلاف مرقوم ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ آیا سورت مائدہ کی آیت، جس میں اہلِ کتاب کا ذکر ہوا ہے، ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن نازل ہونے کے بعد اہلِ کتاب کے دین میں داخل ہوئے یا وہ لوگ مراد ہیں جو اہلِ کتاب کا دین منسوخ اور تبدیل ہونے سے پہلے ان کے دین میں داخل ہوئے؟

پہلی رائے جمہور متقدمین اور متاخرین کی ہے، امام مالک اور ابوحنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے اور امام احمد سے بھی یہی منصوص ہے۔

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٢)

② مسند أحمد (٣/٢١١، ٢٧٠)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣٠)

دوسرا قول امام شافعی اور حنابلہ کے ایک گروہ کا ہے۔

اس اختلاف کی بنیاد بنی تغلب کے ذبیحوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ان کے ذبیحے اور عورتیں حلال نہیں، کیوں کہ انھوں نے نصرانیت میں سے صرف شراب پینے کو تھام کر رکھا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جائز ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ﴾ [المائدة: ٥١]

''اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انہی میں سے ہوگا۔''

عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے ذبیحوں کو حرام نہیں کہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے ایسا منقول نہیں۔ جمہور علما نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عمر رضی اللہ عنہ کا قول اختیار کیا اور امام شافعی اور کچھ حنابلہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی۔

بالجملہ یہ قول کہ قرآن میں جن اہلِ کتاب کا ذکر ہوا ہے یہ وہ ہیں جن کے اجداد یہودیت اور عیسائیت کی منسوخی اور تبدیلی سے پہلے اس میں داخل ہوئے، ضعیف اور کمزور ہے، درست یہی ہے کہ کسی آدمی کا کتابی یا غیر کتابی ہونا اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے نسب سے نہیں جو اہلِ کتاب کا دین قبول کرے، وہ ان ہی میں سے ہے، خواہ اس کا باپ یا دادا ان کے دین میں داخل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ اور چاہے اس نے اس دین کی منسوخی اور تبدیلی کے بعد اسے قبول کیا ہو یا اس سے پہلے اس میں داخل ہوا ہو، یہ جمہور علما کا مذہب ہے، یہی راجح ہے اور اس کے کئی دلائل ہیں:

1. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے انصار کی اولاد میں سے ایک گروہ یہودی مذہب میں داخل ہو گیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: اگر کسی عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا تو وہ یہ نذر مانتی کہ اگر اس کے دو بچے زندہ رہ گئے تو وہ ایک کو یہودی بنائے گی، کیوں کہ یہودی اہلِ علم و کتاب تھے اور عرب بت پرست تھے، جب اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو انصار کے ایک گروہ نے یہودیت قبول کر لی، ان کے باپوں نے انھیں مسلمان ہونے پر مجبور کیا تو یہ آیت اتری:

﴿ لَآ إِكْرَاهَ فِى ٱلدِّينِ ﴾ [البقرة: ٢٥٦] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسلام سے پہلے اور حضرت عیسیٰ کی بعثت کے بعد یہودی ہوئے، یعنی یہودیت کی منسوخی اور تبدیلی کے بعد، اس کے باوجود اللہ نے ان کو مجبوراً مسلمان کرنے سے منع کیا اور جزیے پر برقرار رکھا۔ اس سے نسخ اور تبدیلی کے بعد یہودی ہونے والے سے جزیہ لینے کا جواز بھی نکلتا ہے۔ اگر اس کو ذمی بنانا اور جزیہ لینا ثابت ہو جاتا ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی ذات کو دیکھا جائے گا، اس کے نسب کو نہیں، لہٰذا

اس کا ذبیحہ حلال ہو گا، معلوم ہوا یہی قول درست ہے۔

2 مدینہ کے رہنے والے یہود عرب تھے جو بعد میں یہودی ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کھانا کھاتے وقت، ان کی عورتوں کو حلال قرار دیتے وقت اور ان کو ذمی بناتے وقت کبھی ان سے یہ تفصیل نہیں پوچھی تھی کہ کیا ان کے باپ دادا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہودی ہوئے تھے یا بعد میں، بلکہ سب کو ایک ہی حکم میں رکھا اور ان میں کوئی تفریق نہ کی۔ تو معلوم ہوا کہ اس طرح تفریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت نہیں۔

3 کسی کا مسلمان، عیسائی یا یہودی وغیرہ ہونا اس کے ذاتی دین کا نام ہے اور نسبت ہے، کیوں کہ وہ اپنے عقیدے، ارادے، عمل اور قول میں اس کا پیروکار ہوتا ہے، محض باپ کے مسلمان، یہودی یا عیسائی ہونے کی وجہ سے کسی بالغ اور خود مختار کو مسلمان، یہودی یا عیسائی نہیں کہا جاتا۔

4 اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جن لوگوں کو اہلِ کتاب کہہ کر مخاطب کیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اس وقت موجود تھے اور کتاب سے مراد وہی کتاب ہے جو اس وقت ان کے پاس تحریف شدہ اور منسوخ حالت میں موجود تھی۔ وہ لوگ مراد نہیں جو منسوخ اور تبدیل ہونے سے پہلے اس پر عمل پیرا تھے، کیوں کہ وہ تو کافر نہیں تھے اور نزولِ قرآن سے پہلے مر چکے تھے، جب کہ ان اہلِ کتاب کو اللہ نے کافر بھی کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا جو بھی اس کتاب کا دین اختیار کرتا ہے جو اہلِ کتاب کے پاس موجود ہے وہ اہلِ کتاب میں داخل ہے اور یہ لوگ تحریف شدہ کتاب کو اپنا دین بنانے کی وجہ سے کافر اور دائمی جہنمی ہیں، اس کے باوجود اللہ نے ان سے جزیہ لینے اور ان کے کھانے اور عورتوں کے حلال ہونے کا حکم صادر کیا ہے۔

5 دینی شرف اور عزت کو محض نسب کے ساتھ مربوط کرنا جاہلیت کی عادت ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''اے لوگو! بے شک ہم نے تمھیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمھیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''کسی کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر تقویٰ کے سوا کوئی فضیلت

نہیں۔ لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی کے تھے۔"[1]

قرآن کی کوئی آیت محض نسب کی وجہ سے کسی کی تعریف کرتی ہے نہ مذمت، بلکہ ایمان اور تقوے کی وجہ سے تعریف کرتی ہے اور کفر، فسوق اور نافرمانی کی وجہ سے مذمت کرتی ہے۔

6 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب شام، عراق، مصر اور خراسان کے علاقے فتح کیے تو وہ اہلِ کتاب کے ذبیحے کھاتے تھے اور انھوں نے کبھی ان کے درمیان اس طرح کی تقسیم نہیں کی تھی۔

7 اس قول کو ماننے سے یہ ماننا لازم آئے گا کہ جمہور اہلِ کتاب کا کھانا ہمارے لیے حلال نہیں، کیوں کہ ہم اکثر کا نسب نہیں جانتے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے آبا و اجداد نے کب یہودیت یا عیسائیت قبول کی تھی۔ ان کے ذبائح اور عورتوں کی حلت کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اگر اس قول کو جان لیا جائے تو کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ہونے والے حکم کو مٹا دینا لازم آئے گا، جو باطل ہے۔

8 ہر علاقے اور زمانے میں مسلمان ہمیشہ ان کے ذبیحے کھاتے رہے ہیں، جو اس کا انکار کرتا ہے وہ اجماع کی مخالفت کرتا ہے۔

یہ ساری وجوہ اس قول کے راجح اور دلیل کا تقاضا ہونے کو بیان کرنے کے لیے ذکر کی گئی ہیں، اس جیسے اجتہادی مسائل میں دلیل کے بغیر فریقِ مخالف کی تردید کرنا کسی قول کو راجح قرار دینا، اہلِ علم کا شیوا نہیں، لیکن جس کے پاس شرعی حجت ہو تو شرعی دلیلوں کی پیروی کرنا فرض ہو جاتا ہے، جب وہ ظاہر اور واضح ہو جائیں۔ جہاں حق واضح ہو جائے، وہاں اسے قبول کر لینا چاہیے اور جس کا باطل ہونا کھل جائے، اسے رد کر دینا چاہیے، جس مسئلے میں دونوں پہلو واضح نہ ہوں، وہاں توقف کرنا چاہیے۔ جس طرح ہر ایک کی جسمانی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، وہیں ہر ایک کی ذہنی اور عقلی صلاحیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ علما اجتہاد کرتے ہیں اور عوام تقلید۔ اللہ ہمیں ہدایت اور اپنی رضا کی راہ دکھائے۔ (ملخصاً) واللہ أعلم[2]

عورت کا ذبح کرنا

سوال کیا عورت جانور ذبح کر سکتی ہے؟

جواب عورت اور مرد دونوں کا ذبیحہ جائز ہے، عورت ماہواری کی حالت میں بھی جانور ذبح کر سکتی ہے، اس کا حیض

---

[1] مسند أحمد (٥/٤١١) علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے مجمع الزوائد (٨/١٦٠) میں کہا ہے کہ اسے بزار نے روایت کیا ہے اور بزار کے رجال صحیح والے رجال ہیں۔

[2] مجموع الفتاویٰ (٣٥/٢١٢)

اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ عورت کا ذبیحہ بالاتفاق جائز ہے۔ ایک عورت نے ایک بکری ذبح کی اور آپ ﷺ نے اس کو کھانے کا حکم دیا۔[1]

مرتے ہوئے جانور کو ذبح کر کے کھانا

سوال بکری یا گائے وغیرہ مر رہی ہو تو کیا اس کو ذبح کر کے کھایا جا سکتا ہے؟

جواب الحمد لله رب العالمين. ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ [المائدة: ٣]

''تم پر مردار حرام کیا گیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے والا جانور اور جسے چوٹ لگی ہو اور گرنے والا اور جسے سینگ لگا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم ذبح کر لو اور جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو۔''

امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ کے نزدیک جب ان مذکورہ جانوروں میں سے کسی کو مرنے سے پہلے ذبح کر لیا جائے تو اسے کھانا حلال ہوتا ہے، یعنی جب جانور زندہ ہو اور اس کو ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہوتا ہے، اس میں مذبوح کی حرکت نہیں دیکھی جاتی کہ ذبح ہوتے وقت اس نے حرکت کی یا نہ کی یا کتنی کی، کیوں کہ اس کا کوئی ضابطہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا أَنْهَرَ الدَّمَ وَذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ فَكُلُوا»[2]

جب جانور کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے اور اس سے خون بہہ جائے تو اسے کھا لو۔''

اگر اس ذبح شدہ جانور سے اس طرح خون بہے جس طرح زندہ جانور کو ذبح کرنے سے بہتا ہے تو اس کو کھانا حلال ہوتا ہے، چاہے بظاہر وہ مردہ نظر آ رہا ہو۔ لوگ زندہ اور مردہ کے خون میں فرق کرتے ہیں۔ مردہ کا خون کالا اور جامد ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ نے مردار حرام کیا ہے، کیوں کہ رطوبتیں اس کے اندر جم جاتی ہیں۔ تاہم کچھ صحابہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ جانور ذبح ہوتے وقت ٹانگ مارے، یا آنکھ میں یا دم میں حرکت پیدا کرے تو وہ زندہ ہوتا ہے، کیوں کہ حرکت زندگی کی دلیل ہے، مگر یہ دلیل کافی نہیں۔ بعض اوقات ان علامات کے بغیر بھی جانور زندہ ہوتا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٨١) مجموع الفتاوىٰ (٣٥/٢٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٦٨)

زندہ جانور کو ذبح کرتے وقت جس طرح خون بہتا ہے، اسی طرح خون بہنا ہی اس کے زندہ ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ واللہ أعلم[1]

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنے کی حیثیت

سوال جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینے کا شرعی حکم کیا ہے، نیز اگر یقین ہو کہ ذبح کرنے والے نے اللہ کا نام نہیں لیا تو کیا اس کو کھانا حلال ہوتا ہے؟

جواب ذبح کرتے وقت ''بسم اللہ'' پڑھنا اور اللہ کا نام لینا شرعی حکم ہے، یہ امام شافعی کے نزدیک مستحب ہے اور امام ابو حنیفہ، مالک اور مشہور روایت میں احمد کے نزدیک قصداً واجب ہے، مگر سہواً ساقط ہے۔ تیسرے قول کے مطابق یہ مطلقاً واجب ہے، اس کے بغیر ذبیحہ کھانا جائز نہیں، خواہ کوئی عملاً اس کو نہ پڑھے یا سہواً رہ جائے۔ یہ امام احمد سے دوسرا قول ہے اور کئی اسلاف کا قول بھی یہی ہے۔ یہ سب سے زیادہ واضح اور ظاہر قول ہے، کیوں کہ کتاب وسنت نے کئی جگہوں پر ذبیحے کے حلال ہونے کو اللہ کا نام لینے کے ساتھ معلق کیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١١٨]

''تو اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١١٩]

''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے۔''

فرمایا:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ ﴾ [الأنعام: ١٢١]

''اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔''

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس سے خون بہہ جائے اور جس پر اللہ کا نام لیا جائے تو اسے کھاؤ۔''[2]

صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عدی رضی اللہ عنہ سے کہا:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (٢٣٦/٣٥)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٥٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٩٦٨)

''جب تو اللہ کا نام لے کر اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑے اور وہ شکار قتل کر دے تو کھا لے، اگر تیرے کتے کے ساتھ اور کتے بھی شریک ہو جائیں تو نہ کھا، کیوں کہ تو نے اپنا کتا چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہے، دوسرے کے کتوں پر نہیں۔''[1]

صحیح میں جنوں نے اپنے اور اپنے جانوروں کے لیے کھانے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہر وہ ہڈی جس پر اللہ کا نام لیا جائے، وہ تمھارے لیے وافر گوشت ہے اور ہر مینگنی تمھارے چوپائیوں کا چارہ ہے۔''

آپ ﷺ نے ہڈیوں سے استنجا کرنے سے منع کیا اور فرمایا:

''یہ تمھارے بھائی جنوں کا کھانا ہے۔''[2]

اگر مومن جنوں کے لیے وہ کھانا جائز نہیں، جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تو انسانوں کے لیے ایسا جانور کھانا کیونکر جائز ہوسکتا ہے، جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ تاہم اگر انسان کو ایسا گوشت ملے جو کسی دوسرے نے ذبح کیا ہو تو وہ بسم اللہ پڑھ کر اس کو کھا سکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے:

''کچھ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کچھ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اور وہ گوشت لے کر آتے ہیں، ہمیں معلوم نہیں کہ انھوں نے اللہ کا نام لیا ہوتا ہے یا نہیں لیا ہوتا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم خود اللہ کا نام لے لو اور کھا لو۔''[3]

تاہم اگر انسان کو یقین ہو کہ ذبح کرنے والے نے بسم اللہ نہیں پڑھی تو کھانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ واللہ أعلم[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٨٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٢٩)

[4] مجموع الفتاویٰ (٣٥/٢٣٩-٢٤٠)

یادداشت



Street no: 5, Hameed Colony, Gill Road, Gujranwala
+92-55-3823990 darabitayyab1@gmail.com
fb/darabitayyab www.darabitayyab.com

دار أبي الطيب
للبحث والتحقيق